فہرست مضامین سالنامۂ "ادبی دنیا"

سنہ ۱۹۳۵ عیسوی

مضامین نثر و نظم

تصاویر

سہ رنگی

یک رنگی

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

بزم ادب

ادارت کی بے پناہ ذمہ داریاں ایک عرصے مولانا صلاح الدین احمد کی صحت کا جائزہ لے رہی تھیں، مگر وہ مردانہ وار اپنے روز افزوں فرائض ادا کرتے رہے۔ سالنامہ کی ترتیب و تدوین نے ان کی دماغ سوزی و فرسودگی میں ایک حوصلہ آزما اضافہ کر دیا، پھر بھی وہ ایک عرصہ تک تنہا اپنے تمام فرائض سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ جس جوش و خروش سے وہ سالنامہ کو دنیائے صحافت کا شاندار ترین کارنامہ بنانے میں مصروف تھے، اس سے ان کے احباب کو یہ اندیشہ تھا کہ مولانا کو نقاہت ہو جائے۔ افسوس ہے کہ یہ خیال صحیح ہو کر رہا۔ آج ڈیڑھ ماہ سے مولانا صاحب صاحب فراش ہیں۔ ان کی علالت اور طویل غیر حاضری میں سالنامہ کا مکمل ہو جانا کوئی آسان بات نہ تھی لیکن تائید غیبی میرے شامل ہوئی اور مجھے ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے جیسے رفیق کار میسر آگئے جنہوں نے ترتیب و تدوین کی تمام تر ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ الحمد للہ کہ ان کی قابلیت، مستعدی اور دوست نوازی کی بدولت سالنامہ اپنی پوری آب و تاب سے شائع ہو گیا اور مجھے ان پریشانیوں کا احساس تک نہ ہوا جو مولوی صاحب کی علالت کے باعث مجھ پر قدرتاً نازل ہونے والی تھیں۔

ادبی دنیا نے دورِ جدید میں جو ترقی کی ہے اور جس طرح اپنے معیار کو بلند سے بلند تر بنانے کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کی ہیں اور مصارفِ کثیر برداشت کر کے گراں قدر اور دلچسپ مضامین کی اشاعت کا انتظام کیا ہے، ناظرین سے مخفی نہیں، ہماری مساعی کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں اس کا اندازہ آپ سال گذشتہ کے بلند پایہ مضامین کی کثرت اور تنوع سے کر سکتے ہیں۔ ادارہ کی کاوشوں کا حاصل علم و ادب کے وہ جواہر پارے ہیں جن سے "ادبی دنیا" کا دامن بھرا ہوا ہے، ہمارے کرمفرماؤں کے اس قول میں کوئی مبالغہ نہیں کہ "ادبی دنیا" کا معمولی پرچہ ضخامت اور معیارِ مضامین کے لحاظ سے عام رسالوں کے خاص نمبروں کا مقابلہ کرتا ہے اس طرح گویا "ادبی دنیا" سال میں بارہ خاص نمبر اپنے خریداروں کی نذر کرتا ہے لیکن چونکہ سال نو کو غیر معمولی شان و شوکت سے منانا صحافت کی روایات کے خلاف سمجھا جاتا، اس لئے "ادبی دنیا" کو بھی سالنامہ کی اشاعت پر توجہ کرنی پڑی۔ اس طرح ادارہ کو ایک کٹھن مشکل درپیش ہوئی۔ وہ یہ کہ جو امتیازی شان عام نمبروں میں پائی جاتی ہے اس سے بڑھ کر سالنامے میں امتیازی خصوصیات پیدا کی جائیں۔ اور سالنامہ ہر حیثیت سے سالنامہ کہلانے کا مستحق ہو، یہ مشکل پہاڑ کی طرح ہمارے سامنے تھی۔ اڑھائی سو جہازی صفحات کو ہندوستان کی بہترین ادبی جنس سے پر کرنا ایک دشوار مرحلہ تھا۔ اگر خدا کی رحمت اور ناخدایانِ ادب کی اعانت شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ جہاز کبھی ساحلِ امید تک نہ پہنچتا۔ لیکن اللہ جل شانہ نے ہمارے ارادے کو برکت دی اور ہماری کوششیں رائگاں نہ گئیں۔ "سالنامہ" کو دیکھنے کے بعد ناظرین خود ہی یہ رائے قائم کر لیں گے کہ مشاہیر اہلِ قلم کا ایسا شاندار اجتماع بہت کم موقعوں کو نصیب ہوتا ہے۔

سالنامہ کے مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ بہترین ادبا کے بہترین افکار سے بھرا پڑا ہے، تمام مضامین پر فرداً فرداً قلم اٹھانا اور ان میں سے ہر ایک کی بے شمار خوبیاں گننا تو ممکن نہیں البتہ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ صرف وہی افسانے اور ڈرامے شامل کئے گئے ہیں جو بہ اعتبارِ فن بے عیب ہیں اور جن میں زندگی کی نیرنگیوں سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا گیا ہے، وہی تحقیقی مضمون درج کئے گئے ہیں، جو مدتِ دراز کے مطالعہ، غور و فکر اور واقعات کی جانچ پڑتال کے بعد قلم بند کئے گئے ہیں، سالنامہ کے صفحوں کو صرف انہی شعرا کا کلام مزین کرتا ہے جن کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور جنہیں شعر گوئی کا ملکہ قدرت سے ودیعت ہوا ہے، اشعار کہنے والے کے دل سے نکلتے ہیں اور سننے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں۔

ہمارے محترم اربابِ نگارش تعارف کے محتاج نہیں اور نہ ہم صرف رسمی شکریہ سے ان کے احسانات سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے گرانبہا ادبی عطیات کے پیشِ نظر جو ہدیۂ سپاس ہم ان کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں وہ ایک مختصر تبصرہ کی صورت ہی میں ہو سکتا ہے۔



عمل چغتائی

اس بے نظیر تصویر کی سب سے بڑی فنی خوبی یہ ہے کہ مصور نے محبت اور فرض کی کشمکش کو بہترین رنگ میں ظاہر کیا ہے
سرفروش کی ماں اور بیوی کے متضاد نقوش سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فرض شناسی کے جذبہ نے ان کی یاد کو اس کے
دل سے محو کر دیا ہے۔ رنگوں میں اس نادر تخیل کا اظہار چغتائی ہی کے موقلم کا حصہ ہے اور تصویر کے آئینہ میں جذبات کی اس کامیابی سے عکاسی
صرف چغتائی ہی کر سکتا ہے۔

شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی دحیا آفریں غزل "کیفِ خرابات" ایک ایسا ساغر ہے جس کا ہر جرعہ تشنگانِ ادب کو دعوتِ سرمستی دیتا ہے جس کی رنگینی بادۂ شیراز کو شرمندہ کرتی ہے اور جس کا نشہ غمِ روزگار کو محو کر دیتا ہے، حضرت آزاد انصاری کی "دعوتِ طرب" جدید رنگ کی ایک غزل ہے اور اس طرز کے موجد بھی وہی ہیں۔ خان بہادر رضا علی وحشتؔ اور مولانا احسن مارہروی کی غزلیں قدیم شاعری کا بہترین نمونہ ہیں اور اگر ان استادانِ سخن کو اردو کا عرفیؔ و نظیریؔ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، حضرت امجدؔ کی "آخری منزل" میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے، حق تو یہ ہے کہ ہندوستان کی صوفیانہ شاعری کا وجود ہی ان کے دم سے ہے، حضرت سیمابؔ اکبر آبادی کی فلسفیانہ رباعیات اپنی قسم کی بہترین چیزیں ہیں، حضرت صدق جائسی کی "سحر کی رات" ان کے رنگ کی پختگی کی شاہد ہے، پنڈت تلوک چند محرومؔ کی "رباعیات" اور نظم سے ظاہر ہے کہ وہ مناظرِ قدرت اور جذباتِ قلب کی ترجمانی کس خوبی سے کرتے ہیں، حضرت آثر صہبائی فراقؔ، ساغرؔ، علی منظور کیفیؔ جے پوری کا کوئی منظر ہری چند اختر، اندر جیت شرماؔ کا کلام قابلِ تحسین ہے، مقامی حضرات میں سے پروفیسر عابدؔ، پروفیسر تبسمؔ، حضرت اختر شیرانی اور مولانا جلال الدین اکبرؔ "ادبی دنیا" کے خاص مہربانوں میں سے ہیں، کوئی کور ذوق ہی ہوگا جو عابدؔ کے کلام کی موسیقی اور رنگینی سے متاثر نہیں ہوتا، جس پر تبسمؔ کا کلام کیفیت طاری نہیں کرتا جو اخترؔ کے "الہامِ منظوم" کا قائل نہیں اور جس کے دل پر اکبرؔ کے کلام کی پختگی کا نقش نہیں۔ "ادبی دنیا" کے نوجوان شعراء عدمؔ، ضیاؔ اور حفیظؔ سے بھی اردو شاعری کی بہترین توقعات وابستہ ہیں۔

سالنامہ کے افسانوں میں منشی پریم چند کا "وفا کا جال"، نور الٰہی محمد عمر صاحبان کا "عورت کی لطافت"، مرزا عظیم بیگ چغتائی کا "خود مختار دوشیزہ" اور حضرت فہیم بیگ چغتائی کا "مہتون" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "وفا کا جال" میں تلیا کا کیریکٹر خاص دلچسپی کا باعث ہے، قابل مصنف نے دکھایا ہے کہ ایک بظاہر ہیچ عورت بھی اپنے اخلاق کی بلندی اور اپنی دانائی سے ہیروئن بن سکتی ہے، "مہتون" اور "عورت کی لطافت" نفسیات سے گہری واقفیت ظاہر کرتے ہیں۔ حامد علی خاں کے افسانہ "کلوپیٹرا" کی دلآویزی سے کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ "خود مختار دوشیزہ" مغرب کی آزادی کا ایک پُرلطف مظہر ہے، اسے پروفیسر نندا کے دلچسپ ڈراما "للی کا بیاہ" کے ساتھ پڑھئے تو تہذیبِ مغرب کا ایک مکمل نقشہ آپ کے ذہن میں مرتب ہو جائے گا۔

آغا حشرؔ کاشمیری کا اصلاحی ڈراما "آنکھ کا نشہ"، شاہد احمد صاحب مدیر "ساقی" کا نفسیاتی ڈراما "بے بسی"، انند لال داس صاحب نمر کا معاشرتی ڈراما "تماس" اور حضرت کلیمؔ کا تاریخی ڈراما "فریبِ دولت" پڑھنے کے بعد کسی کے دل میں شک کی گنجائش نہیں رہے گی کہ "ادبی دنیا" تنوع، دلچسپی اور رفعتِ خیال کو یکجا کرنے میں کسی ہمعصر سے پیچھے نہیں۔

ادبی مضامین میں "ادبی دنیا" کی وسعت تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا، علامہ کیفیؔ دہلوی کا جامع مقالہ "اردو شاعری کا پہلا مناظرہ" اردو ادب کی ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ پروفیسر کے آرگاموسے جو جاپانی نژاد اور جاپان کے ایک نامور عالم ہیں، ہمسند رپار سے اپنا پُراز معلومات مضمون "جاپان میں اردو" بھیجا ہے۔ آپ ایسی رواں اور بے تکان اردو لکھتے ہیں کہ اہلِ زبان کو بھی حیرت ہوتی ہے۔ "بن راس" جو ایک مشہورِ عالم انگریز مصنف کے مشاہدات کا نتیجہ ہے اور جسے مسٹر نسیم رضوانی نے محنت اور خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ڈراما کی تاریخ میں مستقل حیثیت کا مطالبہ کرتا ہے حضرت کلیمؔ کا عالمانہ مقالہ "شعرائے ایران اور جدید تحریکات" مشرقی ادبیات اور سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں کافی اضافہ کریگا فارسی ادب کے کسی طالب کو اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے مولانا احسن برنی کا عالمانہ محاکمہ "الازدی کی فتوح الشام" ایک ایمان افروز مقالہ ہے جو اسلامی تاریخ کے شیدائیوں کی یادگار رہے وقار عظیم صاحب ایم اے کا مضمون "غزل میں مقامی اثرات" اردو شاعری کے ایک پیچیدہ مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے اور موجودہ تحقیق کے بہترین نمونوں میں سے ہے حضرت کلیمؔ کا رنگین مضمون "عورت اور آرٹ" فنونِ لطیفہ پر صنفِ لطیف کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے ماہر کے آخری عنوانات "دخترانِ فرنگ" اور "ستانِ مشرق" خاص توجہ کے قابل ہیں، خالص علمی مضامین میں پروفیسر منظور سرورش کا "قوتِ ارادہ" خاص تعریف کا مستحق ہے: نہ صرف اس میں نفسیاتی مسائل کو واضح کیا گیا ہے بلکہ اس میں ایک اخلاقی درس بھی مضمر ہے دماغی پریشانیاں اور ان کا علاج پروفیسر کرپا کے ارشادات کا خاکہ ہے صاحب موصوف کو پنجاب یونیورسٹی کے بیدار مغز پروفیسروں میں سے ہونے کی شہرت حاصل ہے ناظرین کو اس مضمون میں بہت سی نئی باتیں ملیں گی۔

ادارۂ "ادبی دنیا" ان محترمات کا بھی بیحد ممنون ہے جن کے دلچسپ مضامین سالنامے کی زینت ہیں، محترمہ ح۔ ب صاحبہ کی پاکیزہ نظم "ستارے" اس لامذہبیت کے دور میں ایک مشعلِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ محترمہ ز۔ ب صاحبہ نے جس کامیابی اور خوش اسلوبی سے "للی کا بیاہ" کو پنجابی سے اردو میں منتقل کیا ہے وہ اردو کے لئے باعثِ فخر ہے۔ جنابہ طاہرہ دیوی صاحبہ کی "خوابِ رنگین" کے متعلق یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ اگر آج موپساں زندہ ہوتا تو فیصلہ نہ کر سکتا کہ ترجمہ کونسا ہے اور اصل کونسا۔

سالنامہ کی ترتیب کے لئے جو محنت درکار ہوتی ہے وہ کئی کتابوں کی تصنیف سے بھی زیادہ ہے، اس بنا پر بعض غلطیوں کا ہونا ناگزیر ہے، کئی قابلِ قدر نظمیں اور مضامین آخری سطور پر مجبوراً رد کرنے پڑے، بعض حضرات کا ذکر قلتِ گنجائش کی وجہ سے تشنہ رہ گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کرم فرماؤں کا شکریہ بھی ادا نہ ہو سکا ہو، اس لئے ادارہ تمام معاونین کو بحیثیت مجموعی ہدیۂ سپاس پیش کرتا ہے اور اگر کوئی کوتاہی انہیں نظر آئے تو اس کے لئے بھی عذر پیش کرتا ہے۔

صلاح الدین احمد

سالنامہ کی تصاویر

سالنامہ کی تصاویر کے انتخاب میں خاص طور پر احتیاط برتی گئی ہے کہ کوئی ایسی تصویر نہ دی جائے جس سے "ادبی دنیا" کی شہرت میں فرق آئے، اچھی تصویر کی ایک ادبی حیثیت ہوتی ہے، اس میں ایک کیف آور نظم، ایک جذبات آفریں افسانے یا ایک حقیقت افروز مقالے کی خوبیاں پائی جاتی ہیں، سالنامہ کی تصویریں اس اصول کی شرح ہی نہیں بلکہ وہ مشرق و مغرب کے آرٹ کی مختلف اقسام کا مجموعہ بھی ہیں اس طرح "ادبی دنیا" اپنے خریداروں کو انگریزی، ایرانی، ہندی اور جاپانی آرٹ کا ایک مختصر البم نذر کر رہا ہے۔

انگریزی آرٹ

سہ رنگی تصویروں میں سے پانچ انگریزی مصوروں نے بنائی ہیں "نسیم شمال" گذشتہ صدی کے شہرۂ آفاق مصور "برن جونز" کی یادگار ہے، "برن جونز" اس سکول کا ایک ممتاز فرد تھا جس نے تخئیلی تصویروں کو رواج دے کر دنیائے مصوری میں انقلاب برپا کر دیا اس سکول کے مصوروں نے یہ محسوس کیا کہ لکیر کا فقیر بنے رہنے سے وہ آرٹ کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اس لئے انھوں نے اپنا نصب العین یہ قرار دیا کہ دنیا کی فرسودہ چیزوں کی نقالی کو ترک کر کے آرٹ میں خیالات کی تشکیل کریں۔ زیر نظر تصویر میں بھی یہی تمثیلی شان نظر آتی ہے، بائیں جانب گل بدوش ہوائیں دنیا میں ایک نئی روح پھونکنے کو ہیں وہ گیت گاتی اور کیف برساتی آ رہی ہیں، اور کلیاں ان کو دیکھ کر مسکرا رہی ہیں۔

"دختران بہار" میں موسم گل کی نشاط آفرینی کو ہنستے کھیلتے بچوں کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے، فطرت کی معصومیت بچوں کے شگفتہ چہروں سے ظاہر ہو رہی ہے، مصور نے دنیا کی دو بہترین نعمتوں اولاد اور بہار کو یکجا کر دیا ہے۔

"سحر عشق" میں اطالوی ساحل کا ایک منظر ہمارے پیش نظر ہے، عشق کے دیوتا کیوپڈ کا مجسمہ چٹان پر نصب ہے، اس کے زیر سایہ ایک ماہی گیر ایک دوشیزہ سے عشق جتلا رہا ہے، انہوں نے راز و نیاز کے لئے موزوں جگہ تلاش کی ہے، آج کل مچھیرے کیوپڈ کے بت پر اپنے جال سوکھنے کے لئے ڈال دیا کرتے ہیں، مگر کیوپڈ بھی موقع پا کر اس توہین کا انتقام لیا کرتا ہے اور ایسا تیر چھوڑتا ہے کہ دل اور جگر دونوں چھد جاتے ہیں۔

"وینس کی عشرت گاہ" اٹلی کے مشہور بندرگاہ کی شوکت کی شاہد ہے، وینس نہ صرف تجارت بلکہ عیش و نشاط کا مرکز بھی ہے، اس کی روح پرور فضا میں مشرق و مغرب یکجا داد عشرت دیتے ہیں، تصویر کے وسط میں دو ہندوستانی بازار کی رونق دوبالا کر رہے ہیں۔

"انجام داستاں" جدید آرٹ کا ایک شاہکار ہے، مصور تخیل کے پرستان کو خیرباد کہہ کر واقعیت کی طرف متوجہ ہوا ہے، تصویر میں گھریلو زندگی دکھائی گئی ہے، سرما کی رات ہے، گھر کی مالکہ مطالعے سے جی بہلاتی رہی ہے۔ اور اب داستان ختم کر کے آگ تاپنے لگی ہے، آرٹسٹ کی نظر میں محبوب ترین چیزیں قرانے و کتابے و موسم سرما ہیں، ر گوشۂ چمنے نہیں۔

عمل چغتائی

"سرفروش" ہندوستان کے مایۂ ناز مصور خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کا جدید ترین شاہکار ہے۔ حضرت چغتائی کو "رفیل" کی طرح "رنگوں کا راجہ" سمجھا جاتا ہے، اس تصویر سے اس خیال کو اور تقویت ہوتی ہے، جس کامیابی سے انھوں نے نوجوان سپاہی کے دل میں محبت اور فرض کی کشمکش دکھائی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ نوجوان کے چہرے پر معصومیت کے آثار نمایاں ہیں وہ لوٹ مار کی ترغیب سے متاثر نہیں ہوا، بلکہ جنگ اس کے لئے ایک مقدس فرض ہے۔ وہ گناہ اور بدی سے لڑنے چلا ہے اس کے ایک ہاتھ میں نامۂ حکومت ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار، ان کے ہوتے ہوئے اسے دنیا کی کسی اور دولت کی آرزو نہیں ہو سکتی اور نہ اُسے بڑی سے بڑی طاقت مرعوب کر سکتی ہے، اسے دیکھ کر SIRGALAHAD اور HAPPY WARRIOR کی تصویریں یاد آ جاتی ہیں۔ چغتائی صاحب سے یہ مژدہ سن کر ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے کہ وہ عنقریب دیوان غالب کا ایک مصور ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس میں انکی وہ تازہ ترین تصویریں شامل ہوں گی جو خود ان کے "مرقع" کی تصویروں سے بھی بہتر ہیں، "نقش چغتائی" "مرقع" سے بھی زیادہ قدر کا مستحق ہے تفصیلات کے لئے آیندہ اشاعت کا انتظار فرمائیے۔

"دوشیزۂ کوہسار" لاہور کے مشہور فوٹوگرافر مسٹر آر۔ آر۔ جارو دانج کے کمال کا نمونہ ہے، تصویر دراصل ایک گڑیا کا فوٹو ہے مگر آرٹسٹ کے تخیل نے اس میں ایک عجیب شان پیدا کر دی ہے ہمارے سامنے ایک باوقار

دیوی عالم محویت میں کھڑی ہے، پہاڑ، درخت اور آسمان سب فوٹوگرافر کے پیدا کردہ ہیں، تخیل اور حقیقت کی یہ دلفریب آمیزش خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ جس گڑیا کا فوٹو ہے۔ وہ کوئی معمولی گڑیا نہیں بلکہ حضرت مریم کا ایک نادر مجسمہ ہے جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ سے زیادہ ہے اور جو برلن کے ایک عجائب گھر میں رکھا ہے۔

"بچھڑوں کا ملاپ" انگلستان کے باکمال مصور لارڈ لائٹن نے دیوتاؤں کے رنگین افسانوں کی شرح جس کامیابی سے اپنی تصاویر میں کی ہے محتاج بیان نہیں۔

زیر نظر تصویر میں ایک لڑکی دنیائے زیریں کی تاریکی سے نجات پانے کے بعد ارضی زندگی میں دوبارہ قدم رکھنے کو ہے، دونوں دنیاؤں کی سرحد پر اس کی ماں سراپا اشتیاق بنی کھڑی ہے، تفصیلات کے لئے تصویری مضمون "عورت اور آرٹ" کا مطالعہ فرمائیے۔

خواب کے آغوش میں

یونانی تخیل اس تصویر میں جھلک رہا ہے، خواب کا دیوتا تھکی ہوئی دنیا کو اپنے آغوش میں لے کر سلا رہا ہے، عورت کے سر میں گندھے ہوئے پھولوں سے مضمون کی نزاکت کا احساس ہوتا ہے، اس سے خواب کی راحت آفرینی مراد ہے۔ نیند دیوتا کے پروں پر آسمان سے اترتی ہے، اور پھول بن کر دماغ عالم کو معطر کرتی ہے۔

ہندوستانی آرٹ

یہ تصویر فارمن کرسچن کالج کے ادب نواز پرنسپل ڈاکٹر ایس کے۔ دتا صاحب بنگال کے صنعتی ادارہ گویا سکول آف آرٹ کلکتہ سے پسند فرما کر لائے تھے اور یہ عرصے ان کے ذاتی مجموعہ کی زینت تھی۔ ہم صاحب موصوف کے ممنون ہیں کہ انھوں نے "ادبی دنیا" کے سالنامے میں اس کی اشاعت کی اجازت دی۔

آپ عنقریب اپنے کالج میں ادبی اور صنعتی چیزوں کی نمائش کرنے والے ہیں جس میں قدیم اور نایاب تصاویر، قلمی نسخوں، قدیم جنگی سامان اور ہندوستان کی تاریخی صنعتوں کے بہترین نمونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اہل ادب، اور مصوروں کو چاہیے کہ اس نمائش کے کامیاب بنانے میں حصہ لیں۔

ایرانی آرٹ

"بر دریز کی بزم نشاط" کا ایک نظر افروز نقشہ نظامی نے اپنی مقبول عام مثنوی "خسرو شیریں" میں کھینچا ہے ایرانی مصور بیرک کے موقلم نے اسے نقش دوام بخش دیا ہے، خسرو اور شیریں مسند پر بیٹھے کہانیوں کا مزا لے رہے ہیں تصویر میں اکثر چہرے منگول نسل کے آثار ظاہر کرتے ہیں، مگر ایک عورت کے خدوخال سے یورپی قومیت کا اظہار ہوتا ہے۔

"زال اور رودابہ" جن کی محبت کا ایک منظر اس تصویر میں دکھایا گیا ہے شاہنامہ کی ایک ایسی داستان کے کردار ہیں جس پر فردوسی نے اپنا پورا زور کلام صرف کیا ہے، زال رودابہ کے حسن کی تعریف سن کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور رودابہ بھی اس کی شجاعت کے تذکروں سے متاثر ہو کر دل و جان سے اس کی تمنا کرنے لگتی ہے، جوش عشق ایک رات زال کو کشاں کشاں خانۂ محبوب کی دیوار تک لے آتا ہے، اور عین اسی وقت رودابہ بھی جسے زال کا خیال سونے نہیں دیتا۔ سر بام آکھڑی ہوتی ہے، زال کو دیکھ کر اپنی چوٹی لٹکاتی ہے کہ اس کے سہارے چڑھ کر آجاؤ، زال کہتا ہے کہ شرع عشق میں ایسا فعل روا نہیں، اس کی چوٹی کو اس جوش و خروش سے چومتا ہے کہ بوسہ کی آواز آسمان تک جاتی ہے۔ پھر کمند پھینک کر چھت پر چڑھتا ہے اور صبح تک عاشق و معشوق یکجا رہتے ہیں، مگر آداب عشق بے حیائی کی اجازت نہیں دیتے ؎

ہمہ بود بوس و کنار و نبید
مگر شیر کو گور را نشکرید

"تہمینہ اور سہراب" شاہنامہ کا ایک اور رنگین ورق ہے، رستم تہمینہ سے بیاہ کے چند روز بعد ہی رخصت ہو جاتا ہے، اس کی غیر حاضری میں سہراب پیدا ہوتا ہے، تہمینہ اس سے رستم کے نام کو مخفی رکھنا چاہتی ہے تاکہ وہ بھی کہیں باپ کی طرح جنگ کا دلدادہ نہ ہو جائے، سہراب اصرار کرتا ہے کہ اسے باپ کا نام ضرور بتایا جائے، ان دو تصویروں میں آرٹسٹ نے تاریخی حیثیت کا پورا لحاظ کیا ہے "رودابہ اور زال" میں آرٹسٹ کی ایرانی فن تعمیر سے پوری واقفیت ظاہر ہوتی ہے، ستون کی تراش فارس کے پرانے محلوں جیسی ہے، زال کا لباس بعینہ ایسا ہے جیسا دارا کے محل پر تیر اندازوں کی تصویر میں ظاہر ہوتا ہے، ماہرین حضریات کے جدید ترین انکشافات نے اس تصویر کی واقفیت پر مہر ثبت کر دی ہے۔

جاپانی آرٹ

"نابینا مغنیہ" اور "آہوان صحرا" براہ راست جاپان سے حاصل کی گئی ہیں، جاپانی مصوروں کو مناظر قدرت کی جاذب نظر تصویریں بنانے میں جو کمال ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان تصاویر میں نہ صرف تفاصیل کی نزاکت اور نفاست قابل ملاحظہ ہے بلکہ ان کے شاعرانہ موضوع کی داد دینا بھی ہمارا فرض ہے۔

سرورق

سالنامہ کے سرورق کا ڈیزائن سید سرفراز کا تیار کیا ہوا ہے جو لاہور کے بہترین قلمکاروں میں سے ہیں۔ وہ پنجاب میں حروف کے بادشاہ اور انگریزی طرز تزئین کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں پختگی عمر کے ساتھ خبر نہیں ان کا آرٹ کہاں جا پہنچے سالنامہ کی تمام تصویروں کے بلاک "مدن ایف ٹون کمپنی لاہور" نے بنائے ہیں جسے اعلی بلاک بنانے کے لئے خاص شہرت حاصل ہے۔

مُرقع چغتائی

(یا)

دیوان غالب مصوّر

غالب کی شاعری
چغتائی کی مصوری
اقبال کا تعارف

بہترین شاعری، بہترین مصوری اور بہترین ادب

تینوں یکجا

بہزادِ ہند جناب محمد عبد الرحمن چغتائی نے غالب کے غیر فانی اشعار کی شرح بینظیر رنگین تصاویر کے ذریعہ کی ہے۔ جس پر علامہ سر محمد اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں فاضلانہ تعارف نامہ سپرد قلم کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستانی مصوری کے بہترین نقاد ڈاکٹر کزنز کا ایک مبسوط مقدمہ اور خود جناب چغتائی کے قلم سے مصوری کے محاسن پر ایک بصیرت افروز اور پُراز معلومات تبصرہ بھی شامل ہے۔

وہ کتاب یقیناً قابل دید اور قابل قدر کتاب ہے جو

(۱) ہز ایگزالٹڈ ہائینس حضور نظام (۲) مہاراجہ سر کرشن پرشاد (۳) سر سالار جنگ (۴) گورنر پنجاب (۵) گورنر یو۔ پی۔ (۶) مہاراجہ پٹیالہ (۷) مہاراجہ کپورتھلہ (۸) نواب بھوپال۔ اور دیگر والیان ریاست اور عمائد سلطنت کے کتب خانوں کی زینت ہے +

پُرکیف شاعری۔ وجد آور مصوری۔ دیدہ زیب کتابت اور امیٹیشن مراکو کی مضبوط اور خوبصورت جلد۔ اس کا خریدنا حسن مذاق اور صحیح ادبی ذوق کی دلیل ہے (ا) دو رنگین تصاویر جن کے بلاک یورپ کے بہترین کارخانوں میں بنے ہیں (ب) دو رنگین تصاویر خطوط میں (ج) دو پنسل کی بنی ہوئی تصاویر (د) گیارہ مختلف تصاویر جو اس کی خوبیوں میں چار چاند لگا رہی ہیں ۔

کتاب بڑی تقطیع کے ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس کی ہر سطر فوٹو بلاک سے نہایت قیمتی جاپانی ویلم اور بہترین آرٹ پیپر پر چھپی ہے ناشر کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان اس سے پہلے کوئی ایسی شاندار کتاب شائع نہیں کر سکا نہ صرف ہندوستانی مصوروں نے بلکہ یورپ اور امریکہ کے رسائل و جرائد اور اس فن کے ماہرین نے اس کتاب کی نہایت بلند الفاظ میں تعریف کی ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۱۰ روپیہ فی نسخہ کے حساب سے ۳ ماہ میں فروخت ہو گیا۔ دوسرا ایڈیشن قیمتی سترہ روپے فی کتاب ختم ہو چکا ہے۔ اب تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ اس خیال سے کہ ہندوستان کا ہر ادبی ذوق رکھنے والا شریف انسان اس غیر فانی کتاب کو خرید سکے اس کی قیمت بارہ روپے کر دی گئی ہے دوسرے تیسرے ایڈیشن میں کوئی فرق نہیں

بانگ درا

حُسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حُسن کلام آئینہ

بانگ درا علامہ اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ ہے جس میں ابتدا سے لیکر آجتک کی نظمیں درج ہیں۔ اگرچہ حضرت علامہ نے اپنے افکار کے اظہار کیلئے اب زبان فارسی کو منتخب فرما لیا ہے لیکن انکے جس کلام نے اسلامیانِ ہند کی موجودہ نسل کو بیدار کیا وہ ان کا اردو کلام ہے ۔

اقبال۔ کی حقیقت ترجمانی اور اس کی سحر آفرین نغمہ پیرائی کی تعریف کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آفتاب کی درخشانی و تابانی کی مدح سرائی۔ البتہ اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ شاعری کی روح مدتوں سے خوابیدہ تھی مشرق کے اس زندہ جاوید شاعر کی نظموں نے اسے ایک رقص جاوید عطا کیا۔ نوجوان اسلام کی قوت عمل مردہ ہو چکی تھی اقبال کے حیات آفرین ترنم نے ان کی رگوں میں خون غیرت کی حرکت تازہ کر دی۔

بانگ درا ہمارے احساسات لطیفہ کیلئے زندگی کا پیغام ہے۔

بانگ درا حسنِ تخیل حسن بیان اور نکات و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

بانگ درا کی ایک جلد ہر اسلامی گھرانے میں موجود ہونی چاہیئے ۔

اسرار و رموز۔ یعنی اسرار خودی و رموز بیخودی ہر دو یکجا۔ یہ وہی مثنویاں ہیں جن سے اہل صوفیا میں ہلچل پڑ گئی تھی۔ ان کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے سے ہی کشتی قوم منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے قیمت بلا جلد عا مجلد عہ ۔

پیامِ مشرق (فارسی)۔ یہ کتاب جرمن شاعر "گوئٹے" کے دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی ملی اور مذہبی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے یہ کتاب اہل مشرق کے ہر قسم کے مذہبی انقلاب میں رہنمائی کریگی۔ قیمت بلا جلد ہے۔ مجلد ہے ۔

جاوید نامہ۔ علامہ موصوف کی جدید ترین فارسی نظموں کا مجموعہ جو ڈانٹے کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ بلا جلد ہے مجلد للعہ۔

لیکچر انگریزی۔ جو علامہ نے علی گڈھ اور مدراس میں دئے قیمت مجلد پانچ روپے

اقبال۔ علامہ اقبال کی سوانح عمری۔ ان کے منظومات ان کا مقصد شاعری و خیالات کے نشو و نما مضامین کلام اور طرز بیان پر ایک نظر۔ اس سے بہتر اور مستند حالات آپکو نہیں ملینگے قیمت عہ

ملنے کا پتہ :۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور ۔



ہندوستان کے شکسپیئر آغا حشر کاشمیری ڈراما کیونکر لکھتے ہیں؟

حشر کا نام سنتے ہی اردو ڈرامے کی ساری تاریخ ذہن میں روشن ہو جاتی ہے۔ اردو ڈراما حشر کی تخلیق ہے، اور آغاز سے لے کر اب تک وہ جن جن منازل میں سے گزرا اور اُس میں جو جو ترقیاں ہوئیں ان کے لئے وہ سب سے زیادہ حشر کے جوہرِ قابل کا رہینِ منت ہے۔

حشر ظاہری اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے ایک شاندار انسان ہیں۔ انہیں اپنی عظمت کا احساس ہے۔ وہ بڑائی اور غرور سے متنفر ہیں خلوص اور محبت کے سامنے وہ آنکھیں بچھا دیتے ہیں۔ سخن ناشناسوں سے ناراض اور سخن فہموں کی دل سے قدر کرنے والے ہیں۔ اُن کے غصے میں دشمنی نہیں اُن کی دشمنی میں ضرر نہیں، وہ صرف ایک شریف اور بے شر طبیعت کے مالک ہیں۔ اپنے کام سے انہیں بے حد شغف ہے۔ اس کی ذرا ذرا سی تفصیلات کے وہ ماہر ہیں۔ اور ہر بات اپنے اہتمام اور اپنی نگرانی میں کرانا چاہتے ہیں۔ دوسروں کے فن اور مہارت پر انہیں کامل اعتماد نہیں۔

میں نے حشر کو پہلی مرتبہ شاید ۱۹۱۴ء میں دیکھا تھا۔ وہ ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے تقریر کے دوران میں انہوں نے اپنے کسی ڈرامے کا ایک منظر اس جوش سے بیان کیا کہ اس کے آخری فقرات اب تک مجھے اپنے کانوں میں گونجتے معلوم ہوتے ہیں ۱۹۱۴ء کے بعد میں اُن سے ۱۹۳۴ء میں پورے بیس سال کے بعد ملا علالت کی وجہ سے اُن کی صحت میں ایک انقلاب آچکا تھا لیکن اُن کا جوش اور اُن کا عزم اب بھی غیر متزلزل تھے ایک ملاقات کے دوران میں انہوں نے اپنے ڈراما لکھنے کے اسلوب کو یوں بیان کیا۔

منصور صاحب! آپ کو تعجب ہوگا کہ میں نے کبھی لکھتے وقت نشہ سے استمداد نہیں کیا، اب بھی اگرچہ میرے قواہ کمزور رہتے جاتے ہیں لیکن دماغ روز بروز قوی تر ہوتا جاتا ہے، اور مجھے وہ وہ نکتے سوجھتے ہیں جن کا جوانی کے عالم میں گمان بھی نہ تھا، غور کیجئے کہ جب آمد ہوتی ہے تو گھنٹوں تک اس کا اثر رہتا ہے میں کمرے میں ٹہلنے لگتا ہوں اور اپنے دو منشیوں کو پاس بٹھا کر انہیں ڈراما لکھاتا رہتا ہوں، انہیں میری سخت تاکید ہوتی ہے کہ وہ اس دوران میں جہاں انہیں کہیں کسی خامی کا احساس ہو تو اس جگہ ایک نشان بنا دیں۔ جب جوش کم ہوتا ہے تو میں اسی وقت ڈراما لکھانا بند کر دیتا ہوں، کیونکہ میں طبیعت پر جبر کرکے کوئی چیز لکھنا نہیں چاہتا، اور جس طرح کوئی کوچبان تھکے گھوڑے کو چابک مار مار کر ہنکاتا ہے، اس طرح میں طبیعت پر زور دے کر لکھنا پسند نہیں کرتا۔

میں جب کوئی ڈراما لکھنے کا خیال کرتا ہوں تو پہلے اس کے موضوع پر تمام معلومات بہم کر لیتا ہوں اور اس وقت تک اس پر قلم نہیں اٹھاتا جب تک اس کی تمام تفصیلات پر حاوی نہ ہو جاؤں۔ میں وقت اور سوسائٹی کی حالت کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں اور اسی کے مطابق اپنا اصلاحی پروگرام مرتب کرتا ہوں، میں نے تعفن اور سروپا ڈراموں کو جن کا آج سے بیس برس پہلے بہت رواج تھا سٹیج کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن مجھے پبلک کو ادبی ڈرامے کے لئے تیار کرنے کی خاطر کئی سالوں تک انتظار کرنا پڑا۔

میں اپنے ڈرامے کے کردار اپنے دوستوں، آشناؤں اور ملاقاتیوں کے حلقے میں سے انتخاب کر لیا کرتا ہوں اور بعض اوقات انہیں اپنی ذہنی تخیل ہی سے پیدا کر لیتا ہوں، ایک بار میں ایک فلم دیکھنے گیا نام تو شاندار تھا DEVIL'S HOLIDAY لیکن دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی، مگر ایک بات سے میں بہت متاثر ہوا اس میں ایک عورت کا کیریکٹر بہت جاذب تھا وہ گناہ و ثواب کی قیود سے بالکل آزاد تھی، میں نے کہا اسے ڈرامے کی ہیروئن ہونا چاہئے دو سال تک میں اسی فکر میں رہا اور پھر میں نے "دل کی پیاس" لکھا جو مجھے اپنے ڈراموں میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔

منصور احمد

آنکھ کا نشہ

خود مصنف نے ہندی سے ترجمہ کیا ۔۔۔۔۔۔۔ ایک دلچسپ سین

ڈرامے کے افراد

جگل ۔۔۔۔۔۔ ایک نوجوان رئیس

مادھو ۔۔۔۔۔۔ جگل کا ایک خالہ زاد بھائی

سروجنی ۔۔۔۔۔۔ جگل کی تعلیم یافتہ، خوبصورت اور خوب سیرت بیوی

کام لتا ۔۔۔۔۔۔ شہر کی ایک حسین ترین طوائف جگل کی داشتہ

(محل سرائے سے ملحق پائیں باغ)

(پھولوں کی کمان کے نیچے سنگ مرمر کے صوفے پر جگل اور کام لتا بیٹھے ہیں۔ میز پر شراب کے کنٹر اور گلاس رکھے ہوئے ہیں)

کام لتا۔ کیا دیکھتے ہو پیارے۔ کبھی شراب کے گلاس کی جانب کبھی میرے چہرے کی طرف ۔۔۔۔ کیا دیکھتے ہو؟

جگل۔ جب تمہارے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کے پیالے میں حسن کی شراب، کیف و رنگ کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ کام لتا! سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے کیسے پیوں! ۔۔۔۔ گلاس کی شراب یا تمہارے حسن کی شراب،

کام لتا۔ پریتم! حسن اور شراب ہی مل کر محبت پرست دل میں راحت کی آفرینش کرتے ہیں ۔۔۔۔ پیو ۔۔۔۔ اتنا پیو ۔۔۔۔ کہ پیالے میں ایک گھونٹ بھی باقی نہ رہے ۔۔۔۔ ایک کو ہونٹوں سے پیو ۔۔۔۔ اور دوسرے کو آنکھوں سے،

جگل۔ جس گھر میں تمنا سے کامیابی ہم آغوش ہے، حسن ہے، شراب ہے موسیقی ہے، وہی گھر بہشت ہے ۔۔۔۔ سندری! میں جیتے جی بہشت میں ہوں، اور یہ بہشت تمہاری محبت کا عطیہ ہے، (تنہا اندھا ہے)

کام لتا۔ (نفرت آمیز ہنسی کے ساتھ) ہا! ہا! ہا! یہ شرافت کا ملمع کئے ہوئے کمینے، یہ عیاش مرد بھی کتنے جھوٹے اور بے شرم ہیں ۔۔۔۔ اخباروں میں، لکچروں میں، ناولوں میں، ناٹکوں میں، ہم طوائفوں کو بازار کی کنجس کتیا ثابت کرتے اور پھر اسی کنجس کتیا کی ایک حقیر مسکراہٹ کے لئے، "میری زندگی" اور "میرے دل کی رانی" کہہ کر اپنا تھوکا ہوا آپ ہی چاٹتے ہیں ۔۔۔۔ ذلیل! ۔۔۔۔ بے غیرت ۔۔۔۔ (کنٹر سے شراب انڈیلتی ہے، جوں جوں گلاس بھرتا ہے بوتل خالی ہوتی جاتی ہے)۔ (جگل سے) ٹھہر جا! ۔۔۔ اسی بوتل کی طرح میں ایک دن تیرے گھر کو بھی دولت، امن اور خوشی سے خالی کر دوں گی۔

(جگل کی بیوی سروجنی رکتی، جھجکتی ہوئی آتی ہے)

سروجنی۔ محبت کی دیوانگی یہاں تک کھینچ لائی لیکن اب قدم آگے نہیں بڑھتے ۔۔۔۔ چھی چھی۔ مجھے یہاں نہ آنا چاہئے تھا۔ لوٹ جاؤں۔ ارے پاگل دل پھر یہاں لایا ہی کیوں تھا ۔۔۔۔ (سوچتی ہے) نہیں قسمت کا لکھا پڑھ کر دیکھوں گی۔ (ڈرتے ڈرتے کام لتا کے قریب جاتی ہے) کیا تم ہی کام لتا ہو!

کام لتا۔ (چونک کر) ہاں ۔۔۔۔ (غور سے دیکھ کر) تم کون ہو!

سروجنی۔ پہلے میرا نام سروجنی تھا ۔۔۔۔ اور اب بھاگنی ۔۔۔

کام لتا۔ (سر ہلا کر) پہچان گئی ۔۔۔ تمہارے پتی سے یہ نام سن چکی ہوں، لیکن یہ کیا کہا! ایسا چہرہ۔ ایسا روپ اور ابھاگنی!

سروجنی۔ اسے روپ نہ سمجھو، یہ میرے جلے ہوئے نصیب کی راکھ ہے، جو ایشور نے میرے منہ پر مل دی ہے ۔۔۔ کام لتا، کیا تم عورت ہو!

کام لتا۔ تم کیا سمجھتی ہو!

سروجنی۔ اگر تم عورت ہو، تو ایک بدنصیب عورت کی زخمی روح کی تکلیف

کومزور سمجھ سکوگی ــــ جانتی ہو، کون سی شے چھن جانے پر عورت کا چہرہ مرجھائے ہوئے زرد پتے کی طرح سوکھ جاتا ہے؟ جانتی ہو کس چیز کی کمی سے تمام دنیا اسے چتا کی طرح دھائیں دھائیں جلتی ہوئی نظر آتی ہے، کام لتا، جس چیز کو اپنا بنانے کے لئے ہندو عورت رات دن دیوتاؤں کی منتیں کرتی ہے ــ جس شے کے مقابلے میں وہ دو جہاں کی دولت کو ہیچ سمجھتی ہے اسی شے کے لئے میں تمہارے پاس التجا لے کر آئی ہوں ــــ تم عورت ہو ــ کیا ایک دکھیا عورت پر رحم نہ کرو گی؟

کام لتا۔ اگر ہو سکا ــــ کہو، کیا تمنا ہے!

سروجنی۔ جو سہاگ کا سنگھار ہے، ماتھے کا تلک ہے، مانگ کا سیندور ہے، دل کا راجہ ہے۔ اس کی تمنا کے سوا ہندو عورت کی اور کیا تمنا ہو سکتی ہے ــــ میں بڑے گھر کی لڑکی اور بڑے گھر کی بہو ہو کر ایک بھکارن کی طرح تمہارے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہوں!

ــــ بھیک دو ــ مجھے میرے پتی کی بھیک دو۔

کام لتا۔ (تھوڑی دیر تک سروجنی کو دیکھنے کے بعد) تمہارا پتی تمہیں دیدوں!

سروجنی۔ ہاں! ــــ بھکارن کی پونجی بھکارن کو دے دو ــ اور دنیا پر ثابت کر دو کہ جس طرح ہیرا پرنالے کی کیچڑ میں گر کر بھی اپنی چمک نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح گناہ کی گندگی میں لتھڑی ہوئی بھارت کی عورت سب کچھ کھو دینے پر بھی دل کی نیکی نہیں کھوتی

کام لتا۔ ٹھہرو! مجھے سوچنے دو ــ (دل میں، اس کی دکھ بھری پکار سے دل میں سویا ہوا رحم کروٹ لینے لگا ــ کیا اسے جھنجھوڑ کر جگا دوں؟

سروجنی۔ کیا سوچ رہی ہو! میری دولت، عزت، سکھ، چین، نیند، زندگی، نجات جو کچھ ہیں، پتی ہیں ــــ ان کے بغیر دنیا میں میرے لئے کچھ نہیں، اور تمہارے لئے سب کچھ ہے، کیونکہ میں دھرم کے بندھنوں سے بندھی ہوئی استری ہوں ــــ اور تم ــــ آزاد ــــ ویشیا ــــ

کام لتا۔ (چونک کر) کیا کہا! ــــ ویشیا! اوہ! میں رحم کرنے چلی تھی ــــ تم نے ٹھیک وقت پر طمانچہ مار کر میری غلطی مجھے سمجھا دی (غصے میں ناگن کی طرح بل کھا کر) بیشک! میں ویشیا ہوں ــــ ایک وقت تھا، جب میں پارسا تھی، نیک تھی، پاک تھی۔ گناہ کے سائے سے بچنا، اور نیکی کی پناہ میں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی ــــ لیکن تمہارے ہی بھائیوں اور بیٹوں تمہارے ہی سماج کے شریف بدمعاشوں نے میرے اور عصمت کے درمیان گناہ کی دیوار کھڑی کر دی۔ میں نے تپسیا بھی کی ــ اور کوشش بھی، پھر بھی دیوی نہ بن سکی ــ کیا بنی! ویشیا ــ جانتی ہو، کیوں ویشیا بنی!

سروجنی۔ مجھے کانوں کو زخمی کرنے والی، یہ پاپ کی کہانی نہ سناؤ

کام لتا۔ جو لوگ بڑے دھرمی بن کر، ویشیا کو ویشیا، بننے کے لئے الزام دیتے ہیں، انہیں ویشیا کے زخمی دل کی فریاد بھی سننا ہی ہو گی۔ سنو ــــ کوئی لڑکی ماں کے پیٹ سے ویشیا پیدا نہیں ہوتی ــــ اس کی یتیمی، بیکسی، ناداری، فاقہ کشی، اور دنیا کے مکر و فریب سے ناواقفیت کا مجرمانہ فایدہ اٹھا کر، بدچلن، بدمعاش، اسے ویشیا بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

سروجنی۔ اوہ بس ــ چپ رہو۔

کام لتا۔ دنیا میں ایسا کون ہے، جس سے کبھی غلطی نہیں ہوئی، نادان، غریب لڑکی بھی، بدکار مردوں کے فریب اور دھوکے میں پھنس کر غلطی کر بیٹھتی ہے لیکن، اپنی غلطی کا علم ہونے کے بعد جب وہ مستقبل میں پاک زندگی بسر کرنے کے لئے دو مٹھی اناج کا سہارا تلاش کرتی ہے۔ تو سارے رحم و احسان کا وعظ کرنے والے بہرے اور گونگے بن جاتے ہیں۔ سماج کی چوکھٹ سے، شریفوں کے گھر سے، اناتھ شالے اور ودھوا آشرم کے دروازے سے دھتکارے جانے کے بعد نجات کا ہر ایک راستہ بند پا کر وہ جس گناہ کے آہنی پنجے سے کلائی چھڑا کر بھاگی تھی آخر مجبوری اور مایوسی کے ساتھ اسی کے قدموں پر جا گرتی ہے، اور بے شرمی کے بازار کی رونق بن کر اپنی زندگی کے لئے بد دعا۔ اور سماج کے لئے زندہ لعنت بن جاتی ہے

سروجنی۔ ــــ کام لتا۔ اگر ــــ

کام لتا۔ اگر یہ بے شرمی کی زندگی، ذلت کی زندگی، گناہ کی زندگی نفرت اور الزام کے قابل ہے تو اس نفرت اور الزام کا بوجھ اس سماج کے کاندھے پر ہے، جو منہ پھاڑ کر گناہ کو برا کہنا جانتا ہے لیکن گناہ کے بھنور میں زبردستی پھینک دی ہوئی بدقسمت روحوں کو تیرا کر کنارے تک پہنچانا نہیں جانتا۔

سروجنی۔ ٹھیک ہے۔ وقت کا پھیر ہے!

کام لتا۔ (کھسیانی ہنسی ہنس کر) وقت کا پھیر کبھی کبھی الٹا بھی ہو جاتا ہے
جو سماج پہلی غلطی پر بھی رحم نہیں کرتا ــــــ ایسی سماج کی ایک دیوی رحم کی بھیک مانگنے آئی ہے، اور کس سے ایک ذلیل رنڈی سے روایت پس کر ہمیں سماج کے کسی مرد اور عورت نے بے گناہ گنہگاروں پر رحم نہیں کیا ــــ ہم کبھی کسی پر رحم نہیں کریں گے ــــ ہم ویشیا ہیں۔ گھر کی عورتوں کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالنا ہمارا پیشہ ــــ اور ان کے بیٹوں بھائیوں اور شوہروں کی زندگیوں کو انتقام کے پیروں سے روند ڈالنا ہمارا دھرم ہے

سروجنی۔ نہیں ــــ کام لتا نہیں ــــ بھکارنی کو دروازے سے واپس نہ کرو۔ میں دو جہاں کی دولت، آسمان کی سلطنت، ستاروں کا ملک نہیں مانگتی۔ سمندر کے پانی کی ایک بوند، سورج سے ایک کرن، دولت کے دیوتا سے ایک پیسہ، اور سکھ کے راج کی رانی سے ایک رحم کی نظر مانگتی ہوں۔

کام لتا۔ گرہست گھر کی ہر عورت ہم رنڈیوں کی دشمن ہے، دشمن پر رحم کرنا بے وقوفی ہے ــــ تم بھی عورت ہو ــــ تم بھی خوبصورت ہو، تم بھی محبت بھرا غصہ، اور ہنسی ملا ہوا رونا جانتی ہو ــــ اگر تمہارے ہونٹوں میں بھانے، اور تمہاری محبت میں روٹھے ہوئے کو منانے کی طاقت ہے، تو اپنے پتی کو میرے بازوؤں کی قید سے چھڑا لے جاؤ ــــ آج دیکھنا ہے کہ کون زیادہ طاقتور ہے بیوی کی محبت یا رنڈی کا حسن

سروجنی۔ اتنی سنگ دلی!! اتنا غرور!!! ــ اچھا میں بھی دیکھتی ہوں کہ گناہ نیکی کا چہرہ لگا کر کہاں تک محبت اور اعتبار کو دھوکا دے سکتا ہے۔ تم اپنے فریب کی پوری طاقت سے بھی بیوی اور شوہر کے مضبوط رشتہ کو نہیں توڑ سکتیں، آج ہو، کل ہو، دس برس بعد ہو، وہ دن ضرور آئے گا۔ جب میرے سرتاج دل کی پیاس بجھانے کے لئے تمہارے حسن کے سراب سے پناہ اپناہ کہتے ہوئے راحت کے چشمہ کی تلاش میں گھر کی طرف دوڑیں گے اور تمہیں اسی طرح چھوڑ دیں گے جس طرح لوگ مندر میں داخل ہوتے وقت کیچڑ میں لتھڑی ہوئی جوتی کو باہر چھوڑ دیتے ہیں۔

(جگل ہاتھ میں گلدستہ لئے ہوئے آتا ہے)

جگل۔ پیاری، اندر چلو! بادل گھرے آ رہے ہیں (سروجنی کو دیکھ کر چونک پڑتا ہے) کون! ــــ سروجنی!!

کام لتا۔ (بناوٹ سے ہنس کر) تمہیں مجھ سے چھیننے آئی ہیں، کہتی ہیں کہ رنڈی کو محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

جگل ــــ (دل میں) تاریکی کے سامنے روشنی (سروجنی سے) یہاں ــــ تم ــ ــ کیوں آئی ہو!

سروجنی۔ میرے مالک، ہندو عورت اپنے سوامی کو نصیحت کرنے کا حق نہیں رکھتی، لیکن معاف کرنا آج جرأت کر کے تمہاری بھلائی کے لئے ــــ دو حرف بولنے کی اجازت چاہتی ہوں
دیوتا جھوٹے روپ جھوٹی محبت، جھوٹی ہنسی کے سوا، اس عورت میں کونسی خوبی ہے، جو تمہیں دکھائی دیتی ہے، اور دنیا کو دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھو، اس چہرے پر بجلی کی چمک ہے لیکن عصمت کا نور کہاں ہے، ان آنکھوں میں جوانی کا نشہ ہے لیکن پریم کا امرت کہاں ہے۔ ان گالوں پر پھولوں کی لالی اور سفیدی ہے لیکن حیا کا رنگ اور پاکیزگی کی خوشبو کہاں ہے، میرے مالک، بہشت و دوزخ ایک جگہ نہیں رہ سکتے، ویشیا کا چہرہ ہی خوبصورت ہوتا ہے، دل خوبصورت نہیں ہوتا۔

جگل۔ (سوچتا ہے) سروجنی ٹھیک کہہ رہی ہے ــــ اس نے غفلت کی شراب پلا کر اپنے حسن کی چھری میرے ہاتھ میں دے دی ہے۔ جس سے میں اپنی زندگی کو گھائل کر رہا ہوں۔ کیا کروں! ــــ نہیں ــــ بہت سویا! اب جاگنا چاہئے۔ (بگڑ کر) جاؤ، کام لتا، اپنے گھر واپس جاؤ ــــ تمہارے حسن میں آنکھوں کے لئے روشنی ہے دل کے لئے تسلی نہیں۔
(دوڑ کر سروجنی کا ہاتھ تھام لیتا ہے)

سروجنی۔ آؤ، سوامی، میں ان بازار کی ٹھگنیوں سے ڈر گئی ہوں۔ اب تمہیں اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی!

آغا حشر کاشمیری

وفا کا جال

(۱)

بڈھوں میں جو ایک طرح کی بے شرمی، قریب قریب خلوص سے ملتی ہوئی پیدا ہو جاتی ہے وہ تلیا میں اس وقت تک نہ آئی تھی حالانکہ اس کے سر کے بال چاندی ہو گئے تھے اور گال لٹک کر ڈاڑھوں کے نیچے آ گئے تھے۔ لوگ اس کی عمر کا اندازہ سو سے اوپر کرتے تھے۔ وہ خود تحقیق کچھ نہ کہہ سکتی لیکن اب بھی وہ کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہتی تھی چلتی تو ساڑی سے سر ڈھانک کر آنکھیں نیچی کئے ہوئے، گویا نویلی بہو ہے۔ ذات کی چمارن تھی لیکن کیا مجال کہ کسی غیر کے گھر کا پکوان دیکھ کر اس کا جی للچائے۔ گاؤں میں اونچی ذاتوں کے بہت سے گھر تھے۔ تلیا کی سب جگہ آمد و رفت تھی۔ سارا گاؤں اس کی عزت کرتا تھا۔ اور عورتیں تو دل سے اسکے ساتھ عقیدت رکھتی تھیں، اُسے اصرار کر کے اپنے گھر بلاتیں، اس کے سر میں تیل ڈالتیں، مانگ میں سیندور بھرتیں، کوئی اچھی چیز پکائی ہوتی جیسے پھلوڑیاں یا کھیر یا حلوا، تو اسے کھلانا چاہتیں، لیکن بڑھیا کبھی نہ کھاتی تھی۔ اُس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ چماروں کے ٹولے میں ایک آدمی بھی نہ تھا۔ کچھ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کچھ پلیگ اور ملیریا کی نذر ہو گئے۔ ان کے ماتم میں تھوڑے سے کھنڈر کھڑے تھے۔ برہنہ سر، چھاتی سی پیٹتے ہوئے۔ صرف تلیا کی جھونپڑی زندہ تھی اور تلیا۔ حالانکہ تلیا مسافت کا وہ حصہ طے کر چکی تھی جہاں انسان تمام ظاہری اور مذہبی قیود سے نجات پا جاتا ہے اور اب اونچی ذات والوں کو بھی اس کی ذات کی بنا پر اس سے کوئی پرہیز نہ تھا، سبھی اسے اپنے گھر میں ایک گوشہ دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر وضعدار بڑھیا کیوں کسی کا احسان لے۔ کیوں اپنے شوہر مرحوم کی عزت میں بٹہ لگائے۔ جس کی اس نے کبھی صورت بھی نہ دیکھی تھی صرف نام سنا تھا۔ ہاں صرف نام سنا تھا جب اُس کی شادی ہوئی تو اس کی عمر کل پانچ سال کی تھی، اس کا شوہر اٹھارہ سال کا خوش رو گٹھیلا نوجوان تھا۔ شادی کے بعد وہ پورب کی طرف کمانے چلا گیا تھا، سوچا تھا ابھی بیوی کے بالغ ہونے میں دس بارہ سال کی دیر ہے۔ اتنے دنوں میں کیوں نہ کچھ روپے جمع کر لیں۔ اور پھر ساری زندگی مزے سے گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کریں لیکن بیوی بالغ بھی ہو گئی، جوان بھی ہوئی، بوڑھی بھی ہوئی۔ وہ لوٹ کر نہ آیا۔ اس کے خطوط ہر تیسرے مہینے آتے تھے۔ اور خط کے ساتھ تیس روپے کا منی آرڈر بھی ہوتا۔ خط کے لفافہ کے اندر جواب کے لئے ایک خالی لفافہ بھی رکھا ہوتا تھا۔ یہی وہ رشتہ تھا جو ان میں میاں اور بیوی کا تعلق قایم رکھے ہوئے تھا۔ خط میں وہ اپنی مجبوری اور بدنصیبی کا اظہار کرتا۔ اور لکھتا "کیا کروں تولا، دل میں یہی ارمان ہے کہ ایک بار تم سے مل لیتا، اپنی جھونپڑی آباد کر دیتا، مگر سب کچھ نصیب کے ہاتھ ہے۔ اپنا کوئی بس نہیں ہے جب بھگوان لائیں گے تب آؤں گا۔ تم صبر کرنا۔ میرے جیتے جی تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تمہاری بانہہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک اس کا نباہ کروں گا۔ جب آنکھیں بند ہو جائیں گی تب کیا ہوگا کون جانے"! قریب قریب یہی مضمون الفاظ کے خفیف تغیر کے ساتھ ہر ایک خط میں ہوتا۔ اور یہ خطوط "تلیا" کے حرز جاں تھے۔ ایک خط بھی اس نے نہ پھاڑا تھا۔ ایسے شگون کے خط کہیں پھاڑے جاتے ہیں۔ ان کا ایک چھوٹا سا دفتر جمع ہو گیا تھا، بوسیدہ بے رنگ، سیاہی تک اڑ گئی تھی، کاغذ کا رنگ بھی اڑ گیا تھا۔ مگر سب کے سب جوں کے توں اس کی پٹاری میں ایک لال ڈورے سے تہہ بہ تہہ بندھے ہوئے رکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط کو پا کر "تلیا" کو بے اندازہ مسرت ہوتی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے۔ بار بار پڑھواتی، اور بار بار روتی۔ اور اس دن ضرور سر میں تیل ڈالتی سیندور سے مانگ بھرواتی، رنگین ساڑی پہنتی۔ اس کا سہاگ جاگ اٹھتا تھا۔ بہوئیں مذاق سے پوچھتیں۔ کیوں تولا بوا تم نے پھوپھا کو دیکھا تو ہوگا۔ ان کی کچھ یاد آتی ہے؟ اور تلیا کے پر شکن چہرے پر جوانی عود

کرآتی۔ آنکھوں میں ایک سرور پیدا ہو جاتا کہتی یاد کیوں نہیں آتی بٹیا۔ ان کی صورت تو اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں، لال لال، اونچا ماتھا۔ چوڑی چھاتی۔ ایسا تو اب یہاں کوئی بھلا ہی نہیں۔ جیسے موتیوں کے سے دانت تھے بٹیا۔ لال لال کرتا پہنے ہوئے تھے، جب بیاہ ہو گیا تو میں نے ان سے کہا میرے لیے بہت سے گہنے بنوا دو گے نا؟ نہیں تو میں تمہارے گھر نہ آؤں گی۔ لڑکپن تھا بٹیا۔ شرم لحاظ کچھ تھوڑے ہی تھا۔ وہ میری بات سن کر بڑے زور سے ہنسے اور مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر بولے۔ میں تجھے گہنوں سے لاد دوں گا تلیا۔ کتنے گہنے پہنے گی تو۔ میں پردیس کمانے جاتا ہوں وہاں سے روپے بھیجوں گا۔ تو بہت سے گہنے بنوانا۔ اور جب میں آؤں گا تو اپنے ساتھ بہت سے گہنے لاؤں گا میرا ڈولا گیا تھا بٹیا۔ ماں باپ کی ایسی حیثیت کہاں تھی کہ انہیں برات کے ساتھ بلاتے۔ انہیں کے گھر میرا ان سے بیاہ ہوا۔ اور ایک دن میں وہاں رہی۔ اسی ایک دن میں وہ مجھے کچھ ایسے بھائے کہ جب وہ چلنے لگے تو ان کے گلے لپٹ کر روتی تھی۔ اور کہتی تھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارا کھانا پکاؤں گی، تمہاری کھاٹ بچھاؤں گی۔ وہاں انہیں کے عمر کے دو تین آدمی اور بیٹھے تھے۔ انہیں کے سامنے وہ مسکرا کر میرے کان میں بولے۔ اور میرے ساتھ سوئے گی نہیں۔ بس میں ان کا گلا چھوڑ کر الگ کھڑی ہو گئی اور بگڑ کر بولی۔ مجھے گالی دو گے تو کہے دیتی ہوں ہاں۔

لاکھوں ہی بار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل چکے تھے۔ مگر اس کے لیے وہ ہمیشہ تازہ تھے۔ اس کے جگر کے عزیز ترین گوشے میں محفوظ جہاں ہوا کا گذر نہ تھا۔ ان میں وہی لطافت تھی، وہی لذت، وہی شیرینی آہ! اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا! کھلا پڑتا تھا، گھونگھٹ نکال کر، بھاؤ بنا کر، منہ پھیر کر، اور ایک دلآویز تبسم کے ساتھ، دل میں اس کا مزہ لیتی ہوئی، وہ اس واقعہ کو بیان کرتی جو اس کی عمر طویل کی بہترین یادگار تھا۔ اور اس میں کھلے ہوئے پھول کی طرح دلآویز۔ وہ پھول بھی اب تازہ تھا، اس میں وہی خوشنمائی تھی، وہی خوشبو۔ واقعاتی زندگی کی جھلسانے والی آلائشوں سے پاک۔ تمنا ابھی تک تمنا کی سرخوشیوں اور کیفیتوں سے مرقع تھی، جسے کشاکش حیات نے بے جان نہ کر پایا تھا۔

(۲)

تلیا کسی زمانہ میں حسین تھی، کافر ادا تھی، قاتل تھی اور اپنے کشتگان ناز کی درد بھری داستانیں جب وہ بہ چشم پرنم کہتی تو شاید کشتوں کی روحیں عالم زیریں، یا عالم بالا میں وجد کرتی ہوں گی۔ زندگی میں جن کی اس نے بات نہ پوچھی، انہیں پر ہمدردی اور وفا کے پھول نثار کرتی تھی۔ اس کی اٹھتی ہوئی جوانی تھی کہ ماں باپ، رخصت ہو گئے۔ بھائی بھی پردیس چلا گیا وہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ وہ جدھر سے نکل جاتی تھی نوجوان کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے، تب بنسی سنگھ نام کا ایک ٹھاکر تھا۔ بڑا چھیلا، بڑا رسیا، دن میں سیکڑوں بار اس کے گھر کے چکر لگاتا۔ تالاب کے کنارے کھیت میں کھلیان میں، کنوئیں پر، جہاں وہ جاتی، سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا۔ کبھی دودھ لے کر اس کے گھر جاتا، کبھی گھی لے کر، کبھی ساڑیاں لے کر کہتا تلیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا، تو میری بھینٹ لے لے۔ تو مجھ سے نہیں بولنا چاہتی، مت بول، میری صورت نہیں دیکھنا چاہتی مت دیکھ۔ لیکن میں جو کچھ لاؤں اُسے لے لے۔ بس، اسی سے میرا دل بھر جائے گا۔ بھولی بھالی تلیا ایسی انیلی نہ تھی، جانتی تھی یہ انگلی پکڑنے کی باتیں ہیں انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے کی باتیں ہونے لگیں گی۔ لیکن نہ جانے کیسے وہ اس کے دھوکے میں آ گئی نہیں دھوکے میں نہیں آئی۔ اُسے اس کی جوانی پر ترس آیا۔ ایک دن وہ پکے ہوئے قلمی آم لایا۔ تلیا نے اپنی زندگی میں قلمی آم نہ کھائے تھے۔ آم اس سے لے لئے۔ پھر تو روز آم کے ٹوکرے آنے لگے۔ اور آم لے کر بنسی سنگھ خود آتا اور چھپ کر رات کو آتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے نہیں گاؤں میں شور مچ جائے گا۔ ایک دن جب تلیا آم کی ٹوکری لے کر گھر میں جانے لگی تو بنسی سنگھ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور جھٹ اس کے پیروں پر گر پڑا۔ اور بولا تلیا اگر اب بھی تجھے دیا نہیں آتی تو آج مجھے مار ڈال۔ اپنے ہاتھوں سے مار ڈال۔ بس اب یہی ابھلاکھا ہے۔

تلیا نے آم کی ٹوکری پٹک دی اور اپنے پاؤں چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ اچھا ٹھاکر اب یہاں سے چلے جاؤ نہیں تو یا تم نہ رہو گے یا میں نہ رہوں گی تمہارے ہاتھوں میں آگ لگے۔ اور تم کو کیا کہوں، میرا آدمی کالے کوسوں میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے، اسی لئے کہ میں یہاں اس کے نام کو کلنک لگاؤں! وہ مرد ہے، چار پیسے کماتا ہے، کیا وہ دوسری نہ رکھ سکتا تھا! عورتوں کی سنسار میں کمی ہے! لیکن وہ میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے۔ مرد ہو کر بیٹھا ہوا ہے۔ تم سے کم میٹھا نہیں ہے۔ تمہارا جیسا سندر چاہے نہ ہو

پڑھو گے اس کی چٹھیاں جو وہ میرے نام بھیجتا ہے۔ آپ چاہے جس حال میں ہو۔ میں کون یہاں بیٹھی دیکھتی ہوں لیکن ہر مہینے پہلے میرے لئے روپے بھیج دیتا ہے، اسی لئے کہ میں دوسروں سے بہار کروں! وہ ایک پیسہ بھی نہ بھیجے، لیکن جب تک وہ ایسی پریم سے بھری چٹھیاں بھیجتا رہے گا۔ جب تک وہ مجھ کو اپنی اور اپنے کو میرا سمجھتا رہے گا، تلیا اسی کی رہے گی، دل میں بھی، دکھاوے میں بھی۔ جب اس سے میرا بیاہ ہوا ہے تب میں پانچ برس کی الہڑ چھوکری تھی۔ تمہارے دروازے پر جاتی تھی تو تم دتکار دیتے تھے۔ اس نے میرے ساتھ کیا سکھ اٹھایا۔ جو میرے لئے اتنا کر رہا ہے۔ بس ایک بانہہ پکڑنے کی لاج کو نبھا رہا ہے تو میں عورت ہو کے اس کے ساتھ دغا کروں۔

یہ کہہ کر وہ اندر گئی اور چٹھیوں کی پٹاری لا کر ٹھاکر کے سامنے پٹک دی، مگر ٹھاکر کو چٹھیوں کے پڑھنے کا ہوش کہاں تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا، ہونٹ پھڑکے جا رہے تھے۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا۔ تلیا میں نے تم کو پہچانا نہ تھا۔ اب اس کی سزا یہی ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔ اسی وقت مار ڈالو۔ ایسے روسیاہ آدمی کا زندہ رہنا کس کام کا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ بس اب یہی آرزو ہے کہ تمہارے ہاتھوں قتل ہو جاؤں۔

تلیا کو اس پر رحم نہیں آیا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ یہ ابھی تک شرارت کئے جاتا ہے۔ جھلا کر بولی۔ مرنے کو جی چاہتا ہے تو مر جاؤ۔ کیا دنیا میں کنوئیں تالاب نہیں ہیں۔ یا تمہارے پاس تلوار کٹار نہیں ہے۔ میں کسی کو کیوں ماروں۔

ٹھاکر نے مایوس نظروں سے دیکھا۔ "تو تمہارا یہی حکم ہے؟"

"میرا حکم کیوں ہونے لگا۔ مرنے والے کسی سے حکم نہیں لیتے"۔

وہ چلا گیا اور دوسرے دن ندی میں اس کی لاش تیرتی ہوئی ملی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیسے ڈوب گیا یہی خیال ہوا کہ نہانے آیا ہو گا۔ پاؤں پھسل گیا ہو گا کوئی کیا کہتا۔ کئی مہینوں تک گاؤں میں اس کا چرچا رہا۔ تلیا نے زبان تک نہ کھولی۔ ٹھاکر کے مرتے ہی بھائی نے جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اس کی بیوی اور بچے کو ستانے لگے۔ دیورانی طعنے دیتی دیور عیب لگاتا۔ آخر غریب بیوہ ایک دن زندگی سے تنگ آ کر بچے کو لے کر گھر سے نکل پڑی۔ رات کا وقت تھا۔ تلیا اپنے دروازہ پر کھڑی تھی۔ لالٹین جل رہی تھی۔ ارزانی کے دن تھے۔ سہ ماہی تیس روپے میں اس کی بڑی فراغت سے گذران ہوتی تھی۔ جو وہ کھاتی اور پہنتی تھی وہ ٹھکرائنوں کو بھی نصیب نہ تھا۔ گائے پال لی تھی۔ اسی کو روٹی کھلانے نکلی تھی کہ اس نے ٹھکرائن کو بچے کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ٹھکرائن سسکتی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی تین سال کا بچہ گود میں تھا۔

تلیا نے پوچھا۔ اس وقت کہاں جاتی ہو ٹھکرائن۔ سنو سنو۔ کیا بات ہے۔ تم تو رو رہی ہو۔

ٹھکرائن جا تو رہی تھی، مگر کہاں، یہ اُسے خود نہ معلوم تھا۔ یہاں رہنا نہ چاہتی تھی اور اپنے بچے کی جان کا خوف تھا۔ ان دنوں یہ پولیس کی تحقیقاتیں کہاں تھیں۔ دیور اُسے اور اس کے بچے کو مار ڈالتے۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔ مگر اس چمارن سے اپنا دکھڑا کیسے کہے، آخر تھی تو ٹھکرائن۔ ایک بار تلیا کی طرف دیکھ کر بلا کچھ جواب دیئے آگے بڑھی جواب کیسے دیتی گلے میں تو آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ اس وقت نہ جانے کیوں اور زیادہ امڈ آئے تھے

تلیا نے گائے کے سامنے روٹی پھینکی، لوٹے سے ہاتھ دھویا اور قریب آ کر بولی۔ جب تک تم مجھے بتلا نہ دو گی کہاں جا رہی ہو میں تمہیں آگے ایک قدم نہ جانے دوں گی۔

ٹھکرائن رک گئی اور آنسو بھری آنکھوں میں غصہ بھر کر بولی۔ تو کیا کرے گی۔ پوچھ کر تجھ سے مطلب۔

مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں! میں تمہارے گاؤں میں نہیں رہتی! گاؤں والے ایک دوسرے کے دکھ درد میں نہ ساتھ دیں گے تو کون دے گا"۔

اُس زمانے میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے تلیا۔ جب اپنے گھر والوں نے ساتھ نہ دیا، اور تیرے بھیا کے مرتے ہی میرے خون کے پیاسے ہو گئے تو پھر میں کس سے امید رکھوں۔ کیا تو میرے گھر کا حال نہیں جانتی۔ تجھ سے کیا چھپا ہے وہاں اُن کہاران کے لئے روٹیاں ہیں میرے لئے نہیں ہیں۔ اور لاتوں کی ماری روٹیاں کون کھائے۔ میں کسی سے خیرات نہیں مانگتی۔ اپنا حق مانگتی ہوں میں رکھیلی نہیں ہوں، اڑھری نہیں ہوں، بیاہتا ہوں دس گاؤں کے آدمیوں کے بیچ میں بیاہ کے آئی ہوں۔ اپنا رتی بھر حق نہ چھوڑوں گی آج کوئی نہ دے۔ میں اناتھ ہوں لیکن چاہے میری آبرو جائے لیکن کو مٹا کر چھوڑوں گی۔ اور اپنا حصہ لے کر رہوں گی"۔

"میرے بھیا" یہ دو لفظ تلیاکو اتنے پیارے لگے کہ اس نے ٹھکرائن کو گلے سے لگا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ تو بہن میرے گھر میں چل کر رہو۔ اور کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے تلیا مرتے دم تک تمہارا ساتھ دے گی۔ میرا گھر تمہارے رہنے کے لائق نہیں ہے، میں بھی غریب ہوں لیکن گھر ہی چاہیے اور کچھ نہ ہو شانتی تو ہے اور میں کتنی ہی غریب ہوں لیکن تمہاری بہن تو ہوں۔

ٹھکرائن نے اس کے چہرہ کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا۔ ایسا نہ ہو میرے پیچھے میرا دیور تمہارا بھی دشمن ہو جائے۔

تلیا نے دلیرانہ انداز سے کہا میں دشمنوں سے نہیں ڈرتی۔ اور پھر ان سے کہنے ہی کون جاتا ہے۔ اور تم پردے میں رہتی ہی ہو۔

ٹھکرائن تلیا کے ساتھ اس کے گھر میں آکر بیٹھ گئی۔ وہاں ایک ہی کھاٹ تھی۔ تلیا نے اس پر بچے کو لٹا دیا۔ چماروں کے برتن میں ٹھکرائن کیسے کھانا پکائے کیسے پانی پیئے۔ تلیا دوسرے ہی دن بازار سے برتن بھانڈے لائی اور ٹھکرائن کے لئے ایک کوٹھری الگ کر دی۔ ٹھکرائن مغرور تھی، آرام پسند تھی، مگر دھن کی پوری۔ تلیا اس کے برتن دھوتی، اس کے کپڑے صاف کرتی۔ اس کا بچہ کھلاتی۔ ٹھکرائن اس طرح رہتی تھی گویا یہ اسی کا گھر ہے اور تلیا سے اس طرح کام لیتی تھی گویا وہ اس کی لونڈی ہے لیکن تلیا کشتۂ ناز عاشق کے ساتھ شرطِ وفا کا نباہ کر رہی تھی۔ اس کا من کبھی نہ میلا ہوتا۔ ماتھے پر کبھی نہ بل پڑتا۔

ایک دن ٹھکرائن نے کہا۔ تولا، تم بچے کو دیکھتی رہنا میں دو چار دن کے لئے ذرا باہر جاؤں گی۔ اس طرح تو یہاں زندگی بھر پڑی رہوں گی۔ مگر دل کی آگ نہ ٹھنڈی ہوگی اس بے حیا کو اس کی شرم کہاں کہ اس کی بھاوج کسی غیر کے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہے وہ تو اسی کوشش میں ہے کہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکلوا دے۔ اور ممکن ہو تو بدنام کرے اتنے دن تو آرام کر چکی اب کچھ کام بھی کرنا چاہیئے۔

تلیا نے پوچھا۔ کہاں جانا چاہتی ہو بہن۔ کوئی ہرج نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلی چلوں، اکیلی کہاں جاؤ گی؟

"اس سانپ کو کچلنے کے لئے کسی کی مدد کے بغیر کام نہ چلے گا"

"وہ مدد کہاں ملے گی"

"میں جانتی ہوں..... اور پھر تجھ سے کیا چھپاؤں میں اپنے روپ کے جادو سے ان کا گھمنڈ توڑوں گی۔ میرے پاس دوسرا کون ہتھیار ہے، میں جوان ہوں اور ابھی بُری بھی نہیں ہوں میں آج اپنا روپ بیچنے پر آجاؤں تو جانتی ہو اس کے دلم کیا ہوگا مگر اس بھیڑیئے کا سر لاور میں نے یہی طے کیا ہے۔ اس پرگنہ کا حاکم جو کوئی بھی ہو اسی پر میرا جادو چلے گا، اور ایسا کوئی مرد نہیں ہے جو کسی خوبصورت عورت کے جادو سے بچ سکے چاہے وہ اسّی سال کا بڈھا ہی کیوں نہ ہو چاہے وہ رشی ہی کیوں نہ ہو۔ دھرم جاتا ہے جائے مجھے پروا نہیں ہے۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتی کہ میں تن بن کی تیلیاں توڑوں اور وہ شوہدا مونچھوں پر تاؤ دے کر راج کرے۔ اور یہ کل تین چار دن کا کام ہے تلیا، کل تین چار دن کا۔ تو بچے کی دیکھ بھال کرنا بچہ تجھ سے ہلا ہوا بھی ہے۔ میرے لئے بہت نہ ٹرکے گا۔ کوئی پوچھے کہاں گئی۔ تو کہہ دینا میکے چلی گئی ہے۔"

تلیا کو معلوم ہوا اس خود دار عورت کے دل پر کتنی گہری چوٹ ہے اس جلن کو مٹانے کے لیئے وہ جان ہی پر نہیں کھیل رہی ہے، دھرم پر کھیل رہی ہے۔ جسے وہ جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے، مہنی سنگھ کی وہ صورت التجا اس کی نظروں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ طاقتور تھا، اپنے فولادی قوے سے وہ بڑی آسانی سے اس پر جبر کر سکتا تھا۔ اور اس رات کے سناٹے میں اس کی حمایت کرنے والا کون تھا۔ مگر اس کی اس عفت آمیز تنبیہ نے مہنی سنگھ کو کس طرح رام کر لیا، گویا کوئی خونخوار اژدہا سریلا راگ سن کر مست ہو گیا ہو اور اپنا خونی ارادہ ترک کر کے اس راگ کے تالوں پر ناچنے لگے اسی سچے سورما کی آبرو آج خطرے میں ہے۔ کیا تلیا اس آبرو کو لٹنے دے گی اور خاموش بیٹھی رہے گی۔ نہیں نہیں نہیں۔

مہنی سنگھ کا وہ سرفروشانہ ضبط، وہ مردانہ تحمل، وہ ذوقِ شہادت وہ سچا عشق، وہ اپنی شمعِ حیات بجھا کر سوزِ نہاں کو ٹھنڈا کرنے کا شجاعانہ عمل وہ اس کے فیصلہ پر جاں نثار کر دینے کا جذبۂ نیاز...... نہیں مہنی سنگھ نے اس کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا تو وہ بھی اس کی آبرو کو اپنی آرزو سے زیادہ عزیز ثابت کر دے گی، اپنی سحر طرازیوں سے، اپنی محبت نوازیوں سے، اپنی شیریں اداؤں سے، اپنی عصمت کو گوشۂ جگر میں محفوظ رکھے ہوئے، وہ اپنی وفا کا حق ادا کرے گی۔

تلیا نے ٹھکرائن کو تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ابھی تم مت جاؤ بہن کہیں مت جاؤ۔ پہلے مجھے اپنی طاقت آزما لینے دو۔ میری آبرو چلی بھی گئی تو کون ہنسے گا۔ تمہاری آبرو کے پیچھے ایک خاندان کی آبرو ہے۔

ٹھکرائن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔
اس نے کہا تو یہ فن کیا جانے تلیا،
"کونسا فن؟"
"یہی مردوں کو اُلو بنانے کا۔"
"یہ فن سبھی عورتوں کو آتا ہے بہن۔ کہیں سیکھنے جانے کا کام نہیں۔"
"اچھا بتا تو کیا کرے گی؟"
"وہی جو تم کرنے جا رہی ہو تم حاکم پرگنہ پر اپنا جادو ڈالنا چاہتی ہو۔ میں تمہارے دیور پر جادو ڈالوں گی۔"
"بڑا گھاگھ ہے"
"گھاگھوں کو پھانسنا اور بھی زیادہ آسان ہے۔"

(۳)

تلیا نے آزمودہ کار جنرل کی طرح جارحانہ عمل اور مدافعت اور مراجعت کے نقشے تیار کئے اور تسخیر کی تیاریاں کرنے لگی۔ عمل کے مدارج اور کامیابی کی منزل جتنی صفائی سے اُسے نظر آتی تھی۔ شاید سکندر یا نپولین کو بھی نہ نظر آئی ہو گی پیش بندی کے لئے اس نے مدافعت اور مراجعت کے پہلو بھی سوچ لیے مگر اُسے اس میں شک نہ تھا کہ یہ "بڑھے چلو" والی جنگ ہو گی غنیم بالکل بے خبر تھے، بالکل غیر مسلح اور اس فن حرب سے بالکل غیر معروف۔

بنسی سنگھ کا چھوٹا بھائی گردھر کندھے پر چھ فیٹ کا موٹا ڈنڈا رکھے اکڑتا چلا آتا تھا کہ تلیا نے پکارا۔ ٹھاکر جرا یہ گھاس کا گٹھا اٹھا کر میرے سر پر رکھ دو۔ مجھ سے نہیں اٹھتا۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ کسان اپنے اپنے کھیتوں سے لوٹ کر گھر آ چکے تھے۔ راستے میں سناٹا تھا۔

اس وقت تلیا کا آنچل کھسک گیا اور سرخ چولی کے اندر کا ابھار جھلک پڑا۔ تُلیا نے جھٹ آنچل سنبھال لیا۔ مگر اس کوشش میں اس کا سر کھل گیا اور اس کے جوڑے میں گتھی ہوئی پھولوں کی بینی بجلی کی طرح آنکھوں میں کوند گئی۔ گردھر پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز مٹ گیا۔ آنکھوں میں ہلکا سا نشہ نمودار ہوا، اور چہرے پر ہلکی سی سرخی اور خفیف سا تبسم رگ رگ میں نغمہ سا گونج اٹھا۔

اس نے تلیا کو ہزاروں بار دیکھا تھا۔ آرزو اور التجا کی آنکھوں سے۔ مگر تلیا اپنے حُسن اور عصمت کے غرور میں اس کی طرف کبھی مخاطب نہ ہوئی تھی۔ اس کے انداز اور بشرے میں کچھ ایسی بے نیازی، کچھ ایسی سرد مہری تھی کہ ٹھاکر کے سارے حوصلے پست ہو جاتے تھے۔ سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ آسمان پر اڑنے والے طائر پر اس کے لاسے اور دانے اور جال کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ مگر آج وہ طائر اس کے مکان کے سامنے والی شاخ پر آ بیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوکا ہے۔ پھر کیوں نہ وہ دانا اور جال لے کر دوڑے۔

اس نے مخمور ہو کر کہا۔ میں پہنچائے دیتا ہوں تلیا۔ تو کیوں سر پر اٹھائے گی۔

تلیا نے شکار پر وار کیا۔ "اور کوئی دیکھ لے تو یہی کہے کہ ٹھاکر کو کیا ہو گیا ہے"۔

"مجھے کتوں کے بھونکنے کی پروا نہیں ہے"
"لیکن مجھے تو ہے"

ٹھاکر نے نہ مانا۔ گٹھا سر پر رکھ لیا اور اس طرح چلا گویا کوئین کا خزانہ لوٹے لئے جاتا ہو۔

(۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ تلیا نے ٹھاکر پر موہنی ڈال دی تھی۔ اور اب اسے مچھلی کی طرح کھلا رہی تھی کبھی بنسی ڈھیلی کر دیتی کبھی کھینچ لیتی لگاوٹ بازی بھی تھی اور پرہیز بھی۔ اور ٹھاکر کی آتش شوق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ اپنا ایمان اور دھرم سب کچھ نثار کر کے بھی وہ حصول مدعا کے قریب نہ آ پاتا تھا۔ تلیا آج بھی اس سے اتنی ہی دور تھی جتنی پہلے۔

ایک دن وہ تلیا سے بولا۔ اس طرح کب تک جلائے گی تلیا۔ چل کہیں بھاگ چلیں۔

تلیا نے پھندے کو اور کسا۔ ہاں اور کیا۔ جب تم منہ پھیر لو تو کسی کام کی نہ رہوں۔ دین سے بھی جاؤں، دنیا سے بھی۔

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔ اب بھی تجھے مجھ پر وشواش نہیں آتا!

"بھونرے پھول کا رس لے کر اُڑ جاتے ہیں"
"اور پتنگے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں"
"پتیاؤں کیسے؟"

"میں نے تیرا کوئی حکم ٹالا ہے؟"

"تم سمجھتے ہو گے تلیا کو ایک رنگین ساڑھی اور دو ایک چھوٹے موٹے گہنے دے کر پھنسالوں گا۔ میں ایسی بھولی نہیں ہوں۔"

تلیا نے ٹھاکر کے دل کی بات بھانپ لی تھی۔ ٹھاکر حیرت میں آ کر اُس کے منہ کی طرف تکنے لگا۔

تلیا نے پھر کہا "آدمی اپنا گھر چھوڑتا ہے تو پہلے کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا کر لیتا ہے۔"

ٹھاکر نے خوش ہو کر کہا۔ "تو تو چل کر میرے گھر میں مالکن بن کر رہ۔"

تلیا آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "آج مالکن بن کر رہوں اور کل لونڈی بن کر بھی نہ رہنے پاؤں۔ کیوں؟"

"تو جس طرح تیرا من بھرے وہ کر۔ میں تیرا غلام ہوں"

"بچن دیتے ہو"

"ہاں دیتا ہوں"

"پھر تو نہ جاؤ گے؟"

"بچن دے کر پھر جانا نامردوں کا کام ہے"

"تو اپنی آدھی جمین جایداد میرے نام لکھ دو"

ٹھاکر اپنے گھر میں ایک کوٹھڑی، دس پانچ بیگھے کھیت۔ گہنے کپڑے، اور اپنی عزت تو اس کے قدموں پر نثار کرنے کو تیار تھا، لیکن آدھی جائداد اس کے نام منتقل کرنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ کل کو تلیا اس سے کسی بات پر ناراض ہو جائے تو اسے آدھی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے۔ عورت کا کیا اعتبار۔ اسے یہہ گمان تک نہ تھا کہ تلیا اس سے اتنا سنگین مطالبہ کرے گی۔ اُسے تلیا پر غصہ آیا۔ یہہ چار دن ذرا سندر کیا ہو گئی ہے کہ سمجھتی ہے میں ایسرا ہوں۔ اس کی محبت ایک بے تاب خواہش تھی۔ اور بس۔ وہ محبت جو اپنے کو فنا کر دیتی ہے اور فنا ہو جانا ہی زندگی کا حاصل سمجھتی ہے اس میں نہ تھی۔

اس نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "میں نہ جانتا تھا کہ تجھے میری زمین جایداد ہی سے محبت ہے، تجھ سے نہیں۔"

تلیا نے برجستہ جواب دیا۔ "تو کیا میں جانتی تھی کہ تمہیں میرے روپ اور جوانی ہی سے محبت ہے، مجھ سے نہیں!"

"تو محبت کو بازار کا سودا سمجھتی ہے!"

"ہاں سمجھتی ہوں۔ تمہارے لئے محبت چار دن کا تماشا ہو گی۔ میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔ میں اپنا سب کچھ تمہیں دے رہی ہوں، تو اس کے بدلے میں سب کچھ لینا بھی چاہتی ہوں۔ تمہیں اگر مجھ سے محبت ہوتی تو تم آدھی کیا، پوری جایداد میرے نام لکھ دیتے لیکن تمہاری نیت معلوم ہو گئی۔ ہاں بھگوان نہ کرے کہ ایسا کوئی سماں آئے، لیکن دن کسی کے برابر نہیں جاتے۔ اگر ایسا کوئی سمے آیا کہ تمہارے پاس کچھ نہ رہا تو تلیا دکھا دے گی کہ عورت کیا کچھ کر سکتی ہے۔"

تلیا جھلائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ مگر مایوس نہ تھی۔ نہ بے دل۔ آگے کیا ہونے والا ہے، اس کے متعلق اُسے مطلق شبہ نہ تھا۔

ٹھاکر نے جایداد تو اپنی دانست میں بچا لی تھی۔ مگر بڑے مہنگے داموں۔ اُس کا اطمینان قلب رخصت ہو چکا تھا۔ زندگی میں جیسے کوئی لطف ہی نہ رہ گیا تھا۔ جایداد آنکھوں کے سامنے تھی۔ تلیا دل کے اندر۔ روز سامنے آ کر بیٹھنے والی تلیا حقیقت تھی دل کے اندر بیٹھی رہنے والی تلیا آرزو جو حقیقت سے کہیں زیادہ دلاویز ہے، نشہ خیز ہے۔

تلیا اُسے کبھی کبھی خواب کی ایک جھلک کی طرح نظر آ جاتی۔ اور خواب ہی کی طرح غائب ہو جاتی۔ گردھر اس سے اپنا درد دل کہنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا لیکن تلیا اس کے سایہ سے بھی پرہیز کرتی۔ گردھر کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کے لئے اس کی زمین کے مقابلہ میں تلیا کہیں زیادہ لازمی ہے۔ اُسے اپنی تنگ ظرفی پر غصہ آتا۔ زمین اور جایداد کیا تلیا کے نام رہی کیا اس کے نام، اس ذرا سی بات میں کیا رکھا ہے۔ تلیا تو اس وقت کے لئے پیش بندی کر رہی تھی۔ جب میں اس کے ساتھ بے وفائی کرتا۔ جب میں اس کا بن کوڑی کا غلام ہوں، تو بے وفائی کیسی۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی کروں گا جس کی ایک نگاہ کرم کے لئے ترستا رہتا ہوں۔ کاش وہ ایک بار مل جاتی تو اس سے کہہ دیتا تو لا میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔ کہو ہبہ نامہ لکھ دوں۔ کہو بیع نامہ لکھ دوں۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی اس کے لئے نادم ہوں جایداد سے انسان کو جو ایک رواجی الفت ہے اسی کے زیر اثر میں نے وہ حماقت کی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں وہی چیز سب سے بیش قیمت ہے جس سے زندگی میں کیف اور سرور پیدا ہو۔ اگر فقر اور بے نوائی میں سرور حاصل ہو تو وہی سب سے بیش قیمت ہے جس پر زمین اور ملکیت سب کچھ قربان کر دی جاتی ہے۔ آج بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو

دنیا کی نعمتوں پر لات مار کر جنگل بیابان کی سیر کرنے میں مست ہیں۔ اور اس وقت میں اتنی ذرا سی بات نہ سمجھا۔ ہائے رے میری کم عقلی!

(۵)

ایک دن ٹھاکر کے پاس تلیا نے پیغام بھیجا۔ میں بیمار ہوں۔ آ کر مجھے دیکھ جاؤ۔ کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔

رات کے دس بجے ہوں گے ٹھاکر نے سنا اور دوڑا۔ اس کی چھاتی دھڑک رہی تھی اور سر اڑا جاتا تھا۔ تلیا بیمار ہے۔ تلیا اس کی آنکھوں سے دور تھی، لیکن دل میں بسی ہوئی۔ اور دل اور جان سے بھی زیادہ عزیز۔ دل تو محض اس کا مکان تھا۔ اور وہ تلیا بیمار ہے! کیا ہو گا بھگوان! تم مجھے کیوں نہیں بیمار کر لیتے۔ میں تو اس کی جگہ مرنے کو بھی تیار ہوں تلیا کی بیماری اس کے ذہن میں ہر لحظہ خوف ناک ہوتی جاتی تھی۔ اور بیماری میں تلیا نے مجھے بلایا ہے۔ کہا ہے کہ آ کر دیکھ جاؤ۔ کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔ تو اگر نہ بچے گی تلیا تو میں بھی نہ بچوں گا۔ نہ بچوں گا۔ دیوار سے سر پھوڑ کر جان دے دوں گا۔ پھر میری اور تیری چتا ایک ساتھ بنے گی ایک ساتھ دونوں کے جنازے نکلیں گے۔

اس نے قدم اور تیز کیا۔ وہ اپنا سب کچھ تلیا کے قدموں پر رکھ دے گا۔ تلیا اسے بے وفا سمجھتی ہے۔ آج وہ دکھا دے گا۔ وہ کتنا وفادار ہے۔ آج اس کی محبت خواہشوں سے پاک ہو گئی ہے۔ اس میں جسمانیت کا شائبہ بھی نہیں رہا۔ روح تک جا پہنچی ہے۔

اس نے دھڑکتے ہوئے دل اور تھرتھراتے ہوئے پاؤں سے تلیا کے گھر میں قدم رکھا۔ تلیا اپنی کھاٹ پر ایک چادر اوڑھے سمٹی پڑی تھی۔ اور اس نیم تاریکی میں جاں بلب معلوم ہو رہی تھی۔ گردھر نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کانپتی ہوئی اشک میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا تولا! تولا! یہ بدنصیب تمہارے قدموں پر پڑا ہوا ہے۔

تلیا نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز سے بولی۔ تم ہو گردھر سنگھ! تم آ گئے! اب میں آرام سے مروں گی۔ تمہیں ایک بار دیکھنے کے لئے جی بہت بے چین تھا۔ میرا کہا سنا، معاف کر دینا۔ اور میرے لئے رونا مت اس مٹی کی دیہہ میں کیا رکھا ہے گردھر۔ یہ تو مٹی میں مل جائے گا لیکن میں کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پرچھائیں کی طرح سدا تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم مجھے دیکھ نہ سکو گے، میری باتیں سن نہ سکو گے لیکن تلیا آٹھوں پہر سوتے جاگتے تمہارے ساتھ رہے گی۔ میرے لئے اپنے کو بدنام مت کرنا گردھر۔ کبھی کسی کے سامنے میرا نام جبان پر مت لانا۔

گردھر زار و قطار رو رہا تھا۔ ہاتھ میں کٹار ہوتی تو اسی وقت جگر میں مار لیتا۔ اور اس کے سامنے تڑپ کر مر جاتا۔

تلیا نے ذرا دم لے کر پھر کہا۔ میں بچوں گی نہیں گردھر تم سے ایک بنتی کرتی ہوں۔ مانو گے!

گردھر نے چھاتی ٹھونک کر کہا اب جیوں گا تو اسی لئے کہ تیرا حکم پورا کروں۔ نہیں اس جندگی میں کیا رکھا ہے۔

اُسے ایسا معلوم ہوا کہ تلیا مسکرائی۔

نہیں نہیں۔ ایسا مت کہو۔ تمہارے بال بچے ہیں۔ ان کی پرورش کرنا۔ اور مجھے بھول جانا۔ میری یہی بنتی ہے کہ اپنی بھابی کو اور اس کے بچے کو اسی طرح رکھنا جیسے وہ بنسی سنگھ کے سامنے رہتی تھیں۔ ان کا آدھا انہیں دے دینا۔"

گردھر بولا۔ لیکن بھاوج تو دو مہینے سے اپنے میکے میں ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ اب کبھی نہ آؤں گی

یہ تم نے برا کیا ہے گردھر۔ بہت برا۔ اب میں سمجھی کہ کیوں مجھے بڑے بڑے سپنے آ رہے تھے۔ اگر چاہتے ہو کہ میں جی اٹھوں تو جتنی جلد ہو لکھا پڑھی کر کے کاگد میرے پاس رکھ دو۔ تمہاری یہ بے انصافی ہی میری جان کی گاہک ہو رہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری بھاوج کیوں بار بار مجھے سپنے میں دکھائی دیتی تھی۔ اور بنسی سنگھ کیوں مجھ سے سپنے میں کہتے تھے۔ گردھر نے میری گت بگاڑ دی۔ بس ابھی جاؤ گردھر اور لکھا پڑھی کر کے کاگد لاؤ۔ دیر کی تو مجھے جیتا نہ پاؤ گے۔

گردھر نے دبی زبان سے کہا۔ لیکن رات کو کیسے لکھا پڑھی ہو گی تولا۔ اسٹامپ کہاں ملے گا؟ لکھے گا کون۔ گواہ کہاں ہیں بتلاؤ۔

"کل سانجھ تک یہ کام کر لو گے تو میں بچ جاؤں گی گردھر۔ بنسی سنگھ مجھے لگے ہوئے ہیں۔ وہی مجھے ستا رہے ہیں۔ وہی میری جان لے رہے ہیں۔

اگر تم نے دیر کی تو تلیا مر جائے گی۔"

"میں کل سانجھ تک آ جاؤں گا تلیا۔ تیرا حکم سر اور آنکھوں پر۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تو۔۔۔۔۔"

نہیں نہیں۔ میں کل سانجھ تک نہیں مروں گی۔ اس کا اطمینان رکھو"

گردھر اسی وقت وہاں سے نکلا۔ راتوں رات پچیس کوس کی منزل

لے کر کے صدر پہنچا۔ وکیلوں سے مشورہ کیا۔ سب لیدبھاوج کے نام آدمی جائداد منتقل کرائی۔ اور چراغ جلتے جلتے حیران و پریشان، تھکن سے چور، امید و بیم سے محرور، آکر تلیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تلیا نے روحانی شگفتگی کے عالم میں کہا۔ تم آگئے گردھو کام کر آئے!

گردھر نے کاغذ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ ہاں تولا کر آیا۔ اور اگر اب بھی تم اچھی نہ ہوئیں تو تمہارے ساتھ گردھر کی جان بھی جائے گی۔

تلیا اٹھ بیٹھی اور کاغذ کو اپنے سرھانے رکھ کر بولی۔ میں بہت اچھی ہوں گردھر، تم جب رات یہاں سے چلے گئے تب ہی میری طبیعت سنبھلنے لگی اور اب میں بہت اچھی ہوں۔ سویرے تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی لیکن ابھی ابھی مجھے نیند آگئی تھی اور بھی سنگھ سپنے میں مجھ سے کہہ رہے تھے۔ تلیا تو بیاہتا ہے۔ تیرا آدمی بچارہ کس پر بیٹھا تیرے نام کی مالا جپ رہا ہے۔ چاہتا تو دوسری کر لیتا لیکن تیرے نام پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور جنم بھر بیٹھا رہے گا۔ اگر تو نے اس سے دگا کی تو میں تیرا دشمن ہو جاؤں گا۔ تو نے اپنے آدمی کے ساتھ کپٹ کیا، ابھی دن میں تیری جان لے لوں گا۔ بس یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔

گردھر نے ایک لمحہ تلیا کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اس وقت ایک روحانی جلال سا چمک رہا تھا۔ اور دفعتہً جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور ساری سازش سمجھ میں آگئی۔ اس نے بھی عقیدت سے تلیا کے قدموں کو بوسہ دیا اور بولا۔ سمجھ گیا۔ تلیا، تو دیوی ہے۔

پریم چند

آخری منزل

جب جان گئی، تو جانِ جاں تک پہنچا ۔۔۔ مل کر مٹی میں آسمان تک پہنچا
ہے مرقدِ تنگ بطنِ مادر کی طرح ۔۔۔ اس گور میں آرام ملا گھر کی طرح

اس عالمِ فتنہ زا سے روپوش ہوا ۔۔۔ جان بچ کے قبر سے ہم آغوش ہوا
تسکین جگر نے دل نے راحت پائی ۔۔۔ تن خانہ بدوشی سے سبکدوش ہوا

مر مر کے لحد میں میں نے جا پائی ہے ۔۔۔ یاں تک مجھے تیری ہی کشش لائی ہے
آ اے مرے منہ چھپانے والے، آجا ۔۔۔ خلوت ہے، شبِ تار ہے، تنہائی ہے

سید احمد حسین امجد

فریبِ نظر

صحنِ گلشن میں گُل نو رستۂ احمر لباس ۔۔۔ خندہ ہائے دل نشیں سے جس کے رنگیں ہے بہار
دیکھتا ہوں، اور ترے ہونٹوں پہ کرتا ہوں قیاس ۔۔۔ جن کی دل افروز رنگینی کی گُل چیں ہے بہار
ڈال دیتی ہے نگاہِ شوق حیرت میں مجھے ۔۔۔ فرق دونوں میں کوئی آتا نہیں جس دم نظر
سوچتا ہوں میں کہ یہ گُل ہیں لبِ لعلیں ترے ۔۔۔ یا لبِ لعلیں میں تیرے ثانیٔ گلہائے تر

حفیظ ہوشیارپوری

کیفِ خرابات

یہ خرابات ہے تقوے کا نہیں کام یہاں
عین طاعت ہے تماشائے لبِ بام یہاں

رقص کرتی ہے زمیں رات کی رنگینی میں
وجد کرتا ہے فلک صبح کے ہنگام یہاں

جس پہ گردوں سے نہ آتی ہو صدائے احسنت
کبھی ایسا نہیں ہوتا کوئی اقدام یہاں

میکدے میں نہ ہوا شیخِ حرم نکتہ فروش
کہ ازل سے نہیں گنجایشِ اوہام یہاں

شکرِ باری کہ علی الرغمِ فقیہِ خود بیں
حکمِ ایزد ہے کہ گردش میں رہے جام یہاں

اثرِ تربیتِ پیرِ مغاں کے قربان
خارج از بحث ہے اندیشۂ آلام یہاں

میکدے کا ہے مشیّت کے اشاروں پہ مدار
مانعِ کیف نہیں شرع کے احکام یہاں

طوطیٔ قدس ہے اک صیدِ زبونِ مستی
طائرِ سدرہ ہے اک مرغِ تہہِ دام یہاں

سایۂ زلف سے ہے زینتِ رخسارِ حبیب
ظلمتِ کفر سے ہے رونقِ اسلام یہاں

ہدفِ مسخرگی ہے طلبِ جاہ و نمود
موجبِ ننگ و زیاں ہے ہوسِ خام یہاں

گوشِ رندانِ قدح خوار ہے اور لعلِ نگار
لبِ جبریل نہیں درخورِ پیغام یہاں

کسی سورت میں بھی باقی نہیں جائے تاویل
کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں

منزلیں راہ میں تبدیل ہوا کرتی ہیں
رو بہ آغاز ہی رہتا ہے سرِ انجام یہاں

خوفِ عقبےٰ کی اداسی کے عوض چہروں پر
کھیلتا ہے اثرِ بادۂ گلفام یہاں

قیمتِ بادہ میں جو خرقہ کہ ہوتا ہے گرو
اُس پہ قرباں ہیں سو خرقۂ احرام یہاں

اک توہم ہے مہ و سال کی ترتیب و شمار
اک تمسخر ہے نظامِ سحر و شام یہاں

ایک حالت پہ خرابات میں ہوتی ہے بسر
فقط اک واہمہ ہے گردشِ ایام یہاں

ذرّے ذرّے پہ ہے اتنا ابدیت کا جلال
وقت رہتا ہے سدا لرزہ براندام یہاں

گردِ رندانِ سیہ مست بصد عشوہ و ناز
حلقہ باندھے ہوئے رہتے ہیں گُل اندام یہاں

خوابِ صد سالہ کے مانند ہے اے محرمِ راز
وقفۂ یک نفس و لغزشِ یک گام یہاں

لب ہلاتے ہی جو دنیا کو ہلا دیتے ہیں
چند ایسے بھی نکل آئیں گے خدّام یہاں

شکر ہے جوشؔ! کہ اوراد و وظائف کے عوض
لب پہ ہے زمزمۂ حافظؔ و خیّامؔ یہاں

جوشؔ ملیح آبادی

نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ

بعض نہایت عجیب و غریب دریافتوں یا ایجادوں کو مفاجاتی بتایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص آسٹریلیا کے ویرانوں میں پھرتے پھرتے تھک گیا وہ سستانے کو ایک پتھر پر بیٹھا اور وقت کاٹنے کو ہاتھ کی چھڑی سے زمین کریدنے لگا جس میں ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی کھودنے پر اتنا بڑا سونے کا ڈلا جسے نگٹ کہتے ہیں ملا کہ اس وقت تک کسی کے ہاتھ نہ آیا تھا۔ سننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص کو کھولتی ہوئی دیگچی کے سرپوش کے اُچھل پچھل ہونے کے مشاہدے سے دخانی انجن کی ایجاد کا خیال ہوا۔ لکھا ہے کہ فلاں شخص سیب کے درخت کے نیچے چت پڑا ہوا تھا کہ ایک سیب ڈال سے ٹوٹ کر اس کی چھاتی پر آگرا۔ اس سے اُسے کشش ارض یا میل مرکزی کے اصول کا ادراک ہوا۔ یہ کچھ بھی ہو لیکن آپ کے شعر کی تجدید یعنی نئی یا نیچرل شاعری کی ابتدا اتفاقیہ یا مفاجاتی طور پر واقع نہیں ہوئی۔ چونکہ نئی شاعری کے اولین مشاعرے کی کیفیت جاننے سے پہلے یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ نئی شاعری کب اور کیونکر وجود پذیر ہوئی اس لیے اس کی مجمل تاریخی روداد پیش کی جاتی ہے۔

آب حیات کے بعد اردو ادب اور نظم کی کئی تاریخیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اس موضوع پر کسی نے بھی تاریخی واقعات سے بحث نہیں کی گل رعنا کے فاضل مصنف نے اس تنقیح پر اس قدر لکھنا مناسب سمجھا:۔

"پھر اور کچھ بڑھ گئے (آزاد کی تنخواہ کے روپے، اور ان (آزاد) کو موقع ملا کہ یہ اپنی کارگذاری کے جوہر دکھائیں۔ اس وقت گورنمنٹ کو بھی اردو کے نشوونما و ترقی کی فکر تھی ان کو اس سے خاص طرح کا لگاؤ تھا۔ انجمن پنجاب میں مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی اور بجائے طرح کے مصرع کے مضمون کا عنوان دینا قرار پایا انھوں نے کئی نظمیں لکھیں اور مقبول ہوئیں[1]"

اس تحریر سے صرف یہ باتیں دریافت ہوتی ہیں کہ (۱) گورنمنٹ کو اردو کی ترقی کی فکر تھی (۲) آزاد کو اس سے خاص طرح کا لگاؤ تھا اور (۳) انجمن پنجاب میں صرف موضوعی نظم کے ساتھ مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی۔ "بنیاد ڈالی گئی" جو فعل ماضی مطلق مجہول استعمال کیا ہے اس سے فاعل کی تلاش باقی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اردو سے متعلق ایک نہایت مہتم بالشان واقعہ غیر محقق رہا جاتا ہے۔ اس نئی شاعری کے اولین مشاعرے میں آزاد کے سوا اور بھی کئی شاعروں نے مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھیں۔ ان کو بھی آزاد کی طرح اردو کی نشوونما اور ترقی سے خاص طرح کا لگاؤ ہوگا۔ ورنہ وہ اس ادبی بدعت میں شریک و معاون ہی کیوں ہوتے۔ غرضکہ یہ حضرت جو محقق عصر شبلی مرحوم کے مشہور ندوہ کی نظامت کا امتیاز رکھتے تھے اس اہم تاریخی مسئلہ پر روشنی ڈال سکے یا ایسا کرنا ان کو پسند نہ ہوا۔

دوسرے صاحب مولانا عبدالسلام ندوی کا نام اس سلسلہ میں لینا پڑتا ہے جنھوں نے شعر الہند لکھ کر مطبع معارف اعظم گڈھ کے سلسلہ دارالمصنفین کے بیسویں نمبر کی تکمیل فرمائی۔ چونکہ یہ اردو شاعری کی ابتدا سے وقت تالیف تک کی اردو شاعری کی تاریخ تھی شاید اسی لیے فاضل ادبی مورخ نے دیباچہ کے اختتام پر یا کتاب کے سرورق پر تصنیف اشاعت کی تاریخ دینا غیر ضروری خیال کیا بہرحال میں نے یہ کتاب سنہ ۱۹۲۶ء میں خریدی۔

شعر الہند کی اول جلد کے چوتھے باب کا عنوان ہے دور جدید اس باب کو آپ اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"اردو شاعری میں اگرچہ فلسفہ، اخلاق اور فقر و تصوف سب کچھ موجود ہے تاہم اس کا بیشتر حصہ عاشقانہ شاعری پر مشتمل ہے اور عشق و محبت میں بھی جذبات و واردات کو چھوڑ کر ہمارے شعرا زیادہ تر زلف گیسو میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس بنا پر دور جدید میں انگریزی تعلیم کے ساتھ جب شاعری کے متعلق بھی نئے خیالات پیدا ہوئے اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے ہمارے

---

[1] تذکرہ گل رعنا۔ مؤلفہ مولانا حکیم سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ سنہ ۱۳۳۳ ہجری للقدس ۱۲

شعر کے عاشقانہ شعار کے ساتھ ملٹن اور شیکسپیر کے شاعرانہ
خیالات کا مطالعہ کیا تو ان کو اردو شاعری چند محدود فرسودہ
اور غیر شائستہ خیالات کا مجموعہ نظر آئی۔ اس نے ان کو اس
میں ایک عام انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی
اور اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے ہمارے
شعر کے سامنے حسب ذیل اصلاحی مطالبات پیش کیے۔[1]

فاضل مصنف نے اس کے بعد انگریزی تعلیم یافتہ اہل وطن کے اصلاحی مطالبات تشریح کے ساتھ دیے ہیں جو شمار میں پانچ ہیں۔ یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں لیکن ہر معقول پسند شخص مولانا سے یہ سوال کریگا کہ اس دعوے کا ثبوت کیا ہے؟ آخر اتنی بڑی بات آپ کہتے تو کہہ گئے لیکن اس کی واقعیت کی طرف سے بالکل بے پروا رہے۔ اگلے بیانوں سے ثابت ہوگا کہ مولانا کا یہ دعوے صرف واہمہ یا کسی خیال پر مبنی ہے۔ اچھا ہوتا کہ وہ یہ بات نظم میں تحریر فرماتے جس میں اگر قافیہ نہیں وزن تو ہوتا

اس کے بعد ہی آپ مقدمہ خواجہ حالی کا ذکر کر گئے جانتے تھے کہ اس میں شعر شاعری کی مبسوط بحث ہے۔ مولانا یہ بھول گئے کہ دیوان حالی معہ مقدمہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا اس سے پہلے لاہور میں جو کچھ ہوا وہ چونکہ ان کی رائے میں دور جدید کے تاریخی تسلسل سے خارج تھا۔ اس لئے یہاں اس کا تذکرہ ان کے نزدیک نامناسب ٹھہرا پھر اگر پنجاب کو یہ شکایت ہو کہ یو۔پی کے حضرات ادب اور شاعری کے بارے میں پنجاب کے مساعی کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کرتے ہیں تو آپ ہی فرمایئے بجا ہے کہ نہیں!

اور لطف دیکھئے اسی باب میں حالی۔ اسمٰعیل۔ حسرت موہانی۔ وفا رام پوری۔ وحشت کلکتوی۔ فانی۔ جوہر وغیرہم ایک درجن سے زیادہ ناموں کے بعد آپ کو غریب آزاد کا نام یاد پڑتا ہے۔ ذیل کی سطور غور سے ملاحظہ کیجئے اور شعر الہند کے مصنف کی تاریخی واقفیت کی داد دیجئے ارشاد ہوتا ہے۔

"...... لیکن ان اصلاحات کی طرح مولانا حالی کو اس
ضرورت کے پورا کرنے کا بھی موقع ملا چنانچہ لاہور میں کرنل
الرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے جب اردو زبان کی اصلاح
کی طرف توجہ کی تو اس سلسلے میں انھوں نے ایک بزم مشاعرہ
بھی قائم کی جس میں بجائے مصرع طرح کے کوئی خاص مضمون
دیا جاتا تھا تاکہ عاشقانہ مضامین کی جگہ مناظر قدرت اور جذبات
انسانی پر شعرا کو طبع آزمائی کا موقع مل سکے اس وقت مولانا
حالی اور مولوی محمد حسین آزاد نے جو سررشتہ تعلیم سے متعلق
تھے اس مشاعرے میں خصوصیت کے ساتھ حصہ
لیا ... "[2]

"شعر الہند میں تاریخی دیانت اور واقعہ نگاری کا جو خون کیا گیا اس پر زیادہ وقت صرف کرنا فضول ہے۔ غور کے قابل یہ امر ہے کہ خود خواجہ حالی اس بارے میں کیا فرماتے ہیں ملاحظہ ہو۔

"۱۸۷۴ء میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق لاہور
میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر
سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ
کیا تھا جو ہر مہینہ میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا
تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دردبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر
ہو گئی ہے اُس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے
...... چار مثنویاں یعنی برکھا رت۔ نشاط امید
حب الوطن اور مناظرہ رحم و انصاف اسی مشاعرے
کی نظمیں ہیں۔[3]

خواجہ مرحوم اس واقعہ کا اقبال کرتے ہیں کہ انجمن پنجاب کا تاریخی مشاعرہ ان کے لاہور میں آنے سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ مولانا کے بیان کی جو لاگ لپیٹ سے خالی نہیں کافی تردید خواجہ حالی کے الفاظ سے ہوتی ہے یہاں ضمناً یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ چند ہی سال بعد خواجہ مرحوم دہلی واپس چلے گئے۔ اور وہاں ۱۸۷۹ء میں انہوں نے اپنا نامی گرامی مسدس تصنیف کیا۔

اب بحث کے مثبت پہلو پر نظر ڈالنی ہے۔ مولانا آزاد مرحوم کو ۱۸۷۴ء سے بہت برس پہلے اردو کی تجدید اور اصلاح کا خیال پیدا ہوا تھا۔ خدا معلوم کب سے یہ دُھن ان کے دماغ پر حاوی تھی تاریخی ثبوت ہمیں ۱۸۶۷ء تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ اگست ۱۸۶۷ء کے ایک جلسہ میں آپ نے "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" اس موضوع پر ایک مفصل تقریر فرمائی۔ جس میں سے چند جملے آپ کے غور کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:۔

---

[1] شعر الہند۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۵۹۔ [2] شعر الہند حصہ ا صفحہ ۳۸۶۔ [3] مجموعہ نظم حالی۔ دوسرا اڈیشن۔ دیباچہ صفحہ ۳۰۱۔

"........ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فن شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہو لیکن جو لوگ سرِ معنی اور راہ اصل سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صناع خبث طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پہ الزام نہیں آسکتا......"

یہ لکچر ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوا تھا۔

آمید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبایح کی ترویج و اصلاح پہ نظر ہوگی۔ فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے۔ گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاءاللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔ آزاد[1]

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا

جس نظر سے ان ادبی مورخوں نے آزاد کی سینہ فگاری کو دیکھا ہے اس پر آزاد کی روح کیا کہتی ہوگی۔

یہ لکچر تبصرے اور تاویل کا محتاج نہیں آزاد کے دل پہ صدمہ ہے کہ اردو شاعری جیسی کچھ بھی ہے نفقضائے زمانہ کے ہم ردیف نہ ہونے کی وجہ کس مپرسی کے گڑھے میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ کڑھتے ہیں۔ جب شاعری اور شاعروں کو ذلیل ہوتا دیکھتے ہیں۔ اہل وطن کو ترغیباً تاکید کرتے ہیں کہ بُرے شاعروں کے سبب شاعری بُری نہیں ہو سکتی اور اپیل کرتے ہیں کہ شاعری کی طرف توجہ کی جائے۔

طوالت کے خوف سے اور اقتباسات نہیں دیئے جائیں گے اور صرف اس عظیم الشان جلسہ کا ذکر کیا جائے گا۔ جس میں انھوں نے نئی شاعری کے نوطرز مشاعرے یعنی مناظمہ کی بنیاد رکھی۔ ایک جملہ معترضہ معاف فرمایئے۔ ایسی ادبی صحبت کو جس میں صرف مقررہ موضوع پہ نظمیں پڑھی جائیں میں مناظمہ کہا کرتا ہوں۔

جلسہ کی مندرجہ ذیل روداد ضمیمہ کوہ نور لاہور مطبوعہ ۱۲ مئی ۱۸۷۴ء سے ماخوذ ہے۔

یہ عظیم الشان جلسہ جس کی تاریخی عظمت ادبی دنیا میں کسی جلسہ سے کم نہیں ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو شام کے چھ بجے انجمن کے اہتمام سے سکشا سبھا کے مکان میں منعقد ہوا۔ حاضرین میں ہندوستانی اصحاب کے علاوہ کرنل ہالرائڈ۔ مسٹر جسٹس بولنو چیف جج چیف کورٹ۔ مسٹر تھارنٹن سکرٹری پنجاب گورنمنٹ۔ کرنل مکلاگن۔ مسٹر رینگ کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور۔ اور نواب عبدالمجید خاں۔ فقیر سید قمرالدین وغیرہ اصحاب تشریف رکھتے تھے۔ مسٹر جسٹس بولنو صدر جلسہ تھے۔ اس جلسہ میں آزاد مرحوم نے ایک زبردست تقریر کی جس کا ملخص نہایت خساست اور سنگدلی سے پیش کیا جاتا ہے:-

"...... اے گلشن فصاحت کے باغبانو۔ فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ نعالی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کے غائب ہو گئے..........

تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے! ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن انہی پر قناعت ناجائز۔ کیونکہ اب زمانہ کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار طرے ہاتھوں میں لئے کھڑی ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھائے۔"

یہ اہل ہمت خود حضرت آزاد تھے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"اے انگریزی کے سرمایہ دارو بڑا افسوس ہے کہ تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو اور تمہیں افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے اور تمہیں اس کا درد نہیں آتا۔ تم اپنے خزانے اور توشہ خانے سے ایسا بند و بست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔ وطن کا یہ فرض ہے کہ تمہیں قرض سے زیادہ ادا کرنا واجب ہے۔ ہمدردی کی

---

[1] مجموعہ نظم آزاد۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۹۹ء صفحہ ۱۰۸۔

آنکھیں آنسو بہاتی ہیں جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں
اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ وجہ
اس کی یہ ہے کہ بسبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا
نہ ہوں گے۔ یہی پرانی مورتیں جو باقی ہیں وہ چراغ سحری
ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی
اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا۔"

اب یہ امر صاف ہو گیا کہ اس زمانے کے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب جن کو مولانا عبدالسلام صاحب کے شاعرانہ تخیل نے اصلاح اور مطالبات بیگانہ کا تمغہ عطا فرمایا ہے اس وقت کس شغل میں تھے بہت برس نہیں گزرے کہ سر عبدالقادر نے بھی اپنے "نیو سکول آف اردو لٹریچر" میں وہی شکایت کی جو حضرت آزاد نے کی تھی۔ الحمد للہ کہ آج وہ شکایتیں صرف تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج کل جو خدمت اردو ادب اور شاعری کی میرے انگریزی تعلیم یافتہ ارباب وطن کر رہے ہیں اعتراف اور تحسین سے مستغنی ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

اے میرے اہل وطن مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش۔ لطائف اور صنائع کا سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں آکر محبوس ہو گئی ہے۔ وہ کیا؟ چند مضامین عاشقانہ ہیں جن میں کچھ وصل کا لطف بہت سے حسرت و ارمان اس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار۔ خزاں۔ فلک کی شکایت۔ اقبال مندوں کی خوشامد۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ . . . . افسوس یہ ہے کہ اس محدود دائرے سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو بدمزہ ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ مدت سے مجھے اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال تھا مگر اب اس تقریر میں زیادہ زور دینے کا باعث یہ ہے کہ میں دیکھتا ہوں آج کل ہماری گورنمنٹ کو اور اس کے اراکین کو اس طرف توجہ ہے جو ہماری تعلیم و اصلاح کا علاج جان سے ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو یہ ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بہت سا اثر کرے گی....."

اس بارے میں گورنمنٹ اور اس کے اراکین کی توجہ ماسٹر پیارے لعل مرحوم اور آزاد مغفور کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اس تقریر کے خاتمہ پر حضرت آزاد نے ایک نظم مسمیٰ بہ "شب قدر" سنائی۔ اس سے لوگوں کو یہ جتانا مقصود تھا کہ اردو کی نظم مروجہ مضامین کے سوا اور مطالب کے بیان کرنے کی بھی قابلیت رکھتی ہے۔ اگر شاعر کو سلیقہ ہو۔ یہ نظم ان کے مطبوعہ مجموعے میں شامل ہے اور نئی شاعری کی سب سے پہلی نظم قرار دی جاتی ہے۔

کرنل ہالرائڈ نے اپنی تقریر کے سلسلے میں فرمایا۔

"اس وقت مولوی محمد حسین صاحب نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر اشعار سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی صاحب کا بہت شکر گزار رہنا چاہئے۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس طرز کا ہے جس کا رواج مطلوب ہے . . . . . "

مسٹر تھارنٹن۔ رائے مول سنگھ۔ پنڈت بسنت رام اور صاحب صدر کی مختصر اعترافی تقریروں کے آخر میں اس نئی شاعری کے اول مناظمہ کے لئے ایک موضوع قرار پایا۔

اس مجتہد عصر اور مسیحائے ادب کے مساعی مشکور اسی حد تک محدود نہیں جن کا مجمل تذکرہ اب تک ہوا ہے شاعری کی تجدید کی تحریک سے متعلق حضرت آزاد نے مضامین بھی بہت سے لکھے۔ مثال کے طور پر رسالہ انجمن مفید عام قصور ضلع لاہور کی ۱۹۰۵ء کی جلد اسی موضوع پر آپ کے مضامین سے بھری ہوئی ہے۔

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تجدید شاعری کی ان کوششوں کا آزاد کے اہل وطن نے کس انداز سے استقبال کیا اور اردو پریس نے کیا تبصرہ کیا اس بارے میں تفصیل کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے پھر بھی سرسری واقفیت کی غرض سے صرف ایک اخبار سے استفادہ کیا جائے گا۔

میرٹھ کے ہفتہ وار اردو اخبار "لائل گزٹ" کی ۱۴ اکتوبر [illegible] کی اشاعت میں مفصل افتتاحیہ اس موضوع پر درج ہے۔ جس کے

بعض حصے اس بارے میں کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اردو شاعری کے ابتدائی عہدوں کے تذکرہ کے بعد صاحب اخبار اس وقت کی اردو شاعری کی قابل رحم حالت کا خاکہ اتارتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"...... اس واسطے اردو شاعری مردوں میں سمجھی جاتی تھی۔ مگر آفرین ہے مولوی محمد حسین صاحب آزاد تخلص پروفیسر عربی کالج لاہور کی رائے صائب پر کہ انھوں نے اردو شاعری کی بے قدری کو نظر کر کے ایک انجمن قایم کی جس کے مفصل حالات کو شرح و بسط کے ساتھ پھر ابر نظم میں موزوں کرتے ہیں اگرچہ بعض شاعروں نے اس تجویز پر طعن آمیز مضمون اخباروں میں چھپوائے ہیں جیسا ابتدائی قاعدہ ہر ایک عمدہ سے عمدہ تجویز کا ہوتا ہے کہ اول اس پر ہنسا کرتے ہیں۔ پھر اس کے فائدے دیکھ کر خود بھی اُدھر ہی متوجہ ہو جاتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو حضرت آزاد نے آزادانہ اور بے باکانہ شاعری کو دوسرے قالب میں ڈھال دیا جس سے پرانا مردہ زندہ ہو گیا......"

لاہور کی اس جدت آفرینی کے صدائے عام نے کہاں کہاں گونج پیدا کی اس کا بھی کچھ اندازہ لارنس گزٹ کے اسی افتتاحیہ سے ہو سکتا ہے صاحب اخبار نے لکھا:۔

"...... افسوس کہ میرٹھ میں صرف دو ہی جلسے نظم سوسائٹی کے ہونے پائے تھے کہ وبائی بیماری تپ و لرزہ نے لوگوں کو پراگندہ کر دیا ورنہ وہ اُس انجمن کی شاخ ہو جاتی"۔
(انجمن پنجاب کی)

یہ پایا جاتا ہے کہ مناظمہ کا جہاں تک تعلق ہے میرٹھ کی نظم سوسائٹی نے نظم و ضبط کے ساتھ انجمن پنجاب کے ضابطہ کی تقلید کی۔ یعنی یوں ہوا کہ لاہور کی انجمن کے موضوع لے کر انھوں نے اپنے ہاں مناظمہ قایم کیا چنانچہ اس وقت کم سے کم ایک نظم ہم کو ملتی ہے۔ جو لاہور کے موضوع پر لکھی گئی۔ سید محمد مرتضیٰ میرٹھ کے رئیس اور نامی شاعروں میں گزرے ہیں آپ اردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ بیان و یزدانی کے نام اور کلام سے نہ صرف اردو اور فارسی کا ذوق رکھنے والے واقف ہیں بلکہ صحافت بھی ان کی اعلیٰ قابلیت سے بے بہرہ نہیں رہی۔ مناظمہ لاہور کے ابتدائی موضوعوں میں امید بھی ایک موضوع تھا۔

اس موضوع پر حضرت بیان مرحوم نے ایک نظم (مثنوی) میرٹھ کے مناظمہ میں پڑھی۔

لاہور کے نعرہ اصلاح کی صدائے بازگشت دہلی سے بھی اٹھی اور کیوں نہ اٹھتی۔ مولوی سیف الحق ادیب دہلوی مرحوم تلمیذ مرزا غالب جو بعد میں لاہور آ کر انجمن پنجاب کے مناظموں میں شریک ہوئے انھوں نے ایک نظم لاہور کے ایک ابتدائی موضوع برسات پر دہلی لٹریری سوسائٹی کے ایک جلسے میں پڑھی جو اسی کے رسالے میں شائع ہو چکی ہے حضرت بیان کی مذکورہ نظم کا تذکرہ زمانہ کانپور کی حال کی اشاعت میں بھی آتا ہے اگرچہ وہ اُن کے کلیات میں شائع ہو چکی ہے۔

اب میں آپ کو نظم کی اُس خاص اور تاریخی صحبت میں لے جانا چاہتا ہوں جو ساٹھ برس گزرے لاہور میں منعقد ہوئی یہ مناظمہ ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے مکان میں ہوا تھا۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ پرانی چال کے طرحی مشاعروں کی جگہ موضوعی مناظموں کی قرارداد آزاد مرحوم نے ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کے عالی وقار جلسہ میں منظور کرائی تھی جس کی کیفیت آپ کے گوش گذار ہو چکی ہے اور یہ مناظمہ اسی سال کی تیسویں جون کو ہوتا ہے اس لئے ظن غالب ہے کہ یہ نئی شاعری کا اولین مناظمہ ہے اس میں نو شعرا نے اپنی نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ آیندہ مناظمہ کے لئے امید موضوع قرار پایا۔ وہ شعرا حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شاہ انور حسین ہما (۲) مولوی مرزا اشرف بیگ خاں اشرف رئیس دہلی اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائرکٹری پنجاب۔ نظم کا عنوان تھا برد عجوز (۳) منشی الٰہی بخش رفیق عنوان تیغ بستہ (۴) حضرت آزاد (۵) مولوی محمد مقرب علی رئیس جگراؤں (۶) مولوی امو جان ولی دہلوی شاگرد غالب ہیڈ ماسٹر ورنیکولر مڈل سکول فیروز پور جھرکہ (۷) مولوی قادر بخش مدرس انبالہ (۸) مولوی عطاء اللہ (۹) مولوی علاء الدین محمد کاشمیری۔

اس مناظمہ کے لئے موضوع زمستان مقرر تھا۔ جون کی جلتی بلتی گرمی اور مناظمہ کا موضوع زمستان۔ شاید یہ سوچا ہو کہ جاڑوں کا ذکر گرمی کی گرم بازاری کو سرد کر دے گا۔ کوئی کہہ گیا ہے ع۔ ذکرِ حبیب کم نہیں وصل حبیب سے۔

مختصر یہ کہ ان میں سے پچھلے دو کو چھوڑ کر باقی شاعروں کی نظموں سے کچھ کچھ شعر نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

۱۔ شاہ انور حسین ہما حمد سے اپنی مثنوی شروع کرتے ہیں۔ چند

اشعار کے بعد فرماتے ہیں:۔

گرچہ سرزد نہ ہوویں ہم سے گناہ
مغفرت خواہ ہوں نہ خواہ مخواہ

یہ ہے شانِ مہان اس کی عیاں
گرمی اور سردی اور بہار و خزاں

ترو تازہ ہے موسم برسات
نہیں کوئی سوائے دلبر ساتھ

تن ہے گرمی سے صورتِ عناب
دل حرارت سے ہو گیا بیتاب

\+ + + + + + +

گرمی کے بعد برسات آئی۔ پھر حضرت زمستان تشریف لائے۔

کیا لکھوں حال خوبیٔ گرمی
گئی گرمی کی صاف سردردی

عیش و آرام ہے امیروں کو
غم و آلام ہے فقیروں کو

ہے برانڈی برانڈے میں موجود
کان میں آتی ہے سرائے سرود

رکھی مسکوٹ میں ہے اغذیۂ گرم
بہر شربِ شراب ہیں سرگرم

کیوں نہ کمروں میں آکے کھولیں کمر
رخت ہے نرم و گرم شام و سحر

ساقی و جام و شیشہ ہے اور دین
دیتے ہیں دادِ عیش و عشرت و چین

کس طرح مارے سردی اکلاف
گرم ہے نرم توشک اور لحاف

غربا کا یہ سردی سے ہے حال
سر گرمی ہے سر بسر پامال

صورتِ یخ ہے سرد بسترِ و تن
روتے گرمی کو ہیں سگے مرد و زن

شب کو کروٹ جدھر بدلتے ہیں
کفِ افسوس دن کو ملتے ہیں

\+ + + + + + + +

اس نظم کا تبصرہ غیر ضروری ہے۔ یہ صاف کسی انگریز افسر کے متوسل یا کسی سرکاری دفتر کے عملہ سے وابستہ معلوم ہوتے ہیں۔ کمر کھولنا اصل میں ایک فوجی اصطلاح تھی اس سے عبارت ہے سپاہی کا وردی وغیرہ اتارنا۔ برانڈہ اور برانڈی۔ شیری اور شیر بھی خیال کو اسی طرف لے جاتے ہیں لے جائیں کے بدلے لے جاویں ۱۸۷۶ء میں ضرور مروج تھا اور مضارع و مستقبل کے ایسے صیغوں کو اب سے ساٹھ برس پہلے کوئی نہ ٹوکتا تھا لیکن ہینگے یقیناً متروک ہو چکا تھا عشرت و چین بھی مخالفت قیاس لغوی میں داخل تھا۔ ان کی لفظی رعایتیں کچھ مزہ پیدا نہیں کرتیں۔ پھر بھی خدا بخشے یہ حضرت تحسین کے مستحق ہیں۔

۲۔ ان کے بعد مرزا اشرف بیگ کی نظم ہوئی۔ یہ فوراً برسات سے چل پڑتے ہیں:۔

رات دن کی جھڑی معاذ اللہ
مینہ تھا یا قہر تھا خدا کی پناہ

مرزا صاحب واقع میں نکتہ رس تھے حمد سے کلام کی ابتدا جو پرانی رسم تھی۔ اسے تو ترک کر دیا۔ لیکن اللہ کا پاک نام شروع ہی میں لے گئے۔ خیر۔ بہت سے شعر برسات کی نذر کر کے اس طرح اصل موضوع کی طرف رجوع لاتے ہیں:۔

بارے صد شکر کچھ ہوا بدلی
وہ گھمس اب رہی نہ وہ گرمی

جاڑے کی ہو گئی شروع بہار
کونجیں آنے لگیں قطار قطار

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں
اب گھمس کی شکایتیں نہ رہیں

آئے فرحت اور انبساط کے دن
آئے صحت کے اور نشاط کے دن

اب ہوا میں فساد وہ نہ رہا
بارے بیماریوں نے چین لیا

اندنوں میں ہے تندرستی عام
ہے اگرچہ کسی کسی کو زکام

ہضم ہوتی ہے اچھی طرح غذا
کھانا پینا ہے انگ سب لگتا

رہے سونے کے اب نہ صحن میں دن
نیند آتی نہیں رضائی بن

موسم آیا لحاف توشک کا
روئی کا بھاؤ ہو گیا مہنگا

ہندو آئے نہا کے گنگا سے
جاڑا لائے بدل کے برکھا سے

\+ + + + + + + +

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

ہیں جو دنیا میں لوگ دولتمند
گھر میں بیٹھے ہیں اپنے وہ خورسند

ان کے دن عیش میں گزرتے ہیں
بیٹھے بے فکر چین کرتے ہیں۔

جبۂ پوستیں ہے زیب بدن
کمرے میں ہیں انگیٹھیاں روشن

پردے چھوٹے ہیں اور کھٹکے لگے
چار احباب اک جگہ بیٹھے

چائے کے چل رہے ہیں دور پہ دور
لطف ہم صحبتوں میں ہے کچھ اور

چہلیں کرتے ہیں میوے کھاتے ہیں
خوب بیٹھے مزے اڑاتے ہیں

اور جو مسکیں ہیں مفلس اور قلاچ
ان کا پشمینہ دھوپ ہے یا آنچ

کانپتے پھرتے ہیں وہ سردی سے
دانت بجتے ہیں ہونٹ ہیں نیلے

رات کرتے ہیں گدڑیوں میں تیر
زندگانی سے ہو رہے ہیں سیر

تاپتے ہیں تنور پر بیٹھے
یا کہ سینکتے ہیں چولھے کے آگے

کوئی گھر میں پڑا ٹھٹھرتا ہے
کوئی جنگل میں ٹھر کے مرتا ہے

\+ + + + + + + +

دشت میں بھی ہے آج کل جوبن
ہے برستا کچھ اک سہانا پن

ہر طرف کھیتی لہلہاتی ہے
سبزی آنکھوں میں کھبی جاتی ہے

اوس سبزے پہ اس طرح ہے پڑی
جیسے مخمل میں ہوں جڑے موتی

+ + + + + + + +

چرتے پھرتے ہیں کھیتوں میں ہرن
پیٹ بھر بھر کے ہو رہے ہیں مگن

+ + + + + + + +

کابلی شہر میں اب آنے لگے
ہر ولایت کے میوے لانے لگے

میوے والوں کی اب دکانوں پر
بھیڑ بھاڑ اتنی رہتی ہے دن بھر

چھوٹ دم بھر کی ہے انہیں دشوار
نہیں لگتا ہے بات چیت کا وار

مانگتا ہے کوئی انار و بہی
اور چکھتا ہے کوئی مونگ پھلی

مول لیتا ہے کوئی تو بادام
پوچھتا ہے کوئی گری کے دام

ناشپاتی کسی کے مدِ نظر
اور کسی کا ہے دانت پستہ پر

کوئی کشمش پسند کرتا ہے
کوئی انگور ہی پہ مرتا ہے

ہاتھ میں کوئی سیب اٹھاتا ہے
اور چھوارے کوئی چکھتا ہے

+ + + + + + +

مرزا صاحب اپنی نظم اس طرح ختم کرتے ہیں۔

پیسے والے مزے اڑاتے ہیں
مول ہر چیز لے کے کھاتے ہیں

اور محتاج ہیں جو بے چارے
بستے ہیں وہ غریب من مارے

عمر کٹتی ہے بے مزا اُن کی
عیش کیا ان کا زیست کیا ان کی؟

ہے تو یوں مفلسی بری ہے بلا
اس سے ہر شخص کو بچائے خدا

مرزا صاحب کی نظم ادھر اُدھر سے آپ نے سنی۔ اپنے زمانے کے تعلیمی نصابوں میں اور بک ڈپو کے کام میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ فن کے واقف اور مشق سخن سے آراستہ تھے۔ بلاغت کا رنگ ان کے کلام میں موجود ہے زبان پر بھی قوت رکھتے ہیں۔ اگر ان کی ساری نظم پڑھیئے تو کہہ اٹھئے کہ نظم کیا ہے سردی کا دل کش مینا بازار ہے۔

۳۔ منشی الٰہی بخش رفیق قلم کو خطاب کر کے نظم شروع کرتے ہیں۔

اے کلک شعلہ بار اب آتش کا کام ہے
سردی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے

تمہیدی اشعار کے بعد سردی کو خطاب کر کے کہتے ہیں:۔

سب سے نرالا تیری حکومت کا ڈھنگ ہے
نکھرا ہوا یہ گنبد فیروزہ رنگ ہے

دنیا میں رنگ تیرے فرماں کا جم گیا
دریا بھی جس کو دیکھ کے چلنے سے تھم گیا

ہر دل نشانہ ہے تری لعنت کے تیر کا
پنجاب میں ہے اب کے سماں کاشمیر کا

دریا ہے آج کل تری بخشش کا جوش پر
ہوتا ہے خوش خدا بھی بہت پردہ پوش پر

یکساں تو چاہتا ہے غریب و امیر کو
دیتا غنی کو شال ہے کمبل فقیر کو

+ + + + + + + + +

بہت سے اشعار کے بعد کہتے ہیں:۔

لیلائے شب کی کھل گئی زلفِ دراز ہے
ہم کو درازیٔ شبِ ہجراں پہ ناز ہے

آتی اجل بھی خوف کے مارے ادھر نہیں
اس کی تو صبح ہی نہیں اس کی سحر نہیں

یہ مجمرِ سپہر میں دہکتا ز غال ہے
یا ملک ہند کا حبشی کو زوال ہے

انگارے آگ کے نہیں اس میں دھرے ہوئے
میوے ہیں فصلِ دے کے ڈلیوں میں بھرے ہوئے

دل میں اثر محبت آتش یہ کر گئی
یعنی کہ اپنی حد سے بھی آگے گذر گئی

الفت کا ڈھنگ ہی یہ طریقہ ہے چاہ کا
اٹھتا ہے بار بار دھواں دل کی آہ کا

منہ سے دھواں نکلنے لگا دم کے ساتھ ہے
اب سب کی زندگی اسی ہمدم کے ہاتھ ہے

تارے نہیں ہیں گرد یہ ماہِ منیر کے
سردی سے دبکے ہیں بچے چرخ پیر کے

+ + + + + + + +

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

الٹی نقاب رخ سے جونہی حورِ صبح نے
ٹھنڈا جہاں کو کر دیا کافورِ صبح نے

وقتِ سحر ہے اے دلِ دلگیر آ گیا
مشرق سے ٹیکتا وہ عصا پیر آ گیا

وہ دیکھ تو سحر کی ہے تصویر سامنے
بکھری ہوئی ہے یا یہ طباشیر سامنے

یہ حضرت رفیق اس طرح اپنی نظم ختم کرتے ہیں:۔

جاڑے کے خوف سے ہے قلم تھرتھرا رہا
کاغذ کی چادروں میں ہے چہرا چھپا رہا

سردی بہت جو کھائی ہے سرما کی رات میں
سب روشنائی رہ گئی جم کر دوات میں

آرام کرے کوئی گھڑی تو بھی لیٹ کر
سو رہ رفیق منہ پہ رضائی لپیٹ کر

حضرت رفیق کون صاحب تھے یہ نہ معلوم ہو سکا۔ آیا حضرت آزاد سے ان کا کچھ تعلق تھا یا نہیں انداز گفتار یہ آزاد کی زبان کا اڑانا چاہتے ہیں مگر وہ بات نہیں پا سکتے۔ ان کی طبیعت میں اُپج ضرور ہے ادراک بھی۔ لیکن کلام میں پست و بلند موجود ہے بعض اشعار کے مصرعے دولخت ہیں۔ یہ بھی سراغ چلتا ہے کہ آپ پر غزل کا خاصا گہرا رنگ چڑھا تھا۔ مبالغہ بھی کم نہیں۔ غالباً یہ ان سب اصحاب کی اوّل مشقیں ہیں اس لئے یہ سب کچھ درگزر کے قابل ہے۔

۴۔ مولوی اتو جان دلی مرزا غالب کے تلامذہ کی دوسری صف

کے شاعر تھے۔ ان کی مثنوی بہت لمبی ہے۔ حمد کے شعر سے شروع ہو کر موسمی جنگ نامہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے معلوم ہوتا ہے ۱۸۵۷ء کے خونریز ہنگامہ سے ان کا ذہن ابھی تک متاثر تھا تیسرے ہی شعر میں کہتے ہیں:-

اے شہ آسماں خفا کیوں ہے   تخت گیتی سے اب جدا کیوں ہے

رزم کے تیور ملاحظہ ہوں:-

دل پہ دل بادلوں کے آتے ہیں   ملک پامال ہوتے جاتے ہیں
کب یہ بادل گرجتے جاتے ہیں   جنگ کے باجے بجتے جاتے ہیں
یہ مخالف کی فوج کا ہے زور   کہ زمیں سے ہے آسماں تک شور

+ + + + + + +

رعد کا توپ خانہ وہ ہمراہ   شور محشر بھی جس سے مانگے پناہ
ہے سپاہی کے پاس وہ تلوار   صاعقہ کہیئے یا خدا کی مار

+ + + + + + + + +

سردی کے تذکرے میں فرماتے ہیں:-

دھوپ نعمت ہے آج کل یا آگ   اور دلوں لیں تو پیچھے بھاگ
آج جاڑے سے جی ہی چھوٹا ہے   طبقۂ زمہریر ٹوٹا ہے
دن تو کاٹیں گے خیر جوں توں کر   رات اے دل بسر کریں کیوں کر
دن کو تو ہے لحاف پانی سا   شب کو ہوگا وہ برف کا ٹکڑا
ایسے جاڑے میں وہ پہاڑ سی رات   کیونکہ گزرے گی کیا بنے گی بات

+ + + + + + + + +

حضرت ولی کی نظم میں رزمیہ تمہید کے سوا کوئی خاص بات نہیں ان اور دوسرے حضرات کا کلام جیسا کچھ بھی ہے غنیمت ہے۔ کہاں غزل کا بحران اور کہاں موضوع زمستان۔

۵۔ مولوی قادر بخش صاحب مدرس انبالہ خامہ خوش مقال کے آداب سے ابتدا کرتے ہیں۔ ان کی مشق سخن ناقص معلوم ہوتی ہے مثلاً فرماتے ہیں:-

مورخ ہے تو واقعات جہاں   ترے سے ہے باقی نشان جہاں

"ترے سے" غالباً اس زمانے میں ابھی "تجھ سے" کو اپنی جگہ دے چکا تھا۔ پہلے مصرع کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے۔ خیر اصل موضوع پر فرمایا ہے۔

غرض میں کیا کروں وصف تیرا بیان   ہر اک شے پہ ہے حکم تیرا رواں

ذرا سرد مہری کو اب دور کر   کہ حال زمستاں کو مسطور کر
کیا ہے نے قصد برج حمل   ہے آتش پرستوں کا سب جا عمل
برودت کی یارو یہ تاثیر ہے   بنا شہر لاہور کشمیر ہے
ہے سردی سے جی سب کا جلتا یہاں   نکلتا دم گفتگو ہے دھواں
دہن کی صدا کان تک تھم گئی   جو نہیں منہ سے نکلی وہیں جم گئی

مولوی صاحب کیسے ہی شاعر سہی مگر آخر کے دو شعر جو آپ نے ابھی سُنے داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مولوی مقرب علی صاحب رئیس جگراؤں کی نظم بھی اچھی اور خاصی لمبی ہے۔ یہ شروع ہی مطلب نگاری سے ہوتے ہیں فرماتے ہیں:

کس جوش سے آئی فصل سرما   عالم پہ خزاں ہے کار فرما

+ + + + + + + +

سردی کا ہوا ہے گرم بازار   ہر شخص ہے آگ کا خریدار
جس کو دیکھو وہ کانپتا ہے   لرزہ سا ہر اک کو چڑھ رہا ہے
اس درجہ ہوئی ہے شدت برد   آتشکدے ہو گئے ہیں سب سرد
گھٹتا ہر وقت گو لہو ہے   دن رات پر آگ رو برو ہے

+ + + + + + +

ہے برد عجوز کی جوانی   سرمایۂ لطف زندگانی

+ + + + + + +

پانی سرد اور خنک ہوا ہے   کُہرا ہر سمت پڑ رہا ہے
اُڑتی نہیں مطلق ان دنوں گرد   گرمی سردی کے آگے ہے سرد
سردی سے جو آفتاب کانپا   مُنہ پردۂ ابر میں ہے ڈھانپا

+ + + + + + + +

شمس الدولہ کا اب پتا کیا   ہے عہد یہ زمہریر خاں کا

۶۔ حضرت آزاد نے جو نظم اس مناظمہ میں سنائی وہ ان کے مجموعۂ کلام میں موجود ہے۔ یہاں چند ہی اشعار پر اکتفا کروں گا کیونکہ پہلے ہی مضمون بہت طویل ہو چکا ہے۔ آزاد مرحوم اپنی نظم کے لئے بحر کے انتخاب میں فرد تھے ان کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ لیٹی ہوئی اور سست بحروں میں قلم نہ اٹھاتے تھے اور نظموں کی طرح ان کی یہ نظم بھی رواں دواں اور جاندار ہے۔ قوت تالیف اور حسن ادا۔ جدت تخیل اور اسلوب کی ندرت ان پر ختم تھی۔ یہ موقع ان کے کلام پر عام تنقید کا نہیں اب ان کی نظم کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

آ زمستاں کہ ہے تو بادشہ برفانی   شاہ برفانی و شاہنشہ برفستانی
تخت اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا   اور ہے دربار سرِ کوہ ہمالہ تیرا
باد صرصر ہے نشاں تیرا اڑاتی آتی   فوج اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی
طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیر جہاں   تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیر جہاں

* * * * * *

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا   اور بغل سے دل وحشت زدہ نکلا جاتا
یا ہیں اب ہاتھ بغلوں میں دبا لیتے   آگ نا تمامی تو ہیں دل میں چھپا لیتے
مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں   بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

* * * * * *

ہیں زمستاں ترے سب کام زمانے سے الگ   یہ لطیفہ ہے مگر فہم میں آنے سے الگ
جام گردوں میں ہے تو شیر جاتا کیونکر   اور ہوا میں ہے تباشیر جاتا کیونکر
ابر و باراں تو تہِ چرخ بریں دیکھا تھا   پر برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا

* * * * * *

خاتمہ کے شعر ہیں:۔

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی   مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
دیکھ کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھراتا ہے   اور قلم ہاتھ سے تھرا کے گرا جاتا ہے
مارے سردی کے ہے سر اپنا چھپا لے لیتا   منہ ہے کاغذ کی رضائی میں چھپائے لیتا
میرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا   تیرے آزاد کو جاڑے سے پڑا ہے پالا
آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہو دل میں   اب تمنا ہے صبا تی تو یہی ہے دل میں

طپشِ عشق سے سیرا ہے دل نرم سدا
گرمیٔ شعر و سخن سینہ رکھے گرم سدا

اب یہ نصف صدی سے زیادہ کی صحبت ہم سے رخصت ہوتی ہے۔ ان بزرگوں کی جدت طرازی۔ ان کی عبارت۔ ان کی قوت عمل کی جیسی کہ چاہیئے داد نہیں دی جا سکتی وہ شخص جس کا عنصری ڈھیر اس وقت لاہور میں کربلا کے ایک گوشہ میں آسودہ ہے پچاس برس گزرے ۲۰ جون ۱۸۷۴ء کی شام کو کتنا خوش ہوا ہوگا آپے میں پھولا نہ سمایا ہوگا جس وقت یہ مناظمہ ہو رہا ہوگا جب تک اردو زبان کا نام و نشان دنیا میں باقی رہے گا۔ یہ تاریخ یادگار رہے گی۔ اور اُن سات سخن سنجوں کی نظمیں جن سے آپ کا ابھی تعارف ہوا کعبۂ ادب کے آستانہ پر سبعۂ معلقات کا حکم رکھیں گی۔

برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

رباعیات

[illegible]

کوشش و تدبیر کا پھل ہی نہ ملا
پھر عقدۂ تقدیر کا حل ہی نہ ملا
خیر زیست بصد عجز بسر ہو ہی سکی
پھر تیری محبت کا بدل ہی نہ ملا

اسرار جہاں سے تھی
اسرار جہاں سے نہ ہم آگاہ نہ تم
اسرار جہاں سے نہ ہم آگاہ نہ تم
اخبار نہاں سے تسکین
ہر ذرہ عیاں کہہ رہا ہے سخن سے نہ ہم آگاہ نہ تم
قدرت کی زباں سے نہ ہم آگاہ نہ تم

حکیم آزاد انصاری

غزل

کبھی جو دل کو اٹھایا قدم اٹھا نہ سکا
غرض ہیں کوچۂ جاناں سے اُٹھ کے جا نہ سکا

کہیں نہ مجھ کو تغافل سے اب وہ تنگ کرے
جفاؤ جور سے تو دِل مرا دُکھا نہ سکا

کچھ اس طرح سے بگاڑا تھا میں نے اپنا کام
کہ پھر وہ بن نہ سکا اور میں بنا نہ سکا

کشش اُدھر سے بھی کچھ تھی، اِدھر سے بھی کچھ تھی
خدنگِ یار کی زد سے میں بچ کے جا نہ سکا

برابر ایک رہا حال ربطِ باہم کا
کہ تم بڑھا نہ سکے اور میں گھٹا نہ سکا

شکستِ دل کی صدا تو پہنچ گئی تجھ تک
اگرچہ میں تری محفل میں بار پا نہ سکا

حریفِ سوزِ دروں سیلِ اشک ہو نہ سکی
لگی وہ آگ کہ دریا جسے بجھا نہ سکا

بہت ہی حوصلہ فرسا ہے ایسی مجبوری
تم آپ آ نہ سکے اور میں بُلا نہ سکا

حجابِ عشق سے کیا دستِ شوق کی چلتی
خدا گواہ ہے میں آنکھ بھی ملا نہ سکا

ترے وصال کا دل میں سرور تھا کیسا
میں جس کو سختیٔ ہجراں میں بھی بھلا نہ سکا

میں تیری بزم سے کچھ نامراد بھی نہ پھرا
بقدرِ شوق اگر بامراد آ نہ سکا

یہ شاعری تری وحشتؔ ہے کس مرض کی دوا
جو ایک شعر بھی معشوق کو سنا نہ سکا

(خان بہادر) رضا علی وحشتؔ

عورت اور آرٹ

حُسن ہر جلوہ کہ از جائے دلت را ببرد
از پئش گر بروی راہ بجائے دارد (نظیری)

انسان جہاں بھی چلا جائے، دو چیزیں ضرور اسکے ساتھ رہتی ہیں (۱) مذہب اور (۲) حسن پرستی، ہر عہد میں مذہب اور حسن پرستی کا ساتھ رہا ہے، دنیا میں تین قسم کے مذاہب کو عروج حاصل ہوا ہے، ابتدا میں انسان کائنات کی پرستش کرتا تھا، پھر روحانی جذبات بھی مذہب میں شامل ہو گئے، جدید عہد میں سائنس کی ترقی کا دلوں پر ایسا رعب جما اور اقتصادی پیچیدگیوں نے دماغوں کو ایسا پریشان کیا کہ خدا اور روح کے وجود پر بھی شک ہونے لگا، مذہب ایک ذاتی مسئلہ بن گیا، ہر شخص اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اصول وضع کرتا ہے اور انہیں اپنا مذہب سمجھتا ہے، حسن پرستی کو بھی انہی منازل سے گذرنا پڑا

پہلے انسان فطرت کے حسن سے متاثر ہوا، زمین و آسمان کی لفریبیوں اور صبح و شام کی رنگینیوں نے اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ کائنات کی رعنائیوں پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا، اور انہیں کو پوجنے لگا، پھر جب ان سطحی چیزوں سے نظر بلند ہوئی اور یہ محسوس ہوا کہ اس زمین کی تہہ میں اور آسمان کی نیلی چھت سے پرے بھی کوئی چیز ہوگی تو یہ جستجو ہوئی کہ اس عناصر کی چار دیواری سے نکل کر ذرا گلشن روح کی بھی سیر کریں، دنیا کے خیالات کو چھوڑ کر لوگ جنت کے خوابوں سے دل بہلانے لگے، تمام دنیاوی تعلقات کو ترک کر کے کسی مذہبی پیشوا کی خدمت میں عمر بسر کرتے اور محبوب حقیقی کے حُسن لازوال سے بے خود ہو کر دنیا سے منہ پھیر لیتے تھے، یہ دور بھی گذر گیا، دیوتاؤں کو بھولنے والے خدا کو بھی بھول گئے، لیکن فطرت کا تقاضا اب بھی بدستور رہا، انسان کو اپنی زندگی میں ایک خلا نظر آیا اور ایک ایسے رفیق کی خواہش ہوئی جو اس خلا کو پُر کرے، حسن اور عشق کو اپنی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور بیانِ کمال تک پہنچنے کی آرزو نے انہیں چین لینے نہ دیا۔

آرٹ کو بھی یہ تین دور دیکھنے پڑے، کائناتی دور میں دیوی دیوتا برسرِ اقتدار تھے، پھر آرٹ کو مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم صدیقہ کے تقدس کے سامنے سر جھکانا پڑا،

اس کے بعد اگرچہ عورت کے ہاتھ میں نہ دیویوں کی طرح نظامِ عالم کی زمامِ اختیار رہی نہ اسے مریم صدیقہ کی طرح سرچشمۂ نجات سمجھا جاتا تھا، لیکن اس نے دلوں کی ملکہ کی حیثیت سے بدستور حکمرانی کی۔

(۱)

یونان اور روما کے بت کدے

عورت کائنات کے حسن کی آئینہ دار ہے اور اس کی پر اسرار فطرت قدرت کی نیرنگیوں کا بہترین مظہر ہے، اس لئے مصور نے دنیا کی رعنائیوں اور غیبی طاقتوں کے کارناموں کی تشکیل کے لئے عورت ہی کو منتخب کیا ہے، یونان، روما اور ہندوستان میں زندگی کے کئی شعبوں کی نگرانی دیویوں سے منسوب تھی، ہندوستان میں کس نے پاربتی، لکشمی اور کالی دیوی کا نام نہیں سنا! یونان اور روما ان کے مقابلے میں جونو، اور دوسری دیویوں کے نام پیش کر سکتے ہیں۔

قدیم زمانہ میں انسان قدرتی مناظر سے متاثر ہو کر ان کے اسباب و علل سے واقف ہونے کی کوشش کرتا تھا، اکثر اوقات تخیل عقل سے پیش پیش ہوتا تھا، عقل تخیل کے مقابلہ میں نہ تیز رو ثابت ہوتی ہے نہ وہ اتنی جاذب ہے کہ تخیل کے مقابلہ میں اس کے فیصلوں کو منظور کیا جائے، اس لئے مشاہدہ قدرت میں پہلے تخیل ہی میدان میں آتا ہے اور اسی کی حکمرانی ہوتی ہے، انسان مناظر قدرت اور کاروبارِ عالم کے صحیح حالات سے آگاہ نہیں ہوتا تو پوشیدہ قوتوں کو دیوتاؤں اور

دیویوں کی شکل میں تصور کرتا ہے رفتہ رفتہ جب عقل حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھاتی ہے تو انسان اپنے تخیل کی تخلیق سے اتنا مانوس ہو چکتا ہے کہ وہ عقل کے انکشافات پر نظر رکھتے ہوئے بھی دیوی دیوتاؤں سے اپنے تعلقات میں فرق آنے نہیں دیتا۔

یونان اور روما کی صنمیات کو تخیل کا بہترین سرمایہ کہنا نامناسب نہ ہوگا، اگر کسی کو ایک جامع اور ہوش فریب فلسفۂ زندگی مطلوب ہو تو اس کے لیئے اس سے بہتر کوئی طریق نہیں کہ یونان اور روما کے بتکدوں کو جی بھر کر دیکھے، اسے ایک ایسی قوم کے مذہب سے واقفیت ہو جائے گی جس نے زندگی کا پورا پورا لطف اٹھانا چاہا اور ہر بات میں حسن پیدا کیا جس نے اسرار قدرت کو ایک ڈرامے کی صورت میں سمجھنا چاہا، اور دیوی دیوتاؤں کو اس عالمگیر ڈرامے کے کردار فرض کیا۔

۱۔ پیدائش اور شادی زندگی کے ڈرامے کے اہم مناظر ہیں، ان کی ذمہ دار آسمانی ملکہ جونو مقرر کی گئی ہے، وہ ایک دراز سن ملکہ تصور کی گئی ہے، اس کے ساتھ آرگس نام ایک مور ہوتا ہے، جو مسرت کا مظہر ہے جونو کی صورت سے جلال ٹپکتا ہے، اس کے اعزاز میں روما میں ایک میلہ ہوا کرتا تھا اور عورتیں اس سے حصول اولاد کے لیئے دعائیں کیا کرتی تھیں۔

۲۔ زندگی کے ڈرامہ میں علم کی اہمیت کو اس طرح ظاہر کیا گیا تھا کہ علم کو ایک دیوی تصور کیا گیا اور اس کا نام مائی نروا تجویز کیا گیا، اس کے ہاتھ میں ایک برچھی یا سوت کی انٹی ہوتی تھی، اور اس کے سر پر ایک خود، اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ جس پر مہربان ہوتی ہے اس کے لیئے سب کچھ کر گزرتی ہے اور اس کی کوئی خواہش رد نہیں ہوتی، ایتھنز والوں نے مائی نروا کے اعزاز میں ایک شاندار مندر تعمیر کیا تھا اور اس میں اس کا ایک سونے کا بت نصب کیا تھا۔

۳۔ گھر بنا کر رہنا مہذب قوموں کا امتیازی نشان ہے، اس اصول کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ایک دیوی کا نام وسٹا رکھا ہے جس کا مطلب ہے گھر بار۔ اس دیوی کے اعزاز میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی تھی، روما میں اس کا ایک مندر تھا جس میں دو دوشیزہ لڑکیاں اس کی خدمت پہ مامور تھیں، اگر کسی کی غفلت سے مندر میں آگ بجھ جاتی تھی تو اس کی سزا موت ہوتی تھی، وسٹا کا مجسمہ ہاتھ میں ایک مشعل اٹھائے ہوتا تھا۔

۴۔ سیر و شکار کا لطف اور فطرت آزاد کی شوکت دکھانا ایک دیوی ڈائنا کا کام تھا، ڈائنا کے ذمے آسمان زمین اور زیریں دنیا کی نگرانی کے فرائض تھے، زمین پر وہ آکر جنگلوں میں شکار کھیلا کرتی تھی اور دوشیزہ لڑکیوں کی حفاظت کیا کرتی تھی، آسمان پر وہ چاند کی دیوی بن کر نوجوان عورتوں کی نگرانی کیا کرتی تھی، اس تمثیل کا یہ مطلب ہے کہ یونانیوں کے خیال میں چاند کا عورت کی فطرت پر بہت اثر ہوتا ہے، ڈائنا تصویروں میں ہمیشہ شکاری لباس میں کتوں کو ساتھ لئے نظر آتی ہے آج کل بہت سی مغربی عورتیں ڈائنا کی پیروی کرتی نظر آتی ہیں، شعراء ڈائنا کو کبوتروں کے پروں پر سوار تصور کرتے ہیں۔

۵۔ یونانی زندگی کا ایک اہم حصہ زراعت میں بسر ہوتا تھا، اس خیال کو یونانی آرٹ نے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "سیرز" ایک دیوی ہے جو انہیں زراعت سکھاتی ہے اور اناج پکانے میں مدد دیتی ہے، زراعت کی اہمیت دکھانے کے لئے انھوں نے یہ افسانہ بنا لیا ہے کہ دنیائے زیریں کا بادشاہ پلوٹو اس کی لڑکی "پراسرپینا" کو اٹھا کر لے گیا، غم نصیب ماں نے بیٹی کے غم میں زراعت کا شغل ترک کر دیا، تمام دیوتا اور انسان اس بات پر مجبور ہو گئے کہ دیوی کو اس کی لڑکی واپس دلا کر اس سے التجا کریں کہ وہ انہیں کسی طرح فاقوں سے بچائے "مرو زیلی" اور "لارڈ لٹن" نے اس افسانہ کو سامنے رکھ کر دو تصویریں کھینچی ہیں اور یہ کمال دکھایا ہے کہ تصویریں منہ سے بولتی نظر آتی ہیں گویا کہ افسانہ کہہ رہی ہیں "مرو زیلی" کی تصویر میں پراسرپین زیریں دنیا میں مغموم کھڑی ہے، اس کے قلب میں ہیجان نہیں لیکن اسے اپنی بے کسی کا احساس ہے جو طوفان غم سے بیسیوں درجے زیادہ مہلک ہے، وہ زیریں دنیا کو بھولنا چاہتی ہے اس کے خیالات ایک دور افتادہ دنیا میں پہنچے ہوئے ہیں، وہ ایک بیابان کی نام نہاد ملکہ ہے، اس کا پیارا وطن اس سے کوسوں دور ہے، وہ اس دنیا میں ہے جہاں سورج کی روشنی بھی پہنچتے پہنچتے سرد پڑ جاتی ہے، اس کے ساتھ پلوٹو کا دیا ہوا ایک انار ہے یعنی ثمر ممنوع، اگر وہ اسے نہ کھاتی، تو ہمیشہ کے لیئے آزاد ہو جاتی، لیکن مزدرت نے اسے مجبور اور ہمیشہ کے لئے بے بس کر دیا ہے "لارڈ لٹن" کی تصویر میں پلوٹو پراسرپین کو اس کی ماں کے حوالے کرتا نظر آتا ہے پراسرپین بے تابی سے اپنی ماں کی کھلی آغوش میں لپکنا چاہتی ہے،

۶۔ یونانی امن کی برکات سے بخوبی واقف تھے، اور اس کے خواہاں

رہتے تھے، یونان میں ایک امن و انصاف کی دیوی کی بھی پوجا کی جاتی تھی اس دیوی کے ایک ہاتھ میں میزانِ عدل ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی تھی جس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتی۔

۷۔ خوش مذاقی اور تفریح بھی زندگی کی بڑی نعمتیں ہیں جو قسمت سے میسر آتی ہیں، یونانیوں کے خیال میں یہ تین دیویوں کے فیض سے حاصل ہوتی تھیں، تصویروں میں وہ تین سہیلیاں بن کر نظر آتی ہیں۔ جو ایک دوسری کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے۔ مستانہ وار خرام ناز کرتی ہیں۔

۸۔ فنونِ لطیفہ کی ضرورت جس قدر ایک قوم کو ہوتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، یونانیوں کے نظریۂ زندگی میں اس خیال کو کافی وقعت حاصل ہے، اور انہوں نے فنونِ لطیفہ کے لئے ایک لطیف ذریعہ اظہار پسند کیا ہے، ان کی صنمیات میں نو دیویاں ہیں جن سے مراد فنونِ لطیفہ کی نو اقسام ہیں، تاریخ کی دیوی ایک کتاب پڑھتی ہے۔ موسیقی کی دیوی بانسری بجاتی نظر آتی ہے، ایک اور دیوی سروری ڈرامے کو دیکھ کر حظ اٹھاتی ہے، ایک ایسی دیوی بھی ہے جو تلوار اٹھائے بھویں چڑھائے۔ المیہ ڈرامے دکھلاتی ہے، رقص کی دیوی حسین، نوجوان اور شگفتہ مزاج ہے، عاشقانہ شاعری سکھانے کے لئے ایک دیوی بالوں میں پھول گوندھے مسکراتی ہوئی آتی ہے، الہامی شاعری کی دیوی متین نظر آتی ہے، نجوم کی دیوی تاروں بھرا لباس پہنے، اور ہاتھ میں کرہ اٹھائے آتی ہے، رزمیہ شاعری کی دیوی ایک سرو قد حسینہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، اس کے سر پر سونے کا ایک حلقہ ہوتا ہے فنونِ لطیفہ کی نمائش اس سے زیادہ پرشوکت نہیں ہو سکتی۔

۹۔ وقت اور تقدیر کی عالمگیری کا احساس کسے نہیں ہوتا لیکن اس حقیقت کے اظہار کے لئے جو طریقہ یونانیوں نے اختیار کیا اس سے ان کی شاعرانہ ذہنیت کا ثبوت ملتا ہے، تقدیر تین بہنوں کی شکل میں سامنے آتی ہے، ایک کے ہاتھ میں رشتۂ زندگی ہے دوسری اسے کھولتی جاتی ہے، تیسری اسے قطع کر دیتی ہے،

۱۰۔ زندگی کے اس عظیم الشان ڈرامے میں جسے یونانی تخیل نے اس اہتمام سے پیش کیا ہے، ایک اور نسوانی کردار ہے جسے اس ڈرامے کی روح و رواں کہا جا سکتا ہے، وینس[1] ملکۂ حسن یونانی دیویوں میں شہرت اور مقبولیت کے لحاظ سے اپنی مثال نہیں رکھتی، اسے

[1] زہرہ

یونانی تخیل کا شاہکار کہنا چاہئیے، کبھی وہ مسکرا کر دلوں پر بجلی گراتی ہے کبھی وہ سمندر کی سطح پر ابھرتی نظر آتی ہے، کبھی وہ اپنی گاڑی میں راج ہنس جوت کر سیر کو نکلتی ہے، وینس کی اہمیت کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک شکستہ بت جو پیرس کے سب سے بڑے عجائب گھر میں رکھا ہے، دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی تسلیم کیا گیا ہے،

وینس کے مجسمہ کے بازو کٹ گئے ہیں لیکن اس حادثہ کے بعد بھی آرٹ کا کوئی بڑے سے بڑا شاہ کار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس کے اعضا کا تناسب، اس کا رعبِ حسن، اس کا جاہ و جلال، اس کے جسم کا دلفریب گداز، اور پھر ایک نامعلوم وصف جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ بات ہے جو عورت سے کسی بلند تر ہستی کا حصہ ہے، یہ تمام امور اس کے لاجواب ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب وینس کا مندر پجاریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا، گرفتاران محبت کے ارمان بھرے دلوں سے نکلی ہوئی دعائیں ایک عجیب سماں پیدا کر دیتی تھیں، مسرت شباب خوش بیان سیفو[2] جوش عشق سے گھبرا کر وینس کے آگے جھک کر دعا کرتی تھی:۔

زنگار رنگ تخت والی، غیر فانی وینس، سب سے بڑے دیوتا کی بیٹی! مجھے بھول نہ جا، مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑ، اے ملکہ میرے دل کو محبت کے داغ سے بچا، اپنے باپ کے آسمانی قصر سے اترنے کی تکلیف فرما، اپنی زریں گاڑی پر سوار ہو کر کبھی ادھر سے بھی گذر، آسمانی چڑیاں تجھے اٹھا کر آسمان پر سے جاتی ہیں، تو آسمان پر سے گذر کر اپنے باپ کے تخت کے پاس پہنچ جاتی ہے اور تجھے خلا کی آگ ضرر نہیں پہنچاتی۔ شکر ہے تیری سواری ادھر سے بھی گذری تھی اور تو نے میری طرف دیکھ کر مسکرا کر مجھے عزت بخشی، جب میں نے تجھ سے دعا کی تو تو نے مجھ سے پوچھا کہ کس بات نے تجھے اتنا بے قرار کر دیا! تو کسے اپنی آغوش میں لینا چاہتی ہے "سیفو" تجھے کون ستاتا ہے، اے دیوی اب پھر آ، محبت کی ٹیس میرے دل میں اٹھ رہی ہے، آ مجھے قرار بخش، جس کے لئے میں مضطرب ہوں وہ تمنا پوری کر۔

(۲) مسیحیت اور آرٹ

دیویوں کا زمانہ گذر گیا، اب کوئی سیفو نہ رہی، جو اپنا پُر ارمان دل کھول کر وینس کے سامنے رکھ دے اور رو رو کر اس سے وصل

[2] یونانی شاعرہ

کی دعائیں مانگے حسن پرستی جو دیوتاؤں کی تخلیق کا باعث تھی۔ اب ان کے اقتدار کے لئے سنگ راہ بن گئی مصوروں کا بت پرستی سے اسی حد تک تعلق تھا، جتنا آرٹ کے لئے ضروری تھا، انھوں نے دیویوں اور دیوتاؤں سے استمداد کرنا ترک کر دیا اور ان کی آسمانی طاقتوں کے منکر ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اور آرٹ کی علیحدگی سے آرٹ کی روح جاتی رہی اور بت تراشی کی صنعت کا خاتمہ ہو گیا۔

عیسائیت کی اشاعت نے بھی آرٹ پر ایک کاری ضرب لگائی، جب روم ۃ الکبریٰ پر مسیحیت کا پرچم لہرانے لگا۔ اور جگہ جگہ گرجے تعمیر ہونے لگے تو بت کدے ویران ہو گئے، جس طرح آرٹ نے یونان میں مذہب کا خاتمہ کیا تھا، اسی طرح مذہب نے روما میں آرٹ کو ناکارہ کر دیا لیکن خوش قسمتی سے مسیحی یورپ میں آرٹ کا زوال ایک نئے دور کا پیش خیمہ بن گیا، یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ آرٹ مذہب میں جان نہیں ڈال سکتا لیکن مذہب آرٹ کو زندہ کر سکتا ہے، آرٹ مذہب کے نشر و اشاعت کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن مذہب آرٹ کی جان ہے، مذہب روح ہے اور آرٹ جسم، جسم روح کو حرکت میں نہیں لا سکتا، لیکن روح جسم سے حیرت انگیز کام لے سکتی ہے۔

عیسائیت کے عروج کے بعد کچھ عرصہ تک تو مصوری کس مپرسی کی حالت میں رہی لیکن اس نے رفتہ رفتہ عبادت کا درجہ اختیار کر لیا مسیحؑ کی ولادت کا حیرت انگیز واقعہ آرٹ کے لئے ایک مناسب موضوع ثابت ہوا اور آرٹ میں اس واقعہ کی تشکیل بلیغ خطبات سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوئی، حضرت مریمؑ کی پاک دامنی، اور ان کا تقدس جس کے طفیل انہیں دنیا کے ایک بڑے نجات دہندہ کی ماں بننے کا شرف حاصل ہوا آرٹ کے مردہ جسم میں جان ڈالنے کے لئے کافی تھے، یورپ کے طول و عرض میں مقدس ماں اور مقدس بچے کی تصویریں پھیل گئیں۔ بیسیوں مصوروں کی عمر کا حاصل یہی فن تھا۔ رفیئلؔ کو انہی تصویروں نے زندۂ جاوید بنا دیا تمام بڑے بڑے مصوروں نے خواہ ان کا مدعار زندگی کچھ بھی تھا میڈونا کی تصویر بنانے میں اپنا کمال ضرور دکھایا ہے، مائیکل اینجلو سنگتراشی اور معمار ہونے کے علاوہ میڈونا کا مصور بھی تھا "لیونارڈو دے ونچی" انجنیر، سائنس کا ماہر اور ریاضی دان ہونے کے علاوہ میڈونا کی تصویریں بھی بنایا کرتا تھا اگرجاؤں میں تو لوگوں کی عمریں ہی اسی بات کے لئے وقف تھیں۔

جب میڈونا کی تصویریں بنانے کا رواج ہو گیا تو اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مصور جسمانی خوبصورتی کے علاوہ روحانی جذبات کا بھی مطالعہ کرنے لگے اور اپنی تصاویر میں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ میڈونا کی ذات میں مصور جسم اور روح کے کمالات جمع کرنا چاہتے تھے، اور اس لئے وہ اپنی زندگی میں ان باتوں کو بغور دیکھتے رہتے تھے، اور اپنی تصاویر میں اپنے مشاہدات کے اثرات ضرور دکھاتے تھے، اس سے یہ تو ہوا کہ میڈونا ایک یہودی النسل خاتون کے بجائے ایک خوش رنگ، زریں بالوں والی مغربی لڑکی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی بلند نظری، اس کا انکسار اور اس کی محبت کے جذبات کامیابی سے ظاہر کئے گئے ہیں، میڈونا کا پاک حسن، اس کی متانت، اس کی حیا سے جھکی ہوئی نظریں اور اس کی خود فراموشی جس کے ساتھ ہی ماں کی مسرت ملی ہوئی ہے، بصیرت کے لئے سبق آموز منظر پیش کرتی ہیں، پہلے پہل مصور صرف مذہبی جوش سے مخمور ہو کر میڈونا کی تصویر بنایا کرتے تھے، پھر جب میڈونا کی تصویر بنانا رواج ہو گیا۔ اور مذہبی جذبات کے ساتھ تصنع اور اظہار کمال کی خواہش بھی شامل ہو گئی تو تصاویر کا معیار بہت گر گیا، لوگ میڈونا کا تصور دل میں جمانے کے بجائے اپنی آشناؤں کو سامنے بٹھا کر تصویر بنانے لگے۔ اور چونکہ یہ عورتیں اخلاق باختہ ہوتی تھیں اس لئے مصور کو میڈونا کے روحانی اوصاف کے اظہار میں کامیابی نہ ہوتی تھی۔

(۳) دختران فرنگ

لوگ میڈونا کی آڑ میں اپنی آشناؤں کی تصویریں بناتے رہے، رفتہ رفتہ یہ پردہ بھی اٹھ گیا، اور مصور عام عورتوں کی تصاویر بھی اسی اہتمام سے بنانے لگے جس سے وہ میڈونا کے آسمانی حسن کی نمائش کیا کرتے تھے احترام کی جگہ مصور کے دل میں محبت کے جذبات موج زن ہونے لگے، اور وہ عورت سے صرف اس کی ذات کی وجہ سے دلچسپی لینے لگے اب عورت کی قدر اس کی مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کی نفسیاتی خصوصیات کی وجہ سے ہونے لگی، مصور پہلے رہنمایان مذہب اور اکابر کو خوش کرنے کے لئے تصویریں بنایا کرتے تھے مگر اب انہوں نے اپنی تسلی کے لئے اپنا موقلم اٹھایا۔

پیرس کے عجائب گھر میں ایک تصویر ہے جس سے لوگ اتنے

متاثر ہوتے ہیں کہ بعض تو جوش میں آکر خودکشی کر لیتے ہیں، یہ وینس دیوی یا کسی اور دیوی کی تصویر نہیں، نہ اُسے میڈونا سے کچھ مشابہت ہے۔

یہ ایک اطالوی عورت "مونالزا" کی تصویر ہے۔ جس نے چار سال تک لیونارڈو جیسے باکمال مصور کو چین نہ لینے دیا۔ تصویر اگرچہ دنیا کے بہترین شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے، لیکن اس کی تاریخی حیثیت سے اس کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس پراسرار عورت نے اپنے ساحرانہ تبسم سے مصور کے دل کو اسیر کیا اور اُسے یہ دلکش مجسمہ بنانے پر مائل کیا، جس نے ایک زمانہ کو تحیر میں ڈال رکھا ہے، مصور کی روح اس عورت کے پراسرار تبسم میں مقید ہے، ۱۵۰۰ء میں "لیونارڈو" کی نظر "مونالزا" پر پڑی اور وہ اس کی تمام توجہات کا مرکز بن گئی، شہر میں "مونالزا" کے حسن کی دھوم مچی ہوئی تھی، "لیونارڈو" بھی حسن کا قدردان تھا۔ اور اس کی تصویر کھینچنے کا خواہشمند تھا، "مونالزا" کا بوڑھا اور تیز مزاج شوہر بمشکل اس بات پر رضامند ہو گیا "مونالزا" کے زیورات کو اس کا شوہر گرو ڈال چکا تھا۔ اور اس کے دل پر اپنی چار سال کی لڑکی کا داغ بھی تازہ تھا اور وہ سیاہ لباس پہنتی تھی، "لیونارڈو" نے اس کے لبوں پر تبسم پیدا کرنے کے لئے گانے بجانے والوں اور مسخروں کی خدمات حاصل کیں، یہ معنی خیز اور دلفریب تبسم انہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

یہ تصویر "لیونارڈو" کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہے، اور اس کے تخیل، اس کی زندہ دلی، اس کے کمالِ فن اور محنت کی دلیل ہے اس تصویر میں اس کے تمام ہنر نظر آتے ہیں اور خود اس کا اپنا عکس بھی، یہ اس کی علمی قابلیت، اس کی نفسیاتی قوتِ مشاہدہ اور اس کی طبیعت کے تعجب خیز سکون کی آئینہ دار ہے، یوں تو اور کئی تصویریں بھی اصل سے ہو بہو ملتی ہیں لیکن اس میں جسمانی دلکشی کے علاوہ ذہانت کا اظہار بھی ہے رنگ کا احساس دیکھنے والے کو ہوتا ہی نہیں کیونکہ وہ رنگ عورت کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے جسم ہی کا نہیں بلکہ اس کی روح کا بھی ایک حصہ "مونالزا" کی تصویر بار بار دیکھیے، ایسا معلوم ہو گا کہ آپ مصور کی تاریخِ زندگی کے ورق الٹ رہے ہیں،

"لیونارڈو" کے مشہور ہمعصر "مائیکل انجلو" کی زندگی کا ایک دلچسپ باب بھی ایک عورت کی زندگی سے متعلق ہے، اس باکمال مصور کے رویہ سے اس کے تمام رفقا نالاں رہتے تھے، "مائیکل انجلو" حد درجہ بدمزاج سمجھا جاتا تھا، سب اس کے چڑچڑے پن سے تنگ آ گئے تھے لیکن ایک عورت نے اس کا مزاج بدل کر اسے ایک باذوق شاعر بنا دیا، آخر عمر میں ایک شریف النسب بیوہ "وٹوریا کلونا" سے اسے ملنے کا اتفاق ہوا اور وہ "وٹوریا" کے اخلاق کا گرویدہ ہو گیا۔ "وٹوریا" کے ساتھ شعر و سخن میں وقت گزارنا اس کا روزانہ معمول ہو گیا، بوڑھا مصور اس کی مجلس میں اپنا چڑچڑا پن اور اپنی کاروباری رقابتیں بھول کر شعر اور مصوری کے نکات سلجھاتا تھا،

"وٹوریا" حسین نہ تھی، لوگ اسے بدصورت بھی سمجھتے ہوں، یہ بھی ممکن ہے۔ اس کا چہرہ پچکا ہوا تھا: ناک لمبی اور آگے کو بڑھی ہوئی تھی ابرو تنے ہوئے اور ٹھوڑی بڑھی ہوئی لیکن "مائیکل انجلو" اس کے حسنِ سیرت پر مائل تھا، اس میں ایک روحانی کشش تھی جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا، اس کے خطوط پاکیزہ جذبات سے لبریز ہوا کرتے تھے، "مائیکل انجلو" اسے اپنی مذہبی تصویریں بھیجا کرتا تھا اور اس کی کئی نظمیں "وٹوریا" کے نام سے معنون ہیں،

"لیونارڈو" اور "مائیکل انجلو" کے بعد ہم آرٹ کی تاریخ کے چند تاریک اوراق پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں، "مائیکل انجلو" اور "لیونارڈو" کے حالات سے ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے، کہ عورت نے ان کی زندگی کو خوشگوار بنا دیا، لیکن اب ہم چند بدقسمت مصوروں کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہتے جن کے آرٹ میں عورت کا وجود حسرت و آلام کے جذبات کو بیدار کرتا ہے فرانس میں "گرز" ایک مشہور مصور گذرا ہے، جس کی تصویریں معصومیت کی آئینہ دار ہیں، اس کی تصویروں میں بار بار ایک ہی لڑکی نظر آتی ہے جس کی سادگی اور بھولے پن کی بے اختیار تعریف کرنی پڑتی ہے، لیکن ہمیں اس لڑکی کے حالات زندگی چونکا دیتے ہیں اور افسوس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا، یہ بظاہر سیدھی سادی لڑکی وہ تھی جسے مصور نے خاک مذلت سے اٹھا کر اپنی رفیقۂ حیات بنایا اور اس غلطی کی پاداش میں اپنی زندگی کو تلخ بنا لیا اور اپنے کمال کو نقصان پہنچایا، یہی لڑکی اتنی مکار ثابت ہوئی کہ مصور کو تمام عمر کھچتنا پڑا،

"جارج رومنی"، ایک انگریزی مصور کی زندگی بھی بہت حسرت ناک ہے، وہ ایک دفعہ بیمار ہوا، ایک غریب لڑکی نے اس تندہی سے اس کی تیمارداری کی کہ "رومنی" نے خوش ہو کر اس سے شادی کر لی۔ مگر جب "رومنی" مشہور ہو گیا تو اس نے ایک ساحرہ "لیڈی ہملٹن" کے دام میں پھنس کر اپنی

بیوی کو خیرباد کہہ دی، کئی سال گذر گئے اور زمانے نے رنگ بدلا "ردمنی" برباد اور بیمار ہو کر پھر اپنی بیوی کے قدموں پر گر پڑا اور مرتے دم تک اس کے آگے سر اونچا نہ کر سکا۔

ردمنی کا زمانہ "پِٹ" اور "نیلسن" کا زمانہ تھا لیکن اسے "لیڈی ہیملٹن" کا زمانہ کہنا زیادہ موزوں ہے، کیونکہ "نیلسن" جیسے غیور دل، بیر ابھی اس کے آگے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ وہ دلوں کی ملکہ تھی۔ "ردمنی" ایک طرف رہا، "نیلسن" بھی اس پر دل و جان سے فریفتہ تھا، اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ "لیڈی ہیملٹن" تک اس کا سلام پہنچا دیا جائے،

"لیڈی ہیملٹن" انگلستان کے ایک سفیر کی بیوی تھی، اس نے اپنے بڈھے شوہر سے آنکھیں پھیر کر اس کے مست شباب بھانجے سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور اس کے ساتھ دادِ عشرت دیتی رہی، لارڈ ہیملٹن نے اپنے بھانجے کو دولت کا لالچ دے کر اسے اس پری کے دامِ محبت سے نکالا، اس دن سے لیڈی ہیملٹن نے قسم کھائی کہ وہ ایک مرد کی بے وفائی کی پاداش میں ہزار مرد دل کو تیرِ نگاہ کا نشانہ بنائے گی، غریب "ردمنی" بھی ایسا ہی فریب خوردہ تھا، اس نے "لیڈی ہیملٹن" کی کئی تصویریں بنائیں اور گویا ان پر اپنا تمام کمال صرف کر دیا۔ وہ اُسے اس کے حسنِ آتشیں کی شعلہ باری اور اس کے شباب کی سحر آفرینی اور مستی کے ساتھ پیش کرتا ہے تصویریں کیا ہیں صحرائے محبت میں چند لالے کھلے ہوئے ہیں "ردمنی" کہا کرتا تھا کہ میرا کمالِ فن "لیڈی ہیملٹن" کا فیض ہے لیکن نقاد کہتے ہیں کہ وہ صرف اس کے نقائص کی ذمہ دار ہے۔

"ردمنی" کی طرح "روزیٹی" کی زندگی بھی بہت دردناک ہے۔ لیکن ان میں یہ فرق ہے کہ "ردمنی" کو دیکھ کر ہمیں افسوس تو ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی، برخلاف اس کے "روزیٹی" کی زندگی سے ہمیں افسوس ہی نہیں ہوتا بلکہ ہم اس کے حوصلے، اس کی بلند نظری اور اس کی وفا کی تعریف کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں، "روزیٹی" ابتدا ہی سے اپنے نامور ہم وطن "ڈانٹے" کی پیروی کرنا چاہتا تھا اور اس کی طرح ایک دلچسپ شخصیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ "ڈانٹے" نے جو خیالات نظم میں اپنی محبوبہ "بیٹرس" کے متعلق ظاہر کئے وہی "روزیٹی" بھی اپنی تصاویر میں ظاہر کرنا چاہتا تھا، سوء اتفاق سے اس نے جس لڑکی کو اپنے لئے "بیٹرس" کی جگہ منتخب کیا تھا وہ بھی "بیٹرس" کی طرح جواں موت مر گئی گویا "ڈانٹے" اور "روزیٹی" کی مشابہت مکمل ہو گئی "روزیٹی" نے اپنی بیوی کے مرتے ہی "بیٹرس" کی موت کی تصویر شروع کی اور گویا واقعیت کو انتہا تک پہنچا دیا، اس نے اپنا دیوان بھی اپنی بیوی کے ساتھ دفن کر دیا، لیکن دو سال کے بعد دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اسے نکال کر شائع کیا۔

"روزیٹی" کی تصویریں اس کے جذباتِ محبت کی ترجمانی کرتی ہیں، اس کی بہترین تصویریں وہ ہیں جو اس نے اپنی مرحوم بیوی کی یاد میں بنائی ہیں۔ وہ منہ سے بولتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، گمان ہوتا ہے کہ کیا محبت موت کے بعد بھی کامیاب ہو سکتی ہے، انتظار کی زحمت اور عشق کا صلہ بھی آخر کچھ ہے، کیا ٹوٹے ہوئے دل کسی اور دنیا میں بھی جڑ سکتے ہیں! کون ہے جو ان تصویروں کو دیکھ کر ان سوالات کا جواب نفی میں دے گا!

اس کی ایک مشہور تصویر "مرحومہ" ہے، اسی موضوع پر اس کی ایک نظم اس کے دل کی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے، "مرحومہ جنت کی سنہری سلاخوں والی کھڑکی سے جھانکتی ہے، اس کی آنکھوں کی سیاہی شام کے سایوں سے بھی گہری ہے، اس کے بالوں میں سات ستارے ہیں اور اس کے ہاتھ میں تین پھول۔ وہ اپنے عاشق کا انتظار کر رہی ہے جو ابھی بقیدِ حیات ہے، اور اس لمحے کے لئے مضطرب ہے۔ جب موت اسے نویدِ وصل پہنچائے گی، وہ وصال بعدِ موت کا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے لانا چاہتی ہے "شاید وہ سہما ہوا ہوگا، اور خاموش ہوگا، تب میں اپنا گال اس کے گال پر رکھ دوں گی اور اپنی محبت کا ذکر کر دوں گی، اور گھبراؤں گی نہیں"، پھر کھڑکی سے جھانکتی ہے، فرشتے اس کے شوہر کو لاتے ہیں، نور کی ایک شعاع نظر آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے، اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی راہ کون سی ہے اور اس کے شوہر کی کون سی، پھر وہ بے بسی کے عالم میں سلاخوں کے گرد اپنا بازو ڈال دیتی ہے اور آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر رونے لگتی ہے،

محبت "روزیٹی" کے لئے ایک دلکش خواب نہ تھی بلکہ زندگی کی دل ہلا دینے والی حقیقت تھی، وہ محبت کے سرد و گرم دیکھ چکا تھا، پھر بھی وہ یہی چاہتا تھا کہ دردِ الفت کو جاوداں بنا دے، اس کا دل ایک خمار بال میں بندھا ہوا تھا، اس کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ اس حلقہ کو جس قدر زریں اور نظر فریب بنا سکے، بنا دے، اسی

مقصد کے حصول کے لیئے اس نے اپنے تمام کمالات وقف کر دیئے اور آج اسی وجہ سے انگلستان اس کی ذات پر نازاں ہے،

"ڈوذینی" کا جو رتبہ انگلستان میں ہے وہی وسلر کا امریکہ میں ہے۔ وسلر جس کی سویں برسی حال ہی میں منائی گئی ہے، دو تصویروں کی وجہ سے بہت مشہور ہے ایک اس کی ماں کی ہے، اور دوسری ایک معصوم لڑکی کی ہے جو آئینے کے سامنے کھڑی ہے جو وسلر ایک حسینہ کی زندگی کا منظر پیش کرنا چاہتا ہے، پہلے وہ بے دردی سے اپنے چاہنے والوں کے جذبات سے کھیلتی رہی، اس نے ان کی محبت کی قدر نہ کی، لیکن اب وہ تنہا ہے، اس کا شباب ڈھل رہا ہے اور عاشق کا وجود اس کے لئے ایک نایاب جنس بن گیا ہے، اس کس مپرسی کے عالم میں وہ آئینہ کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور عشرتِ ماضی کی یاد آآکر اس کے دل پر بجلی گراتی ہے،

انگریزی شاعر سوئنبرن نے ایک نظم میں اس مغموم حسینہ کے منازل زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، ہم ذیل میں اس نظم کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، تصویر اور نظم کی ہم آہنگی دیکھ کر قارئین کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔ نظم

میری دنیائے طرب میں ہے خزاں آئی ہوئی
ہر کلی گلزارِ عشرت کی ہے مرجھائی ہوئی
تیز پا گھڑیاں مسرت کی، وہ لمحاتِ سرور
میری خوشیوں کا وہ بانکا کارواں جاتا ہے دور
وہ سبک رو، گرم رو، الفت کا دریائے خوش آب
جس کی موجیں بحر کو دیتی تھیں درسِ اضطراب،
دیکھنا! اے چشمِ عبرت آج وہ بھی سرد ہے
کیا غضب ہے دامن دریا میں بھی اب گرد ہے
رو رہا ہے خاک سر پر ڈال کر دیوانہ وار
جس کے دامن کو کبھی چھو بھی نہ سکتا تھا غبار
سطحِ دریا پر ہیں وہ معصوم سی کچھ دیویاں
میری مخمورِ محبت روح کا خوابِ جواں،
عشرتِ ماضی کے افسانے سناتی ہیں مجھے
سرد آہیں بھر کے اشکِ خوں رلاتی ہیں مجھے
میری امیدیں کھڑی ہیں ڈوب مرنے کے لیئے
میں یہاں ہوں آخری اک آہ بھرنے کے لیئے

(۴) بتانِ مشرق

ہم ابھی تک مغرب کے بت کدوں کی سیر کرتے رہے ہیں اب جی چاہتا ہے کہ مشرق کے نگار خانے کو بھی ایک نظر دیکھ لیں ہم ایسے شخص کی مثال اپنے اوپر عاید نہیں کرانا چاہتے جو تمام عمر حسن رہگذر کے نظارہ سے جی پرچاتا رہا۔ اور اپنی رونق خانہ کا خیال تک نہ کیا، نگارستانِ چین، نقش ارژنگ اور بتانِ ہند کی دھوم تمام دنیا میں مچی ہوئی ہے، ان سے بے خبری ظاہر کرنا کوتاہ نظری کا ثبوت دینا ہوگا، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، اگرچہ مانی، نگارستانِ چین، اور سحر بابل کے قصے گھر گھر پھیلے ہوئے ہیں لیکن مشرق کے پاس ان کے نام کے سوا کچھ نہیں رہا جس پر ناز کرے،

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

عرب، بابل اور شام کے بتکدے اسلام کی فاتحانہ یلغار کے سامنے سرنگوں ہو گئے، نگارستانِ چین گذشتہ صدی میں دول یورپ کی حریصانہ یورش کی نذر ہو گیا، پیکن کا شاہی محل جو مشرق کی قدیم تہذیب کا آئینہ دار تھا، گورے سپاہیوں کے ہاتھوں لٹ گیا، مغرب کے مبصر آج تک اس حادثہ کو یاد کر کے کفِ افسوس ملتے ہیں کہ اس طرح دنیا آرٹ کے ایک گنجِ گراں مایہ سے محروم ہو گئی، بتانِ ہند بھی دستِ روزگار کے شاکی ہیں، بت تک ان کے سر و سینہ مجاہدانِ اسلام کی ضربوں کی گواہی دیتے ہیں، لیکن وہ کچھ ایسے سخت جان واقع ہوئے ہیں، کہ محمود جیسے بت شکن بھی ان کے مٹانے میں کامیاب نہیں ہوئے،

مشرق میں جو آرٹ کے شاہ کار زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہے ہیں، ان میں بہزاد اور علی رضا عباسی کی چند تصویریں، بابل کے دو جاریت اور ہندوستان کے مندروں کی کثیر التعداد مورتیاں ہیں، شام و فلسطین کے بت کدے اگرچہ پیوند زمین ہو گئے ہیں، لیکن بت پرستی ان زمینوں میں کچھ ایسی سرایت کر گئی تھی، کہ یہودیت بھی انہیں پاک نہ کر سکی، جب ان کا مذہبی سرمایہ بلادِ یورپ میں منتقل ہو گیا، تو مذہبی داستانیں بھی بتوں کے قالب میں ڈھل کر دنیا کے سامنے آئیں، چونکہ ان کے وجود میں یورپ کی کاریگری کو بھی دخل ہے اس لیئے ہم ان پر سر دست قلم نہیں اٹھا سکتے، اور ان کی بجائے خالص مشرقی صنعت کے نمونوں پر بحث کریں گے،

دورِ جاہلیت میں عرب بت پرستی کا مرکز تھا، ہر دل کے لئے ایک خدا مقرر تھا، ہر قبیلے کا معبود جدا تھا، کعبے میں تین سو ساٹھ بت تھے، دیوتاؤں کے علاوہ فرشتوں کی پرستش بھی کی جاتی تھی، فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں تصور کیا جاتا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی رحمت، تقدس اور خوش قسمتی کو عورت سے منسوب کیا جاتا تھا،

اسلام کے ظہور کے بعد بت پرستی کا یکقلم خاتمہ ہوگیا۔ اور تطہیر کعبہ کے بعد قبیلوں کے خداؤں اور خدا کی بیٹیوں کو کہیں سر چھپانے کو بھی جگہ نہ ملی، یہی حال بابل کا ہوا، بابل ہوس پرستی کی دیوی اشتر کا مرکز تھا، اشتر میں نہ جونو کا وقار ہے، نہ وینس کا پاکیزہ حسن، وہ شیطنت اور ہوس کا ایک ناپاک مجسمہ نظر آتی ہے، اس کے چہرہ سے شرارت ٹپکتی ہے، عیاری، اور ہوس رانی اس کی پیشانی پر رقم ہے، اس کا جسم گناہ کی کیچڑ میں لت پت نظر آتا ہے، ہمیں اس قوم کی عقل پر رونا آتا ہے جو اس شکل و صورت اور اس اخلاق کی دیوی کو پوجتی ہوگی، لیکن یہ ہو نہیں سکتا کہ بابل کی سرزمین میں صرف اشتر کی حکومت ہو، قدرت نے اہلِ بابل کے ذوقِ نظر پر رحم کھا کر ملکہ شباد کو پیدا کیا، بابل کی یہ ساحرہ حُسن و خوبی کا ایک دلفریب مجسمہ تھی، اس کا چہرہ سانولا، اس کے ابرو خمدار، آنکھیں سیاہ، چمکیلی اور بیضوی، ناک ستواں، ہونٹ پتلے، ٹھوڑی چھوٹی اور چہرہ بارونق تھا، زلفیں کوتاہ اور پریشان تھیں، جس طرح دورِ حاضر کی فرنگی عورتوں کی ہوتی ہیں، گلے میں جڑاؤ ہار اور کانوں میں بالے تھے، سر پر سونے کے پتوں کی ایک خوبصورت ٹوپی تھی، ملکہ شباد کے بت کو دیکھ کر کون یقین نہ کرے گا کہ انسان کے مخلوق خداوندوں پر خدا کی مخلوق کو فضیلت حاصل ہے،

شعر و عشق کی سرزمین ایران اس تباہ حالی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں اگرچہ اب نہ اس کا باکمال مصور مانی باقی ہے جس کی استادی کے تمام اہلِ فن قائل تھے اور جس کی یکتائی کا کلمہ پڑھا کرتے تھے، نہ اس کا نقش ارژنگ ہے جس سے ہزاروں داستانیں مزین ہیں، نہ شاپور ہے جس کے ذکر سے شیریں خسرو کی داستانیں رنگین ہیں۔ مگر ایران کبھی حسن و محبت کو فراموش نہیں کرتا، اور آج بھی عشق کے زندۂ جاوید ہونے کا ثبوت دے رہا ہے بہرام گور ایران کے شہرۂ آفاق بادشاہوں میں سے گزرا ہے، وہ ایران کا سب سے بڑا شکاری تھا، اور عشق و شکار کا جو تعلق ہے وہ اہلِ نظر پر ظاہر ہے، ایران کی تین مشہور صنعتوں قالین بافی، کوزہگری اور مصوری میں بہرام گور کے عشق کے شواہد نظر آتے ہیں، بہرام کی ایک کنیز "فتنہ" اس کی منظورِ نظر تھی اور ہمیشہ سیر و شکار میں اس کے ساتھ رہا کرتی تھی، بہرام گور نے ایک دفعہ ایک ہرن کی ٹانگ کو اور اس کے کان کو ایک ہی تیر میں پرو دیا، پہلے ایک ڈھیلے سے ہرن کے کان کا نشانہ کیا، پھر جب ہرن ٹانگ سے کان کو کھجانے لگا تو ایک تیر چھوڑا جو ہرن کی ٹانگ سے نکل کر اس کے کان میں پیوست ہوگیا، بہرام نے اپنی محبوبۂ دلنواز سے اپنے کمال کی داد لینا چاہی، لیکن اس نے سرد مہری سے جواب دیا کہ یہ محض مشق کا نتیجہ ہے، بہرام نے اپنی خفت کو مٹانے کے لئے ایک افسر کو معشوقہ کے قتل پر مامور کیا، "فتنہ" کی منت و زاری سے اس افسر کا دل موم ہوگیا اور وہ اسے اپنے گھر پناہ دینے پر رضامند ہوگیا، انہی دنوں اس افسر کی گائے نے ایک بچھڑا دیا، "فتنہ" روزانہ اسے اٹھا کر سیڑھیوں پر چڑھا کرتی تھی، جوں جوں بچھڑا بڑا ہوتا گیا فتنہ کا حوصلہ بڑھتا گیا، ایک دن بادشاہ کے سامنے وہ بچھڑے کو اٹھا کر ساٹھ سیڑھیوں پر چڑھی، بادشاہ متعجب ہوا، "فتنہ" نقاب اٹھا کر اس کے سامنے آئی اور اسے اپنی بات یاد دلائی کہ مشق سے انسان ہر کمال حاصل کر لیتا ہے، بہرام نے خوش ہو کر اس کی بات تسلیم کر لی اور اپنی گذشتہ غلطی پر تاسف ظاہر کیا، ایرانی تصویروں میں فتنہ بچھڑے کو اٹھائے سیڑھیوں پر چڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

ایرانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک ہی بات کو سو دفعہ دہراتی ہے اور ہر بار اس کا نیا لطف آتا ہے، یوسف زلیخا، وامق عذرا، شیریں خسرو اور لیلیٰ مجنوں کے افسانے کئی بار نظم ہو چکے ہیں، پھر بھی طبیعت نہیں اکتاتی، اسی طرح ایرانی مصور بھی وہی تصویریں بار بار بنائے جاتے ہیں، مگر وہ کبھی طبیعت پر گراں نہیں گذرتیں، بہزاد نے امیر خسرو کی شیریں خسرو کے لئے پرویز کی ایک بزمِ نشاط کی تصویر بنائی، پھر علی رضا عباسی نے اسی موضوع کو سامنے رکھ کر تصویریں بنائیں، غرض داستان ایک ہے کہنے والے کئی ہیں اور لطف یہ ہے کہ نہ کہنے والے تھکتے ہیں نہ سننے والے یہ افسانہ اتنا مقبول ہوا ہے کہ اجنتا کے ایک غار میں بھی شیریں خسرو داد عشرت دیتے نظر آتے ہیں، کہاں ایران کہاں ہندوستان مگر شہرت اسے یہاں بھی لے آئی ہے،

قدیم ہندآرٹ کے خزانوں سے معمور ہے، ہندوستان کو وسعت کے لحاظ سے ایک برِاعظم کہنا چاہیئے، اور اس برِاعظم کے چپہ چپہ میں قدیم

تہذیبوں کے آثار نظر آتے ہیں بہرحال الگ رہا خاص ہندوستان ایک وقت میں تین عالمگیر تہذیبوں کا گہوارہ تھا، ہندو، بدھ اور جین مذہب جو فلسفۂ زندگی کے تین مختلف اور عجیب و غریب نظریئے پیش کرتے ہیں، سراسر آرٹ ہیں، اور ان کا سرمایہ اتنا وسیع ہے کہ تبان ہند کی ایک جھلک دکھانا بھی گستاخی تصور کیا جائے گا، قدیم ہند میں زندگی کا مقصد عبادت سمجھا جاتا تھا، اور عبادت کا ذریعہ آرٹ، اس لئے ہندوستان میں آرٹ کے خزانے اتنے بے شمار اور فراواں ہیں کہ دنیا کا کوئی واحد ملک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اور ہندوستانی آرٹ کو یورپ کے آرٹ پر اسی طرح فوقیت حاصل ہے جس طرح رامائن اور مہا بھارت کو ہومر اور ورجل کی رزمیہ نظموں پر اور مہاتما بدھ کے سوانح حیات کو یونانی صنمیات پر، ہندی تصویروں میں قلبی ہیجان اور طوفانی جذبات کی تشکیل کی گئی ہے یورپ کے آرٹ کا نصب العین سکون ہے۔ ہندوستان میں آرٹ کا مابہ الامتیاز حرکت اور اضطراب ہے، پاربتی ناچتی نظر آتی ہے لکشمی دودھ کے حوض میں اچھل رہی ہے، یا زیورات اور اناج سے لدی ہوئی شاداں و فرحاں جا رہی ہے کوئی شہزادی موت و حیات کی کشمکش میں مضطرب نظر آتی ہے ایک عورت نزع کے عالم میں اپنے شوہر کا منہ حسرت سے تک رہی ہے ایک عورت خوشی میں مست ناقوس پھونک رہی ہے، مایا بدھ کی ولادت کا خواب دیکھ کر بستر سے اچھل پڑتی ہے، کہیں عورتیں راجہ کی تخت نشینی کے موقع پر انسانوں کی قربانی کرتی نظر آتی ہیں اور قربانیوں کو طشت میں لئے نظر آتی ہیں،

یورپی آرٹ تمثیلی ہوتا ہے اور ہندی آرٹ تخیلی اس لئے اس میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے پچاس عورتیں ایک راجہ کے گرد پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس سے راجہ کی خوش قسمتی جتانا مقصود ہوتا ہے۔ یا کسی دیوی کو چھ ہاتھ اور تین سر بنائے ہوتے ہیں جس سے دیوی کی طاقت ظاہر ہوتی ہے، ہندی آرٹ کا اصول یہ ہے کہ آرٹ عورت کے لئے ہے نہ عورت آرٹ کے لئے، اس لئے آرٹ کے اصول عورت کے لئے وضع کئے اور توڑے جا سکتے ہیں،

ہندی آرٹ میں عورت کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو درجہ عورت کو سماج میں حاصل ہے اس سے بھی بلند رتبہ اسے آرٹ میں نصیب ہے، وہ ایک باعشمت رانی، ایک شفیق ماں اور ایک وفادار کنیز کے فرائض حسن و خوبی سے سرانجام دیتی ہے۔ اگر بد ارواح بدھ کو ورغلانے کے لئے عورت کی شکل اختیار کرتی ہیں تو اس کا معزز حلقہ بھی عورتوں کے وجود سے خالی نہیں، اگر وہ بھکارن بن کر بھی آتی ہے تو اس کی شان میں فرق نہیں آتا، ہندی آرٹ نے دیویوں سے بڑھ کر معمولی عورتوں کی تشکیل میں حصہ لیا ہے، اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہندوستان میں ہر عورت واقعی ایک دیوی ہے،

مغلوں کے زمانے میں بھی آرٹ کو بہت فروغ ہوا، قدر شناس بادشاہوں نے مصوروں کے دامن موتیوں سے بھر دیئے، ہند کے طول وعرض سے مصور بادشاہ کے حضور میں اپنا کمال دکھانے آتے تھے اور خاطر خواہ انعام پاتے تھے، بادشاہ کی فیاضی کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا، ایران اور اطالیہ سے مصور کھینچے آتے تھے، اطالوی مصوری کی تصویر سینٹ سیسیلیا جو موسیقی نوازی کے لئے مشہور رہے، کی موت اس بات کا زندہ ثبوت ہے، کئی مصور اسی خدمت پر مامور تھے کہ بادشاہ، ملکہ اور شہزادیوں کی تصویریں کھینچیں، سیر و شکار کے مناظر جشن مسرت اور دربار شاہی ایسے موقعوں پر مصور کو بھی اپنا کمال دکھانا پڑتا تھا، اکثر مغل شہزادیوں کی تصویریں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ شہزادیاں مینا بازار یا سیر و شکار میں بادشاہ کے ساتھ نظر آتی ہیں، ایک موقع پر ملکہ نورجہاں بادشاہ جہانگیر اور شہزادہ خرم کی خاطر و مدارات میں مصروف نظر آتی ہے، مغل عہد کی تصویروں میں عورت ایک شگفتہ پھول کی طرح ہے، وہ خود خوش ہے اور دوسرے اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

"راجپوت سکول" کی تصویروں میں عورت کو سکون کی حالت میں دکھایا جاتا ہے اور اس سکون پر مردہ دلی کا شبہ ہوتا ہے۔ عورت سر جھکائے بیٹھی ہے اور چاروں طرف کنیزیں خدمت کے لئے دست بستہ کھڑی ہیں، گویا ایک مورتی سامنے ہے اور پجارنیں پوجا کر رہی ہیں،

کانگڑہ سکول کی تصویروں میں وجاہت نظر آتی ہے، عورت میں "راجپوت سکول" والی نزاکت کا پتہ نہیں چلتا، لیکن دیکھنے والا ضرور اس کے رعب سے متاثر ہوتا ہے "بنگال سکول" کی تصویروں میں نفاست ہوتی ہے لیکن اعضا کے تناسب کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا، بمبئی پنجاب اور دوسرے سکولوں کے کارنامے بھی قابل قدر ہیں لیکن

ان پر فرداً فرداً بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔

ابانندر ناتھ ٹیگور، ٹھاکر سنگھ اور پروفیسر اللہ بخش کی مساعی کو نگاہِ استحسان سے دیکھا جائے گا، کیونکہ یہ تینوں مصور عورت کی دیہاتی زندگی کے نظر فریب نقشے کھینچا کرتے ہیں، سادگی ہندوستانی تہذیب اور ہندی عورت کا نمایاں وصف ہے۔ خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کے آرٹ کو بہت سراہا بھی گیا ہے اور تضحیک کا نشانہ بنانے کے لیئے بھی اکثر اسی کو منتخب کیا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ چغتائی شاعر ہے جس نے بحر و قافیہ کی جگہ رنگ و خط کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے، اس کی تصویروں میں عورت کی ایک خیالی شکل نظر آتی ہے اور گو وہ اصل کے مطابق نہ بھی ہو لیکن اس میں ایسا حُسن ہوتا ہے کہ مصور اس کے کھینچنے میں حق بجانب ہے، مصور کو بھی وہی آزادی حاصل ہے جو شاعر کو، جس طرح شاعر کے کلام میں معشوقہ کے لیئے لازمی نہیں کہ وہ چکی پیستی یا کوئیں سے پانی نکالتی، یا کشیدہ کاڑھتی یا دودھ دوھتی نظر آئے، بلکہ وہ کبھی ساقی بنتی ہے، کبھی مطربہ، کبھی گل کبھی شمع کبھی قاتلہ، کبھی محمل نشیں، اسی طرح مصور اس کی مبالغہ آمیز تصویریں کھینچے تو اس کے لئے کوئی گرفت نہیں۔ البتہ جس طرح کسی شاعر کے طرزِ سخن کو ہدفِ اعتراض بنانا ایک رواج ہو گیا ہے، اسی طرح کہہ سکتے ہیں کہ چغتائی کامیاب مصور ہے لیکن اپنے انداز کا جیسے ایک شاعر کو کہتے ہیں کہ وہ کامیاب ہے لیکن لکھنؤ سکول کا ہے۔

ہر زمانہ آرٹ سے کچھ نہ کچھ تقاضا کرتا ہے، پہلے زمانہ نے دیویوں کے بت بنوائے، پھر مذہب نے علم دارانِ نجات کے بُت ترشوائے، انقلابِ فرانس کے رہنماؤں نے آزادی، اخوت اور مساوات کے بت ترشوائے، شاہجہان نے ممتاز محل کا مقبرہ بنوایا، دورِ حاضرہ میں سوویٹ روس نے اپنی مفلسی اور باہمت ارادوں کا ایک مجسمہ ڈھونڈنا چاہا اور دیکھا کہ ایک مفلس اور جفاکش عورت اس کی حالت کی مظہر ہے، اس لیئے اس کی تصویریں بنا کر انہیں نوٹوں پر چھپوایا ملک کے ہر کونے میں پہنچائیں، اسی طرح ہندوستان سے بھی زمانہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک ستم زدہ مگر پُر امید عورت کا غیر فانی مجسمہ بنائے جس کا نام ہو مادرِ ہندوستان؟

عطاء اللہ کلیم

رباعیات

ہنگامۂ زیست میں وہم
بیدار کو کیوں نہ وادو سمجھا تھا
کرتی ہوتا تو ضرور دھوکا کھاتا
سپنے تھے جب تک دکھائی بھی پھر دنیا
ہنگامۂ زیست میں وامق [illegible] آیا آتا

سید [illegible] بنات

تخلیق سے کل جہاں کا مقصد تو ہے
[illegible] تو ہے اور منتظر تو ہے
تصدیق سے خفی معروض
اے تصور سے اور جوہر تو ہے
اے خیر محض سے اور [illegible]

[illegible] آزاد انصاری

غزل

تا بہ دامن، وسعتِ چاکِ گریباں کیجئے | بن پڑے تو ہوش میں وحشت کا ساماں کیجئے

چشمِ نظارہ کو خیرہ دل کو حیراں کیجئے | آیئے کچھ ہمّتِ دیدارِ جاناں کیجئے

کیجئے اجزائے ہستی کو پریشاں کیجئے | اور ان کو پھر غبارِ کوئے جاناں کیجئے

اس کو بالیں پر بلانے کا یہ ساماں کیجئے | گُل، دمِ آخر سے شمعِ بزمِ امکاں کیجئے

بن گئیں دل کی کھٹک رگہائے جاں پیش از بہار | آج اس کانٹے کو ہم رنگِ گلستاں کیجئے

اپنی ہستی ہے تو پھر اس کا تصور ہے محال | ہوش کو بربادِ راہِ دشتِ امکاں کیجئے

ہے یہی وسعت عدم کی، ہے یہی حدِّ وجود | یا نہیں کر دیجئے یا ناز سے ہاں کیجئے

ہو گئی ہستیِّ فانی نذرِ کیفِ بے خودی | آیئے اب دوسری ہستی کا ساماں کیجئے

شوق سے ہم کو کمالِ ہمّتِ غم دیجئے | لیکن اس کو کیجئے دل، یا اسے جاں کیجئے

دیجئے بے تاب دل کو درسِ اندازِ سکوں | پہلے اس شعلے کو مشتِ خاکِ انساں کیجئے

ہے ادب کا ترک، یہ ہنگامہ بحثِ وجود | کھویئے اپنے کو تو پھر اس کا ارماں کیجئے

اپنے اندازِ نظر سے دیکھئے بزمِ جہاں | یعنی تابِ دل کو شمعِ سرِ شبستاں کیجئے

جی میں ہے یوں آج سنئے نغمۂ سازِ حیات | دل کو مضرابِ سرِ تارِ رگِ جاں کیجئے

ہے جہاں میں سب سے آگے سرحدِ ادراکِ عشق | یعنی دل کو بے نیازِ کفر و ایماں کیجئے

اس کا جلوہ دیکھ کر اپنے کو بھولا آپ ہی | کس کے آگے آہ اب دعویٰ عرفاں کیجئے

ان کے لب، برقِ تبسم، رنگِ رخ موجِ نشاط | آیئے نظارۂ فصلِ بہاراں کیجئے

گردشیں اب دہر کی کہتی ہیں کیفیؔ! کیا کہوں؟
زندگی بھر شکوۂ جورِ عزیزاں کیجئے

کیفیؔ چریاکوٹی

"للّی کا بیاہ"

پہلا ایکٹ

لاہور میں نیو روڈ پر ایک کوٹھی ہے اس کے ڈرائنگ روم میں جو ولایتی ساز و سامان سے آراستہ ہے جے کشن مدن کو پڑھا رہا ہے۔ جے کشن نے ٹینس کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ریکٹ پاس ہے گویا پڑھانے کے بعد ٹینس کھیلنے کے لئے جانے والا ہے۔

وقت تقریباً چار بجے سہ پہر۔

مدن (پڑھتے پڑھتے باتیں کرنے لگتا ہے) ہمارا ایک ماسٹر ہے۔ کانا سا۔ وہ روز لڑکوں سے پوچھتا رہتا ہے "لڑکو! تمہاری گلی میں کوئی مکان ہے"۔ کل کیدار ابول اٹھا۔ ماسٹر جی مکان تو ہیں مگر خالی کوئی نہیں"۔ ہم سب ہنس پڑے اس پر ماسٹر نے اسے دو چپت لگائے اور بولا شریر لڑکا شرارت کرتا ہے"۔ ہم سب میں تو اس کا نام ٹنڈا پڑ گیا ہے۔

جے کشن۔ تم باتیں بہت کرتے ہو سبق بھی سناؤ گے یا نہیں۔ چلو جلدی کرو۔

مدن۔ اس کا سر تو نرا ٹنڈا ہے۔

جے کشن۔ اگر سبق نہ سناؤ گے تو میں رائے صاحب سے کہہ دوں گا

مدن۔ وہ اس وقت گھر میں ہیں کہاں؟ (سبق سنانا شروع کرتا ہے اور جے کشن اردو کے الفاظ کے معنی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے)

میں پانی پی آؤں جی! مجھے بڑی پیاس لگ رہی ہے۔

جے کشن۔ چلو بھاگو۔ جلدی آنا وہاں کھیل میں نہ لگ جانا۔ اور سنو مائی بدھاں کے ہاتھ میرے لئے بھی پانی کا ایک گلاس بھیج دینا (مدن پانی پینے کے لئے چلا جاتا ہے کنول کے باجہ بجانے کی آواز آ رہی ہے جے کشن مدن کی کاپی درست کرتے ہوئے باجے کے سروں پر تال بجاتا جاتا ہے۔ پھر کاپی ایک طرف پھینک کر کرسی پر لیٹ جاتا ہے۔ بدھاں پانی کا گلاس لاتی ہے)

جے کشن۔ کہو مائی! کیا کچھ ہوا ہے۔ کوئی بھلی خبر سناؤ۔

بدھاں۔ ہوا کیا ہے۔ وہی روز ہوتا ہے۔ بھلی خبر کوئی نہیں نہ کوئی ہوتی نظر آتی ہے۔

جے کشن۔ پھر بھی کوئی فیصلہ ہوا ہے یا نہیں؟

بدھاں۔ فیصلہ کوئی نہیں ہوا اور نہ ہوتا نظر آتا ہے۔

جے کشن۔ صاف کہو نا کیا کچھ بات چیت ہوتی ہے۔ میری نسبت کوئی بات نہیں ہوئی!

بدھاں۔ ہوئی کیوں نہیں۔ ہر روز ہوتی ہے۔ مگر آگے بات چلے بھی۔ پر میں کہتی ہوں چلے بھی کیسے ایک دوسرے کی کوئی مانتا تو ہے نہیں۔ بڑے رائے صاحب تو بہتیرا زور لگا رہے ہیں۔ مگر نہ صاحب مانتا ہے نہ بڑھیا بڑھیا تو بالکل اس طرف آتی ہی نہیں۔

جے کشن۔ ہوں! ہوں!! اچھا پھر اور کچھ صلاح؟

بدھاں۔ اور بھی بس تو بہ ہی بھلی ہے۔ کیا کہوں جو بات صاحب کرے وہ بڑھیا اور رائے صاحب نہیں مانتے۔ جو بڑھیا کرے اس کو صاحب اور رائے صاحب نہیں مانتے اور جو بات رائے صاحب کریں اس کو صاحب اور بڑھیا نہیں مانتے۔

جے کشن۔ ہیں! ہیں!! میری سمجھ میں نہیں آیا پھر کہو صاف صاف

بدھاں۔ کہوں کیا بس ہر کوئی اپنی اپنی چلاتا ہے۔ بڑھیا تو ٹھیکے دار دل کے لڑکے کے لئے بڑا زور لگا رہی ہے۔



وینس کی عشرت گاہ

جے کشن۔ اچھا بی بی کی کیا صلاح ہے!

بدھاں۔ کچھ بھی نہیں نہ اس کی کوئی پوچھتا ہے نہ وہ کچھ کہتی ہے۔

جے کشن۔ رائے صاحب تو مجھ سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں۔
باتوں باتوں میں پوچھ کچھ بھی بہتیری کرتے رہتے ہیں۔

بدھاں۔ خوش ہوتے رہیں ان کی سنتا کون ہے۔

جے کشن۔ پھر تو کام خراب ہوا سائیں!

بدھاں۔ بڑھیا تو آج بھری بیٹھی ہے کہتی تھی میں آج منوا کے رہونگی۔

جے کشن (ایک چٹھی دیتے ہوئے) یہ کنول کو دے دینا اور کہنا
جو فیصلہ ہو مجھے لکھکر بھیج دے۔ چٹھی وہیں پھاٹک کے پاس
رکھ دینا۔

بدھاں۔ جہاں پہلے رکھی تھی؟

جے کشن۔ ہاں ہاں چلو اب جلدی کرو۔ مدن کو بھیج دینا۔

(رائے صاحب کی آواز سنائی دیتی ہے "او بیلی ارے او
بیلی حقہ بھر کے لا"
چل مائی بھاگ! دیر نہ کر
(بدھاں چلی جاتی ہے)

(رائے صاحب پرانے فیشن کے بزرگ ہیں دو سال تک
ان کی عمر پورے ساٹھ برس ہو جائے گی۔ ڈاڑھی صفا چٹ ہے
مگر مونچھیں گچھوں کے گچھے لٹک رہی ہیں۔ توند بڑھی ہوئی ہے تنگ
پاجامہ اور فراک کوٹ پہنتے ہیں۔ پاؤں میں اکثر گنٹھیا کا درد رہتا
ہے اس لئے ذرا دقت سے چلتے ہیں۔ باہر سے سیدھے ڈرائنگ
روم میں آئے ہیں)

رائے صاحب۔ اچھا جے کشن تم ہو۔ مدن کہاں گیا ہے۔

جے کشن۔ (کھڑا ہو کر) آداب عرض ہے۔ ابھی پانی پینے کے
لئے بھاگ گیا تھا اور میں اس کی کاپی ٹھیک کر رہا تھا ذرا۔

رائے صاحب۔ بڑا پاجی ہے۔ پڑھنے میں تو اس کا ذرا جی
نہیں لگتا۔

جے کشن۔ رائے صاحب! بچے سب اسی طرح کرتے ہیں۔

رائے صاحب۔ نہ بھئی جب ہم پڑھتے تھے تو پڑھنے ہی میں
دن رات ایک کر دیا کرتے تھے۔ کتاب ہاتھ سے اس وقت
چھوٹتی تھی جب حفظ ہو جائے۔ گلستاں ہمیں ابھی تک!
یاد ہے۔

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشت من
آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

(اتنی دیر میں مدن آکر رائے صاحب کے پیچھے کھڑا ہو چکا
ہے۔ جوں ہی ان کی بات ختم ہوتی ہے۔ وہ زور سے تڑاق کی آواز
نکالتا ہے رائے صاحب اچانک ڈر جاتے ہیں اور اٹھ کر مدن
کو پکڑنے کے لئے دوڑتے ہیں وہ بھاگ کر کوچ کے پیچھے جا
کھڑا ہوتا ہے)

رائے صاحب (درد کی تکلیف سے) اوئے۔ اوئے۔ اوئے۔ پکڑنا
جے کشن! اس کو لاؤ میرے پاس میں اس کا دو کانوں میں
سر کروں۔

مدن۔ ہوں! ہوں!! میں نے کیا کیا ہے؟

رائے صاحب۔ کیا ہے اپنا سر۔ مجھے ڈرا دیا ہے۔

مدن۔ آپ تو خواہ مخواہ ڈر جاتے ہیں۔

رائے صاحب۔ اتنی دیر کر کے کیوں آئے ہو۔

مدن۔ میں کیا کرتا جی بیلی ہی پانی نہ دیتا تھا۔

رائے صاحب۔ تم نے ضرور اس کو تنگ کیا ہوگا تم بڑے شیطان ہو

مدن۔ بابا جی! آپ خواہ اس سے پوچھ ہی لیجئے۔

رائے صاحب۔ (ایک آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے) خوئے بد را
بہانۂ بسیار۔

مدن۔ (اردو پڑھتے ہوئے غلطیاں کرتا ہے۔ رائے صاحب تلفظ
درست کرتے ہیں) آگے مجھے نہیں آتا جی۔

رائے صاحب۔ چلو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ اور یاد کرو۔ ہر
ایک لفظ کو دس دس مرتبہ دُھراؤ۔

جے کشن۔ جناب یہ (intelligent) تو کافی ہے
اگر ذرا دھیان لگا کر پڑھے تو لایق ہو جائے۔

رائے صاحب (Same old story, Jaikishan)
امیروں کے بیٹے پڑھ چکے دھیان لگا کر جانتا ہے کہ باپ
ڈھیروں کے ڈھیر دولت کماتا ہے پھر مجھے پڑھنے کی
کیا ضرورت ہے۔

جے کشن۔ جی نہیں ابھی بچہ ہی تو ہے کھیل کود اور شرارت میں
زیادہ جی لگتا ہے بڑے ہونیکے بعد خود ہی عقل آجائیگی۔

راے صاحب۔ بڑا ہو کر یہ کون تیس مار خاں بن جائے گا۔ ہونہار کے عنوان ہی اور ہوتے ہیں۔ شیخ سعدی نے کہا ہے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

اسے کب عقل آئے گی عقل اس کے باپ کو کب آئی تھی۔ وہ بھی بچپن میں اسی طرح کیا کرتا تھا آخر ایف اے میں فیل ہو کر ہمت ہار بیٹھا

جے کشن۔ فیل ہونا ان کو تو بہت راس آیا اپنے (Business) میں ہزاروں کی آمد ہتا رہے ہیں

رائے صاحب۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے

اگر روزی بدانش برفزودے
ز ناداں تنگ روزی تر نبودے

وہ تو بھلا ہو جرمنوں کا جنہوں نے جنگ چھیڑ دی۔ اگر جنگ نہ چھڑتی تو کچھ بھی نہ ہو سکتا یہ تو چانس ہو گیا۔

جے کشن۔ (But Chance is an important part of Life)

رائے صاحب۔ بھئی ہمارا تو یہ عقیدہ نہیں۔ آدمی وہ جو اپنی ہمت سے کچھ کر کے دکھائے۔ چانس وانس پہ بالکل بھروسہ ہی نہ رکھے۔ آپ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو۔

مدن۔ اور اگر پاؤں پر کھڑے کھڑے تھک جائیں تو؟ مجھ سے نہیں اب کھڑا ہوا جاتا۔ اور مجھے پیاس بھی لگ رہی ہے اور بانفہ ر دم بھی آیا ہے

رائے صاحب۔ ہے پاجی! بہانے۔ بالکل بہانے۔ سارا دن اچھل کود۔ پھلانگ دوڑ۔ مجال ہے کہیں دو گھڑی آرام سے بیٹھ کر پڑھ بھی لے۔ چلو بھاگو یاد رکھو رات کے وقت یہ سبق میں تم سے سُن لوں گا۔

مدن۔ اب جو آپ نے سُن لیا ہے۔ میں اب کل سناؤں گا۔

رائے صاحب۔ جے کشن! مرد کو اپنی ہمت کے بل پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ ہمت مرداں مدد خدا

مشکلے نیست کہ آساں نشود
مرد باید کہ ہراساں نشود

سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم اسی وجہ سے زیادہ عزیز ہو کبھی ہمارا اپنا ہمیشہ یہی اصول رہا ہے۔

جے کشن۔ خیر رائے صاحب میں تو مجبور بھی ہوں اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں!

رائے صاحب۔ واہ کر کیا سکتے ہو! وہی جو تمام لڑکے کرتے ہیں۔ والدین سے خرچ منگا سکتے ہو۔

جے کشن۔ پہلے ان کی بات مان لوں تو خرچ بھی منگاؤں۔ وہ میں مان نہیں سکتا۔ کہتے ہیں بیاہ کر لو۔ امتحان بھی بعد میں دو۔ پہلے جلدی سے بیاہ کر لو۔

رائے صاحب۔ واہ! واہ! تو تمہیں اور کیا چاہیئے؟ اس میں برائی کونسی ہے؟

جے کشن۔ بیاہ کیسے کر لوں جناب خبر نہیں لڑکی کیسی ہے کیسی نہیں!

رائے صاحب۔ لڑکیوں جیسی لڑکی ہو گی اور کیسی ہو سکتی ہے۔

جے کشن۔ جی ہاں ایک ان پڑھ دیہاتی لڑکی سے بیاہ کر کے بلا گلے ڈال لوں نہ ادھر کا رہوں نہ اُدھر کا۔

رائے صاحب۔ بھئی ہم تو سُن چکے ہیں کہ پڑھی ہوئی لڑکیاں آفت کی پڑیا ہوتی ہیں۔

جے کشن۔ رائے صاحب بن دیکھے بوجھے شادی کا مطلب کیا ہوا۔ خواہ مخواہ کسی کو کسی کے گلے باندھ دیا جائے یہ اچھا ہے

رائے صاحب۔ بھئی ہم نے تو کچھ دیکھا سنا تھا نہیں۔ جیسے ماں باپ نے کہا ہم نے چپ چاپ مان لیا۔ دیکھ لو آخر عمر گذر رہی گئی ہے۔

جے کشن۔ رائے صاحب۔ آپ کی بات الگ ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا ایک educated آدمی کس طرح ایک uneducated wife کے ساتھ Happy ہو سکتا ہے

رائے صاحب۔ یہ سب باتیں ہیں۔ اب ہمارے گھر میں بی۔ اے پاس لڑکی ہی ہیں بلکہ بی اے تو ہم نے خود بھی پاس نہیں کیا

جے کشن۔ پھر بھی رائے صاحب ایسی شادی کا کچھ لطف نہیں۔

رائے صاحب۔ لطف وطف کی بات چھوڑو۔ بیوی پڑھی ہوئی ہو یا ان پڑھ بس "چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے"۔ پہلے پہلے ہر ایک کی مزے سے گذرتی ہے۔ آٹے دال کا بھاؤ تو بعد میں آ کر معلوم ہوتا ہے۔

جے کشن۔ پھر تو شادی بالکل کرنی ہی نہ چاہیئے۔

رائے صاحب۔ نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہ تھا تم سمجھتے ہو کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ میں کچھ فرق پڑجاتا ہے۔ نہیں۔ سنو بیویاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک نرم مزاج ایک گرم مزاج۔ توبہ! ان گرم مزاج والیوں سے خدا کی پناہ۔ پڑھی لکھی ہوں یا ان پڑھ دونوں پر لعنت۔ لیکن نرم مزاج والیوں کا تو کوئی مقابل نہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ جنہیں ایسی بیویاں مل جائیں۔

جے کشن۔ رائے صاحب پھر مزاج کے متعلق کچھ معلوم ہو تو کیونکر۔ بھلا جس کی شکل تک نہ دیکھی ہو اس کے مزاج کے متعلق آدمی کیا کہہ سکتا ہے۔ پھر ہونی بھی بڑی گنوار۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

رائے صاحب۔ تمہارے والدین کو تو بہت صدمہ ہوا ہوگا!

جے کشن۔ مجھے خود بہت صدمہ ہے رائے صاحب! لیکن میں کروں کیا اگر وہ مجھ سے بن پوچھے سگائی کر چکے ہیں تو میرا اس میں کیا قصور ہے۔ انہیں لاکھ سمجھایا کہ مجھے ایسی شادی کرنی ہی نہیں وہ کہتے ہیں ہم قول دے چکے ہیں تمہیں شادی ضرور کرنی پڑیگی۔

رائے صاحب۔ پھر!

جے کشن۔ پھر کچھ بھی نہیں۔ میں تو بالکل انکار کر چکا ہوں MOTHER کہنے لگیں اگر تمہیں لڑکی پسند نہیں تو پھر کیا ہرج ہے ہمیں تو پسند ہے نا۔ اس وقت تم شادی کر لو بعد میں اپنی مرضی سے ایک اور شادی کر لینا۔ بلکہ اس طرح دو گھروں سے دان دہیز آجائے گا۔

رائے صاحب۔ بات تو مزے دار ہے جے کشن! لیکن کہیں اس پر عمل نہ کر بیٹھنا بیوی ایک بھی اچھی نہیں ہوتی۔ دو آگئیں تو بالکل ہی کہیں کے نہ رہو گے۔

جے کشن۔ توبہ کیجئے جناب۔

رائے صاحب۔ اچھا تمہیں خرچ دینا بالکل بند کر چکے ہیں اب گذر کیسے ہوتی ہے

جے کشن۔ بہت اچھی طرح۔ بھگت گنپتی لعل کے دفتر میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ Correspondence کر لیتا ہوں۔ پچیس تیس روپے وہ دے دیتے ہیں۔ باقی آپ کی مہربانی سے بیس تیس مل جاتے ہیں۔

رائے صاحب۔ شاباش! والدین کے ساتھ تمہارا بگاڑ مجھے پسند نہیں لیکن خیر تمہاری ہمت کی تعریف کئے بغیر میں رہ نہیں

سکتا۔ بھئی تم کسی دن کچھ بن کے رہو گے۔

جے کشن۔ آپ کی مہربانی شامل حال چاہئے۔ اب بھگت صاحب میرے پیچھے لگے ہیں کہتے ہیں تمہاری شادی کا بند وبست کرتے ہیں۔ لیکن بات پھر وہیں رہ جاتی ہے۔

رائے صاحب۔ بھگت بڑا با رسوخ ہے وہ تو شادی بھی کسی اچھی جگہہ کرے گا۔

جے کشن۔ ذرا پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ سو ویسے ہی ان کے match بھی ہیں۔

رائے صاحب۔ تو تمہیں بیوی کوئی نئے فیشن کی چاہئے۔ ہے ناں ٹھیک بات! اس لئے تمہیں کوئی جگہہ پسند نہیں آتی۔

جے کشن۔ سچ ہے رائے صاحب! ہو تو اپنی مرضی کے مطابق۔ ورنہ کچھ ضرورت ہی نہیں۔ دوسرے جلدی کس بات کی ہے ابھی تو مجھے امتحان دینا ہے۔ پھر کوئی JOB بھی تلاش کرنی ہوگی۔

رائے صاحب۔ ارے بھئی بعض وقت جھٹ میرا بیاہ اور پٹ مجھے "JOB" کا معاملہ بھی ہو جاتا ہے۔ لڑکی والے خود JOB ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ ہوا کرتا تھا رادھا رام اب تو بیچارہ مر بھی چکا ہے۔ جس وقت وہ ریٹائر ہوا پوسٹ آفسز کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ ادھر اس کے داماد نے بی اے پاس کیا ادھر یہ اُسے لے کر بڑے صاحب کے دروازے پر جا بیٹھا کہ صاحب میری اسامی میرے داماد کو دلوائے صاحب نے بہتیرا ٹال مٹول کیا۔ جھڑکا، جھڑکا مگر وہ دروازہ روک کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا صاحب میں تب اٹھوں گا جب نوکری لے لوں گا۔ ساری عمر سرکار کی خدمت میں گذر گئی اب اور کہاں جاؤں۔ آخر صاحب نے تنگ آکر انسپکٹر بنا دیا۔

جے کشن۔ اچھا انسپکٹر!

(رکوبر صاحب رائے صاحب کا بیٹا انگریزی لباس پہنے سیگار سلگاتا ہوا اندر آتا ہے)

صاحب۔ HULLO, Jacksen! How is the world treating you?

جے کشن۔ Not so bad! Thanks!

صاحب۔ Going for tennis?

بے کرشن (چونک کر) اوہو آج تو میرا match ہے (گھڑی دیکھ کر) آداب عرض رائے صاحب۔ I must run.

Good Bye, Mr. Cooper!

صاحب۔ Bye, Bye! Nice boy, that, but un-lucky!

بیلی۔ (ڈاک لاتا ہے) چٹھیاں ہیں سرکار!

بھگت جی۔ (باہر ہی سے) رائے صاحب! رائے صاحب گھر میں ہیں آپ؟ ارے بیلی! او بیلی!

صاحب۔ کون ہے یہ؟ عجب بے ہنگم آدمی ہے۔

بیلی۔ بھگت جی ہیں سرکار! (وہی میل بھر کے فاصلے سے آوازیں دینے لگ جاتے ہیں۔

صاحب۔ بھگت! Damn! میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

(صاحب اندر کے کمرے میں چلا جاتا ہے)

رائے صاحب۔ بھاگ کے جا بیلی! او چلم بھر کے لا۔

(بھگت جی کی عمر کوئی پچاس پچپن سال کے قریب ہو گی ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، کوٹ اور لسٹری صافہ پہنے ہوئے ہیں۔ توند نکلی ہوئی ہے ہاتھ میں موٹی سی پہاڑی لکڑی ہے سفید خشخشی ڈاڑھی ہے۔ اندر آنے سے پہلے بوٹ دروازے میں اتار لیتے ہیں پھٹی ہوئی جرابیں نظر آ رہی ہیں)

رائے صاحب۔ آئیے! آئیے۔ آج تو مدت کے بعد درشن ہوئے

بھگت جی۔ مہاراج کب سے آنا آنا کہہ رہا تھا مگر کچھ نہ پوچھیے دنیا کے دھندے کہیں دم لینے نہیں دیتے۔ ہوشیارپور سے سرکاری نیلام کرانے کے بعد آیا ہی تھا کہ رام رکھا اپنا لڑکا دیکھنے کے لئے سیالکوٹ لے گیا۔

رائے صاحب۔ یہ رام رکھا کون ہے۔

بھگت۔ آپ نہیں جانتے اچھا کھاتا پیتا آدمی ہے۔ مہاراج اس کے دادا اور ہمارے دادا ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ تب سے آپس میں میل جول چلا آتا ہے۔ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں ورنہ آج کل کون کسی کی پوچھتا ہے۔ اس کی لڑکی ہے بارہ چودہ سال کی۔

رائے صاحب۔ اچھا اس کے لئے لڑکا پسند کرنے گئے تھے؟ پھر پسند آیا؟

بھگت جی۔ چپ ہی بھلی مہاراج! بس دیکھ کر ہی سیر ہو گئے۔ ذرا بندر کا بندر۔ ریوڑی سی چپٹی ناک۔ ہم نے رام رکھا سے کہا چل بے بابا بھاگ یہاں سے مہاراج کچھ شکل و صورت ہو کوئی عقل کی رتی نظر آئے تو آدمی بات کرتا بھی بھلا معلوم ہوتا ہے

رائے صاحب۔ بھگت جی لڑکوں کا معاملہ آج کل بہت ٹیڑھا ہو گیا ہے

بھگت جی۔ کیا بتائیں لڑکے ملتے ہی نہیں آج کل۔ مہاراج میرے پاس اس وقت دس رشتے ہیں۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ ماں باپ کنوئیں جھانک رہے ہیں مطلب کے لڑکے ملتے ہی نہیں اگر بر اچھا ہے تو گھر اچھا نہیں۔ گھر اچھا مل جائے تو بر اچھا نہیں ملتا ہے۔ جناب ادھر لڑکیوں والے بھی دکانداری لڑکے کو سرے سے پسند کرتے ہی نہیں۔ سب یہی الاپتے ہیں پڑھا لکھا ہو۔ نوکر ہو۔ یہ ہمارا گوردتہ شاہ ہے آپنی اس کی دکان چلتی ہے کہ آج ہزاروں سینکڑوں کی آمدنی ہے لڑکی جوان ہے ایسی سندر مہاراج! ہماری اپنی بیٹی ہے پر سچ مانئے صورت پر نگاہ نہیں ٹکتی۔ خود شاہ صاحب کو الف کے نام بھالا بھی نہیں آتا۔ مگر چاہتے کیا ہیں کہ لڑکا بہت پڑھا لکھا ہو۔ کوئی وکیل، جج یا بیرسٹر ہو۔ ادھر لڑکے ایسے اڑ گئے ہیں کہ پڑھی لکھی فیشن ایبل کے سوا تو بات ہی نہیں کرتے نازشک نخرے غمزے والی پر مرتے ہیں ہمارے پرانے سمے بہت اچھے تھے مہاراج کوئی پڑھائی لکھائی کو جانتا ہی نہ تھا سب کی اچھی گذر جاتی تھی۔ اب تو زمانہ ہی الٹا آ گیا ہے۔

رائے صاحب۔ بھگت جی کچھ نہ پوچھئے لڑکا تلاش کرنا بڑی مصیبت ہے کئی سال ہوئے کہ آئے ہم خود تلاش میں ہیں۔ مگر مرضی کے مطابق لڑکا نہیں ملتا۔ ادھر ہمارے صاحب کا خیال ہے کہ لڑکا England returned ہو

بھگت جی۔ مہاراج کانوں پر ہاتھ دھریئے۔ یہ جو ولایت کا پانی پی آئے ہوں ان کا تو نام نہ لیجئے۔ رام رام! ان کی تو پرچھائیں سے بھی بھاگنا درست ہے کبھی بھول کر بھی رشتہ کرنے کا نام نہ لیجئے۔ پچھتایئے گا! ہا! ہا! دھرم کرم ان کا نہیں عقل نہ تمیز۔ ہماری تو کسی بات کو یہ پسند کرتے ہی نہیں۔ ان سے تو بس ہمیں پوری اترتی ہیں جب تک پیسہ موجود رہا گلچھرے اڑائے پھر تو کون میں کون؟ ٹکٹ لیا اور جھٹ ولایت جا دھمکیں۔ مہاراج بیس قصے اس وقت خود مجھے یاد ہیں۔ خدا بچائے بہتوں کا تو گھر بار سب فنا ہو گیا

ایک بیچارے کو خدا نے عقل دی وہ اُفیم کھا کر مر گیا۔ مہاراج
ولایت والوں کے نزدیک نہ جائیے۔ انہیں ولایت والیاں
ہی مبارک رہیں۔ ہماری بیٹیاں بھولی بھالی، شریف، حیادار،
بے زبان، سیدھی سادھی ان ولایت والوں کو پسند آسکتی ہیں!

رائے صاحب۔ بھگت جی میں آپ کے ساتھ پوری طرح متفق
ہوں۔ پھر دیکھئے والدین کے لئے کتنی مشکل ہے پالیں پوسیں،
پڑھائیں لکھائیں گھر سے دھن دولت دیں پگڑی تک
اُتار کر قدموں پر رکھ دیں مگر لڑکوں کے مزاج ایسے بگڑ گئے
ہیں کہ کوئی عقل و تمیز کی بات جانتے ہی نہیں گویا نیلام کی
بولی بلواتے ہیں۔ کوئی موٹر مانگتا ہے کوئی کوٹھی کا راگ الاپتا
ہے اور کوئی کہتا ہے مجھے ولایت جانے کا خرچ ساتھ دو۔
سنتے جائیے۔ کئی دفعہ خیال آتا ہے کہ بزرگوں کی یہ بات
ٹھیک ہی تھی کہ پیدا ہوتے ہی لڑکی کا گلا گھونٹ دو۔ بھگت
جی آج کل کے زمانے میں ماں باپ کا بُرا حال ہے۔

بھگت جی۔ کچھ فکر کی بات نہیں شکر خورے کو رب شکر ہی دیتا
چلا آیا ہے۔ نیت کا پھل ضرور ملتا ہے مہاراج۔ جیسا
آپ کا شریف گھرانہ ہے مہاراج، ویسا ہی لڑکا بھی ہونا چاہیئے
دیکھئے میں کب سے ایک بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ آج
میں وہ بات کہہ دوں گا اور آپ کو بھی میرا کہا ضرور ماننا ہوگا۔ یہ
ہمارا چھوکرا ہے جے کشن مہاراج آپ سے کچھ پوشیدہ نہیں
آپ خود دانا ہیں مہاراج آنرز کے ساتھ بی۔ اے پاس کر چکا
ہے۔ اور دیکھ لینا ایم اے بھی آنرز کے ساتھ ہی پاس کرے گا
مہاراج لڑکا سچا موتی ہے ہیرے کی کنی، تیز فہم، نرم مزاج،
آنکھ میں شرم، بھلا مانس گدڑی کا لال ہے گدڑی کا لال! ذرا
غریب ہے مگر اس بات کا فکر کیا۔ دولت ان کی باندی ہے
انسان کو دولت کا غلام نہ بننا چاہیئے۔ دھن مرد کے بازو
میں ہوتا ہے کہتے ہیں نا کہ حرکت میں برکت ہے۔

رائے صاحب۔ لڑکا واقعی اچھا ہنرمند ہے۔

بھگت۔ ہنرمند سا ہنرمند! مہاراج ایسا ہوشیار ہے کہ بس
جھٹ پٹ چٹھی پتری لکھ کام پورا کر کے اپنی راہ لیتا ہے۔
ادھر ہم بھی کبھی کسی قسم کا فرق نہیں کرتے بس گھر کا معاملہ ہی
سمجھ لیجئے۔ مہاراج اس کی مدد کر کے ہمارا جی خود بھی بہت
خوش ہوتا ہے۔ اور ہم اس سے کہہ بھی چکے ہیں کہ تمہارا بیاہ
کسی اونچے گھر میں کرائیں گے۔ اور مہاراج ہم کرا بھی ضرور
دیں گے۔ دو تین غریب لڑکوں کو خود پڑھا لکھا کر ہم نے اپنے
ہاتھوں بیاہا ہے آپ جانتے ہیں اب وہ کتنے مزے میں ہیں۔

رائے صاحب بھگت جی کیا کہنے ہیں آپ کے!

بھگت جی۔ کیا کریں مہاراج اپنا بال بچہ کوئی ہے نہیں اور اولاد کا
ارمان شوق بھی پورا کرنا ہوا اس وقت بھی ہمارے پاس تین چار
اچھے اچھے رشتے ہیں مگر جے کشن چاہتا ہے کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو
انگریزی بولتی ہو۔ یہ آج کل کے لڑکوں میں خبر نہیں کیا اُلٹی ہوا
چل گئی ہے۔ ہمارے وقتوں میں کوئی کچھ نہ پوچھتا تھا۔ لنگڑی،
لولی، کانی سب بیاہ دی جاتی تھیں۔

رائے صاحب۔ اب زمانے کے طور بدل گئے ہیں بھگت جی!
اب تو لڑکی پڑھی لکھی بھی چاہیئے۔ خوبصورت بھی ہو لڑکے کو پسند
بھی آجائے ساتھ ہزاروں کا جہیز بھی ہو۔

بھگت۔ سب کچھ دے دلا کر اچھا آدمی پھر بھی قسمت ہی سے ملتا ہے
ایسے ایسے جھگڑالو سننے میں آئے ہیں کہ بس توبہ بھلی۔ تمام عمر
لڑکی کو دق کرتے رہتے ہیں۔ بس یہی کہتے ہیں اور لاؤ۔ اور لاؤ۔
لڑکی سے نہیں بلکہ روپے سے شادی کرتے ہیں اصل آدمی
کسی کو بھاگوں ہی سے ملتا ہے۔

رائے صاحب۔ ہم خود فکرمند ہیں۔ لڑکی سیانی ہو گئی ہے مرضی
کے مطابق کوئی لڑکا نہیں ملتا ادھر صاحب کو
England returned کا خبط ہے

بھگت جی۔ مہاراج سمجھائیے صاحب کو۔ خوب سمجھائیے میں خود
بھی سمجھاؤں گا باقی جیسی بیٹی آپ کی ویسی ہماری۔ میں نے سوچ
سمجھ کر آپ کے سامنے بات کہی ہے جے کشن کے برابر شریف،
لایق، ہوشیار، خوبصورت اور ہونہار لڑکا مشکل سے ملے گا۔
لڑکی بھی پڑھی لکھی لڑکا بھی پڑھا لکھا یہ تو خدا نے جوڑی ملائی ہے

رائے صاحب لڑکا تو اچھا ہے مگر گھر بار بھی تو اچھا ہونا چاہیئے
آپ خود دانا ہیں اچھا گھر دیکھنا بھی تو آخر ہمارا فرض ہے۔

بھگت۔ آپ کی بات ٹھیک ہے مہاراج پر ایسے لایق لڑکے کو

کبھی بھی سی بات کی نہیں ہوسکتی۔ یہ چھوٹتے ہی کوئی عہدہ پالے گا

مہاراج لوگوں کو مرتا نہیں اس وقت بھی پچاس سا ٹھ روپے

کما رہا ہے گھر سے ایک کوڑی نہیں منگاتا۔ تھوڑی سی بات

ہے آگے آپ کا اقبال بڑا ہے، سوچ بہت ہے ذرا ہی

ہمت کیجئے گا تو لڑکے کا بندوبست ہو جائے گا۔

رائے صاحب۔ بھگت جی میرا کچھ بس نہیں چلتا۔ میں خود تنگ

آگیا ہوں۔

بھگت جی۔ واہ وا مہاراج سب کچھ آپ ہی کے ہاتھ ہے۔ سب

اختیار ہی آپ کا ہے آپ ایک دفعہ حامی بھریں تو صاحب

کو میں خود منوالوں گا۔

رائے صاحب۔ میں عرض کر چکا ہوں میرے کہنے کی کچھ قیمت نہیں

بھگت جی۔ مہاراج میں تو اب منہ پھاڑ کر کہہ چکا ہوں میرے

کہنے کی لاج آپ کو رکھنی ہوگی۔ پھر لڑکا بھی ایسا ملنا مشکل ہے

رائے صاحب۔ بہت بہتر، معاملہ غور طلب ہے آگے جو پرماتما

کو منظور ہو۔

(صاحب آتا ہے لیکن دروازے ہی میں کھڑا رہتا ہے)

صاحب۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔

بھگت جی Good evening! صاحب جی

صاحب Good evening! بھگت جی

بھگت۔ لو رائے صاحب ہم اب چلتے ہیں اجازت دیجئے

اور وہ میری بات یاد رکھئے بھول نہ جائیے بالکل نہ بھولئے

بار بار تاکید ہے ورنہ ہماری اور آپ کی ختم۔ ہی ہی ہی

ہنستا ہے، دکان میں، ابھی صاحب سے بات کیجئے وہ،

دوسری بات بھی یاد رکھئے۔ وہی انگلینڈ والی۔

صاحب Good bye Bhagat ji

بھگت مہاراج! مہاراج! (جاتا ہے)

(رائے صاحب ٹریبون پڑھتے ہیں صاحب ڈاک دیکھ

دیکھ رہا ہے)

صاحب۔ پاگل ہوگئے ہیں لوگ بالکل پاگل۔

رائے صاحب۔ بالکل پاگل یہ سنو۔ Wanted a

match sound in body and sound in

mind for a girl of sixteen springs

Only fair coloured young men

need apply with photos

—✻—

ساتھ ہی testimonial بھی مانگ بھیجتے تو بہتر

تھا۔ لکھنے والا ہے نہیں پاگل۔

صاحب۔ میرا مطلب یہ نہ تھا (بیٹھ جاتا ہے)

رائے صاحب (اخبار کو کبھی آنکھوں کے قریب لاتے ہیں۔

کبھی دور لے جاتے ہیں جیسے کچھ ٹھیک نہ پڑھا جاتا ہو)

صاحب! یہ دیکھو تو کیا لکھا ہے حد ہوگئی بھئی

wanted a match for a young man of 83.

صاحب (ہاتھ سے اخبار لے کر) کیا کرتے ہیں آپ ۳۳ ہے

۸۳ نہیں آپ نے میری بات تو ٹوک سی دی میں نے کہا

تھا کہ لوگ پاگل ہوگئے ہیں۔

رائے صاحب۔ میں بھی یہی کہتا ہوں اور ساتھ ہی تم پاگل ہوگئے

ہو بھلا کہیں اشتہاروں سے بھی لڑکے مل سکتے ہیں۔

صاحب۔ ہم چاہتے ہیں England returned

ادھر جو لکھتا ہے وہی کہتا ہے مجھے testimonial

بھیج دیجئے۔ ہر کوئی جانے کو تیار بیٹھا ہے۔

رائے صاحب۔ تین چار سال سے تم نے یہ کھیل بنا رکھا ہے

ادھر لڑکی سیانی ہوگئی ہے اب اور کتنی دیر انتظار لگا رکھو گے

نہ اب تک England returned

ملا ہے نہ آگے چل کر ملے گا۔

صاحب۔ پھر آپ ہی کہئے یوں Lilly کو کہاں دھکیل

دیں! اتنی اس کی education کس لئے

کرائی تھی۔ کوئی suitable match

ملے تب تو بات بھی ہو سکتی ہے۔

رائے صاحب۔ نہیں صاحب suitable کوئی

نہ ملے گا۔ تم چاہتے ہو سب باتیں سولہ آنے پوری ہوں یہ

کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ بر اچھا ہوا تو گھر خود ہی بن جائے گا۔

صاحب۔ خود کیسے بن جائے گا جی Lilly کو اتنے

لاڈ پیار سے پالا اس شوق سے تعلیم دلوائی جو اُس کی aspirations

بااس کے برابر کی educated لڑکی کی
aspirations ہوسکتی ہیں ان کا خیال رکھنا بھی بہت
ضروری ہے۔ جہاں جائے کوٹھی رہنے کے لئے ہو کام کاج
family کو نوکر چاکر ہوں سواری کے لئے موٹر ہو آگے
بھی well-connected ہو۔ دوسرے سچ تو یہ ہے
کہ معمولی جگہ شادی کرتے ہوئے مجھے تو شرم آتی ہے
آخر دنیا کا بھی کچھ خیال چاہیئے۔

رائے صاحب۔ بات تو ٹھیک ہے مگر میرے خیال میں جے کشن
بھی اچھا بھلا MATCH ہے

صاحب۔ ہاں Jackson! Jackson! جیکسن۔
نام تو اچھا ہے۔

رائے صاحب۔ لڑکا خوبصورت، جوان اور ہونہار ہے عنقریب
کسی اچھے عہدے پر لگ جائے گا۔

صاحب۔ لگ جانے کی کیا خبر ہے؟ جی نہیں پہلے تو کوشش
یہ ہونی چاہیئے کہ کوئی ENGLAND RETURNED
مل جائے۔

رائے صاحب بھئی ہم تو چاہتے ہیں England
چھوڑ کوئی America returned مل جائے
مگر کوئی کم بخت ملے تو سہی۔ یہ تو وہی بات ہے کھینی چڑیا
چھوڑ کر اڑتی کے پیچھے بھاگنا۔

صاحب۔ آپ یوں ہی اتنی جلدی مچا رہے ہیں England
Returned کہیں بیست دناہو دو تو ہو نہیں گئے بہتیرے
آ رہے ہیں (ایک چٹھی دکھا کر) یہ دیکھئے ایک ایم۔ اے
P.nd Bar-at-Law کی چٹھی ہے۔

رائے صاحب۔ اچھا بھئی تمہاری مرضی کے مطابق مل
جائے تو ہمیں اور کیا چاہیئے۔ کیا لکھتا ہے؟

صاحب (چٹھی پڑھ کر) لکھتا ہے پنا سر بہت فضول فضول شرطیں
لکھی ہیں۔

رائے صاحب۔ ذرا ہم بھی تو سنیں کیا لکھتا ہے تمہارا
England returned

صاحب۔ لکھتا ہے تین شرطیں میرے باپ کی طرف سے ہیں اور
دو میری طرف سے۔ لیکن ہیں پانچوں کی پانچوں rubbish

رائے صاحب۔ سناؤ تو ذرا۔

صاحب۔ باپ کی شرائط تو یہ ہیں کہ اول لڑکی منگنی نہ ہو اب کوئی
اس idiot کے بچے سے پوچھے کہ یہ انگلینڈ گھاس
چرنے کے لئے گیا تھا کہ ابھی تک منگنی کی سنگلی اس کے گلے
میں پڑی ہے۔

رائے صاحب۔ بھئی ہم نے تو ابھی تک کنول کی جنم پتری بھی نہیں
بنوائی۔

صاحب۔ جنم پتری کا تو خیر فکر نہیں وہ تو جیسی کہئے آج بن سکتی ہے
لیکن مجھے تو اس نالایق پر غصہ آ رہا ہے دیکھو رام جی کا بچہ
Damnfool! یہ England سے ہو کر آیا ہے

رائے صاحب۔ اچھا آگے؟

صاحب۔ دوسرے یہ کہ لڑکی میرے باپ سے پردہ کرے۔ دیکھئے
لوگ تو پردہ ہٹا رہے ہیں یہ پردہ کرائے گا۔ اب کل کو کہے گا
میری ماں سے بھی پردہ کرے بھلا silly سے silly یہ
فضول باتیں پوری ہو سکتی ہیں۔

رائے صاحب۔ اور بولو۔

صاحب۔ اور شادی پرانے طریقے پر ہو گی۔ میں کہتا ہوں یہ الّو
کا پٹھا انگلینڈ کس لئے گیا تھا۔ جو بات دیکھیں وہی
Reactionary ہے۔

رائے صاحب۔ کوئی اور بھی باقی ہے؟

صاحب۔ سنتے جائیے لکھتا ہے دو شرطیں میری ہیں۔ اول یہ کہ
مجھے ہفتہ دو ہفتے لڑکی کے پاس رہنے کا موقع دیا جائے۔
تاکہ میں اس کے Tastes and manners
کو study کر سکوں اس کے بعد میں اپنا mind
make up کر سکوں گا۔

رائے صاحب۔ لعنت ہو بے شرم پر اسے لکھ دو پھر واپس
England چلا جائے۔

صاحب۔ ابھی ایک اور شرط بھی ہے کہ مجھے dowry میں
ایک موٹر ضرور ملے اور کم از کم Twenty thousand

سے زنجیر پنجابی

یعنی میرا ولایت کا خرچ بھی دیا جائے۔

رائے صاحب۔ اسے ایک موٹا سا رسا پھانسی لینے کے لیئے کیوں نہ دیا جائے۔

صاحب۔ Oh! I am sick of it! للی کی اتنی education نہ کرائی جاتی تو بہتر تھا شادی کرتے وقت افسوس نہ ہوتا

رائے صاحب۔ صاحب! میں نے تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ تمہارا رایا کنٹرول کا بدخواہ نہیں ہوں پھر کیوں تم میرے تجربے سے فایدہ نہیں اٹھاتے

صاحب۔ میں سب مانتا ہوں مگر آپ کی outlook اور ہے میری اور آپ sufficiently modern نہیں ہیں

رائے صاحب۔ پھر تو یہ modern England والا کافی ہے اسی کی بات مان لو سب کھیڑا تو تمہارے modern پن ہی کا ہے۔

صاحب۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں Lilly کوئی بوڑھی تو ہو نہیں گئی۔

رائے صاحب۔ اور بھئی تم ضرور اُسے بوڑھی ہوئے بعد ہی بیاہو گے

صاحب ابھی تو اس کے پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ برس چھ ماہ اور سہی آخر لوگوں نے England آنا جانا بند تو کر نہیں دیا۔ مجھے یقین ہے بہت suitable match مل جائے گا

رائے صاحب Goon seeking on a you will go mad میں تو سمجھتا ہوں یہ خواہ مخواہ کی دردسری ہے۔ تم England returned ڈھونڈتے رہو گے لڑکی کی عمر گذر جائے گی۔ اب اسے بیسواں سال لگے گا پھر کام کا لڑکا یہاں سے بھی نہ ملے گا یہ بات غور طلب ہے زیادہ سیانے بنتے بنتے ہی کہیں خطا نہ کھا بیٹھنا۔

صاحب آپ خواہ مخواہ اتنے Pessimistic ہو رہے ہیں۔ ابھی اور تین چار سال WAIT کر سکتی ہے۔

رائے صاحب۔ ارے وہ تو WAIT کرے یا نہ کرے دنیا WAIT نہیں کرے گی۔ بھئی اگر تمہیں ایسا ہی کرنا ہے تو میں اس میں کوئی دخل نہ دوں گا۔ جو تمہارا جی چاہے کرو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ

آنچہ دانا کند کند ناداں

لیک بعد از خرابی بسیار

(بڑی ماں گھبرائی ہوئی باہر نکلتی ہے)

ماں۔ کیوں جی تم نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے چار سال ہونے کو آئے ہیں مجھے تمہارے ساتھ سر مارتے میری جان اندر ہی اندر فکروں میں گھل رہی ہے۔ اور تم کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھے ہو۔ تم کو زمانے کے برے بھلے کی کچھ خبر بھی ہے! کسی وقت ضرور کچھ نہ کچھ کر کے رہو گے۔

رائے صاحب۔ ہیں ہیں!! ہوا کیا آخر!

صاحب۔ ماں بات تو کرو کیا ہوا!

ماں۔ بات کیا کروں خاک۔ کوئی نئی بات ہے! آپ جان بوجھ کر انجان بنے بیٹھے ہیں گھر میں فیل کا فیل لڑکی بیٹھی ہے۔ خبر نہیں آپ کو چین کی نیند کس طرح آتی ہے۔

رائے صاحب۔ کیوں ہیں تم سے کم فکر ہے! یہی تو صلاح کر رہے تھے

ماں۔ آخر یہی ہے تم لوگوں پر اور تمہاری صلاحوں پر۔ اصلاحیں کرتے کرتے عمر گذر گئی پر کیا آج تک کچھ بھی نہیں۔ آپ کو تو اپنی عزت کا بھی خیال نہیں آتا۔ ادھر زمانے کو ایسی آگ لگ رہی ہے کہ توبہ بھلی

صاحب۔ ماں! ہوا کیا کوئی بات بھی کرو گی یا ایسے ہی شور مچا رکھا ہے

ماں۔ ہوش میں آؤ۔ میں شور مچا رہی ہوں! اپنے میں عقل نہ ہو تو کسی سے عقل سیکھ لینی چاہیئے۔ تم تو سودائی ہو گئے ہو۔

صاحب۔ ماں دن رات جھڑکیاں دے دے کر تم سودائی بنا دو گی

رائے صاحب۔ بھئی کوئی بات بھی کہو کچھ معلوم تو ہو۔

ماں۔ (صاحب کی طرف منہ پھیر کے) ہر کہتی ہوں مگر آج تک تم نے میرا کہا نہ مانا تو بس نہ میں تمہاری ماں نہ تم میرے بیٹے میرا کلیجہ اندر ہی اندر جل گیا ہے۔

صاحب۔ غضب خدا کا بات کا کچھ سر پیر بھی ہے یا نہیں!

ماں۔ میں سب بتاؤں گی مگر پہلے میرے سر کی قسم کھاؤ۔ میرے ہی سر کی قسم کھاؤ کہ جو میں کہوں مان لو گے۔ جو گذر چکا سو گذر چکا۔ اب میں تمہاری ایک نہ سنوں گی۔ تم لوگ آنکھیں بند کئے بیٹھے تم

رائے صاحب۔ بس تم بھی بڑی زبردست ہو۔ کوئی بات کرتی نہیں اور ناحق شور مچا رکھا ہے

ماں۔ جی ہاں باپ بیٹوں کو تو شور ہی سنائی دے رہا ہے۔ پر مجھے کہیں کا نہ رہنے دو گے۔

صاحب (تنگ آکر) ماں! کچھ کہنا ہے تو کہو ورنہ میں یہاں سے جاتا ہوں فضول سر کھانے سے کیا مطلب؟

ماں۔ بڑے آئے سر والے۔ اچھا میری بات سن لو مگر میرا کہا پورا نہ کیا تو میں بھی آج کچھ کر کے رہوں گی۔

صاحب (تنگ آکر اور ہاتھ جوڑ کر) اماں! اب بخش بھی دو میں مان لوں گا سب مان لوں گا۔ جو کچھ کہو گی مان جاؤں گا تم بات تو کرو۔

ماں۔ بس بات یہی ہے کہ آج سے کولاں (کنول) کو کہیں باہر آنے جانے نہ دو۔ کسی کالج اسکول میں نہ بھیجو۔ خاک پڑے اس پڑھائی پر دروازے سے باہر پاؤں نہ دھرنے دو۔ اور دوسرے یہ کہ جلدی سے اس کا بیاہ کر دو۔ عزت سے اپنے گھر کو چلی جائے تو یہی بڑی بات ہے۔ بہت دیر انتظار کیا۔ انتظار کرتے کرتے جگ بیت گئے۔ اس کا بیاہ کر کے سر سے بوجھ ہلکا کرو۔ اب میں کہہ چکی ہوں اگر میری بات نہ مانی گئی تو میں آج سے اناج پانی کو منہ نہ لگاؤں گی اور جان دے دوں گی۔

رائے صاحب۔ ہیں۔ ہیں! مگر یہ خفگی کس بات پہ ہے آخر ہوا کیا؟

ماں۔ ہوا کیا! آپ نے سنا نہیں اتنی بڑی بڑی اندھیر کی باتیں ہو رہی ہیں توبہ اہیری توبہ۔

صاحب۔ ہم نے تو کچھ سنا نہیں۔

ماں۔ نہیں سنا تو اب سن لو گے۔ اس کی تو اخباریں بھی چھپ گئی ہیں وہ کون ہے وکیل۔ بھلا سا نام ہے اس کا۔ اس کی جوان لڑکی اٹھارہ سال کی وہ بھی اسکول جاتی تھی۔

رائے صاحب۔ پھر اب ہوا کیا؟

ماں۔ ہوا کیا! ماں باپ کا منہ کالا ہو گیا وہ لڑکا تلاش کر رہے تھے لڑکی نے شادی ہی سے انکار کر دیا لوگ تو کہتے ہیں اس نے آپ ہی اپنے لئے لڑکا ڈھونڈ لیا ہے۔ نانے اگلے لوگ اس زمانے کو یہ سنا کرتے تھے کہ کلجگ آئے گا کوٹھے اور دیواریں بھاگتے پھریں گے سو دیکھ لو بیلیں چل رہی ہیں کہتے تھے کنواریاں بیٹھ

منہ سے بر مانگیں گی اب یہ بھی آنکھوں دیکھ لیا۔ کانوں سن لیا۔

صاحب۔ فضول عورتوں کی افواہیں ہیں۔ کوئی بات ہو یا نہ ہو رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہیں۔

رائے صاحب۔ عورتوں کو اور کام ہی کیا ہے۔ سارا دن بیٹھ کر گپیں ہانکتی رہتی ہیں۔

صاحب۔ ہاں نری گپیں۔ بالکل!

ماں۔ آپ کے لئے تو گپیں ہیں اس کے ماں باپ سے جا کر کوئی پوچھے جنہیں ڈوب مرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ اس کی ماں کو تو غش پر غش آ رہے ہیں۔ مردوں نے اب نئے نئے دستور نکال لئے ہیں لڑکیاں بڑی بڑی کر کے بیاہتے ہیں ہمارے زمانے میں کوئی دستور ہی نہ تھا۔ مردوں کے دخل کا مائیں خالائیں ہی مل جل کر سب بندوبست کر لیتی تھیں۔ ستیاناس ہو ان انگریزوں کا جن سے لوگوں نے یہ نئے طور سیکھے ہیں۔ لڑکیوں کو پڑھا لکھا کر میم بنا دیا ہے۔ سارا دن کنگھی چوٹی سے فرصت نہیں ملتی ذرا سے کام کا نام لیا جائے تو لڑکیوں کو غش آ جاتا ہے۔ بھلا یہ دوسرے گھر میں جا کر ماں باپ کا نام کیا نکالیں گی۔

رائے صاحب۔ نیک بخت! اب یہ لیکچر تو کرو ختم اور مطلب کی بات کہو۔

ماں۔ مطلب کیا بس اب شگون بھیج دو۔ ٹھیکیداروں کی طرف اور اگلا مہینہ بیاہ کا مقرر کر لو۔ ٹھیکیدارنی کل مجھ سے ملی تھی کہنے لگی اگر رشتہ کرنا ہے تو خیر ورنہ ہمیں جواب دو۔ سو میں تو کہہ آئی ہوں۔

صاحب۔ کیا کہہ آئی ہو ماں اس میں تمہارا دخل دینے کا کیا واسطہ۔ ہم خود جو موجود ہیں کرنے کے لئے۔

ماں۔ تم لوگ کرنے والے بن جاؤ تو اور چاہئے کیا تم تو باتیں بنانے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔

رائے صاحب۔ میں تم سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ کشن بہت اچھا اور لائق لڑکا ہے۔ لائق بھی ہے۔ تندرست بھی۔ خوبصورت بھی ہونہار بھی۔

ماں۔ بس چپ رہئے آپ نے بھی عمر گذار دی پھر بھی عقل نہ آئی۔ خالی لڑکے کو بھلا ہم شہد لگا کر چاٹیں گے؟ وہی بات ہوئی جنم نہ دیکھا بوریا اور سپنے آئی کھاٹ۔ گھر نہ بار۔ نرا ملنگ کا ملنگ۔ آپ اس کا نام ہی کیوں لیتے ہیں لوگ بھی کہیں گے بڑا بھاری ہمدھیانہ

تلاش کیا ہے

صاحب ۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایسی جگہ شادی کرتے شرم آتی ہے کوئی بڑا family ہو جہاں رشتہ کرنے سے کچھ عزت بھی بڑھے ۔

ماں ۔ اتنا اونچا سارا خاندان! اور آپ کن لوگوں سے ناتہ جوڑنے لگے ہیں ہم تو کبھی لڑکی کو ایسی جگہ نہ پھینکیں گے ۔ چوبارے کی اینٹ موری کو نہیں لگ سکتی ۔ سارے خاندان کو بٹہ لگ جائے ۔ جہان کیا کہے گا ۔ چاروں طرف باتیں ہوں گی ۔ کہ ضرور لڑکی میں کوئی خرابی ہوگی تب ہی ایسے کنگال کے پلے باندھ دی گر

صاحب ۔ ! By Jingo مجھے تو اب تک یہ بات strike ہی نہ ہوئی تھی ۔

رائے صاحب ۔ میری کہی کو تم لوگ بعد میں یاد کرو گے ۔ جب یہ لڑکا بھی رُک جائے گا ۔ بھگت اس کے لئے بہت کوشش کر رہا ہے ۔ شریف اور ہونہار لڑکے ملتے کہاں ہیں

ماں ۔ کون ہے یہ بھگت ۔ اپنی لڑکی کیوں نہیں بیاہ دیتا ۔

صاحب لڑکوں کا کال تو پڑ نہیں گیا Lilly کے لئے بہتیرے مل جائیں گے باقی رہا بھگت وہ تو Idiot ہے ۔ معلوم نہیں آپ نے اسے کیوں منہ لگا رکھا ہے ۔

رائے صاحب ۔ بڑا اکھا آدمی ہے ۔ بڑا نرم دل ہے ۔

صاحب ۔ نرم دل ہو یا نہ ہو نرم دماغ ضرور ہے ۔ بھلا اس معاملے میں Interfere کرنے کا اسے حق ہی کیا ہے ۔

رائے صاحب ۔ ارے بھئی اس معاملے میں دخل دینے سے اسے کوئی تمغہ نہیں ملے گا ۔ میں اُسے اچھی طرح سمجھتا ہوں ۔

صاحب ۔ بہتر ہے آپ اُسے سمجھیئے اور وہ آپ کو سمجھے آئندہ میرے سامنے اس کا نام نہ لیجئے By Jingo اس کا Cheek تو دیکھیئے ۔

رائے صاحب ۔ اچھا بھئی Jingo مانو یا نہ مانو لیکن لڑتے کیوں ہو

ماں ۔ اور کیا ؟ ٹھیک تو کہتا ہے اُس کا مطلب کیا ہے بیچ میں دخل دینے سے ۔

صاحب ۔ سنو ماں ! تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو ۔ یہ دیکھو ابھی ایک چٹھی آئی ہے England returned لڑکے کی شرطیں کچھ الٹی سی لکھی ہیں مگر ہم ذرا سمجھا بجھا کر ٹھیک کر لیں گے ۔

رائے صاحب ۔ ہاں ہاں بھئی تم بھی سن لو کیا شرطیں ہیں جی خوش ہو جائے گا ۔ تمہارا ایک تو یہ ہے کہ میں آٹھ دس دن لڑکی کے پاس رہ کر اس کو اچھی طرح دیکھ بھال کے پھر بتاؤں گا کہ پسند ہے یا ناپسند ۔

ماں ۔ گرم گرم راکھ ڈالو ایسے شرم کے سر میں ۔ پاؤں تو رکھنے پائے یہاں ۔ وہ موا کون ہے ایسی بات کہنے والا ۔

صاحب ۔ ماں نہیں کچھ خبر نہیں یوں ہی شور نہ مچاؤ ۔

ماں ۔ بس چپ رہو ۔ گل کھلا دیا تمہاری چترائی نے ۔

صاحب ۔ ماں وہ بہت لایق ہے ۔ ولایت سے ہو کر آیا ہے ۔

ماں ۔ خاک ڈالو ان ولایت ماروں پر ۔ خبردار پھر ان کا نام نہ لینا میں جانتی ہوں ان کو ۔ بڑے کا لحاظ نہ چھوٹے کی شرم ۔ نہ آنکھ میں حیا نہ منہ کا لحاظ بیسیوں کی باتیں تو میں ابھی تم کو سنا سکتی ہوں بیویوں کو بیاہ کر چھوڑ دیتے ہیں ۔ وہ دیکھی ہے ابھی دھر کی لڑکی ولایت مارے خاوند نے دس سال سے بات نہیں پوچھی ۔ ولایت سے آتے ہوئے ساتھ ایک کھلالی سی لے آیا اب وہ نامراد گھر والی بن بیٹھی ہے ۔ اور گھر کی رانی ماں باپ کی چوکھٹ پر پڑی اس کی جان کو رو رہی ہے ۔ تمہیں کب سے میں سمجھا رہی ہوں ۔ ان کا پیچھا چھوڑ دو اور میرا کہا مانو ۔

صاحب ۔ تمہارا کہا کیسے مانوں ۔ وہ ٹھیکیداروں کا لڑکا Lilly کے قابل بھی ہے !

ماں ۔ للّی ۔ للّی ۔ للّی لئے پھرتا ہے ۔ کیا بُرائی ہے اس لڑکے میں ننھیال ددھیال اچھا ۔ اونچا خاندان ۔ نیک اصل ۔ کھاتا پیتا گھرانا ۔ اپنے مکان ، کوٹھیاں سب موجود ہیں ۔ کسی بات کی کمی نہیں ۔ ہاں ذرا ماں ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتی ۔ مگر باپ تو تمہاری منتیں کرتا پھر رہا ہے جیسے کہو ماننے کو تیار ہے ۔ خبر نہیں پھر تمہاری عقل کہاں چلی گئی ہے

رائے صاحب ۔ میں پوچھتا ہوں صرف مکانوں اور کوٹھیوں کو شہد لگا کر چاٹیں گے !

صاحب ۔ Oh! I am bothered! ارے ماں تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتیں کہ خواہ سب کچھ موجود ہے

مگر لڑکا آخر خود کیا ہے! بی اے فیل Lilli اس سال بی اے
کرے گی۔ پھر یہ کیسا جوڑ ہو!

ماں۔ چھوڑیے لڑکے! جوڑ کی بات کونسی ہے Lilli کو بھی
بی اے میں سے فیل کرا لو، خود ہی جوڑ بن جائے گا۔ اور وہ
لڑکا بھی تو پڑھنے لکھنے میں تیز ہے ان پڑھ تھوڑا ہی ہے۔
ہزاروں روپے باپ کے ساتھ مل کر ٹھیکے میں مار رہا ہے

صاحب۔ ہاں! سچ تو یہ ہے مجھے یہ MATCH پسند نہیں۔

ماں۔ بس بس اب اپنے پیچ مچانے بند کرو۔ تمہیں پسند نہیں مجھے
تو پسند ہے۔

صاحب۔ (مسکرا کر) گھبراؤ مت ماں! برس چھ ماہ تک ٹھہر جاؤ
Lilli کو امتحان پاس کر لینے دو۔ اتنے میں ولایت
سے اور لڑکے بھی آجائیں گے۔

ماں۔ (دانت پیس کر) چولہے میں جائے امتحان اور بھاڑ میں جھونکو
پڑھائی کو۔ ستیاناس ہو اس ولایت کا اور ساتھ ہی ولایت والوں
کا بھی۔ تم کو جنا تھا یا تم نے مجھے۔

رائے صاحب۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے شاباش! تم نے اسے
جنا تھا۔

صاحب۔ میری جان عذاب میں پھنس گئی ہے اور آپ کو مذاق
سوجھ رہے ہیں۔

رائے صاحب۔ بھئی تم ماں بیٹے جانو ہماری سنتا کون ہے۔

ماں۔ سن لی ہے آپ کی۔ اب ہم اپنے لڑکے سے بیٹی بیاہ دیں۔ خاندان
کو کلنک لگوا لیں۔ کچھ ہوش کی دوا کرو۔

صاحب۔ میں جاتا ہوں جی!
میری جان سخت عذاب میں ہے۔ میں تنگ آگیا ہوں!
Oh! I am damned!

ماں۔ جاتے کہاں ہو۔ میں جانے دوں گی تمہیں! اب جانا وانا
کہیں نہیں۔ یہاں بیٹھ کر بات کا فیصلہ کرو (پکڑ کر بٹھا لیتی ہے)

صاحب۔ ماں میں تم سے کہہ چکا ہوں چھ مہینے تک اور ٹھہر جاؤ
Lilli کوئی بوڑھی تو ہو نہیں گئی۔

ماں۔ اب بیس سال سے تو اوپر ہو رہی ہے اور کیا اب اس کے
منہ پر داڑھی آئے گی۔
چھ مہینے اب کوئی نہیں ٹھہرے گا۔ میں تو چھ دن چھ پل بھی نہیں
رک سکتی۔ دس بھلی مانسوں کے منہ پر تو میں اس کی ماں کے سامنے
ہاں کہہ آئی ہوں۔ اب میں کس منہ سے کہوں لڑکی کی پڑھائی تو کر دو
بند اور اگلا مہینہ بیاہ کا ٹھیرا لو۔

صاحب۔ ماں اتنی جلدی کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں کچھ نہ کروں گا۔

ماں۔ تم کچھ نہ کرو گے پر میں ضد رکھ کر کے رہوں گی مجھ سے نہیں
فکروں میں جان گھلائی جاتی۔ میری بات نہ مانو تو میرا ہی مُردہ
دیکھو (رونے لگتی ہے) تم ضد کر کے دیکھ لو میں بھی منہ کالا کر کے
کسی طرف کو نکل جاؤں گی۔ کنوئیں میں کود پڑوں گی۔

رائے صاحب۔ ہاں ہاں اس لئے کہ منہ پر سے سیاہی دھل جائے

ماں۔ آپ کی بلا سے۔ آپ نے کوئی شرم حیا رکھی ہی نہیں۔ کل کو کوئی
بات نکل گئی تو کہیں ڈوب مرنے کو جگہ نہ ملے گی پھر میری آ
یاد کر کے رو دو گے۔ اتنی جوان بیٹی گھر میں بٹھا کر پھر لگو ہیں باتیں بنانے

رائے صاحب۔ صاحب فضول ضد نہ کرو۔ اور چھ مہینے تک کوئی نئے
لڑکے تو پیدا ہو کر آ نہیں جائیں گے زیادہ انتظار کو اب رہنے دو۔
تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ زمانہ خراب ہے میری بات
مانو تو جے کشن ہی سب سے اچھا بر ہے۔

ماں۔ آپ کی بات مان لی جائے۔ کیوں نہ ہو! اور میں جو قول ہار آئی
ہوں! میرا کہا نہ مانا تو دیکھ لینا میرا خون آپ کے سر ہو گا

رائے صاحب۔ بھئی میری بات نہیں مانتے تو اسی کی مان لو۔ کہیں
سچ مچ ہی کوئی تماشہ نہ کر دکھائے۔

ماں۔ آپ کے لئے تو ہر بات تماشا ہے دوسرے کی خواہ جان
بھی چلی جائے۔

رائے صاحب۔ او۔ خدایا! میں کب کچھ کہتا ہوں

ماں۔ میں منوا کے رہوں گی۔ جب تک مان نہ لو اناج پانی کو منہ نہ
لگاؤں گی۔ تمہارے سر خون چڑھا کر مروں گی۔ تم بھی اپنی ضد
کر کے دیکھ لو۔

صاحب۔ اور تو سب ٹھیک ہے ایک صرف لڑکا England
returned نہیں یہی بڑا دکھ ہے۔ اگر اس کا Fomer
اسے England بھیجنے پر تیار ہو جائے تو Lilly
کا خرچ میں خود ادا کر دوں گا۔

رائے صاحب۔ کہہ کر دیکھ لو۔ اگر مان جائے تو۔ ولایت ہی سے جا کر
سرخاب کا پر لگوا آئے۔

صاحب BEST تو نہیں مگر خیر Second Best ہی سہی
لیکن England returned ضرور ہو جائے

رائے صاحب بس ختم ہوا قصہ!

ماں۔ اب بچہ بھابھی نہ مارنا بڑی مشکلوں سے صاحب کو راضی کیا ہے

صاحب میرا خیال ہے شادی کے بعد یہ لوگ honeymoon
یورپ ہی جا کر منائیں۔

رائے صاحب honey moon خواہ moon میں جا کر منائیں
مگر سچی بات تو یہ ہے کہ لڑکا ہے کشن کے پاسنگ بھی نہیں بہت
غلطی کر رہے ہو۔ جے کشن سا لڑکا کہیں نہ ملے گا۔

ماں۔ چھوڑ بھی دو اب جے کشن مارے کا پیچھا۔ کام ہونے دو۔

صاحب۔ ماں اب تو خوش ہوئیں؟ للّی کو ولایت بھیج دیا جائے؟

ماں۔ بیاہ کے بعد جہاں مرضی ہو بھیج دینا۔ مگر بیاہ اب جلدی سی کر دو

صاحب لیجیے صاحب اب شگون بھیج دیجیے اور باقی
arrangements شروع کیجیے۔

رائے صاحب اچھا بھئی کر دو شروع۔

صاحب۔ ماں پھر خوش ہو جاؤ۔

ماں۔ شاباش میرا بچہ تیری بڑی بڑی عمر۔

للّی کا بیاہ

دوسرا ایکٹ

سین۔ صاحب دیال ٹھیکے دار کا مکان۔ شاہ عالمی دروازے کے اندر۔ بیٹھک میں دری بچھی ہوئی ہے۔ ایک چارپائی اور دو تین کرسیاں رکھی ہیں۔ صاحب دیال ایک آرام کرسی پر لیٹا ہے۔ عمر تقریباً پینتالیس اور پچاس کے درمیان۔ بھگوتی، صاحب دیال کی بیوی قریب ہی چارپائی پر بیٹھی ہے۔ عمر چالیس سال کے قریب مگر بظاہر کچھ کم عمر معلوم ہوتی ہے۔ جسم ذرا بھاری ہے۔

وقت دوپہر

صاحبدیال۔ آج دل بہت ہی خوش ہے۔ کندن کی ماں سب کام خود بخود ٹھیک ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ بل جو مدتوں سے پھنسا ہوا تھا پرماتما نے نکلوا دیا۔ دو ہزار کی ڈالی تو نذر کرنی پڑی مگر اس کے بغیر یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ ایک طرح یہ اچھا بھی ہوا آئندہ کے لئے راہ کھل گئی۔ اب بہتیرے کام نکل جائیں گے۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ رشتہ کا فیصلہ ہو گیا اور بڑا اچھا ہو گیا۔ میں تو آج بہت ہی خوش ہوں۔ بے حد خوش۔

بھگوتی۔ خوش ہو تو ہوا کرو۔ میں نہیں جانتی تم نے کون سی جاگیر پالی ہے میرے لڑکے کو رشتوں کی کمی نہیں۔ میں رشتے میں خود لا سکتی ہوں شام سے پہلے پہلے۔ اور رشتے بھی وہ جو اندر چھوڑ باہر بھی ریل پیل کر دیں۔

صاحبدیال۔ تم کبھی میرے کسی کام سے خوش نہ ہوئیں۔ تمہاری کوئی نہ کوئی کل ہمیشہ بگڑی ہی رہی۔

بھگوتی۔ ہائیں بھلا یہ ہمیشہ کل بگڑی رہنے کا مطلب کیا ہوا۔ تمہارے کام سے میں خوش کیا ہوں خاک۔ میری بات تو تم کبھی مانتے ہی نہیں۔ جب بھی ہو اپنی مرضی کی بات کرتے ہو خواہ میں چیختی ہی رہوں۔

صاحبدیال۔ خواہ مخواہ شور نہ مچاؤ جو کچھ ہے تمہاری صلاح کے ساتھ ہو رہا ہے۔

بھگوتی۔ خاک ہو رہا ہے میری صلاح سے۔ آگے بھگت چکے ہو نا! جنوائی کشنا کی طرف سے تمام عمر کا جان کو روگ لگا لیا ہے۔ چاروں پہر پڑھا لکھا۔ پڑھا لکھا پکارا کرتے تھے۔ اب کیا دے دیا ہے پڑھے لکھے ہونے نے۔ اگر ذرا تنخواہ نہ آئے تو روٹی کے ٹکڑے کو بھی ترستے ہیں۔ میری بیٹی کی تو عمر خراب ہو گئی ہے یہی دن اس کے کھانے پہننے کے تھے اور وہ بیچاری چیتھڑوں کو بھی ترس رہی ہے ہو کیا سکتا ہے۔ سو سوا سو روپے سے آج کل کے سمے میں۔

صاحبدیال۔ تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے کشنا میری سوتیلی تھی۔ تھوڑے لڑکوں کو دیکھ چکے تھے؟ پھر اپنی دانست میں تو لڑکا اچھا ہی تلاش کیا تھا آگے کشنا کے بھاگ قسمت پہ کوئی زور نہیں۔ پھر خواہ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی اپنے گھر میں خوش تو ہے۔ دولت

نہ ہوئی لیاقت تو ہے۔

بھگوتی۔ نری لیاقت کو چاٹو جی شہد لگا کر۔ وہ لیاقت کس کام کی جس سے پیسہ نہ آئے! اور ایک مٹی ملی ساس بڑی لیاقت والی ہے دیتے دیتے ہاتھ رہ گئے ہیں جو منہ سے مانگ بھیجتی ہے دیتی ہوں پھر بھی لڑکی کو تنگ کر رکھا ہے۔ بات بات پر تکرار اٹھتے بیٹھتے طعنہ۔

صاحبدیال۔ بھئی میں نے تو صرف لڑکے کو دیکھا تھا ساس نہ دیکھی تھی

بھگوتی۔ واہ وا! اور وہ لڑکا بہت را اشراف ہے اماں کو روک نہیں سکتا کہ ہر وقت لڑکی کو کانٹوں پہ نہ گھسیٹتی رہا کرے۔ وہ تو گدھ ہے گدھ یہی کہتی ہے کہ بس جو کچھ ہو لڑکی ماں باپ کے گھر سے کھینچ لائے

صاحبدیال۔ وہ اب موت کے کنارے پہنچ چکی ہے بیٹھی تھوڑا ہی رہے گی۔ دوسرے جانتی ہے کہ دینے والے بھی دے سکتے ہیں۔

بھگوتی۔ نہ دے سکیں تب بھی دینا پڑتا ہے وہ تو مار پیٹ سے بھی فرق کرنے والی نہیں۔ پھر ہم اپنی بیٹی کی جان تو نہیں گنوا سکتے اب بملا کے لئے تو میں وہ گھر تلاش کروں گی۔ جہاں ساس نہ ہو۔ اس مٹی ملی نے تو میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے۔ جو روپیہ یہاں سے جاتا ہے دوسرے لڑکے کی پڑھائی پر لگا رہی ہے۔ جیسے ہم نے اس کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

صاحبدیال۔ بس اب چپ رہو۔ پچھلے جھگڑے کرید کر تم میرا جی ہی خراب کر دو گی۔ اگر دینے کا تم کو اتنا پچھتاوا لگ رہا ہے تو اب لے کر کسر پوری کر لینا۔ سمدھی تمہارے بہت امیر ہیں۔ جو منہ سے مانگو گی ملے گا۔

بھگوتی۔ خیر کچھ ملنا ملانا تو قسمت سے ہوگا ابھی جانے بہو رانی کیسی ہے کیسی نہیں۔ اتنی پڑھی لکھی بتا رہی ہو ممکن ہے میری کوئی بات اُسے پسند ہی نہ آئے۔ خبر نہیں مزاج کیسا ہے۔ ہم نے تو آج تک ان پڑھنے والیوں کی کوئی صفت سنی نہیں

صاحبدیال۔ باپ کی توصفتیں بیان کرتے کرتے زبان تھکتی ہے

بھگوتی۔ جی ہاں اپنے منہ میاں مٹھو ہر کوئی بن سکتا ہے معلوم تو جب ہوگا جب وہ صفت کریں گے جن کے ساتھ نباہ کرنا ہے۔ رام جانے ہیں میرا جی ذرا خوش نہیں۔ مجھے تو وہ لڑکی پسند ہے دیبی بھامل کی بیٹی ایسی سندر کہ بس ہیرا دیکھ۔ دیکھ کر جی نہیں بھرتا۔ گوری چٹی، موٹی موٹی کٹورا سی آنکھیں۔ رنگ ایسا جیسے کندن دمکتا ہے وہ لڑکی تو گھر کا سنگار ہے ساتھ لے کر چلیں تو سیروں خون بڑھے۔

صاحبدیال۔ لڑکی یہ بھی بہت سندر ہے۔ جب تمہارے گھر میں آئے گی دیکھنا تم خوشی سے پھول کر کپا ہو جاؤ گی۔ تم سمجھی کیا ہو۔

بھگوتی۔ بھامل کی جورو تو منتیں کرتی تھی وان دہیز بھی اتنا آتا کہ اندر باہر کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ چاندی کے پایوں والا پلنگ تین سو تولہ سونا اور پچاس پچاس تولے سونا لڑکی کے ماموں دینے والے ہیں۔ چار لڑکی کے چچا ہیں۔ سونے، چاندی اور ریشم، مخمل کا کوئی شمار ہی نہ رہتا۔ ہمارے دیسی طریقے کے لوگ ہیں پر اب کیا کہا جائے تم اپنے دل کی آئی کرتے ہو۔ میں تو جانتی ہوں بڑی بھول ہوئی۔

صاحبدیال۔ تم نے یوں ہی جھک جھک لگا رکھی ہے تم کیا جانو۔ ہمیں ان لوگوں سے ہزاروں اور لاکھوں کا فائدہ پہنچے گا۔ تمہیں خبر نہیں لڑکی کا دادا رائے صاحب ایگزیکٹو انجنیئر رہ چکا ہے اور اس کی وجہ سے ہمیں ایسے ایسے ٹھیکے مل سکتے ہیں کہ تمہارا بھامل ساری عمر جتنا دیتا رہے گا وہ ہمیں ایک ہی ٹھیکے سے وصول ہو جائے گا۔

بھگوتی۔ ہاں یہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے۔

صاحبدیال۔ نیک بخت! لینے دینے کے بھی کئی گُر ہوتے ہیں۔ تمہیں بس ایک پرانا طریقہ یاد ہے۔ یہ ہمارا نیا طریقہ ہے۔ رشتے تلاش ہی کس لئے کئے جاتے ہیں! بڑے خاندانوں سے ناتہ جوڑنے کا یہی تو فائدہ ہے۔ میں نے اسی لئے ان کی سب شرطیں مان لی ہیں۔ بیاہ کے بعد لڑکے لڑکی دونوں کو ولایت بھیج دیں گے۔ لڑکی کا خرچ وہ ادا کر دیں گے لڑکے کا ہم۔ دو چار ہزار اور لگ جائے گا۔ مہینے دو مہینے کے لئے جا کر سیر کر آئیں گے کوئی برس تو گذارنے ہی نہیں۔

بھگوتی۔ لو اگر ولایت بھیجنا ہے تو لڑکے کا خرچ بھی خود ہی دیں کیا دنیا دیتی نہیں؟ وہ دیکھو ہرجی مل وکیل نے بھی جنوائی کو بھیجا ہی تھا۔

صاحب دیال۔ ہرجی مل کی لڑکی بھی تو آخر اکلوتی تھی اگر بھیج دیا تو کونسی

بڑی بات کی۔ اور نہیں تو اس سے بھی بڑھ کر فائدہ پہنچے گا۔ تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ صاحب کی مرضی ہے بلکہ میں نے خود بھی کہا تھا کہ کندن لعل ولایت ہو آئے اور وہاں کے بیوپار کا رنگ ڈھنگ بھی اچھی طرح دیکھ لے پھر آکر صاحب کے کام میں حصہ دار بن جائے ان کے ولایتی مال کا کام منڈی سڑک پر اتنا چل رہا ہے کہ ہزاروں کی آمدنی ہے تمہیں اور کیا چاہئے

بھگوتی۔ یہ تو سب دل بھلاوے کی باتیں ہیں اور آگے خیر سے کندن لعل کون سا خالی بیٹھا ہے۔

صاحب دیال۔ تم تو کسی طرح بھی خوش نہ ہوگی۔ اور ہاں سنو ایک اور بات بھانامل کی لڑکی خواہ تمہیں کتنی ہی پسند ہو کندن کو پسند نہیں آئے گی۔

بھگوتی۔ کیوں؟ وہ کوئی لولی لنگڑی ہے؟ ویسی لڑکی تو سارے شہر میں ڈھونڈو تو نہیں ملے گی۔ واہ! واہ!! کیسی بات کی ہے

صاحب دیال۔ خوبصورت خواہ کتنی ہی ہو پڑھی لکھی تو ہوگی نہیں ادھر لڑکے پڑھی لکھی فیشن ایبل کے سوا بات نہیں کرتے۔ کندن لعل بہت خوش ہے۔

بھگوتی۔ لو اور سنو! لو وہ کوئی ان پڑھ ہے۔ پانچویں جماعت پاس کر چکی ہے۔ ایسی اچھی کہا ماننے والی، گھر کے کام دھندے میں ہشیار سلیقہ مند یہ بہت پڑھی لکھی لڑکیاں تو ہاتھ سے تنکا نہیں توڑتیں۔ کام کا نام لیا جائے تو سو سو حجت کرتی ہیں بھو کے بیٹھے رہنا منظور پر ہاتھ سے توے پر روٹی ڈال دینا عیب۔ نہ کسی کا خوف نہ کہے سنے کا ڈر۔ ہم بہتوں کی باتیں سن چکے ہیں۔

صاحب دیال۔ تم ٹھیک کہتی ہو خود جوان پڑھ ہوئیں۔ بھئی ہمارے دل ہی میں گٹ پٹ کرنے والی جورو کا ارمان ہی رہ گیا۔

بھگوتی۔ اتنا کڑھتے کیوں ہو آؤ تم بھی ایک گٹ پٹ کرنے والی۔ تمہیں بھی مزہ آجائے۔ وہ وہ باتیں ان گٹ پٹ ماریوں کی سن چکے ہیں کہ توبہ بھلی۔ تم مرد کیا جانو۔

صاحب دیال۔ مردوں کے لئے اور تھوڑے دھندے ہیں وہ تو کام میں لگے رہتے ہیں۔ عورتیں ہوئیں نکمی بس سارا دن بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر کے لوگوں پر باتیں بناتی رہتی ہیں اچھا اب باقی باتیں پڑوسن کے ساتھ کر لینا مجھے یہ بتاؤ کہ کون کون سے کمرے ان کے لئے خالی کر دیئے جائیں تاکہ جس طرح لڑکی ماں باپ کے گھر میں رہتی ہے اس طرح یہاں بھی رہ سکے۔

بھگوتی۔ واہ یہ اچھی بی بی ہے جو آتے ہی الگ کمرے مانگے گی۔ پھر میرا کام خاک کرے گی! بھلا مجھے منھی چاپی تو کیا کرے گی۔ الٹی مجھ سے خدمت لے گی۔

صاحب دیال۔ بلکہ صاحب کو کہتا ہے کہ شہر سے باہر کوٹھی لے لو

بھگوتی۔ یہ اچھی ہوئی۔ کل کو صاحب کہے گا تم بھی ولایت میں جا رہو کوٹھی و وٹھی والی بات مشکل ہے۔ مفت میں کرایہ برباد کرتے پھریں۔ یہ گھر کیا کاٹتا ہے؟

صاحب دیال۔ کرایہ برباد کرنے کی ضرورت کیا ہے اپنی کوٹھی خالی کرا لیں گے۔

بھگوتی۔ اور وہ ڈیڑھ دو سو روپے کی بندھی رقم جو کرائے میں آتی ہے مفت میں جائے۔ میں تو کبھی وہاں اجاڑ بیابان میں جا کر نہ رہوں گی۔ ساتھ آس نہ پڑوس۔ پاس کوئی بات کرنے والا نہ دم بھرنے والا۔

صاحب دیال۔ بس تمہیں تو ہر وقت باتوں کی پڑی رہتی ہے یہ نہیں سوچتیں کہ کام ہو جانے دوں۔ وہاں رہنا ناپسند ہوا تو پھر واپس یہیں آجانا۔

بھگوتی۔ بس لے دے کر اسباب ہی ڈھونے میں لگے رہیں۔

صاحب دیال۔ جس وقت کندن ولایت سے ہو کر آگیا وہ بھی صاحب بن جائے گا۔ پھر وہ کب گلیوں میں رہنا پسند کرے گا۔ مجھے تمہارے ساتھ کتنا مغز مارنا پڑتا ہے۔ تم اپنا کوئی نفع یا نقصان سوچ ہی نہیں سکتیں میں نے کہا تھا کہ آج میرا دل بہت خوش ہے، سو تم خراب کر کے رہیں۔ تم سے تو بات کرنا بھی......

بھگوتی (بات کاٹ کر) اتنے تنگ کیوں آ رہے ہو لو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔

صاحب دیال۔ جاتی کہاں ہو مجھ سے کچھ صلاح نہ کرو گی؟

بھگوتی۔ صلاح کروں گی! خاک۔ تم تو بس ملامت شروع کر دیتے

ہو۔ بات کرتے بھی ڈر لگتا ہے تم سے۔ باتوں باتوں میں
دوسرے کی عزت اتار دیتے ہو۔ ایسا کرنا ہو تو پھر صلاح
کی ضرورت کیا ہے؟ خود ہی جو جی میں آئے کرو اور خود
ہی بھگتو۔ میں اس بات میں دخل ہی نہ دوں گی (اٹھ کر جانے
لگتی ہے)

صاحب دیال۔ بیٹھ جائیے مہاراج اتنی خفگی کس بات پر ہو گئی

بھگوتی۔ جی نہیں۔ تمہارا جی خوش تھا میں نے خراب کر دیا میں جاتی
ہوں۔ اب بیٹھے خوش ہوتے رہو خواہ اٹھ کر ناچ بھی لو۔

صاحب دیال۔ اس وقت آپ کا پارہ بہت چڑھ گیا ہے۔ اچھا
یہ بات پھر سہی اب کوئی اور بات کریں گے۔

(باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

کون ہے؟ (باہر جا کر دیکھتا ہے) آئیے آئیے (بھگوتی سے)
جائیے مہاراج کوئی ملنے کے لئے آیا ہے۔ اور یہ چلم بھی لیتی جاؤ
تلسی کے ہاتھ اسکو بھر کر بھیج دینا۔ ذرا دبا کر بھرنا۔

(بھگوتی چلی جاتی ہے اور جے کشن اندر آتا ہے)

جے کشن۔ نمستے۔

صاحب دیال۔ نمستے۔ آئیے تشریف رکھئے۔ کیسے آنا ہوا؟

جے کشن۔ جناب آپ سے ایک ضروری بات کہنے کے لئے آیا ہوں

صاحب دیال۔ خوش آمدید۔ شوق سے کہئے۔ ایک چھوڑ دس
باتیں کہیئے۔

جے کشن۔ (جھجک جھجک کر) جناب معاف فرمائیے بات بہت
private ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا مگر بغیر کہے رہ
بھی نہیں سکتا

صاحب دیال۔ اوہو!! وہ کونسی ایسی بات ہے۔ کہئے! جلدی
کہیئے پھر دیر کیوں کرتے ہیں۔

جے کشن۔ جناب عرض تو یہ ہے کہ پہلے آپ اس بات کو بالکل
confidential رکھنے کا وعدہ کیجئے۔

صاحب دیال۔ میں وعدہ وغیرہ کچھ نہیں کرتا البتہ بات
confidential ہوئی تو confidential
ہی رکھی جائے گی۔ یہ تو سننے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے آپ
بات تو کہئے۔

جے کشن۔ میں ابھی سب عرض کئے دیتا ہوں مگر پہلے آپ وعدہ کیجئے
کہ یہ بات کسی دوسرے کے کانوں تک نہیں پہنچے گی کیونکہ
اس میں بہت سے لوگوں کی Reputation اور
Happiness کا سوال ہے۔

صاحب دیال۔ صاحب من۔ آپ بات تو کہئے کچھ معلوم تو ہو؟

جے کشن۔ آپ مہربانی فرما کر صرف اتنی assurance دے دیں
تو میں عرض کرنے کی جرات کروں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔
کہ بات نہایت ضروری اور آپ کے فائدے کی ہے۔ پرماتما
جانتے ہیں کہ میں بالکل نیک نیتی سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں

صاحب دیال۔ ہمارے فائدے کی بات ہے کہئے پھر جلد۔ کتنا فائدہ ہو گا؟ اچھا میں
promise کرتا ہوں کہ اسے بالکل secret کی طرح رکھوں گا۔ بتائیے جلدی کیجئے

جے کشن۔ آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ کیوں میں اسے
confidential رکھنے کے لئے اتنا زور دے رہا ہوں۔

صاحب دیال۔ بہت بہتر کہئے اب۔ بات کیا ہے؟

جے کشن۔ آپ اپنے بیٹے کی betrothal کر چکے ہیں؟

صاحب دیال۔ کر تو چکے ہیں مگر اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟

جے کشن۔ میں ابھی سب کچھ سمجھائے دیتا ہوں۔ مگر مختصر یہ کہ شادی بالکل نہ کیجئے۔

(بھگوتی اندر کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ صاحب دیال اٹھ کر اس
سے چلم لیتا ہے اور پھر دروازہ بند کر دیتا ہے۔ بھگوتی دروازے کے
پیچھے کھڑی ہو کر چپکے سے باتیں سننے لگتی ہے)

صاحب دیال۔ واہ یہ کیا بات ہوئی۔ شادی تو ہم ضرور کریں گے۔
آپ کون ہیں؟

جے کشن۔ میں سب بتائے دیتا ہوں patiently سنئے۔

صاحب دیال۔ Patiently پیشنٹلی کیا! آپ بات ختم کیجئے
زیادہ بڑھانے سے کیا مطلب؟ جلد بتائیے۔

جے کشن۔ مختصر یہ کہ سگائی لڑکی کی مرضی کے خلاف ہے۔

صاحب دیال۔ اچھا!!! آپ لڑکی کے کون ہیں آپ کو کیسے خبر
ہوئی؟

جے کشن۔ میں لڑکی کا کچھ نہیں ہوتا مگر مجھے خبر ضرور ہے۔ میں ایک اور
جنٹلمین کی طرف سے آیا ہوں۔ کیونکہ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے
ہوئے وہ خود آنا ذرا ناپسند کرتے تھے۔

صاحب دیال۔ غضب خدا کا!! آپ مطلب کی بات کیجئے۔ میں بہت puzzle ہو رہا ہوں۔

جے کشن۔ patiently سنئے میں سب کہہ دوں گا۔

صاحب دیال۔ میں تو patiently ہی سنوں گا آپ بھی مہربانی کر کے briefly بیان کر دیجئے۔

جے کشن۔ اپنا وعدہ مت بھولئے۔ بات کو بہت confidential رکھئے۔ کیونکہ لڑکی کا future اب آپ کے اختیار میں ہے۔

صاحب دیال۔ جناب میں promise کرتا ہوں قسم ہے مجھے جیسے کہیے گا ویسے ہی مانوں گا۔ مجھ سے اصل بات کہئے

جے کشن۔ بات briefly یہ ہے کہ لڑکی کا attachment کسی دوسری جگہ ہے۔ والدین کو اس کی خبر نہیں۔

صاحب دیال۔ آپ کے ساتھ attachment ہے!

جے کشن۔ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے! آپ خود ہی سوچئے کہ اگر میرے ساتھ ہوتا تو میں آپ کے سامنے حاضر ہونے کی جرات کر سکتا تھا میں تو کسی اور کے behalf پر آیا ہوں۔ لڑکی اس شادی کے بالکل خلاف ہے۔

صاحب دیال۔ خلاف ہے تو اپنے ماں باپ سے کیوں نہیں کہہ دیتی۔

جے کشن۔ لالہ جی! لڑکیاں بہت shy ہوتی ہیں۔ مگر شاید ضرورت ہو تو کہہ بھی دے۔ آخر کبھی نہ کبھی تو کہنا پڑے گا۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ آپ اس معاملے میں قدم آگے مت بڑھائیے۔ کیونکہ آخر کار اگر لڑکی کو کہنا ہی پڑا تو آپ کے لئے بہت awkward ہو جائے گا۔ اور مفت میں scandal ہو گی۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں دونوں پارٹیوں کے فائدے کو سوچ کر پورے good faith میں عرض کر رہا ہوں۔ آگے آپ مرضی کے مالک ہیں آپ کا اختیار ہے

صاحب دیال۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ذرا کھل کر بات کیجئے۔ غضب! غضب!! اتنا بڑا family یہ ہو کیسے سکتا ہے!

جے کشن۔ اس میں بڑے یا چھوٹے family کا سوال ہرگز نہیں البتہ مجھے آپ کے ساتھ پوری sympathy ہے مگر plain fact یہ ہے کہ لڑکی کسی اور سے love کرتی ہے

صاحب دیال۔ مجھے یقین کیسے آئے میں حیران ہوں۔

جے کشن۔ مجھے نہایت ہی افسوس ہے۔ آخر مجھے آپ کے ساتھ کوئی عداوت تو ہے نہیں نہ کسی اور کے ساتھ دشمنی ہے۔ میرا اپنا بھی کوئی خاص motive نہیں۔ پھر آپ بے دھڑک میری بات کا یقین کیوں نہیں کر لیتے۔

صاحب دیال۔ غضب کرتے ہیں۔ آپ آخر جو step لینے کے لئے آپ مجھے کہہ رہے ہیں اس کے لئے میری اتنی satisfaction بھی تو ہونی چاہئے۔ کچھ تو details دیجئے

جے کشن۔ مجھے زیادہ details دینے کی تو اجازت نہیں مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لڑکی کی ایک جنٹلمین کے ساتھ خط و کتابت ہے تقریباً دو سال کے عرصہ سے۔

صاحب دیال۔ ہائیں! جنٹلمین سے خط و کتابت!! یہ خوب جنٹلمین ہے جو لوگوں کی لڑکیوں سے خط و کتابت کرتا پھرتا ہے۔ جنٹلمین ہے یا لفنگا بے ایمان۔ بدمعاش

جے کشن۔ بندہ پرور! میرے منہ پر تو میرے دوست کو insult نہ کیجئے۔ کم از کم میں بہت feel کرتا ہوں۔ مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آگے جناب مختار ہیں۔ صرف اتنا کہے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے شادی کر لی تو اس جنٹلمین کے لئے، لڑکی کے لئے، آپ کے لئے، غرضکہ ہر ایک کے لئے اچھا نہ ہوگا۔

(بھگوتی دروازہ کھول کر جھٹ اندر آ جاتی ہے)

بھگوتی۔ ہم نہیں کرتے شادی وادی۔ وہی جنٹلمین کرتا پھرے ایسی میم کر

جے کشن (سٹپٹائے) اب مجھے تو اجازت دیجئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ناحق آپ کو آن ستایا۔ نمستے!

بھگوتی۔ بہت اچھا کیا بھیا! جو ہمیں وقت پر آن بتایا۔ بھلا ہو تمہارا وہی کرے شادی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔

(جے کشن چلا جاتا ہے)

دیکھ لیا۔ دیکھ لیا تم نے سائے قہر۔ یہ بڑے گھروں کا حال ہے ہائے آگ لگے ان پڑھائیوں کو اور چولہے میں جائیں یہ سکول میں کیا کہا کرتی تھی! ہوئی نا آخر میری بات سچ۔ ان پڑھی ماریوں کی ہر روز نئی سے نئی بات سننے میں آتی ہے۔ بھلی خاک جھونک دی ہے اس نے



مصر عشق

ماں باپ کے سر میں۔ شکر ہے کہیں ہم اپنے گھر میں نہیں لے آئے

صاحب دیال۔ خبر نہیں سچ ہے یا جھوٹ کیا ہے کیا نہیں! پوچھ گچھ کرنے سے کچھ معلوم ہوگا۔

بھگوتی۔ جھوٹ کچھ بھی نہیں۔ سب سچ ہے رتی رتی سچ!! ان پڑھنے والیوں سے کچھ دور نہیں۔ شکر ہے میرا لڑکا اس کلنک سے بچ گیا۔ اب پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں۔ وقت بے وقت کچھ نہ دیکھو۔ ابھی جاؤ جا کر توڑ آؤ رشتہ۔ شگون واپس کر دو۔ کہو پاس ہی رکھیں ایسی بہو کو۔

صاحب دیال۔ اتنی جلد بازی نہ کرو سب باتوں کا پتہ نکال لیتے ہیں۔

بھگوتی۔ کوئی ضرورت نہیں کسی بات کا پتہ نکلنے کی۔ واپس کر دو شگون ورنہ میں چولھے میں آگ نہ سلگنے دوں گی۔ بھوکے بیٹھے رہو۔ بس میں نے کہہ دیا۔

صاحب دیال۔ لو بھئی یہ اچھی رہی!!!

(پردہ گرتا ہے)

للی کا بیاہ

تیسرا ایکٹ

سین۔ نیو روڈ پر وہی مسٹر کوپر کی کوٹھی۔ وہی ڈرائنگ روم اس وقت غیر معمولی طور پر آراستہ ہے۔ کیونکہ آج کنول کماری کی سالگرہ کی تقریب پر یہاں ٹی پارٹی ہے چھوٹی میزوں پر چائے کا سامان لگا ہے۔ ایک طرف ہارمونیم رکھا ہے۔ کنول اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھی چائے، کیک، پیسٹری وغیرہ سے ان کی تواضع کر رہی ہے۔

وقت تقریباً چار بجے سہ پہر

کنول۔ ایک اور کپ (CUP) پیو سمتو!

سمترا۔ نہ بھئی پہلے ہی دو پی چکی ہوں۔

شانتی کو پھر کیا ہوا! سنجوگتا کی شادی پر جب تم نے چار پئے تھے۔

سمترا۔ ہاں بھئی کسی کو سنجوگتا کا خط بھی آتا ہے یا نہیں مجھے تو اس نے کوئی نہیں لکھا۔

شانتی۔ اب اُسے خط لکھنے کا Time ہی کہاں ملتا ہوگا! دوسرے اب وہ سنجوگتا تھوڑی ہی رہ گئی ہے وہ تو بن گئی اب بہت بڑی important Lady اس نے اپنی cousin کو خط

لکھا تو Mrs. R. N. Luthra I.M.S کیا sign

اُشا۔ وہ خود ہی Asif I.M.S بن گئی ہے۔

سمترا۔ تو بہت Happy ہوگی؟

بلونت کور۔ position کا خیال کر کے ہو تو ہو۔ ورنہ Luthra Sahib کی تو صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ ہم نے دیکھا تھا اُس وقت موٹا۔ بھدا کالا۔ جیسے کا تھیلا۔

سمترا۔ اونہہ۔ اور اس کی اپنی شکل بہت اچھی ہے! ایک آنکھ بڑی ایک چھوٹی۔ لمبی لمبوتری تپلی تینگ۔

شانتی۔ وہ اپنے بالوں کی اتنی proud ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو

بلونت۔ پھر اُس کا تو تھوڑا بھی اپنے خصم ہونے کا بہت proud ہوگا۔

اُشا۔ تو تم تو کسی کو پسند ہی نہیں کرتیں۔

بلونت کور۔ افسوس! افسوس!! وہ خصم پرشاد نہیں بہت پسند تھا مگر سنجوگتا لے گئی۔

I Sympathise with you

اُشا۔ چپ! You naughty

شانتی۔ میرا خیال ہے کہ خود سنجوگتا بھی اسے زیادہ پسند نہیں کرتی۔

سمترا۔ کیوں اتنی بڑی position ہے I.M.S. یا I.C.S. سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کوٹھی اور موٹر کار تو ضرور ہوگی!

شانتی۔ نہیں سمتو! شکل تو ضرور ناپسند ہوگی اتنا تو میں کہہ سکتی ہوں کیوں کنول! جب ہم شادی سے پہلے اس سے ملنے کے لئے گئے تھے تو کیا کہا تھا اس نے!

کنول۔ Oh! That was awfully funny!

بلونت کور۔ بھئی ہمیں بھی تو بتاؤ کہتی کیا تھی!

اُشا۔ Yes, Lilly! I like to hear that!

کنول۔ جی نہیں میں نہ بتاؤں گی کیوں خواہ مخواہ بیچاری کا مذاق اڑائیں

سمترا۔ شانتی! تم بتا دو۔ پھر ایک بات میں بھی سناؤں گی۔

بلونت کور۔ چلو تم بتاؤ پہلے۔

سمترا۔ نہیں پہلے للی یا شانتی دونوں میں سے کوئی بتلائے پھر میں بتاؤں گی

شانتی۔ واہ تم کیوں نہ پہلے بتاؤ!

بلونت کور۔ نہیں شانتی! تمہیں نے پہلے کہا تھا اب تم ہی پہلے بتاؤ

سمترا۔ That's right! That's right!

شانتی۔ ملو بلا! میں نے کہا "سنجو گتا" ایہیں ذرا جیجا کی فوٹو تو دکھاؤ

سنا ہے بہت خوبصورت ہیں۔

بلونت کور۔ تم بہت naughty ہو شانتی۔

شانتی۔ تو اور میں کیا کہتی بہت بدصورت ہیں۔

سمترا۔ اچھا آگے؟

شانتی۔ سنجو گتا فوٹو دکھانے سے بہت شرماتی تھی کہنے لگی

Oh, who told you that? He is'nt at all handsome!

میں نے کہا اچھا نہ دکھاؤ۔ پھر میں تمہاری

شادی ہی میں نہ آؤں گی

بلونت کور۔ پھر دکھایا یا نہیں؟

شانتی۔ بھلا میں بغیر دیکھے اُسے چھوڑ سکتی تھی

وہ فوٹو لے ہی آئی اور ہمارے ہاتھ میں دے کر خود منہ پھیر

لیا اور بولی Oh! I am very disappointed in him!

سمترا۔ فوٹو میں سے تو کچھ ایسا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا

شانتی۔ وہ تو کئی دفعہ interview بھی کر چکی تھی۔

بلونت کور۔ اچھا! Very, very disappointed

تم نے پھر کیا کہا؟ Very, very sad

شانتی۔ میں نے بہت praise کیا اور کہا تم بہت

lucky نکلیں۔ یہ تو بہت ہی خوبصورت ہیں۔ اور

مجھے خبر ہے تم دل میں اپنی بہت like کرتی ہو۔

اور ہمارے سامنے دکھاوے کے لئے pretend

کر رہی ہو۔

بلونت کور۔ تم بہت naughty ہو شانتی

شانتی۔ بلو! بس! مجھے بار بار Naughty! Naughty!

نہ کہا کرو۔ بھلا اور میں کہتی کیا؟

بلونت کور۔ چلو سمترا اب تم بولو!

سمترا۔ ابھی اب اور کوئی بات شروع کرو سنجو گتا کا ذکر چھوڑو۔

بلونت کور۔ تم پہلے بات تو سناؤ وہی۔

سمترا۔ بات کوئی تھی ہی نہیں! God کی قسم میں تو صرف شانتی

کی بات سننے کے لئے کہہ رہی تھی۔

اُشا۔ ابھی نہ تو ممتاز آئی نہ رضیہ۔ LILLY تم نے بلایا نہیں ان کو

کنول۔ اُشا بلایا کیوں نہیں! بلکہ میں تو کل remind بھی

کرا چکی ہوں۔ رضیہ کو۔ اور ممتاز کو ابھی فون کیا تھا کہتے ہیں گھر

سے چل پڑی ہے۔

بلونت کور۔ رضیہ ویسے تو دیر لگانے والی نہیں۔ کہیں بھول نہ گئی ہوں

(ممتاز اور رضیہ آجاتی ہیں)

(سب مل کر) ممتاز You are late! No tea for you

ممتاز۔ LILLY بہت بہت مبارک۔ افسوس مجھے دیر ہو گئی۔

گاڑی باہر چلی گئی تھی۔ دوسرے مجھے رضیہ کو بھی ساتھ لانا۔

رضیہ۔ مبارک صد مبارک! LILLY دیر اس لئے ہو گئی کہ

Auntie آ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

کنول۔ Thanks for coming تم نہ آتیں تو میں نہایت ہی

disturbed ہوتی۔

بلونت کور۔ میں تو سمجھی کہ شاید بھول گئیں۔

ممتاز۔ ایسے مبارک دن کو کون بھول سکتا ہے۔ مگر ہماری گاڑی

کو آتے آتے دیر لگ گئی۔

(کنول ان کو چائے نکال کر دیتی ہے)

کنول۔ تم سناؤ اب اشا! وہ رکھا ہے باجا۔

اُشا۔ LILLY پہلے تم خود سناؤ۔ تمہیں معلوم ہے میں اچھی طرح جانتی

بھی نہیں۔

بلونت کور۔ اش! یوں ہی نخرے نہ کرو۔ خود ہی ہمیشہ شیخی بگھارا کرتی

ہو اور اس وقت جان تول دکھانے لگی ہو۔

کنول۔ اش جلدی کرو۔ ابھی تمہیں میری ہی قسم۔

شانتی۔ اش یہ کیا بات ہوئی تھی؟

ممتاز اور باقی سب۔ اُش۔ اش ضرور ضرور ضرور

سب شور مچاتی ہیں رضیہ فوراً اپنی استانی کی نقل اتار کر لڑکیوں

کو ڈانٹتی ہے

رضیہ۔ No noise, you silly girls۔ اش پیاری

اش ضرور میری خاطر۔

اُشا۔ پھر LILLY بھی سنائے گی!

ممتاز۔ سنائے گی کیوں نہیں۔ بیرا ذمہ رہا۔

کنول۔ پولا (ایک مشہور ایکٹرس) ضد نہ کیا کرو۔ سناؤ واب۔

اُشنا۔ بھئی مجھے Polal Polal نہ کہا کرو۔

کنول۔ کیوں بُرا ہے نہیں اس کی شکل BolaNegri کی طرح آنکھیں تو بالکل اسی کی ہیں۔

بلونت کور۔ یہ تو ہو بہو Pola Negri ہے

اُشنا۔ (بگڑ کر) Lilly!! don't like that!

کنول۔ اچھا بھئی چلو معاف کر دو اور سناؤ۔ جیا مورا الہرائے ہے۔

بلونت کور اور شانتی۔ اُشن جلد سناؤ۔ ورنہ ہم سب تمہیں کلاس میں بنائیں گے۔

(اشا سناتی ہے۔ اس کے ختم کرنے پر سب تالیاں بجاتی ہیں)

اُشنا۔ Lilly اب تمہاری باری ہے۔

باقی سب Please, Lily, yes, yes.

(کنول گاتی ہے "جنگل کی ڈالی سنونتی۔ لاجونتی۔ موہنی۔ کامنیاں"

کنول کا گانا ابھی ختم نہیں ہوا کہ بڑی ماں نے آکر ٹوک دیا)

بڑی ماں۔ کولاں ری اب بس نہ کرے گی یہ ٹیں ٹیں۔ سارا دن تجھے یہی کام ہے۔

کنول۔ ٹیں ٹیں! What noise! تمہیں ٹیں ٹیں سے کیا۔ جاؤ نہیں بس کرتی۔ خواہ مخواہ ہر وقت کی روک ٹوک سے مطلب کیا ہے

ماں۔ ہیں! دیکھو اس کا مزاج۔ کرے گی اب تیری ساس تجھے سیدھا۔ اسی کے قابو میں آئے گی تو۔

کنول۔ (Shut up!) چپ۔ جاؤ اب یہاں سے۔

(زور سے باجہ بجاتی ہے)

ماں۔ دیکھو تو کیسے بولتی ہے؟ ہے اسے کسی کا لحاظ؟

کنول۔ No Lihaz, please

Right about turn. Quick march

(ساتھ ہی اُٹھتی ہے اور دادی کو پکڑ کر اس کا منہ دروازے کی طرف پھیر دیتی ہے۔ سہیلیوں میں سے بلو اور شانتی منہ چھپا کر مسکراتی ہیں اور ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے)

ماں۔ (جاتے جاتے) آگ لگے تیری انگریزیوں کو۔

کنول۔ بس معاف کرو معاف۔ جاؤ اب تشریف لے جاؤ۔

بلونت کور۔ آؤ اب ذرا چل کر بیڈمنٹن کھیلیں۔

کنول۔ تم لوگ چلو میں تو اب ضرور کچھ دیر یہاں بیٹھ کر باجا بجاؤں گی۔ بڑی بی کو ذرا اچھی طرح تنگ تو کر لوں بلو تم لوگ جاؤ میں ذرا دق کر لوں Granny کو ممتاز تم میرے پاس ٹھہرو۔

(کنول اور ممتاز کے سوائے سب چلی جاتی ہیں)

ممتاز۔ کنول ختم کرو اب باجا سنو تو Granny یہ ساس ساس کیا کہہ رہی تھیں!

کنول۔ (بدھاں کو آواز دیتی ہے) Just wait! مائی! مائی! مائی بدھاں!

بدھاں۔ جی بی بی

کنول۔ یہ اٹھا کر لے جاؤ سب چیزیں۔ جلدی۔

(کنول باجا بجائے جا رہی ہے اور بدھاں اکٹھی کر کے لے جاتی ہے)

ممتاز۔ اب بتاؤ مجھے سب بات Lilly I am dying to know it!

کنول۔ ممتاز کیا بتاؤں "فادر" شادی کے سامان میں لگے ہیں مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں کیا کروں۔

ممتاز۔ تم Mother سے کیوں نہیں frankly کہہ دیتیں

کنول۔ مدر کو پوچھتا کون ہے کوئی ان کی سنتا ہی نہیں۔ وہ تو اسی لئے بالکل indifferent ہیں۔ یہاں تو بس Granny مختار ہیں جو چاہیں کریں۔ دوسرے میں اپنی زبان سے کچھ کہنا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے شرم آتی ہے۔

ممتاز۔ یہ تو بہت awkward مگر تم کہو تو میں کسی طرح بات کھولوں۔

کنول۔ No! No! No! اس کا نتیجہ ہمارے لئے کسی طرح اچھا نہ ہو سکے گا۔ اس وقت Grandfather بالکل ہمارے favour میں ہیں۔ وہ اُن سے بہت اچھی طرح impress ہو چکے ہیں۔ خبر ہو گئی تو وہ بھی ناراض ہو جائیں گی پھر کوئی chance ہی نہ رہے گا۔

ممتاز۔ تو Grandfather کی بات بھی نہیں مانتے؟

کنول۔ نہیں۔ کہتے ہیں۔ وہ بہت poor ہیں family
اعلیٰ نہیں۔

ممتاز۔ مگر کنول جو کچھ تم مجھے اب تک بتا چکی ہو اس سے تو یہی
ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔

کنول۔ ٹھیک ہو یا غلط۔ مگر ممتاز Money is not
everything!

ممتاز۔ پھر بھی Parents کو خیال تو ضرور ہوتا ہے۔

کنول۔ ممتاز مجھے تو اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔ مجھے ان میں بہت
faith ہے۔ اگر مجھے کبھی ذرا بھی کچھ خیال آئے تو انہیں دیکھتے
ہی فوراً سب بھول جاتی ہوں۔ کیوں ممتاز تمہارا کیا خیال ہے
تم نے بھی تو دیکھا تھا جب Intercollegiate
depar ہوئی تھی۔

ممتاز۔ He is very, very handsome!

کنول۔ And he is so clever, too!

ممتاز۔ میرا brother انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔
ہمیشہ ان کی تعریف کرتا ہے۔ اس دفعہ کے کالج میگزین میں
ان کا ایک بہت اعلیٰ آرٹیکل نکلا ہے۔ تم نے دیکھا یا نہیں۔

کنول۔ آخر ہمیشہ تو poor نہیں رہیں گے ممتاز! مجھے اس بات
سے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ میرا دل تو کہتا ہے کہ سب
ٹھیک ہے۔

ممتاز۔ Lilly پھر تم boldly اپنے Parents سے
کیوں نہیں کہہ دیتیں۔

کنول۔ ممتاز کیا کیا جائے۔ نہ مجھے یہ حوصلہ ہو سکتا ہے نہ انہیں
ان کی بہت awkward situation ہے۔

ممتاز۔ بھئی یہ بات کتنی funny ہے کہ Granny
اپنی صلاح کریں Grandfather اپنی
Father اپنی اور جس کی شادی ہو رہی ہے۔ اُسے
consult ہی نہ کیا جائے۔

کنول۔ Education on its own fill اتنی
کرانے سے مطلب کیا ہوا کہ ہمیں Treat اس طرح کیا
جائے گویا ہماری کوئی will ہی نہیں۔ جیسے ہم بالکل
ہی ILLITERATE ہیں۔

ممتاز۔ تم دونوں کی آخر کچھ نہ کچھ plans تو ضرور ہوں گی
That's to say, you are bon anima

کنول۔ ممتاز جب ہمیں Father کے فیصلے کی خبر ملی تو بہت
پریشانی ہوئی۔ ایک دن شام کے وقت میں walking
کے بہانے سے باہر چلی گئی۔ ادھر وہ بھی پہلے ہی سے وہاں
پہنچ چکے تھے۔ کشمیر روڈ پر کوئی گھنٹہ بھر ہم نے situation
کو discuss کیا۔ ممتاز وہ dejected تھے
اس قدر کہ میں کیا بتاؤں۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں serious
بھی ہوں یا ویسے ہی play کر رہی ہوں۔ ممتاز Dear
اس وقت میں نے بہت hurt feel کیا۔

ممتاز۔ Naturally!

کنول۔ لیکن میں انہیں blame نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ایک تو
انہیں اپنی position کا خیال ستا رہا ہوگا۔ دوسرے وہ
اپنے parents کے ساتھ جو quarrel کر چکے
ہیں سب میری وجہ سے ہے۔ ممتاز میں اپنے feelings
تم سے کہہ نہیں سکتی۔ خواہ Father نے سب کچھ میری مرضی
کے خلاف کیا۔ پھر بھی میں کچھ نہ کچھ guilty ضرور فیل
کر رہی ہوں

ممتاز۔ I sympathise with you, both

کنول۔ ممتاز آخر میں نے کہہ دیا کہ مجھ سے جیسے بھی کہو ماننے کو تیار ہوں
لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ یہ سن کر وہ بہت
buck up ہو گئے اور بولے then, there
is yet hope for us! سب سے اول تو کوئی ایسی تدبیر
ہونی چاہئے جس سے یہ شادی کسی طرح رک جائے۔ بعد میں پھر دیکھا
جائے گا۔ ہم دونوں ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ وہ بولے کہ لو مجھے
ایک brain-wave آئی ہے اس سے اگر شادی نہ بھی
رک سکی تاہم کچھ گڑبڑ ضرور ہو جائے گی۔ میں نے کہا بتائیے نہ پھر
ویسے ہی کیا جائے۔ بولے ہے تو ٹھیک مگر ذرا sneaking
سا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دوبارہ پوچھا تو کہنے لگے کہ اگر ٹھیکیدار
کو سب حالات confidentially بتا دئے جائیں تو وہ

ضرور شادی کرنے سے رک جائے گا۔ اب سوال یہ ہوا کہ اُسے جاکر
بتائے کون؟ ایک Anonymous Letter لکھا تو ضروری
نہیں کہ وہ یقین کرلیں۔ دوسرے وہ خط لکھنے کو پسند بھی نہ کرتے
تھے۔ آخر میں نے کہا خواہ نتیجہ برا ہو خواہ بھلا آپ خود ہی جائیے
میری طرف سے اجازت ہے۔ جیسے مناسب ہو بات کھول
دیجئے۔ مگر بہت cautiously وہ کسی طرح نہ مانتے
تھے لیکن میں نے زور دے کر کہا کہ اور تو کوئی HELP
اب باقی رہی نہیں پھر مجھ سے کہنے لگے اگر گھر میں کسی کو خبر ہوگئی اور گھر
والوں نے کچھ پوچھا تو بالکل چپ رہنا کسی بات کا جواب نہ دینا۔

ممتاز۔ پھر کیا ہوا گئے تھے ملنے کو؟

کنول۔ مل تو چکے ہیں اور اُن کے گھر میں کچھ گڑبڑ بھی ہوگئی ہے۔ مگر ابھی
کچھ خبر نہیں آگے کیا ہو کیا نہ ہو۔

ممتاز۔ Lilly! You are very brave!
اس حالت میں میں تو گھبرا جاؤں مجھے تو کچھ سوجھ ہی نہ سکے کہ کیا
کیا جائے۔

کنول۔ ممتاز میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ اگر یہ betrothal
کسی طرح نہ ٹوٹ سکی تو پھر میں شادی ہی سے صاف انکار کردوں
گی کہ میں ابھی شادی کرنا چاہتی ہی نہیں بی۔ اے کے بعد پھر
ایم۔ اے میں داخل ہو جاؤں گی ایم۔ اے کر لینے کے بعد میں
independent ہو جاؤں گی۔ ممتاز تم میری
جگہ ہو تو کیا کرو۔

ممتاز۔ خدا بچائے۔ یہ تو بڑی مصیبت ہے۔

(بدھال آتی ہے)

بدھال۔ بی بی! رائے صاحب اور صاحب جلدی جلدی بیٹھک
میں آرہے ہیں۔

کنول۔ اچھا ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ چلو ممتاز باہر چل کر ذرا
بیڈمنٹن کھیلیں۔

ممتاز۔ نہیں آج گھر جانے کی جلدی ہے میں کھیلنے کے لئے نہیں ٹھہر
سکتی۔ پھر کالج میں کھیلوں گی تمہارے ساتھ۔

کنول۔ اتنی جلدی میں نہ جانے دوں گی ابھی تو تم آئی ہو۔

(دونوں باہر چلی جاتی ہیں)

(رائے صاحب آتے ہیں ان کے ساتھ ہی صاحب ہے)

رائے صاحب۔ کیوں بھئی وہ درزی کو بلا بھیجا تھا۔

صاحب۔ اگر بلایا ہے تو ابھی آتا ہوگا۔

بیلی۔ مہاراج درزی کھڑا ہے۔

صاحب۔ بلاؤ اندر اس کو۔ اب سب ARRANGEMENTS
ہو جائیں۔ تو اچھا ہے۔

رائے صاحب۔ کر دیجئے کر دو۔

(نورالدین آتا ہے)

نوردین۔ سلام ہے جناب

رائے صاحب۔ کہو نوردین تمہارے کاریگر تو تگڑے ہیں!

نوردین۔ حکم کیجئے سرکار سب اچھے ہیں۔

رائے صاحب۔ ارے یار! پہلے تو تم نے ہمیں ہیر پھیری میں رکھا
تھا۔ جب پوچھیں تب ہی کاریگر بیمار۔ آج کیا ہے! بخار ہو گیا ہے
جناب! کل کیا تھا مرگی کا دورہ جناب!

نوردین۔ نہیں جناب بہت کاریگر تھے ہی بیمار۔ نہیں تو قسم ہے اللہ پاک
کی آپ کے سامنے کوئی جھوٹ تھوڑا ہی بولنا تھا۔

رائے صاحب۔ نہیں اگر اب بھی پہلے کی طرح ٹال مٹول کرنا ہے تو
ابھی سے کہہ دو۔ ہمیں جلدی ہے۔ شادی بیاہ کا کام ہوا۔

صاحب۔ وقت پر کام نہ ہو سکنے کے ذمہ دار تم ہوگے۔

نوردین۔ سرکار کہئے تو آج سے آٹھوں سب کو آپ کے پاس بٹھا کر
کام کریں گے۔ پیسہ ایک نہ دیجئے۔ اگر ذرا دیر ہو جائے تو۔

رائے صاحب۔ بس پھر پرسوں اتوار تک ضرور آ جانا۔

نوردین۔ بہت اچھا جناب!

صاحب۔ اتوار تک کام ضرور شروع ہو جائے۔

نوردین۔ ضرور جناب! اچھا سلام عرض ہے (چلا جاتا ہے)

(بڑی ماں آتی ہیں)

ماں۔ درزی سے کہہ دیا یا نہیں؟ خوب تاکید کر دی تھی

صاحب۔ سب ہو رہا ہے۔ ماں! تم کچھ فکر نہ کرو۔

ماں۔ بس جلدی کرو کہ سوارتھ ہو جائے سر سے بوجھ اترے۔ اگلا
مہینہ بیاہ کا مقرر کرو۔

صاحب۔ اپنی طرف سے تو بہت جلد جلد کر رہے ہیں۔ آئے جب

تیاری ہو جائے۔

ماں۔ ڈھیل نہ کرنا اب۔ بیاہ کرو اور ساتھ ہی شے دو مکلاوہ۔ پھر آگے سنگت پڑ جائے گی۔

صاحب۔ سنگت کیا کہتی ہے ماں تمہاری یہ باتیں نہ گئیں۔

رائے صاحب۔ ارے صاحب! کیوں بے کار مغز ماری کر رہے ہو تم جانتے بھی ہو کہ جو کچھ اس کی مرضی ہو وہی ہو کر رہتا ہے۔ تمہارا اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

صاحب۔ ہرج تو نہیں۔ ویسے میں نے ایک بات کہی تھی۔ باقی دیکھیئے جیسے ان کی مرضی تھی میں نے ویسے ہی مان لیا۔

رائے صاحب۔ بس اچھا ہوا روز روز کا جھگڑا ختم ہوا۔ بات ٹھکانے لگی۔

ماں۔ جھگڑا بھی تو تم ہی لوگوں نے بنا رکھا تھا میں تو کب سے یہی کہہ رہی تھی۔ اچھا اب بھی جو ہوا اچھا ہوا رب سکھ چین سے رکھے۔ لڑکی عزت سے اپنے گھر کو سدھارے۔ ہم بھی سرخرو ہو کر بیٹھیں کم بخت زمانہ جو الٹا ہو گیا اسی لئے ڈر لگتا ہے

صاحب۔ اچھا جناب اب اور کون کون سا کام باقی ہے۔

رائے صاحب۔ بھئی تم جانو اور تمہارا کام یا اپنی ماں سے پوچھ لو۔

صاحب۔ ایک ڈرائینگ روم سیٹ اور سلور ٹی سروس کا آرڈر تو میں دے چکا ہوں۔

ماں۔ اور بھیا برتن خریدتے وقت مجھ سے ضرور پوچھ لینا۔ چار چاندی کے تھال۔ دس گلاس اور پندرہ کٹوریں۔ اس کے بغیر بات نہ بنے گی۔ ٹھیکیدارنی بار بار دان دہیز کا سنا رہی تھی میں نے بھی اُسے شینہ ٹھونک کر کہہ دیا کہ جب ہم سے برتو گی تب جانو گی۔ سو ہمیں تو ہر بات نام نمود والی کرنی ہے

صاحب۔ ماں نام نمود بہتیرا ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو تم سے زیادہ مجھے اس کا خیال ہے۔

ماں۔ بھیا میں تو اس لئے کہتی ہوں کہ پہلا سوارتھ ہو سکھ خیر سے۔ کسی طرح بے مزگی نہ رہ جائے۔

رائے صاحب۔ تم ہو وہمی مزاج تمہاری تسلی کسی طرح نہ ہو گی۔

ماں۔ ہائے ابلنے! خبر نہیں آپ کو کیا بُری عادت ہے ہر بات میں لڑائی ڈھونڈنے کی پڑی رہتی ہے اب میں اپنے بچے سے بات بھی نہ کروں۔ بات بات پر میرے پیچھے نہ پڑ جایا کرو۔

رائے صاحب۔ بھئی حد کرتی ہو تم۔ لڑتی خود ہو اور الزام میرے منڈھ دیتی ہو۔

ماں۔ ہائیں۔ کیا ہوتا جا رہا ہے عقل کو۔ بات بھی نہیں کہنے دیتے اب۔ خبر نہیں کہاں سے اتنی خشکی چڑھ گئی۔

صاحب۔ ماں مجھ سے تو اب خوش ہونا! جو کچھ تم نے کہا میں نے وہی مان لیا۔

ماں۔ آج تم نے میری مانی تو کل کو تمہارے بچے بچیاں تمہاری مانیں گے۔

بیلی۔ ہجار اج ٹھیکیدار صاحب آئے ہیں۔

(صاحب دیال آتا ہے)

ماں۔ جم جم آئیے۔ نت نت آئیے سر آنکھوں پر۔

رائے صاحب (اٹھ کر) ادھر آئیے۔ یہاں بیٹھیئے۔

ماں۔ ہم نے تو سب تیاریاں رسبھ دی ہیں۔ اب خواہ اگلے مہینے شادی کر لیجئے۔

صاحب۔ میرا خیال ہے کہ بیاہ جلد ہو جائے تو پھر ان کا PASSAGE بک کرا دیا جائے۔ ولایت کی سیر کر آئیں جا کر۔

رائے صاحب۔ آپ کے ہاں تو اب کوئی خاص دیر نہ ہو گی۔

صاحب دیال۔ میں آپ سے ایک بات کرنے کے لئے آیا تھا۔

ماں۔ جم جم کیجئے۔ پھر باتیں کرتی ہی کب ہیں۔ یہی تو وقت ہے باتیں کہنے کا۔ آخر مل جل کر آپس میں صلاح کرنے سے ہی سب کام ہوں گے نا! میں تو پہلے ہی صاحب سے کہہ رہی تھی کہ جاؤ خود جا کر ساری بات ان سے طے کر آؤ۔

صاحب۔ جناب! ہم تو آج کپڑے زیور وغیرہ سب کا آرڈر دے چکے ہیں۔ درزی اتوار کو سینے کے لئے بیٹھ جائیں گے۔ اب آپ کوئی دیر نہ کیجئے۔ ہمارے ARRANGEMENTS. تو سب ٹھیک Progress کر رہے ہیں۔ بلکہ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ سب اتنی smoothly ہو جائے گا

رائے صاحب۔ کام ہونے پر آئیں تو سب اسی طرح ہو جاتے ہیں۔

بہ ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

جب تک کام کو ہاتھ میں نہ لیا جائے بہت بوجھ معلوم ہوتا ہے
کام شروع کیا تو بس سمجھیے کہ ہو گیا کہئے۔ فرمایئے کوئی خاص
بات ہے؟

صاحب دیال۔ بات تو بہت خاص ہے۔ میں صرف آپ کے سامنے
کروں گا۔

ماں۔ ہائیں! تو کونسی ایسی بات ہے ہم سے چھپا کر کرنے کی؟ اب
آپ ہمارے ہو چکے اور ہم آپ کے۔ کوئی پردہ تھوڑا ہی ہے

صاحب دیال۔ رائے صاحب۔ مجھے بات صرف آپ کے ساتھ
کرنی ہے یا ذرا PRIVATE ہے۔

رائے صاحب۔ بہت اچھا! صاحب جی جاؤ تم لوگ۔ ہمیں ذرا
پل بھر بات کر لینے دو۔

صاحب۔ لیجیے جناب! آؤ ماں! ہم چلیں۔

ماں۔ وہ کون سی ایسی پردے کی بات ہے؟ آپ میرے سامنے کریں

رائے صاحب۔ جاؤ جی بات کر لینے دو۔

صاحب۔ ماں آؤ بھی جاؤ ہمیں خود ہی بتا دیں گے۔ ابھی۔

(صاحب ماں کو زبردستی اندر لے جاتا ہے وہ دروازے
کے پاس کھڑی رہتی ہے)

رائے صاحب۔ فرمایئے!

صاحب دیال۔ رائے صاحب غضب ہو گیا۔ اُف!

رائے صاحب۔ کیا ہو گیا؟ خیریت تو ہے؟ کندن لعل کیسا ہے؟

صاحب دیال۔ کیا بتاؤں۔ بہت بڑی بات ہے میں کہہ نہیں سکتا

رائے صاحب۔ کہئے تو سہی۔ جلدی کیجیے۔

صاحب دیال۔ بات کہنے کی نہیں۔ مگر بغیر کہے گذارہ بھی
نہیں ہو سکتا۔

رائے صاحب۔ کہئے نا پھر جلد کہئے آپ رک کیوں گئے ہیں بری
بھلی جو کچھ بھی ہے صاف کہہ دیجئے۔

صاحب دیال۔ رائے صاحب۔ میں شگون واپس کرنے پر مجبور ہوں

رائے صاحب۔ کیا ہوا۔ ہم سے کونسی ایسی خطا ہو گئی۔

صاحب دیال۔ آپ سے کوئی خطا نہیں ہوئی مگر میں مجبور ہوں

رائے صاحب۔ کوئی وجہ!

صاحب دیال۔ کندن کی ماں بالکل نہیں مانتیں۔ ہمارے پروہت
نے جنم پتری دیکھ کر بتایا ہے کہ لڑکے لڑکی کا یوگ ٹھیک نہیں
کوئی گریہہ برا پڑا ہے۔

رائے صاحب۔ اتنے بڑے دانا ہو کر آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں پہلے
آپ کا پروہت سویا پڑا تھا اور گریہہ وریہہ کی آج کل پروا بھی
کون کرتا ہے سب لوگ ایسا کرنے لگیں پھر تو بہت گڑبڑ مچے

صاحب دیال۔ رائے صاحب! جب لڑکے لڑکی کا یوگ ہی ٹھیک
نہ ہوا تو پھر بات آگے کیونکر بڑھے؟

رائے صاحب۔ بندہ پرور بیاہ سے پہلے یوگ نہ یوگ کی خبر کیا ہو سکتی
ہے؟ آپ بالکل بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔

صاحب دیال۔ مہاراج گریہہ اچھا نہیں۔ میں یہ رشتہ نہیں کر سکتا۔

رائے صاحب۔ غضب ہے! ایسی بھی گریہہ کی آپ کو پہلے خبر نہ تھی۔

صاحب دیال۔ پہلے خبر ہوتی تو کبھی نام نہ لیتے۔

رائے صاحب۔ آپ یہ پہیلیاں کیا کہہ رہے ہیں۔ سیدھی بات کیجئے۔

صاحب دیال۔ سیدھی بات یہ ہے کہ آپ کی لڑکی رضامند نہیں اس
شادی پر اس کی مرضی نہیں۔

رائے صاحب۔ بندۂ خدا! وہ رضامند نہیں تو کیا ہوا۔ لڑکیوں کو رضامند
ہونے سے کیا واسطہ۔ اور آپ کو لڑکی کی مرضی کی کیا خبر؟ اُس
کی بھی وہی مرضی ہے جو ہماری ہے۔

صاحب دیال۔ آپ کو کچھ خبر نہیں۔ لڑکی سے اچھی طرح پوچھئے۔
میں یہ رشتہ کر ہی نہیں سکتا۔

رائے صاحب۔ آپ زبردستی کر رہے ہیں۔

صاحب دیال۔ جو کچھ میں جانتا ہوں۔ اگر آپ جانتے ہوں تو کبھی
ایسا نہ کہیں۔

رائے صاحب۔ خبر نہیں آپ کیا جانتے ہیں ہمیں کوئی خواب
تو آیا نہیں کہ معلوم ہوتا۔

صاحب دیال۔ آپ کی لڑکی کسی اور کو چاہتی ہے۔ معاف کیجئے
میرا کہا ہیں اس حالت میں رشتہ کیسے کر سکتا ہوں۔

رائے صاحب۔ ہیں کسی اور کو چاہتی ہے؟ آپ کیسے یہ بات کہہ
رہے ہیں۔

صاحب دیال۔ جناب میں بلاوجہ نہیں کہتا۔ میرے پاس اُس شخص
کا دوست آیا تھا۔ دو سال سے خط و کتابت جاری ہے۔ آپ کو

کچھ خبر نہیں۔ اپنی لڑکی سے پوچھیئے۔

رائے صاحب۔ خط وکتابت! کون ہے وہ شخص؟ اس کا نام بتایئے

صاحب دیال۔ میں اس بات کو Private رکھنے کا وعدہ کر چکا ہوں میں اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکوں گا۔ باقی آپ لڑکی سے معلوم کر لیجئے۔ میں اس معاملے میں قدم آگے نہیں بڑھا سکتا مجھے خود بہت بڑی disappointment ہوئی ہے۔ یہ بہ رکھا ہے شگون۔ معاف فرمایئے۔ بس نمستے

(صاحب دیال چلا جاتا ہے)

(ماں جھٹ پٹ دروازے کے پیچھے سے نکل آتی ہے)

ماں۔ پڑ گئی خاک سب کے سر میں لگ گیا کلنک کا ٹیکا سب سن لیا میں نے سب سن لیا۔ میں کہتے کہتے تھک گئی۔ ساری عمر انہیں باتوں کو روتے گذر گئی۔ تم لوگوں نے میری ایک نہ سنی۔ اب کیا کرو گے۔ میں تو مر چلی۔

صاحب۔ کیوں کیا بات ہوئی؟

رائے صاحب۔ بات ہوئی تمہارا سر تمہیں چار سال سے میں کیا کہہ رہا تھا کہ لڑکی کا بیاہ کر دو۔ کر دو۔ لو رکھو اب۔ ٹھیکیدار شگون واپس کر گیا ہے۔ کہتا ہے لڑکی کی خط وکتابت ہے کسی سے

صاحب۔ بکواس بالکل بکواس۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

ماں۔ ہائے آگ لگ جائے اس پڑھائی کو۔ جل جائیں یہ سکول نہ اسے پڑھاتے نہ یہ چٹھیاں لکھنے جوگی ہوتی۔ میں تو کھپ گئی۔ روز سکولوں کی جان کو روتے روتے میری زبان تھک گئی کہ نہ بھیجو اسے سکولوں میں لڑکی جوان ہو گئی ہے اسے باہر نہ جانے دو۔ شادی کر دو نامراد کی اور گھر سے نکالو۔ میری ایک نہ سنی تم باپ بیٹوں نے۔ ہائے اب سارے افیم کھا لو۔ ہائے میں کیا کروں میں کہیں کی نہ رہی۔ ہائے میں لٹ گئی۔

رائے صاحب۔ دیکھا تم England returned ڈھونڈتے تھے لڑکی نے یہیں England بنا لیا خبر نہیں کس کے ساتھ اور کب سے Court-ship جاری ہے۔

صاحب۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

رائے صاحب۔ تمہیں سمجھ خدا نے دی تھی؟

ماں۔ ہائے رے میں کہتے کہتے تھک گئی میں اسی جلن میں راکھ ہو گئی۔ تم لوگوں نے میری ایک نہ مانی۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔ مجھے تو لا دو افیم!

رائے صاحب۔ مجھ سے کیا کہتی ہو اپنے بیٹے سے کہو۔

ماں۔ ہائے رے نوج یہ دن آتا۔

رائے صاحب۔ بہت برا ہوا۔ صاحب تو نے غارت کر دیا۔

صاحب۔ میں Lilly سے پوچھتا ہوں یہ بات کیا ہے۔ بغیر پوچھے کیا معلوم کیا ہے کیا نہیں۔

ماں۔ لی۔ لی۔ لی۔ ہائے نوج پیدا ہوتی یہ لِلی۔ نہ رہتی لِلی مر جاتی لِلی تو یہ دکھ کیوں بھوگنے پڑتے۔

صاحب۔ میں اس کی Mother سے کہتا ہوں۔ وہ پوچھے اس سے کہ بات کیا ہے؟

ماں۔ بات ہے خاک۔ کیا پوچھو گے اس سے۔ اب کہیں ڈوب مرنے کی جگہ ڈھونڈو۔ ہائے خلقت کیا کیا باتیں کرے گی؟ عورتیں کیا کہیں گی ہائے میرے رام! مجھے راتوں رات موت دے دے ہائے میں جانتی تو پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ ڈالتی۔

رائے صاحب۔ اب رونے پیٹنے سے کچھ نہ بنے گا۔ اب یہ سوچ کہ آگے کرنا کیا ہوگا؟

ماں۔ ٹکڑے کر و مُردارے کے اور بہتے دریا میں پھینک دو اور اب کیا کرنا ہے! زہر مل جائے ایسی کو اور پھر نظر نہ آئے۔ اس نے ہمیں غرق کر دیا ہے پرماتما! میں کدھر جاؤں۔

(للی اور یشودھا آتی ہیں)

یشودھا۔ کیا کیا تو نے؟ بول بول! تیرے سر میں خاک۔ بول کہاں گئی تیری شرم عزت۔ تجھے ماں باپ کی لاج نہ آئی۔ اسی لئے تجھے پڑھایا لکھایا تھا۔ اسی لئے خاک ڈالی تھی تیرے سر میں!

(بڑی ماں لکڑی اٹھا کر مارنے لگتی ہے)

ماں۔ مرجا۔ مرجا۔ مرجا تیرے سر میں خاک غرق ہو جا یہیں اسی دھرتی میں دھنس جا۔ تو اسی دن کیوں نہ مر گئی جب تو نے جنم لیا

صاحب۔ بولو Lilli کیا بات ہے؟ کون ہے؟ کیا کیا تم نے؟

رائے صاحب۔ کیا ہے وہی جو مدت سے نظر آ رہا تھا۔ میرا سر کھپ گیا تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تم England returned ڈھونڈنے میں رہے مل گیا!

یشودھا۔ بول! بول! کلموہی۔ جوانا مرگ۔ تیرا بیڑا غرق ہو کیا کیا تو نے!
کہاں ہمارے سر میں خاک جھونکنے گئی تھی؟

ماں۔ یہ کیا بتائے گی! اسے زہر کا پیالہ دے دو۔ مار ڈالو جان سے۔
اب بھی میرا کہا مانو۔ خبر نہیں کل کو اور کیا گل کھلائے گی۔

صاحب۔ بولو SALLY تم بولتیں کیوں نہیں! کیا کیا تم نے! یہ کیا
بات ہے!

ماں۔ مرجا۔ مرجا اب تیرے لئے یہی اچھی بات ہے۔ چپکے سے
پھانسی لے اور جھگڑا پاک کر۔

(للی اندر چلی جاتی ہے)

رائے صاحب۔ ارے صاحب! اس کا کوئی قصور نہیں۔ سب تیرا
کیا دھرا ہے۔ سب تیرا اب آخر عمر میں تو نے ہمیں بھی بٹہ لگا دیا

ماں۔ سب تیرے کرتوت ہیں۔ صرف تیرے۔ میں کہیں کا نہ چھوڑا تو نے

صاحب۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں!

ماں۔ تم کرو سر جننے والوں کا۔ افیم کھا لو۔ یا اس کا گلا گھونٹ دو۔ ہائے
کل تک سارا جہاں باتیں کرتا ہوگا۔

رائے صاحب۔ اب بیٹھ کر سوچو کہ آخر کرنا کیا چاہیئے۔

ماں۔ کچھ مت سوچو۔ اس کلموہی کو زنجیریں ڈالو اس کی مشکیں کس کر
اسے کوٹھری میں بند کر دو۔ صاحب! جا پکڑ اُسے۔ کسی طرف کو نکل
نہ گئی ہو۔ اس پر ایک پل کا بھروسا نہ کرو۔ (یشودھا سے) ہماری
اس کے پاس رہ۔ یہ بچھیری نکل جائے گی کسی طرف کو اس کے طور
اچھے نظر نہیں آتے۔ اندر بند کر کے تالا لگا دو۔

رائے صاحب۔ اب سوچنا تو یہ چاہیئے کہ اس سے آگے ہمیں کرنا کیا
ہے بات نکل گئی تو لڑکا ملنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

ماں۔ اب لڑکا نہ ملے گا۔ اور نہ ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت ہے۔
اسے جہاں بھی ہو سکے۔ پھینک دو۔ منہ کالا کرو مردار کا۔ اور شام
سے پہلے پہلے گھر سے دور کرو۔ ہائے خبر نہیں کیا کچھ کر چکی ہے

رائے صاحب۔ صاحب تم منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھے ہو بولتے کیوں
نہیں کہ اب کرنا کیا ہے؟

ماں۔ یہ اب کہاں رہا بولنے جوگا۔ کرنا کیا ہے! جو بھی ملے اسی کے ساتھ
رخصت کر دو۔ اب نہ ٹھیرو نہ کچھ دیکھو۔ اب بات ہی کچھ دیکھنے کی
نہیں رہی پھیرے دو اور گھر سے باہر کرو۔ مرتی جیتی جیسے
بھی ہو ایک دفعہ یہاں سے چلی جائے۔ نہیں تو پھر میں پھانسی
لے کر جان دے دوں گی۔ سب سن لو۔

رائے صاحب۔ جے کشن کو بلائیں اب تو زیادہ باریکیاں چھانٹنے کی
نوبت نہیں رہی۔

ماں۔ جے کشن نہ مانے تو بیلی کے ساتھ رخصت کر دو۔ ہائے میرا جی
ڈوب رہا ہے۔

صاحب۔ اس کے متعلق تو کوئی DIFFICULTY نہ ہوگی۔

ماں۔ میٹھی میٹھی باتیں کرنا اس سے کہیں وہ بھی نہ بگڑ بیٹھے۔ پھر کیا کریں
گے! اب تو اور کوئی جگہ نہ ملے گی۔

رائے صاحب۔ (گھڑی دیکھ کر) اس کے آنے کا وقت قریب ہے
میں اس سے ابھی بات کرتا ہوں۔

ماں۔ مجھے بھی بلا لینا اس وقت۔ میں خود بات کروں گی آپ کچھ مت
بولیں کہیں ہاتھ سے نہ گنوا دیں سنبھل کر۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے
پیار سے جیسے بھی خواہ لوبھ لالچ دے کر کسی طرح منا لینا
چاہیئے۔ بس بیاہ کر دو آٹھ دن کے اندر اندر!

صاحب۔ اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے!

ماں۔ سب خرچ اپنی گرہ سے کرو۔ کسی طرح بھی ہو بیاہ کر دو۔ لڑکی
ہمارے گھر سے چلی جائے۔ خبر نہیں قسمت میں کیا کچھ لکھا
ہے۔ ہائے کسی طرح منا لو اور نکال دو لڑکی کو گھر سے۔ ہائے
کو لاں! ری تجھے موت آ جائے کل سویرے پھر نہ اُٹھے
اب تیرے اُٹھنے کی گھڑی نہ آئے کبھی۔

(جے کشن باہر سے آواز دیتا ہے۔ مدن! مدن!)

لو آ گیا۔ آ گیا۔ بلا لو۔ اندر بلا لو۔ جلدی فیصلہ کر دو۔ یہی شگون
اسے دے دو۔ جلدی کرو۔ وقت نہ گنواؤ۔

رائے صاحب۔ اچھا اب تم اندر جلد چلی جاؤ۔ اس طرح شور نہ
مچاؤ کہیں سن لیا تو وہ بھی اکڑ بیٹھے گا۔

صاحب۔ ہاں ہاں اب شور بند کر دو اگر اُسے بھی کچھ شک ہو گیا
تو پھر بالکل نہ مانے گا۔

ماں۔ دیکھنا بات سنوار کے کرنا سوچ کر سمجھ کر۔ چلو مجھی کو رہنے دو یہاں
اور تم جاؤ۔ تم باپ بیٹوں کو کچھ عقل نہیں کہیں بنا بنایا کام بگاڑ
کر نہ رکھ دینا۔

رائے صاحب۔ اب جاؤ مہربانی کرو۔ پھر گھڑی بھر کو آ جانا اور جو
کچھ بھی مرضی ہو کہہ لینا۔ پہلے مجھے بات تو کرنے دو۔
ماں۔ اچھا۔ اچھا میں جاتی ہوں۔ اب ذرا سوچ کر بات کیجئے۔ سمجھ کر
پیار سے۔ دلاسے سے مناکر سمجھائیے۔ جو کچھ کہے وہی مان لیجئے
کوئی کڑوی بات نہ کیجئے۔ ہمیں اس وقت ضرورت جو ہوئی۔
رائے صاحب۔ بس سمجھ لیا۔ جاؤ اب۔ جلدی کرو (جانے کا اشارہ
کرتے ہیں)

صاحب۔ Hello! Jackson! How are things!
جے کشن۔ Jolly well! I should say! Thanks!
رائے صاحب۔ کہو بھئی، باپ کے ساتھ صلح ہوئی یا نہیں!
جے کشن۔ ابھی تو جنگ ہی سمجھئے۔ وہ میری بات نہیں سمجھتے میں ان کی
نہیں سنتا۔

صاحب۔ Quarrelled with your father!
جے کشن۔ جی نہیں Quarrel تو کوئی نہیں۔ وہ کہیں سگائی
کر بیٹھے تھے اب شادی پر زور دے رہے ہیں میں نے
انکار کر دیا ہے بس۔
صاحب۔ انکار کیوں! آخر شادی کرنی تو ہوگی۔
جے کشن۔ کچھ ضروری نہیں۔ مرضی کے مطابق ہو تو کر لی ورنہ بیٹھے
بٹھائے جنجال گلے ڈال لینے سے مطلب کیا؟
رائے صاحب۔ بھئی وہ لڑکی جے کشن کی مرضی کے مطابق نہیں
صاحب۔ Educated نہیں ہوگی۔
جے کشن۔ بالکل ان پڑھ بھلا ایسی Marriage میں
happiness کیا ہوگی!
صاحب۔ You're right, Jackson!
جے کشن۔ معمولی common-sense کی بات ہے
کم از کم educated تو ہو۔
رائے صاحب۔ صاحب بھئی تم ذرا جاؤ تو (صاحب چلا جاتا
ہے) جے کشن! آج میں تم کو ایک بات کہتا ہوں۔ مدت سے
میرے دل میں ہے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ میں شروع
ہی سے تمہیں کتنا Like کرتا ہوں۔
جے کشن۔ میں جانتا ہوں جناب! آپ کی بہت مہربانی ہے۔

رائے صاحب۔ سچ تو یہ ہے بھئی مجھے تمہارا کیرکٹر بہت ہی پسند
ہے Simple, self-helping,
اگر تم اسی طرح لگے رہے تو کسی دن ضرور کچھ
بن کے رہو گے۔
جے کشن۔ آپ کی دعا چاہئے جناب۔
رائے صاحب۔ نہیں بھئی یہ حق بات ہے۔ ہمارا صاحب بھی تمہارا
بے حد مداح ہے اکثر تمہارا ہی ذکر ہوا کرتا ہے۔
جے کشن۔ ان کی بھی بہت مہربانی ہے۔
رائے صاحب۔ اور جے کشن اوہ! جتنا تمہیں صاحب کی ماں
پسند کرتی ہیں تمہاری تعریفیں کرتے کرتے زبان تھکتی نہیں تمہیں
دیکھ دیکھ کر بے حد خوش ہوتی ہیں۔
ماں۔ (جھٹ پٹ دروازے کے پیچھے سے نکل کر) شاباش ہے
اس ماں کو جس نے ایسا لعل جنا۔
رائے صاحب (اشارہ کرتے ہوئے) ٹھہرو جی ٹھہرو! بات کر
لینے دو پہلے (ماں پھر اندر چلی جاتی ہے)
جے کشن۔ ان کی بھی بے حد مہربانی ہے۔
رائے صاحب۔ ہاں بھئی صاف بات تو یہ ہے کہ ہمارے صاحب
کی خواہش ہے کہ تم سے ہوشیار اور ہونہار نوجوان کو اپنے
family کا ممبر بنا لیا جائے۔ سمجھے؟!
جے کشن۔ جی۔
رائے صاحب۔ لڑکی کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔
شاید تم نے دیکھا بھی ہو بہت pretty ہے educated
ہونے کا تمہیں علم ہے۔ اس کے music کے لئے
بھی خاص انتظام کر رکھا ہے۔ ہارمونیم بہت اعلیٰ جانتی ہے
وائلن کا بھی شوق ہے Piano کے Lesson
بھی لے رہی ہے اور ہر طرح سے up-to-date
ہے۔ باقی مزاج کی نسبت سن لو کہ جیسا ہنس مکھ صاحب ہے
بالکل اسی طرح وہ بھی ہے۔
جے کشن۔ جناب آپ کی ......
رائے صاحب۔ نہیں ہم تم پر کوئی خاص احسان تو کر ہی نہیں رہے
بلکہ ہم بھی ایک طرح سے selfish ہیں ہم جانتے

ہیں تمہارے Circumstances اس وقت اچھے نہیں۔ پھر بھی تم سالڑ کا کم ملتا ہے۔ ہمیں دولت یا خاندان کی خواہش نہیں۔ ہاں دولت کوئی ساتھ لے کر دنیا میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں دیکھو جب ہم نے انٹرنس کا امتحان دیا ہمارے گھر میں کھانے تک کو نہ تھا۔ نری بھانگ بھن رہی تھی۔ مگر اپنی محنت اور کوشش سے دیکھ لو اس وقت خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ سچی بات تو یہ ہے مجھے تم سے اسی لئے زیادہ محبت ہے کہ تم میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو اسی عمر میں خود ہم میں ہوا کرتی تھیں۔

جے کشن۔ آپ مجھ پر اتنی مہربانی کر رہے ہیں جس کا مجھے کبھی خواب میں بھی خیال نہ آسکتا تھا۔ کہاں میں کہاں آپ۔ میں خیال کرتا ہوں تو دل ہی دل میں . . . .

رائے صاحب۔ بات کاٹ کر اور ہنس کر۔ ہیں! ہیں! ہیں!!! مہربانی ہم تم پر نہیں بلکہ خود اپنے آپ پر کر رہے ہیں یقین مانو میں نے تم سے لایق نوجوان بہت کم دیکھے ہیں۔ باقی دھن دولت کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں دھن مرد کے بازوؤں میں ہوتا ہے۔

جے کشن۔ رائے صاحب میں نہیں جانتا کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

رائے صاحب۔ نہیں نہیں شکریے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں

جے کشن۔ میں اس معاملے میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہا ہوں

رائے صاحب۔ تم سے expected یہی تھا۔

جے کشن۔ مجھے معاف کیجیے اگر میں عرض کرنے کی جرأت کروں کہ آپ کی proposal گو عین ذرہ نوازی ہے مگر آپ کی نازو نعمت میں پلی ہوئی صاحبزادی مجھ جیسے بے سروسامان اور بے مایہ شخص کے پاس کس طرح آرام سے رہ سکے گی! میرے کوئی Parents نہیں۔ والدین سے میں لڑائی کر چکا ہوں۔ یہ میری ناشکرگذاری ہوگی اگر میں آپ کی ذرہ نوازی کی قدر نہ کروں۔ مگر میں اپنی ذمہ داری کو فیل کرتے ہوئے جھٹ پٹ ہاں بھی نہیں کر سکتا۔ میری یہ پوزیشن نہیں۔

رائے صاحب۔ بھلے آدمی! پوزیشن کی تمہیں کیا فکر ہے۔ سنو ادھر آؤ نزدیک آکر بات سنو۔ پوزیشن کا بندوبست خود لڑکی والے کریں گے تمہیں کیا! انہیں اپنی بیٹی کا شگفہ منظور نہیں کیا وہ نہیں جانتے کہ تمہارے حالات کیسے ہیں۔ واہ! اس بات کا تمہیں بالکل خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

(ماں فوراً اندر آجاتی ہے)

ماں۔ لو بھیا تو بھلا ہمیں اس کی خبر نہیں۔ پر بھیا آدمی لایق ہو شریف ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ہم تو نیک بر سے ہیڑتے ہیں۔ دھن کی ہمیں پروا نہیں خاندان کی چاہ نہیں۔ ہم نے تمہاری نیکی اور لیاقت کو پسند کیا ہے۔ رائے صاحب تو بس روز تمہاری ہی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا صاحب ولایت ولایت جپا کرے تو میں نے کہا نہ بابا ولایت والوں کے پیچھے بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے پاس جو موجود ہے ایسا لایق اور سندر لڑکا ہمیں اور کوئی ڈھونڈنے کی خواہش ہی نہیں۔

رائے صاحب۔ میں بار ہا صاحب کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ یہ فضول خبط ہے۔ مگر دیکھو۔ تھا وہ بھی اپنی جگہ سچا۔ آج کل سبھی کو یہ خبط ہو چکا ہے۔ جس کی بھی لڑکی چار حرف انگریزی کے جاننے لگے وہی یہ چاہتا ہے کہ لڑکا England returned ملے۔ بہتیرے لوگ ایسے بھی ہیں۔ کہ بس نہائیں تو گنگا پر نہائیں ورنہ کہیں اور منہ بھی نہ دھوئیں۔ ENGLAND RETURNED سے ادھر بات ہی نہیں کرتے اور بعد میں کام کا لڑکا یہاں سے بھی نہیں ملتا اصل تو یہ بات ہے جے کشن کہ تمہاری دادی نے تمہارے لئے بے حد زور لگا رہا ہے ہر روز تمہارا ہی ذکر۔ ہر روز تمہاری ہی صفتیں۔

جے کشن۔ ان کی بے انتہا مہربانی ہے مگر میں عرض کر چکا ہوں کہ میں یہ بات نباہ نہیں سکتا۔

ماں۔ ہیں۔ نادان لڑکا! تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ ہم خود نہیں یہ سب جانتے۔ شاید تم نے سنا ہوگا۔ کہ لوگ گھر جنوائی بھی رکھا کرتے ہیں۔ بس بیٹا ہم تجھے گھر جنوائی ہی رکھیں گے۔ لڑکی کو رخصت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ابھی۔ جیسے پہلے رہا کرتی ہے۔ اسی طرح اب بھی گھر میں رہے اور تم بھی رہو۔ بس پھر فکر کاہے کا!

رائے صاحب۔ تو بھئی جے کشن اب تو پانچوں گھی میں ہیں۔ اب بتاؤ! You are a Pucry dog بھئی سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے صلاح کے بغیر تم سے کچھ کہنا نہ چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی دیکھ لو کہ ہماری دادی ہمیشہ مجھ سے بڑھ کر قدم مارتی ہیں۔

ان کی یہ ہنسی کی عادت سے رہنستے ہیں، ہی ہی! ہی ہی! ہی ہی!

(باہر سے بھگت جی کی آواز سنائی دیتی ہے)

رائے صاحب! رائے صاحب! گھر میں ہیں آپ؟

رائے صاحب۔ لو بھگت جی بھی آ گئے ہیں۔ جے کشن کی نسبت یہ بھی بہت کہہ چکے ہیں۔

ماں۔ تو انہیں کہنے کہلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

(بھگت جی اندر آ جاتے ہیں)

رائے صاحب۔ آیئے۔ آیئے آج بہت دن بعد درشن دیا کہاں رہے؟

بھگت جی۔ کچھ نہ پوچھو مہاراج۔ بہت دن سے آنا آنا کر رہا تھا مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک بکھیڑا نپٹاتا ہوں تو دوسرا آن پڑتا ہے۔ ایک جان اور سو کام۔ کہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ بلکہ ہم تو بیمار ہو گئے۔

رائے صاحب۔ اوہو۔

بھگت جی۔ اب آپ یہ بتلایئے کہ کیا فیصلہ کیا۔ آپ نے ہماری بات مانی یا نہیں؟ میرے پاس دو رشتے ایسے بڑھیا آئے ہیں کہ بس کچھ مت پوچھئے۔ اور لڑکیاں بھی پڑھی لکھی فیشن ایبل پر میں نے کہہ دیا کہ نہیں پہلے رائے صاحب سے پوچھ لوں ہم ان کو زبان دے چکے ہیں۔

رائے صاحب۔ پوچھنا کیا بھگت جی آپ کہیں اور ہم نہ مانیں۔ یہ کبھی ہو سکتا ہے۔ آخر کبھی آپ کا کہا رد بھی کیا ہے!

(صاحب آتا ہے)

صاحب۔ اچھا بھگت جی ہیں کہئے مہاراج مزاج اچھے ہیں! آپ کی بات جناب ہمارے سر آنکھوں پر۔ رائے صاحب کا کہا اور آپ کا کہا ہمارے لیے برابر ہے۔

ماں۔ تو ہم آپ کا کہا نہ کریں گے تو اور کس کا کریں گے۔ ہماری آپ کی تو قدیم سے ایسے ہی چلی آتی ہے۔ بلکہ آپ کچھ اور بھی کہہ دیکھئے اور پھر لڑکا ایسا کہاں ملتا ہے؟

بھگت جی۔ مہاراج میں نے کہہ دیا تھا کہ لڑکا لاکھ غریب ہو مگر گودڑ کا لعل ہے۔

ماں۔ ہم خود جانتے ہیں بھگت جی سب کچھ۔ ہماری بھی عمر بیت گئی ہے لڑکوں کو دیکھتے دیکھتے!

بھگت جی۔ بس پھر ہو گئی پختہ بات!

رائے صاحب۔ ہماری طرف سے خواہ ابھی شگون لے جایئے۔

بھگت جی۔ واہ وا! واہ وا!! کیوں بچہ جی! ہم نے تم سے کہا نہ تھا کہ تمہارا منہ دو کسی ایسی جگہ بڑھوائیں گے کہ بس ساری عمر یاد کیا کرو گے ہم نے جس کام کو بھی ہاتھ میں لیا۔ پورا کر کے چھوڑا کیوں رائے صاحب!

رائے صاحب دھن مہاراج! آپ کی برابری نہیں۔

ماں۔ دھن جنم ہے۔ ہم تو سر ردند آپ کی سوبھا سنتے ہیں۔

بھگت جی۔ یہ سب مہاراج کی کرپا ہے۔ ورنہ میں کون ہوں اور کس لائق ہوں؟

اچھا رائے صاحب اب ہم آپ کو ایک خبر سناتے ہیں۔

رائے صاحب۔ کوئی اچھی خبر سنایئے۔

بھگت جی۔ کبھی آپ کو ایسی ویسی بھی سنائی ہے! خوش ہو جایئے گا سن کر۔

رائے صاحب کیوں نہیں! ضرور ضرور کچھ نفع ہوا ہے!

بھگت جی۔ (ہنستے ہیں) ہی ہی! ہی ہی!! ہی ہی!!! بوجھ لیجئے بوجھ لیجئے۔

رائے صاحب۔ آپ کی باتیں آپ ہی جانیں۔

بھگت جی۔ کیا بتائیں مہاراج ہم گئے ہوئے تھے باہر پچھلے دنوں اتنے بیمار ہو گئے۔ اتنے بیمار کہ زمین پر اتار دیا۔

رائے صاحب اور ماں۔ ہرے ہرے ہرے۔

بھگت جی۔ مہاراج پردیس کا معاملہ۔ نہ پاس کوئی خبر لینے والا۔

ماں۔ ہرے رام! ہرے رام!!

بھگت جی۔ مہاراج ہم سمجھے کہ بس انت کی گھڑی آ پہنچی۔ بار بار یہی خیال آئے کہ او گینڈی لعل! تیرا اتنا کما کمایا کس کام؟ اگر

ابھی تیرا دم نکل جائے۔ تو پیچھے کوئی تیرا پانی دینے والا بھی نہ رہے۔ اُس وقت ہم نے واگورو کا دھیان کیا کہ او سچے پادشاہ اس وقت بخش دے تو ہم کوئی پانی دینے کا سہارا ہی بنا لیں۔ سو مہاراج .... جے کشن کو اب ہم نے بیٹا بنا لیا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے اسے باپ کی ضرورت تھی اور ہمیں بیٹے کی اب دیکھئے مہاراج کیسے ٹھاٹھ کے ساتھ برات لاتے ہیں۔

رائے صاحب۔ جے کشن! YOU ARE A LUCKY BOY!

صاحب۔ میرے خیال میں شادی کے بعد جے کشن England چلا جائے تو بہتر ہے۔

بھگت جی۔ نہ مہاراج میں تو لڑکے کو نہ بھیجوں گا۔ وہاں جا کر لڑکے بگڑ جاتے ہیں۔

صاحب۔ جی نہیں ہم LILLY کو بھی ساتھ بھیج دیں گے۔ کم از کم honeymoon تو ضرور وہاں جا کر منائیں

(پردہ گرتا ہے)

(مترجمہ) ز۔ ب

رباعی

وہ کیف لئے اب کے سحاب آیا ہے
کہ دورِ مئے ناب آیا ہے
اک شور ہے کہ دوش پہ آ جاؤ
ہر جام بکف زلف بدوش شباب آیا ہے

میخانۂ فطرت
محشر رامپوری

رباعیات

(۱)

[illegible] آگئے جب آؤ گے
سب ہو گئے ایک آؤ گے آؤ گے
کب تک نہ قیامت کا سبب آؤ گے
آئین کے شیشے میں شراب
آرائش ہے بہار اور ہستی ہے شباب
ہمراز بنے آؤ گے کب آؤ گے

(۲)

مستی ہے کہ بے تاب ہوئی جاتی ہے
ہر سانس گرداب ہوئی جاتی ہے
گردش ہے گھٹاؤں کی قسم
برسات کی بدمستی بے تاب ہوئی جاتی ہے

مرثیہ
محشر رامپوری

گناہ

(۱)

تیزی سے کاوشِ وار چھوٹا نہ گیا
پھر ہم سے بھی کمند دام سے چھوٹا نہ گیا
جتنا دنیا نے ہم کو لوٹا سیماب
اتنا دنیا کو ہم سے لوٹا نہ گیا

(۲)

غفلت میں نہ اپنی ہم خطا یاد آیا
بس یہ کہ گناہوں کا مزا یاد آیا
بھولے جو خدا کو تو ہوش میں آئے جب
تنگی آئی تو ہوش سے تو خدا یاد آیا

(۳)

انساں کبھی پھول کو شرارا سمجھا
نادان شرر کو بھی تارا سمجھا
سمجھا نہ گناہوں کو اساسِ توبہ
توبہ کو گناہوں کا کفارہ سمجھا

(۴)

تخئیل ہی پاکی کی شگوفہ کاری ہے یہاں
نیکی و بدی سب اعتباری ہے یہاں
جیسا جسے سمجھو گے وہ ہے ویسا ہی
یعنی ہر چیز اعتباری ہے یہاں

(۵)

ہر راہِ دنیا کی سے گذرتا ہوں میں
نیک اور بد سب کام ہی کرتا ہوں میں
خوف اپنے گناہوں کا نہیں ہے مجھ کو
لیکن اپنے خدا سے ڈرتا ہوں میں

(۶)

ایسا کوئی جس سے ہوا ہو نہ گناہ
اعمال سے جس کے آشنا ہو نہ گناہ
وہ ترکِ گناہ کا سبق دے مجھ کو
جس نے کوئی دنیا میں کیا ہو نہ گناہ

(۷)

پنہاں کی نگاہ دیکھ لیتا ہوں میں
قلب بد خواہ دیکھ لیتا ہوں میں
پڑتی نہیں اپنے عیب پہ میری نظر
اوروں کے گناہ دیکھ لیتا ہوں میں

(۸)

خلوت میں بہ صد نیاز و سامان کے ساتھ
کرتا ہوں جو چھپ کے برملا اعلان کے ساتھ
اخفائے گناہ غیر ممکن ہے یہاں
شیطان لگا ہوا ہے انسان کے ساتھ

(۹)

پندار سے دل تباہ ہو جاتا ہے
بندہ یوں ہی روسیاہ ہو جاتا ہے
نیکی سے کوئی فرشتہ تجھے معلوم بھی ہے
ہر سانس میں اک گناہ ہو جاتا ہے

(۱۰)

عشرت کی طرف نگاہ بھی میں نہ کروں
تو نغمہ سرا ہو، آہ بھی میں نہ کروں
نیکی نہیں ممکن ہے تو کیا ایسا نا ممکن
دنیا میں کوئی گناہ بھی میں نہ کروں

(۱۱)

ہے کفر گناہ اور اسلام گناہ
یہ کام گناہ اور وہ کام گناہ
القصہ ہے ایک چیز کا اس دنیا میں
اک نام ہے کچھ اور ہے اور اک نام گناہ

(۱۲)

عشرت کو گناہ زندگی سمجھا ہے
جذبات کی تسکین کو بدی سمجھا ہے
ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خفا
کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے؟

سیماب اکبرآبادی

رادھا کے گیت

(۱)

پریتم روٹھ گئے۔
آہ، سکھی پریتم روٹھ گئے۔
پچھلی بسنت میں پریتم کہتے تھے پریم کے بندھن ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔
یوں ہی کھیلتے کھیلتے،
یوں ہی ہنستے ہنستے،
سکھی ایسے ہی ہوا، پریتم نے جیسے کہا وہی ہوا۔
یوں ہی کھیلتے کھیلتے،
یوں ہی ہنستے ہنستے
پریتم سے میں نے اپنے من کی بات کہہ ڈالی اور پریتم روٹھ گئے
پریتم روٹھ گئے،
آہ، سکھی پریتم روٹھ گئے۔

(۲)

سکھی میں باغ میں گئی، بھونرے نے کلیوں سے نہ جانے کیا کیا کہا،
آہ، سکھی پریت کتنی انجان بن جاتی ہے دکھ کے سپنوں میں۔
سکھی میرا پریتم دکھ بھی ہے اور سکھ بھی،
پھولوں کی باس چندرماں سے گا،
اور میرے سریر کی باس میرا پریتم،
سکھی لوبھی پریتم کس کام کے۔
سکھی لوبھ کتنا بھلا لگتا ہے جوانی میں
کام دیو پریت کے روپ کو بدل دے،
میرا پریتم دیوتا ہے، شکتی ہے میری آتما کی،
اور میری پریت میرے کرم،
آہ! سکھی پریت کتنی انجان بن جاتی ہے دکھ کے سپنوں میں!

(۳)

سکھی پریتم سے میں نے پریم بھکشا مانگی، پریتم رو دیے
پریتم نہ جانے کیوں رو دیتے ہیں جب میں کچھ مانگوں اُن سے،
بھونرے نے کلیوں کا رس چوسا
اور اپنے ہردے کی پیاس بجھائی۔
سکھی یہی ہے نا پریم بھکشا؟
چندرماں نے ندی کے پانی کو چوما،
اور اپنے پیاسے نیروں کو تر کر لیا،
سکھی یہی ہے نا پریم بھکشا؟
بھونرے نے پریم بھکشا مانگی، کلیاں تو نہ روئیں۔
چندرماں نے پریم بھکشا مانگی ندی تو نہ روئی،
آہ میرے پریتم تو رو دیتے ہیں جب میں کچھ مانگوں اُن سے،
سکھی پریتم سے میں نے پریم بھکشا مانگی، پریتم رو دیے۔
پریتم نہ جانے کیوں رو دیتے ہیں جب میں کچھ مانگوں اُن سے،

(۴)

میں من کی آشا پریتم کو سنانے گئی، پریتم نے نہ سنی،
سکھی پریت کی آشائیں پریتم کیوں سنے،
جھوٹے ہیں سکھی، آہ جھوٹے ہیں پریت کے سارے بچن
برہن گوپیوں کی پیا نے میرا پریتم موہ لیا،
سکھی کتنا دکھی بن جاتا ہے جھوٹی پریت میں جیون،
کوئل نے سچی پریت کا گیت گایا۔
آہ سکھی کتنی مورکھ تھی وہ کوئل!
پپیہے نے برہ میں ایک دکھ بھری ہوک ماری!
آہ سکھی کتنی جھوٹی تھی سچی پریت کی ہوک۔
جھوٹے پریتم کو کوئی من کی آشا کیوں سنائے
میں من کی آشا پریتم کو سنانے گئی، پریتم نے نہ سنی،

سکھی پیت کی آشا من میں کیوں ہے

(۵)

سکھی پھولوں کا ہار پیتم نے نہ لیا اور میں روتی رہی،
میری پیت میرے من کی پھلواڑی ہے،
میں نے اپنی پیت کو نیروں کے چھینٹوں سے پالا
سکھی نیروں کے چھینٹے کتنے سندر ہوتے ہیں
اس سمے جب پیتم روٹھ جائیں،
سکھی کیا سب سکھیوں کے پیتم ایسے ہی روٹھ جاتے ہیں جیسے
میرا پیتم!
سکھی کیا سب سکھیاں اپنے پیتم کے لیئے ایسے ہی رویا کرتی
ہیں جیسے میں!
آہ، سکھی نہ جانے میرا پیتم کیوں روٹھ جاتا ہے یونہی ہنستے ہنستے
کتنی ابھاگن ہے میری پیت،
اور آہ کتنا دکھی ہے میرا جیون،
جب پیتم ہی روٹھا ہوا ہو!!
میں پھولوں کی باس کیوں سونگھوں،
میں سنگار کر کے اپنی جوانی کو کیوں رُلاؤں!
میں بسنت رُت کیوں مناؤں!
سکھی پھولوں کا ہار پیتم نے نہ لیا اور میں روتی رہی!

(۶)

سکھی پیتم سے نہ کہنا
کہ رادھا ان کے دُکھ میں آہ ان ہی کے دُکھ میں رو رو کے
بے جان ہوگئی!!
آہ پیتم یہ کیوں جانیں
کہ رادھا ان کے لئے رویا بھی کرتی ہے
چاندنی راتوں کے اس سمے میں جب سنسار خوشیوں کے
سپنوں میں سویا ہوتا ہے!
آہ پیتم کو یہ کیوں خبر ہو
کہ رادھا ان کے لئے آہیں بھی بھرتی ہے۔
بہار کے ان لمحوں میں جب سنسار مستیوں کی نیندوں میں کھویا
ہوتا ہے!

سکھی پیتم سے نہ کہنا
کہ رادھا اُن کے دکھ میں آہ اُن ہی کے دکھ میں رو رو کے
بے جان ہوگئی!!

(۷)

سکھی جا پیتم کو منا لا
روٹھے ہوئے بھونرے کو
کلی نے چوم چوم کر منا لیا!

روٹھی ہوئی برکھا کو!
چاتک نے رو رو کر منا لیا!!

روٹھی ہوئی بسنت کو،
کوئل نے گا گا کر منا لیا!
سکھی جا پیتم کو منا لا

(۸)

پیتم آگئے
سکھی پیتم آگئے!
میں اٹھوں!
اور اُٹھ کر اُن کے پگ چوم آؤں!
میں جاؤں!
اور جا کر ان کے لیئے پیار ڈھونڈھ لاؤں!
میں ناچوں!
اور ناچ کر ان کے پریم میں باؤلے گیت گاؤں!
میں رو دوں!
اور رو کر اُن کے ہردے سے لپٹ جاؤں!
پیتم آگئے
سکھی پیتم آگئے!

(۹)

سکھی میں آج اپنا من بھول آئی!
صبح سویرے پھولوں کے باغ میں!!
اپنے دھیان میں!

کھویا ہوا!
اپنے گیان میں!
بیٹھا ہوا!
برج کا ایک بھولا سا!
باؤلا لڑکا!
گا رہا تھا پریم کا یہ منوہر گیت!
مُرلی کے میٹھے میٹھے سروں میں!
"تیری رادھا کے نین ستارے ہیں!
میری مُرلی کے گیت پیارے ہیں!"
سکھی میں آج اپنا من بھول آئی!
صبح سویرے پھولوں کے باغ میں!!

(۱۰)

سکھی رادھا ڈر گئی،
کل رات سپن میں!
سوتے سوتے!!
نہ جانے،
کون،
چپکے سے ہنستا ہوا آیا میرے سوئے ہوئے نینوں کے پاس!
نہ جانے،
کون،
دھیمے سے گاتا ہوا آیا میرے کھوئے ہوئے وچاروں کے پاس
نہ جانے،
کون،
رادھا سے شرماتا ہوا آیا، رادھا کے سہمے ہوئے سپنوں
کے پاس!
سکھی رادھا ڈر گئی
کل رات سپن میں!
سوتے سوتے!!

عظیم قریشی

پیامِ رُوح

شاعرِ کائنات ہوں، حُسن سے مجھ کو کام ہے
پھول ہیں مجھ سے ہم سخن، چاند بھی ہم کلام ہے

میں ہوں، خیالِ دوست ہے، گردشِ صبح و شام ہے
میری یہی نماز ہے، میرا یہی سلام ہے

ایک طرف جفائے دوست، ایک طرف وفائے دل
زیست مجھے وبال ہے، موت مجھے حرام ہے

چاند بھی کہہ کے چھپ گیا، شمع بھی کہہ کے بجھ گئی
حُسنِ ازل کی داستاں قصۂ ناتمام ہے

عشق کی وسعتوں میں کچھ دخل نہیں ہے ہوش کو
اُس کو خزاں سے کام کیا، جس کو جنوں سے کام ہے!

پھول ہیں، اور بہار ہے، تارے ہیں اور چاندنی
قلب کی کائنات میں درد کا انتظام ہے

جس نے یہ بھید پا لیا اس کے لیے فنا نہیں
اصل میں بےخودیٔ عشق زندگی کا اک پیام ہے

نوحۂ مرگِ دوست سے فائدہ کچھ نہیں ضیا
کس کو یہاں ثبات ہے کس کو یہاں قیام ہے

ضیا فتح آبادی

احسن الکلام

کھو کے ہوش و عقل، شامل مدِ فاضل میں رہے
ہم نہ رہنے کے برابر اُن کی محفل میں رہے

تیر چٹکی میں، نہ خنجر دستِ قاتل میں رہے
اک مرے پہلو میں بیٹھے اک مرے دل میں رہے

ہم مصیبت میں رہیں یا غیر مشکل میں رہے
دیکھیے کس پر نگاہِ یار محفل میں رہے

آپ جب تک میرے ارمانوں بھرے دل میں رہے
خلوتوں کے لطف حاصل مجھ کو محفل میں رہے

یوں رہا عمرِ رواں کے ساتھ دنیا میں قیام
ہم سفر کرتے ہوئے ہر وقت منزل میں رہے

ایک دردِ دل کے صدہا قصۂ رنگیں بنے
غرق جب تک دستِ قاتل خونِ بسمل میں رہے

اضطرابِ زندگی پر ہے مدارِ زندگی
دل رہے پہلو میں جب تک درد بھی دل میں رہے

دل نوازی کیا ہوئی، پہلو نشینی کب ہوئی!
تم نہ خلوت میں کبھی ٹھہرے نہ محفل میں رہے

سُن کے عرضِ وصل بولے اور ہم کیوں کر ملیں
خواب میں آئے خیالوں میں پھرے دل میں رہے

عشرت افزائے چمن جب تک رہی فصلِ بہار
پھول بھی ہنستے ہوئے شورِ عنادل میں رہے

خودکشی کا صدمہ یک لمحہ عاشق کے لئے
اس سے آساں ہے کہ ساری عمر مشکل میں رہے

پردہ در ہے عہدِ حاضر دیکھئے کیا گل کھلے
غنچہ رو اب تک تو میرے گوشۂ دل میں رہے

بے خیالِ عشق حسنؔ پہلوئے انساں میں دل
یوں ہے جیسے ظرفِ خالی دستِ سائل میں رہے

حسن بریلوی

الازدی کی فتوح الشام

اسلام کے ابتدائی دور (عہدِ نبوی اور خلافت راشدہ) میں مسلمانوں کو اپنی عملی مصروفیتوں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اپنے عظیم الشان کارناموں کی خود ہی تاریخ لکھ دیتے۔ البتہ یہ یقینی امر ہے کہ کچھ دفتری اور شخصی یادداشتیں رکھی جاتی تھیں، جن سے بعد کے مورخوں نے استفادہ کیا۔ لیکن اسلامی تاریخ کی تدوین زیادہ تر زبانی روایت کے ذریعہ سے ہوئی، جس کا سلسلہ فوراً ہی شروع ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے ان ناموروں کے حیرت انگیز حالات اور کارنامے آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے، وہ قدرتاً مشتاق تھے کہ اُن لوگوں کی زبان سے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے یا شریک رہے تھے، سب باتیں معلوم کریں۔ اس طرح اسلامی تاریخ کی روایت شروع ہوئی جو بعض دیگر اسلامی خصوصیات کی طرح اپنی نوعیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی کہی جا سکتی ہے۔

خالص تاریخی روایات کی صداقت کا معیار تو بیشتر اسلام میں ہمیشہ بلند رہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم جس قدر اُس ابتدائی دور کے قریب پہنچتے جاتے ہیں اتنا ہی اُسے اور بلند ہوتا ہوا پاتے ہیں، یہاں تک کہ اسلامی تاریخ کے اکثر قدیم ترین مآخذ ہمارے بہترین مآخذ ثابت ہوتے ہیں۔

افسوس ہے تو یہ کہ اُن کے بیش بہا ذخائر دستبرد زمانہ سے نیست و نابود ہو کر رہ گئے۔ بہت تھوڑے باقی ماندہ آثار اصلی حالت میں دستیاب ہوتے ہیں، اور بعد میں آنے والوں نے قدیم ماخذوں سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے جس کی منت سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے، لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے ایسا استفادہ کیا ہو جو ہمیں اُن اصل مآخذ سے بے نیاز کر دینے والا ثابت ہو سکے۔

شام کی فتوحات اسلام کی سب سے پہلی فتوحات تھیں، اور خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت کا مرکز بھی شام ہی تھا۔ اس لئے شام کی تاریخ کو خاص امتیاز و اہمیت حاصل تھی کہ قرونِ اولیٰ کے اسلامی ناموروں کے سب سے پہلے کارنامے اسی سرزمین سے شروع ہونے تھے جنھیں بعد کے دور میں گویا ایک طرح کا تقدس حاصل ہو چکا تھا۔ شام کی تاریخیں بہت جلد قلمبند ہو گئی تھیں، اور کافی تعداد میں موجود تھیں۔

ابن الندیم کی الفہرست (۳۷۷ھ / ۹۸۸-۹ء) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص مبحث پر ابو مخنف الازدی، الواقدی، اور المدائنی کی کتابیں (الفہرست مطبوعہ مصر ص ۱۳۶، ۱۴۴، ۱۵۰) زیادہ متداول و معروف تھیں۔ امام طبری (متوفی ۳۱۰ھ / ۹۲۳-۹۲۲ء) نے بھی پرانے ماخذوں سے استفادہ و تلخیص کی، لیکن وہ سب اصلی مآخذ ہم تک نہیں پہنچے۔ فتوحات کی تاریخ میں البلاذری (متوفی ۲۷۹ھ / ۸۹۲-۸۹۳ء) کا درجہ سب سے بلند سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب البلدان میں بعض بہترین قدیم اسناد سے تمام اسلامی فتوحات کا خلاصہ یک جا کر دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس بلند پایہ مصنف کی مفصل کتاب البلدان الکبیر (الفہرست ص ۱۶۴) "جسے وہ مکمل نہیں کر پایا تھا" (الفہرست ایضاً) دستیاب نہیں ہوتی۔

فتوحاتِ شام پر البلاذری اور طبری ہمارے بہترین مآخذ ہیں اور جس حد تک ہیں اُن کے نہایت مفید بلکہ ناگزیر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں مصنف اس دور کے متعلق نہ اصلی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، نہ ان کے بدل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ رہی واقدی کے نام سے منسوب ہو جانے والی تاریخ شام، تو وہ جعلی، صدیوں بعد کی لکھی ہوئی، اور زیادہ تر افسانہ آمیز ہے، جس کا علمی رتبہ قدیم مآخذوں کے مقابلہ میں چنداں امتیاز نہیں رکھتا۔

اس وقت تک فتوحات شام پر صرف ایک ہی اصلی ماخذ دستیاب ہوا ہے، یعنی امام ابو اسماعیل محمد بن عبداللہ الازدی البصری المتوفی ۱۹۰ھ

(تقریباً) کی کتاب فتوح الشام، جس کا متن ۱۸۵۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا تھا اور جس کا اردو ترجمہ حال ہی میں مولانا شیخ آبادی نے ہند پریس کلکتہ سے شائع کیا ہے جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔

یہ ایک نہایت قیمتی کتاب کا نہایت قابلِ پسند ترجمہ ہے جس پر ایک مختصر مگر جمیل و دلکش مقدمہ بھی لکھا گیا ہے۔ جو پاکیزہ جذبات اور بصیرت انگیز افکار سے مملو ہے یہ کتاب بلاشبہ اس قابل ہے کہ ہر تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے کے ہاتھ میں ہو اور کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہ رہے۔

(۲)

ہم اس کتاب کی تاریخی اہمیت اور علمی حیثیت پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلامی تاریخ کی کتابوں میں اس کا رتبہ معلوم ہو سکے۔

اس کتاب کا ذکر نہ تو الفہرست میں ہے نہ بظاہر امام طبری والبلاذری نے اس سے کام لیا ہے۔

لیکن ایک ہی مبحث پر متعدد کتابوں کے موجود ہونے کی وجہ سے جن میں سے ہر ایک مصنف اپنے لئے جداگانہ انتخاب کرتا رہتا تھا، یہ چنداں تعجب انگیز نہیں ہے نہ اس سے اس کتاب کی قدر و قیمت پر اثر پڑتا ہے، ہمیں حیرت ہے کہ خود ہمارے زمانہ میں اطالوی مستشرق کائتانی Catani نے بھی فتوحاتِ شام کی تاریخ مرتب کرتے وقت اس قیمتی ماخذ کو بالکل فراموش کر دیا ہے

جب اسلامی تواریخ کی تدوین شروع ہوئی تو ہر ہر مقام پر بالخصوص مرکزی شہروں میں قدیم روایات کو محفوظ کرنے کے لئے سعی جاری ہو گئی۔ حجاز میں مکہ معظمہ و مدینہ منورہ، شام میں دمشق، مصر میں فسطاط، اور عراق میں بصرہ اور کوفہ مشہور سیاسی اور علمی مرکز تھے۔ اس علمی بیداری میں جو اسلام کے ساتھ ظہور میں آئی کوئی مرکز جدوجہد میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ بصرہ اور کوفہ عربوں کے بسائے ہوئے شہر اور عراق میں عربی تمدن کے مرکز تھے۔ عربی نحو اور ادب کے بصری اور کوفی مدارس کے نام اب تک زندہ ہیں۔ اور ان کی اختلافی بحثوں کی صدائے بازگشت آج تک گونجتی ہے۔

ان مرکزوں میں اسلامی تاریخ سے پوری دلچسپی لی جاتی تھی، جس کا ثبوت الازدی کی تاریخ سے ملتا ہے جو شام کی فتوحات سے تعلق رکھتی ہے۔

وہ بصرہ کا رہنے والا اور عرب کے ممتاز قبیلۂ ازد سے جس نے اور بھی بعض نامور مصنف و مورخ پیدا کئے، تعلق رکھتا تھا۔ ذاتی حالات ہمیں دستیاب نہ ہو سکے، نہ سنہ ولادت و وفات ہی معلوم ہوا۔ کتاب کا زمانہ تالیف دوسری صدی ہجری کا وسط معلوم ہوتا ہے، اور مصنف امام ابن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ ۷۶۸ء) سیرۃ النبی کے مشہور مصنف کا ہمعصر ہے۔ اور عربی مورخوں میں وہ ابن ہشام (متوفی ۲۱۸ھ ۸۳۳ء) المدائنی (۲۲۵ھ) الواقدی (متوفی ۲۰۷ھ ۸۲۲ء) ابن سلام (۲۳۰ھ) الدینوری (متوفی ۲۸۲ھ ۸۹۵ء) البلاذری متوفی (۲۷۹ھ ۸۹۲ء) سب ہی سے مقدم ہے، اور عربی مورخوں کے امام اعظم ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ ۹۲۳ء) سے تو اس کا زمانہ سوا سو برس پہلے ہے۔

یہ عجب نہیں ہے کہ الازدی کی تاریخ کو اس علمی تحریک سے کچھ تعلق ہو جو بغداد میں مرکزِ خلافت قائم ہونے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اور اسلامی روایات کی تدوین و احیا کی خاص طور پر حامی تھی، اور اسی کے سلسلے میں ابن اسحاق نے سیرۃ لکھی تھی، جس پر ابن ہشام کی موجودہ سیرۃ مبنی، اور ایک قدیم تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔

الازدی کے راوی صحابہ و تابعین ہیں جن کے نام ہی کتاب کی عظمت کے لئے کافی ضامن ہیں، لیکن کتاب کی اصلی قدر و قیمت وہ بیّن صداقت ہے، جو پرانے عربی مورخوں کا طرۂ امتیاز اور الازدی کی کتاب کی نمایاں خصوصیت ہے۔

اگر اسلام کی تاریخ میں کوئی جماعت سورماؤں کی حیثیت رکھتی ہے، جن کی ذات کو تقدس کا رتبہ مل سکے، تو وہ یہی بزرگ ہیں، جن کے ہاتھوں وہ مہتم بالشان کارنامے سرانجام پائے، کہ جن سے چشم زدن میں تاریخ عالم کا ایک بہت بڑا اور عالمگیر انقلاب ہو گیا۔ عجب نہ تھا کہ عقیدت کی راہ سے اُن سے ایسے واقعات منسوب ہو جاتے جو فوق الفطرت اور حیرت افزا ہو سکیں۔ دوسری قوموں کی تاریخیں اس کی شاہد ہیں، جن کی قدیم ترین کتابیں انہیں چیزوں سے پُر ہیں، جو انہیں تاریخ کے رتبہ سے گرا کر افسانوں کی سطح پر لا رکھتی ہیں۔ خود مسلمانوں میں بھی بعد کے ذہنی انحطاط کے ساتھ یہی ہوا کہ اُن کی بھی بعض کتابیں، ایسی باتوں سے خالی نہ رہ سکیں، مثلاً الواقدی کے نام سے مشہور ہو جانے والی

تاریخ فتوحات شام کو دیکھو لیکن الازدی کے دور کے مسلمانوں کا معیارِ صداقت انتہائی بلند تھا۔

چنانچہ تمام کتاب میں ایک بھی واقعہ ایسا نہ ملے گا۔ جو بظاہر ناقابل یقین مافوق الفطرت، ناقابل اور بعید از عقل ہو۔ تمام روایات سے کھلی سچائی جھلکتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنا قدم کمال احتیاط سے اٹھاتا ہے۔

قدیم اسلامی مورخوں کا مخصوص طریقہ بیان خاص لطف رکھتا ہے کہ جو اُن کی لکھی ہوئی تاریخوں کو ڈراما کے مشابہ بنا دیتا ہے مکالموں مراسلتوں، اور گرد و پیش کے حالات سے تاریخی اشخاص کی سیرتیں آسانی سے پہچانی جاتی ہیں۔ بلکہ اُن کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویریں آنکھوں میں پھرنے لگتی ہیں۔

یرموک کی جنگ کے حالات بیان کرتے ہوئے الازدی لکھتا ہے:۔

ابو معشر سے روایت ہے کہ جب رومی فوجیں مسلمانوں سے قریب ہوئیں تو حضرت ابو عبیدہ نے مسلمان سرداروں کو جمع کر کے مشورہ چاہا:۔

یزید بن ابی سفیان نے کہا "میری رائے ہے کہ آپ مسلمانوں کو لے کر یہاں سے ہٹ جائیں اور مقام ایلیہ میں ٹھہریں پھر امیر المومنین کو لکھیں کہ ہمارے مقابلہ پر اتنی عظیم الشان فوجیں آ گئی ہیں، اور ہم کمک آنے کا انتظار کریں۔

عمرو بن العاص نے کہا میرے خیال میں ایلیہ بھی دوسرے شہروں کی طرح ایک شامی شہر ہے، میں یہ مشورہ دوں گا کہ مقام قرح میں چلیں اور کمک کا انتظار کریں جس سے قوت حاصل کر کے دشمن پر حملہ کر سکتے ہیں۔

یہ سب باتیں ہو رہی تھیں اور خالد بن ولید چپ تھے..... اس موقع پر انہیں خاموش دیکھ کر حضرت ابو عبیدہ (سپہ سالار) نے کہا آپ کی کیا رائے ہے!

حضرت خالد نے جواب دیا میری رائے یہ ہے کہ اگر ہم نفس اور دنیا کے لئے لڑ رہے ہیں تو بیشک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اور اس سے جنگ ہمارے بس سے باہر ہے، لیکن اگر ہم اللہ کے لئے اور اللہ کی مدد سے لڑتے ہیں، تو قسم ہے خدا کی کہ اگر تمام دنیا کی فوجیں بھی سمٹ کر رومیوں کی مدد پر آ جائیں تو بھی انہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتیں!

راوی کہتا ہے یہ فرماتے ہوئے وہ جوش میں آ گئے اور حضرت ابو عبیدہ نے کہا "ضرور"

حضرت خالد نے فرمایا "تو مجھے اپنے خیمہ کے باہر جو کچھ ہے اس کی سرداری دے دیجئے میں جو کچھ کروں کرنے دیجئے، مجھے یقین ہے کہ اللہ ہمیں ضرور دشمن پر فتیابی دے گا"

حضرت ابو عبیدہ نے یہ خواہش منظور کر لی، اور انہیں سپہ سالار بنا دیا اور اُس جنگ میں انہوں نے سب سے بڑھ کر بہادری دکھائی"

کیسا بے تصنع، بے مبالغہ اور سادہ بیان ہے، اور کس آسانی سے ہم حضرت خالد کی شخصیت کو پہچان لیتے ہیں، جو اُسی رنگ میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے، ناقابل شکست عزم، خدا پر لامحدود اعتماد، اور کامیابی کی یقین آمیز اُمید کے ساتھ۔ ایسے ہی قائد تھے جنھوں نے دنیا کی تاریخ کو بدل دیا۔

(۳)

جب الازدی کی روایتوں کا دوسرے پرانے مورخوں کی روایتوں سے جو دوسرے اسناد پر مبنی ہیں مقابلہ کیا جاتا ہے، تو جہاں وہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں وہاں بھی الازدی کی تفصیلیں بیشتر بصیرت افزا اور دلچسپ ثابت ہوتی ہیں، اور کبھی کبھی الازدی کے بیانات سے مزید تکمیل و توضیح ہوتی ہے بعض جزئیات میں وہ اُن سے زیادہ باخبر ثابت ہوتا ہے: دوسرے مورخ زیادہ تر اپنی اصل روایتوں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں لیکن الازدی کی روایتیں اصلی حالت میں ہیں۔

مثلاً حضرت عمرؓ کے سفرِ شام اور فتح بیت المقدس کے مشہور واقعہ کو لو۔

البلاذری لکھتا ہے:۔

"اہل ایلیا نے ابو عبیدہ سے دیگر اہالیان شام کی طرح جزیہ و خراج اور یکساں برتاؤ کے وعدہ پر امن و صلح طلب کی اور یہ شرط پیش کی کہ خود حضرت عمر بن الخطاب آ کر اُن سے معاہدہ کریں۔ ابو عبیدہ نے حضرت عمر کو لکھا جس پر وہ آئے اور جابیہ دمشق میں ٹھیرے وہاں سے ایلیا تشریف لے گئے اور ایلیا والوں سے صلح

کرلی، اور صلح نامہ لکھ کر حوالے کیا۔ فتح ایلیا ۱۷ھ میں ہوئی۔

(فتوح البلدان مطبوعہ مصر ص ۱۴۵)

دوسری روایت ابی حبیب کی سند سے:۔

حضرت عمر بن الخطاب نے خالد بن ثابت الفہمی کو ایک لشکر کے ساتھ بیت المقدس بھیجا تھا اور وہ اس وقت جابیہ میں تھے۔ ایلیا والوں سے جنگ ہو کر بالآخر یہ قرار پایا کہ وہ مسلمانوں کو قلعہ میں سے بھی کچھ دیں گے اور قلعہ سے باہر سب مسلمانوں کا ہوگا۔ حضرت عمر آئے اور انہوں نے اسے منظور کر لیا، اور لوٹ گئے"۔

الاوزاعی کی سند سے:۔

"ابو عبیدہ . . . . . ایلیا میں اترے، اہل ایلیا نے صلح چاہی ۱۶ھ میں یہ صلح ہوئی کہ حضرت عمر خود آ کر صلح نافذ فرمائیں اور لکھ کر دیں"۔

عبداللہ بن قیس کی روایت سے:۔

میں ان لوگوں میں شامل تھا جو ابو عبیدہ کے ساتھ حضرت عمر کے خیر مقدم میں جبکہ وہ شام میں آئے تھے شریک تھے۔ اذرعات کے رہنے والے تلواریں اور پھول لئے گاتے بجاتے آئے۔ انہیں دیکھ کر حضرت عمر نے کہا انہیں منع کرو" ابو عبیدہ نے کہا اے امیرالمومنین یہ ان کی رسم ہے یا ایسے ہی کچھ الفاظ تھے، اور اگر انہیں منع کیا جائیگا تو وہ یہ سمجھیں گے کہ معاہدہ توڑا جاتا ہے" (یعنی ان کی رسم و رواج کی آزادی میں دست اندازی ہوتی ہے) اس پر حضرت عمر نے فرمایا، "اچھا رہنے دو"

طبری نے سفر شام و فتح بیت المقدس پر متعدد روایتیں پیش کی ہیں، جن میں سب سے زیادہ دلچسپ عہد ناموں کی نقلیں ہیں طبری نے ان حالات کو ۱۵ھ کے واقعات بیان کئے ہیں۔ البلاذری نے ۱۷ھ لکھی ہے۔ کاتانی نے سفر و فتح بیت المقدس کی تاریخ ۱۶ھ قرار دی ہے۔ خود الازدی نے بعض اہم واقعات کی تاریخیں بعض اوقات بقید یوم و سنہ لکھی ہیں لیکن اس واقعہ کی کوئی تاریخ بیان نہیں کی ہے مفصل بحث کا یہ موقع نہیں ہے لیکن میری رائے میں البلاذری اور الازدی دونوں کے بیانات سے ۱۶ھ ہی صحیح معلوم ہوتی ہے طبری کی روایتیں خلاصہ کے طور پر بیان کی گئی ہیں، لیکن کل کا علاوہ اس مقام پر تطویل کے خیال سے نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ الازدی کا بیان انتخاب کر کے لکھتے ہیں، جو ہمارے خیال میں سب سے بہتر اور مشرح ہے:۔

(حملہ)

راوی کہتا ہے، حضرت ابو عبیدہ نے ایلیا والوں کی آمد کا انتظار کیا، جب انہوں نے آنے اور صلح سے انکار کر دیا تو یلغار شروع کی۔ اور سختی سے محاصرہ کیا، ایک دن ایلیا والے شہر سے نکلے اور کچھ دیر لڑے، مسلمان ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، وہ بھاگ نکلے اور شہر کے پھاٹک بند کر لئے، اس جنگ کے سپہ سالار خالد بن ولید اور یزید بن ابی سفیان تھے . . . .

بیت المقدس والوں کی شرط

ایلیا والوں نے پیغام بھیجا کہ صلح کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابو عبیدہ نے جواب دیا "ہم بھی تیار ہیں" ایلیا والوں نے کہا آپ اپنے خلیفہ عمر کو بلا لیجئے ہم انہیں کے ہاتھ سے عہد نامہ لیں گے انہیں سے صلح کریں گے اور انہی کے دستخط سے امان حاصل کریں گے، حضرت ابو عبیدہ نے ان کا یہ مطالبہ منظور کر لیا" ص ۲۷۲-۲۷۳)

مشورہ کے بعد خط لکھا گیا، اور حضرت فاروق صحابہ سے مشورہ کر کے (جس کی تفصیلات ہم نظر انداز کرتے ہیں) روانہ ہو گئے:۔

"آپ نے مسلمانوں سے فرمایا "بسم اللہ تیار رہو جلد میں بیت المقدس جاؤں گا" چنانچہ آپ کے ساتھ بڑے بڑے سردار اور مہاجرین و انصار روانہ ہو گئے، اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بن عبدالمطلب کو بھی ساتھ لے لیا . . . . ."

(صفحہ ۲۷۸)

امیرالمومنین پہلے جابیہ اور پھر وہاں سے ایلیا (بیت المقدس) پہنچتے ہیں:۔

راوی کہتا ہے۔ حضرت عمر جابیہ سے چل کر ایلیا پہنچے مسلمان استقبال کو نکلے۔ حضرت ابو عبیدہ ان کی سواری کے لئے ایک اچھا سا گھوڑا بھی ساتھ لے گئے تھے۔

حضرت عمر اونٹ پر سوار تھے۔ اونٹ پر زین کسا تھا اور کھال کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ امیرالمومنین کو دیکھ کر مسلمان جوش سے آگے بڑھنے لگے، انہوں نے سب کو ٹھہرنے کا حکم دیا، اور خود اونٹ سے اتر پڑے۔

مہار اپنے ہاتھ میں لے لی جو رسی کی تھی، اور اونٹ کے آگے آگے چلتے ہوئے سامنے کا نالہ پار کیا۔ یہاں پہنچ کر حضرت ابو عبیدہ کے ساتھ گھوڑا دیکھا۔ مسلمانوں نے کہا امیر المومنین آپ اس گھوڑے پر سوار ہو جائیے کیونکہ اس سے آپ کے شہ زیادہ خوشنمائی اور وقار ہے، ہمیں پسند نہیں کہ آپ اپنی اس ہیئت کے ساتھ ذمیوں کے سامنے جائیں پھر انھوں نے اچھا سفید لباس پیش کیا۔ حضرت عمر نے کپڑے چھوڑ دیے لیکن گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ وہ شوخی سے پھدکنے لگا۔ آپ اتر پڑے اور کہنے لگے "اسے دور کرو۔ اسے دور کرو، یہ شیطان میرے دل کو خراب نہ کر دے"! (یعنی تمکنت نہ آ جائے)

پھر مسلمانوں نے کہا "امیر المومنین کپڑے پہن لیتے اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلتے تو زیادہ شان ہوتی، زیادہ اثر ہوتا اور زیادہ فائدہ"،

حضرت عمر نے جواب دیا "تمہاری نادانی کا برا ہو! اس میں عزت نہ سمجھو، جو اللہ نے تمہارے لئے پسند نہیں کیا۔ ایسا کرو گے تو ذلیل ہو جاؤ گے"۔

پھر آپ اپنی اصلی ہیئت سے چل دیے۔ مسلمان بھی ساتھ تھے، یہاں تک کہ ایلیا میں پہنچ گئے"! (ص ۳۸۱-۳۸۲)

وہاں پھر لوگوں نے اصرار شروع کیا تو حضرت عمر نے جواب دیا۔

"واللہ۔۔۔ میں اس وضع کو نہ چھوڑوں گا۔ جو دوستوں سے جدائی کے وقت میری تھی۔ میں دنیا والوں کے لئے کوئی ایسی آرائش نہ کروں گا جس سے اللہ کی نظر میں بدنامی کا اندیشہ ہو (یعنی ریا خود نمائی اور نمایش)، میں نہیں چاہتا کہ آدمیوں کی نگاہ میں بڑا سمجھا جاؤں اور اللہ کے حضور میں چھوٹا بنوں"! (ص ۳۸۲-۳۸۳)

ایلیا والوں سے صلح ہونے کے چند روز بعد تک حضرت عمر وہیں مقیم رہے، ایک دن حضرت ابو عبیدہ (سپہ سالار) کے یہاں دعوت میں تشریف لے گئے:۔

"کیا دیکھتے ہیں کہ گھوڑے کے نمدے کے سوا کوئی چیز موجود نہیں، یہی ان کا بچھونا تھا۔ اور زین اُن کا تکیہ۔ ایک طاق میں کچھ سوکھی روٹی کے ٹکڑے پڑے تھے، وہی حضرت عمر کے سامنے زمین پر لا کر رکھ دیے، کچھ نمک لائے، اور مٹی کے کورہ میں پانی بھر کر رکھ دیا! حضرت عمر نے یہ دیکھا تو بے اختیار رو پڑے اور ابو عبیدہ کو سینے سے چمٹا لیا"۔۔ (ص ۳۸۵-۳۸۶)

حضرت بلال بھی ساتھ گئے تھے، وہ آنحضرت کی وفات کے بعد عہد کر چکے تھے کہ اب اذان نہ دیا کروں گا، لیکن حضرت عمر کے کہنے پر اذان دینے کھڑے ہو گئے۔

جب بلال نے اذان دی اور صحابہ نے آواز سنی تو بے اختیار نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یاد تازہ ہو گئی، اور زار زار رونے لگے حضرت ابو عبیدہ اور حضرت معاذ پر سب سے زیادہ گریہ طاری تھا۔

حضرت عمر نے کہا "تم پر اللہ کی رحمت ہو، ضبط کرو"۔ (ص ۳۸۸)

کس دوسری کتاب میں یہ چیزیں ملیں گی؟ حضرت عمر کو پہچانا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں، رسی کی مہار ہاتھ میں ہے، وہ سامنے کا نالہ پار کر کے چلے آ رہے ہیں، کھال کا تھیلا اُن کی اونٹ کی زین سے لٹک رہا ہے! اس روایت میں اس نوکر کا ذکر نہیں ہے، جو عام طور پر مشہور ہے کہ اونٹ پر سوار تھا۔ عجب نہیں کہ کوئی خادم بھی ساتھ نہ ہو، کہ اُن کی خاص شان سے اس حالت کو عین مناسبت ہے۔

(۴)

اس کتاب میں اس روح کا جلوہ نظر آتا ہے، جو اسلامی انقلاب کا باعث ہوئی۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ بعد کے مورخوں نے ان بزرگوں کی عظمت بڑھانے کے لئے حالات کو جلا دینا چاہا ہے۔ الازدی کی کتاب اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیتی ہے اسلام کے اونچے آئیڈل کا جو عملی مظاہرہ اس زمانے میں ہوا تھا، اس کتاب میں عکس افگن ہے۔ خالص توحید، تمام توہمات کے شائبہ سے بری، خدا پر پکا بھروسہ، جو حریت و عظمت نفس کا خاص باعث ہوتا ہے، اسلامی مساوات و جمہوریت کے وہ دل افروز نظارے نظر آئیں گے۔ جو اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نہیں دیکھے گئے۔ انصاف، دیانت، راستبازی کے بعض حیرت ناک واقعات دکھائی دیں گے، جن کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں شاید ہی دوسری جگہ ملیں۔

بعد کے مسلمان مورخوں نے، جو استبداد کے دوروں میں پیدا ہوئے تھے ان چیزوں کو آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر ان کی کتابوں میں ان چیزوں کی کچھ صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، تو اُن کے سوت بھی یہی قدیم عربی ماخذ ہیں، جو اُس حریت کی روح کو سمجھتے تھے، جو بعد کے زمانے کی شخصی حکومتوں اور شاہنشاہی میں بہت کچھ

مُردہ، اور بالآخر فنا ہو کر رہ گئی تھی۔

پہلا لشکر مدینہ سے چلتا ہے:۔

یزید ابن ابی سفیان سپہ سالار، گھوڑے پر سوار تھے، اور حضرت صدیقؓ خلیفۂ وقت ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ یزید نے کہا "رسول اللہ کے خلیفہ آپ بھی سوار ہو جائیں، ورنہ اجازت دیں کہ میں بھی پیدل چلوں، کیونکہ نہیں دیکھا جاتا کہ میں سوار ہوں، اور آپ پیدل جائیں" حضرت صدیقؓ نے جواب دیا "نہ میں سوار ہوں گا نہ تمہیں اترنے دوں گا۔ اللہ کی راہ میں میں اپنے قدموں کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہوں!"

خلیفہ سپہ سالار کو نصیحت کرتے ہیں:۔

"اللہ سے ڈرنا، اس کی اطاعت کرنا، اُسے سب پر ترجیح دینا اس کا خوف ہر وقت رکھنا۔ جب دشمن سے مقابلہ ہو تو دیکھو نہ مال غنیمت میں بدعنوانی کرنا، نہ دشمن کے ناک کان کاٹنا، نہ دھوکا دینا، نہ بزدلی دکھانا خبردار کسی بچے کسی بڈھے، کسی عورت کو قتل نہ کرنا، باغ نہ کاٹنا، اور نہ پھلنے والے درخت برباد کرنا۔ کھانے کے سوائے جانوروں کو نہ مارنا۔ خانقاہوں میں لوگ ملیں گے جو کہتے ہیں ہم نے زندگی کو عبادتِ الٰہی کے لئے وقف کر دیا ہے، ان سے چھیڑ نہ کرنا۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا" (ص ۳۹۔ ۴۰)

یزید ابن ابی سفیان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

"اپنے ساتھیوں سے اچھا برتاؤ کرنا، اُن کی پناہ بننا، اُن سے خاکساری سے پیش آنا، معاملوں میں اُن سے مشورہ لینا، اللہ تمہیں ان کا بہترین ساتھی اور رہما بہترین قائم مقام بنائے"۔ (ص ۴۰)

ایک سردار لشکر خلیفہ کو نصیحت کرتا ہے:۔

"اس دین کے ہر ایک فرد کا فرض ہے کہ بھلائی کرتا رہے۔ حاکم کا انصاف سب سے زیادہ مفید ہے پس اے ابوبکر اپنی حکومت و ولایت میں اللہ سے ڈرتے رہنا، بیواؤں یتیموں پر ترس کھانا، کمزور مظلوم کی مدد کرنا، اگر کسی سے خوش ہو تو خوشی کی وجہ سے رو رعایت نہ کرنا۔ اور اگر ناخوش، تو اس کی وجہ سے حق تلفی نہ کرنا۔ حتی الامکان غصہ نہ کرنا کہ وہ ظلم کا پیش خیمہ ہے" (ص ۴۴)

اسلام کا سفیر رومیوں کے دربار میں قیمتی قالینوں اور نفیس فرشوں پر بیٹھنے کے لئے تیار نہیں وہ اسلامی مساوات اور حریت کا اس طرح وعظ دیتا ہے:۔

حضرت معاذ نے ترجمان کے ذریعہ سے فرمایا۔

"ہمارے نبی صلعم نے حکم دیا ہے کہ ہم کسی مخلوق کے لئے کھڑے نہ ہوں ہمارا کھڑا ہونا صرف اللہ کے لئے ہے۔ میں تمہاری تعظیم کے خیال سے کھڑا نہیں ہوں، بلکہ ان قیمتی قالینوں پر چلنا اور ان نفیس فرشوں پر بیٹھنا گناہ سمجھتا ہوں جو تم نے اپنی قوم پر ظلم کر کے اپنے لئے مخصوص کر لئے ہیں! (ص ۱۴۹۔ ۱۷۹)

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گئے کسی نے کہا یہ فعل ذلیل اور غلامانہ ہے تو جواب دیا:۔

"یہ اعزاز جس کی طرف تم بلاتے ہو اپنی قوم پر ظلم کر کے تم نے پایا ہے اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ شان اور شوکت جو تم نے ظلم کی راہ سے حاصل کی ہے اور یہ دنیا جو غریبوں کو لوٹ کر تمہارے سرداروں نے جمع کی ہے، اللہ کی نظر میں اعزاز ہے۔ تو تمہارے قول کی غلطی اور عمل کا ظلم ہے رہا یہ کہنا کہ میں نے غلاموں کی حرکت کی .... تو میں اللہ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں، اور اللہ کے بچھائے ہوئے فرش پر بیٹھا ہوں

رہا یہ کہنا کہ میں نے خود کو ذلیل کیا تو ... اللہ کو وہی بندے محبوب ہیں، جو اس کے نام پر خاکسار ہیں، اور خلق خدا سے زیادہ قریب جو نہ بالکل دنیا ہی میں پھنسے ہیں، نہ آخرت سے دستبردار (ص ۱۸۱)

آدمی حیران ہو کر پوچھتے ہیں "تم لوگ کیا چاہتے ہو کیا پیغام رکھتے ہو، اس ملک میں کیوں آئے ہو؟" اور آخر میں اپنی شان و شوکت اور دبدبہ سے ڈرانا چاہتے ہیں، جس پر وہ مفصل جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں "اگر تمہارا بادشاہ ہرقل ہے، تو ہمارا بادشاہ اللہ عزوجل ہے، جس نے ہمیں پیدا کیا" (ص ۱۸۴)

پھر بتاتے ہیں کہ اسلام میں حاکم کیا حیثیت رکھتا ہے:

"ہمارا حاکم ہمارے ہی آدمیوں میں سے ایک شخص ہے جب تک وہ ہمارے نبی کے قانون (سنت) پر استوار ہے ہم اُسے حاکم مانتے ہیں لیکن اگر اس کا طرز عمل بدل جائے تو ہم اسے معزول کر دیں گے۔ اگر چوری کرے گا اُس کا ہاتھ کاٹ دیں گے اگر زنا کرے گا تو کوڑے ماریں گے۔ اگر گالی دے گا تو اُسے بھی گالی ملے گی۔ اگر کسی کو زخمی کرے گا تو خود ویسے ہی سزا پائے گا۔ نہ وہ ہم سے پردہ

کرتا ہے، نہ ہم پر تکبر نہ مالِ غنیمت میں ہم سے زیادہ کا حق دار ہے، بلکہ وہ بالکل ویسا ہی ایک آدمی ہے جیسے ہم سب ہیں" (ص ۱۸۵)

بالآخر رومیوں کا سفیر مسلمانوں کے کیمپ میں آتا ہے۔

"وہ مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا تو سپہ سالار ابو عبیدہ بن الجراح کو عام مسلمانوں سے تمیز نہ کر سکا۔ یہ بھی نہ جان سکا کہ وہ یہاں ہیں یا نہیں کوئی شان و شوکت جسے وہ ڈھونڈتا تھا دکھائی نہ دینے کی وجہ سے اس کے دل پر رعب نہ ہوا وہ متعجب ہو کر مسلمانوں سے کہنے لگا "اے اہل عرب تمہارا سردار کہاں ہے؟" مسلمانوں نے جواب دیا "ہمارا سردار بیٹھا ہے"! دیکھا تو حضرت ابو عبیدہ زمین پر بیٹھے تھے کمان کندھے پر لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں تیر تھے جنہیں وہ اُلٹ پلٹ رہے تھے! (ص ۱۸۹)

انہوں نے سفیر کو بتایا کہ "میں نہ کسی دینار کا مالک ہوں نہ درہم کا ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ کمان تلوار اور ہتھیاروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کل ضرورت پڑی تو پاس ایک حبہ نہ تھا۔ مجبوراً اپنے بھائی (معاذ) سے قرض لینا پڑا۔ اگر میرے پاس قالین اور فرش ہوتے بھی تو اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر ان پر نہ بیٹھتا" (ص ۱۹۰)

ان فاتحین کا مفتوحین سے کیا عمل تھا۔ اس کا حال حضرت عمر کے خط سے معلوم ہوتا ہے جس میں لکھا تھا۔

"ان پر جزیہ لگا دو۔ انہیں قید ہونے اور غلام بننے سے بچاؤ۔ مسلمانوں کو اُن پر ظلم کرنے، نقصان پہنچانے اور نا جائز طور پر اُن کی کمائی کھانے سے روکو" (ص ۲۱۷)

"میری رائے ہے کہ باشندوں کو ان کی حالت پر رہنے دو" (ص ۲۱۷)

دیانت اور امانت کی مثال دیکھنی ہو تو اس واقعہ پر غور کرو کہ جس وقت مسلمانوں کو حمص خالی کرنا پڑتا ہے تو سپہ سالار محصل خراج کو بلا کر حکم دیتے ہیں۔

"شہر والوں کو سب واپس کر دو جو ان سے لیا ہے۔ کیونکہ صلح نامہ کے رو سے جائز نہیں کہ اب جبکہ ہم اُن کی حفاظت نہیں کر سکتے ان سے کچھ لیں۔ . . . شہر والوں سے کہہ دو . . . تمہارا روپیہ واپس ہے" (ص ۲۳)

جب خراج واپس دیا گیا تو شہر والے دعائیں دیتے اور کہتے تھے "تم اِن رومی حاکم . . . اگر تمہاری جگہ ہوتے تو ایک پیسہ بھی واپس

نہ کرتے بلکہ چلتے وقت جتنا لوٹ سکتے اور لوٹ لیتے" (ص ۲۲۷)

یرموک کی ہولناک لڑائی سے پہلے رومی قاصد آتا ہے۔ حضرت خالدؓ اس کے سامنے اسلامی خلیفہ کی حیثیت ظاہر کرتے ہیں۔

"اس شخص کو (اللہ نے) بالکل ہم جیسا بنا دیا ہے، جسے ہم نے اپنا سردار مقرر کیا اور اپنے معاملات کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ہمارے سردار کی حالت یہ ہے کہ اگر دعوے کرے کہ وہ پادشاہ ہے تو ہم اسے فوراً ہی معزول کر ڈالیں۔ ہمارے نزدیک ہمارا سردار کسی مسلمان سے بھی افضل نہیں ہے۔ ہاں اللہ کی نظر میں زیادہ پرہیزگار اور نیکوکار ہے . . . . ."

اور اسلام کا مقصد بتاتے ہیں:۔

"(ہماری قوم) نیکی کا حکم کرتی ہے، بدی سے روکتی ہے۔ غلطی اور گناہ کا اعتراف کر کے اللہ سے ہمیشہ مغفرت چاہتی ہے، اللہ وحدہٗ کی عبادت کرتی ہے، اور اُس کی ذات حق کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتی"۔

کیا اب بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ قرون اول کے مسلمانوں کا نصب العین جمہوریت تھا اور اُن کا خلیفہ ایک منتخب شدہ صدر جمہوریت سے زائد حیثیت نہ رکھتا تھا!

(۵)

اس دور میں عورتیں کیا تھیں اور عملی دنیا میں کیا حصہ رکھتی تھیں! الازدی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کی مہم پر اکثر لشکری اپنے اہل و عیال کو اپنے ساتھ لے گئے تھے (ص ۵۹)

ان دختران صحرا کی جھلک ہم میدان جنگ میں دیکھتے ہیں تو انہیں کافی آزاد پاتے ہیں۔

ایک موقع پر ایک سردار عورتوں کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں:۔

"اللہ اس عورت کا منہ بگاڑ دے جو سر پر دشمن کی موجودگی میں شوہر کو اپنے پاس آنے دے۔ جو مرد نہ لڑے اور تمہارے پاس آئے اس کے منہ پر خاک ڈالنا اور کہنا "جا میری طرف سے لوٹ جا ورنہ میں تیری بیوی نہیں ہوں" (ص ۲۶۲-۲۶۳)

چنانچہ اس فیصلہ کن جنگ میں مسلم خواتین نے جو حصہ لیا وہ ذیل کے واقعے سے معلوم ہوگا۔

حضرت خالد نے جو رومیوں کو آتے دیکھا تو مسلمان عورتوں کی طرف گئے جو اسلامی لشکر میں اونچے ٹیلے پر کھڑی تھیں۔ حضرت خالد نے کہا، جس آدمی کو بھاگتا دیکھو، فوراً مار ڈالو۔ چنانچہ مسلمان عورتوں نے لکڑیاں ہاتھ میں اٹھا لیں، اور مجاہدین کے سامنے آکر کہا "تم ہمارے شوہر نہیں ہو اگر آج ہمیں نہ بچا سکے" (ص ۳۳۶)

ایک خاتون خولہ بنت ثعلبہ اپنے ہاتھ میں خیمہ کی میخ لئے کھڑی اور یہ رجز پڑھ رہی تھی:۔

یا هاربا عن نسوة تقیات اسب بالسهم و بالمنیات
معن قلیل ماتری سبیات غیر حظیات و لا رضیات

نیک عورتوں سے بھاگنے والے کوئی تیر تیرا کام تمام کر ڈالے۔ موت کے طوفان تجھ پر ٹوٹ پڑیں۔

عنقریب تو دیکھ لے گا کہ یہ عورتیں قید ہوں گی۔ نہ ان کی عزت بچے گی نہ خوشی (ص ۳۴۱)

لڑنے والوں میں سے بھاگنے والوں کا راستہ عورتوں نے روک لیا اور انہیں لاٹھیوں سے مار مار کر فوج میں لوٹا دیا (ص ۳۴۰)

سچ ہے "جنگ اور عشق میں ہر بات جائز ہے!"

(۶)

ان کارناموں کو دیکھ کر، جن کی یادگار ہر دور کی تاریخ تازہ کرتی ہے، دنیا حیران ہے کہ ان کی کیا توجیہ کی جائے۔ کوئی کہتا ہے کہ ان کا باعث صرف جذبہ کشورکشائی و سلطنت سازی تھا کوئی کہتا ہے سامی قوم کی یہ بھی ایسی ہی ملک گیری کی جنبش تھی جیسی اس سے سیکڑوں ہزاروں برس پہلے بھی عرب سے پیدا ہو کر قدیم زمانوں میں عراق، مصر اور شام کی فتوحات کا باعث ہو چکی تھی۔ بعض کو اس میں بھی کلام ہے کہ کارناموں کو پیغمبر اسلام کی غیر معمولی شخصیت یا اسلام کی خاص تعلیمات کا ممنون سمجھا جائے

ان اور دوسرے دلفریب نظریوں کا جن کی کوئی کمی نہیں ہے، اور نئے نئے محققوں کے نام سے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں، پیش کر دینا آسان ہے، لیکن ثابت ہونا مشکل۔

سچ وہی ہے، جو سب کو معلوم ہے لیکن اس کا ماننا نہ ماننا دوسری بات ہے۔

ان عربوں کی کس چیز نے کایا پلٹ کر دی، اور ان کے ہاتھوں دنیا کی کایا پلٹ کرا دی۔

بیشک عرب باہر نکلے تو ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی۔ لیکن دوسرے ہاتھ میں اس سے زیادہ طاقتور چیز تھی یعنی قرآن۔ تلوار نے اسلامی سلطنتیں بنائیں، اور بگاڑیں۔ پھر ایک وقت یہ تلوار بھی عربوں کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور عصائے جہانبانی بھی۔

لیکن قرآنی فتوحات کا دور کبھی ختم نہیں ہوا۔ اس نے عرب و عجم کو فتح کیا۔ دوست دشمن کو فتح کیا۔ ترک و مغل کو فتح کیا۔ چینی اور بربر کو فتح کیا۔ ملائی اور یورپ کو فتح کیا، اور مشرق و مغرب کو اپنے سامنے جھکتے دیکھا۔

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ ان کی سب سے بڑی فتوحات اس مقدس کتاب کے ذریعے سے ہوئیں جو ذہنی و علمی دینی و دنیوی ترقیوں کا سوت ہے۔

جو ذہنی انقلاب اس مقدس کتاب نے انسانوں کی اس ابتدائی جماعت میں پیدا کیا تھا۔ اس کا پتہ الازدی کی تاریخ کے ہر ایک صفحہ پر ملتا ہے۔

سید حسن برنی

آہ وہ سیریں

ہماری سیر
وہ راتوں کو باہم!....
کنارِ آب
تنہا اور چپ چاپ!....
بساطِ آسمان پر،

چاند رقصاں!
ہمارے دل
مئے الفت سے سرشار!
....
چمکتا چاند ہے

اب بھی اسی طرح!
دھڑکتے ہیں
محبت میں دل اب بھی!
(بائرن)

مگر اب آہ!
وہ سیریں کہاں ہیں!....

تمنائی

نوائے غیب

مجھے تاروں کی آبادی سے اک آواز آتی ہے
کوئی کرنوں کے بربط پر سنہری گیت گاتا ہے
اور اپنے گیت سے خوابیدہ دنیا کو جگاتا ہے

فضاؤں میں بہار کیف و نکہت مسکراتی ہے
خدائی سلسبیل بیخودی میں ڈوب جاتی ہے

یہ نغمہ روح کے پردوں کو جا کر گدگداتا ہے
اور اپنی مستیوں میں یہ سندیسہ لے کر آتا ہے
کہ فطرت اپنے شعرستان میں مجھ کو بلاتی ہے

~~~

یہ کون آباد ہے ان روشن و رنگیں ستاروں میں
ہے کس کا نور عریاں کہکشاں کی شاہراہوں پر
ہیں کس کے نغمے رقصاں ان طلائی جلوہ گاہوں پر
یہ کس کی لے چھپی ہے بربط انجم کے تاروں میں
یہ کس کے جلوے مضطر ہیں قمر کے آبگینے میں
یہ کون آ کر سمایا جا رہا ہے میرے سینے میں

اختر شیرانی
~~~

بن راس

(یہ مضمون ایک عکس ہے ان تاثرات کا جو اس کی مصنفہ ایلس بونر کے دل میں مالابار کے دیہاتیوں کی "خاموش تمثیل" کو دیکھ کر پیدا ہوئے۔ مصنفہ ۱۹۳۰ء میں مشہور رقّاص ادے شنکر کی معیت میں اس غرض سے ہندوستان تشریف لائی تھیں کہ قدیم ہندوستانی فن تعمیر اور رقص کا مطالعہ کریں۔)

فنی عجائبات کے تجسس میں ہم ایک غیر معروف پگڈنڈی پہ چلتے ہوئے اس چھوٹے سے موضع میں پہنچ گئے جو جنوبی مالابار کے جنگل میں واقع تھا۔ ہمیں کسی طرح معلوم ہو سکا تھا کہ وہاں ایک میلے میں چند مذہبی کھیل دکھلائے جائیں گے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ہر طرف ناریل کے اونچے اونچے درخت کھڑے ہیں۔ کہیں کہیں دھان کے چھوٹے چھوٹے کھیت بھی تھے، جن کے قریب مٹی کے جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ کچھ نیم برہنہ کسان اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ اور گائیں بھینسیں گھاس چر رہی تھیں۔ اسے جنگل کہیے۔ یا یہ ایک چھوٹی سی ارضی جنت تھی جس میں ابھی تک فطری شادابی اور رعنائی بجنسہ موجود تھی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس جگہ کسی تھیٹر کے وجود کا امکان بھی ہے یا نہیں! جب ہم نے اس کے متعلق گاؤں کے ہندوستانی طبیب سے استفسار کیا تو وہ ہماری حماقت پہ ہنسنے لگا کہ ہم یورپ سے چل کر اس چیز کو دیکھنے کے لئے آئے ہیں جس کی حیثیت شیکسپیر کے عہد سے پہلے کے تماشوں سے کسی صورت بھی بہتر نہیں۔ لیکن اس جواب نے ہمارے ارادے کو اور تقویت دی اور ہم نے وہاں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا اگرچہ بارش کے طوفان کی وجہ سے قیام و طعام کا مسئلہ لاینحل بنتا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود ہمارے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس عجائب و غرائب سے بھرے ہوئے ملک میں کس وقت کوئی نادر تجربہ حاصل ہو!

کئی دن تک گاؤں میں غیر معمولی چہل پہل رہی۔ اور مضافات سے لوگ وہاں آ کر جمع ہوتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی غیر معمولی ہنگامہ برپا ہونے والا ہے۔ لیکن یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کب ہونے والا ہے۔ اس تمام ہنگامے کا مرکز ایک عمر رسیدہ آدمی تھا جو مکمل طور پر بہرہ ہونے کے باوجود اس ہنگامہ کی روح تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ جنوبی ہندوستان کا مشہور شاعر "ولیتھل نرائن مینن" ہے۔ تمام لوگ اس کی عزت کرتے تھے اور اُسے شمالی ہندوستان کے شہرۂ آفاق شاعر رابندر ناتھ ٹاگور کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔

لوگوں نے ہمیں بتایا کہ ولیتھل نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے رکھا ہے کہ وہ اپنے ملک کے بہترین فن یعنی مذہبی تھیٹر کو جسے وہ لوگ کتھا کلی کہتے تھے صفحۂ ارض سے مٹنے نہیں دے گا۔ اس شاعر نے اردگرد کے ذہین نوجوانوں میں اس فن کی ترویج کے لئے تحریک جاری کر رکھی تھی اور اس کی بقا کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرتا رہتا تھا۔

انھوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ کچھ عرصہ قبل کتھا کلی کے کھیل مالابار کی زندگی کا ایک جزو سمجھے جاتے تھے۔ ہر مندر میں ایکٹروں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو پجاریوں کے مجمعے کو وید دل، پرانوں، مہابھارت اور رامائن کے مذہبی رزمیہ کھیل دکھایا کرتی تھی۔ بعض اوقات ایک مکمل نظم کو شروع سے لے کر آخر تک ختم کرنے کے لئے وہ متواتر دس یا بیس راتوں تک کام کرتے تھے۔ کھیل دکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ پروہت سنسکرت میں اشلوک پڑھتے جاتے ہیں اور ایکٹر خاص وضع کے کپڑے پہن کر الفاظ کی ترجمانی "مدرا" حرکات کے ذریعہ کرتے جاتے ہیں۔ مدرا بہت قدیم زمانے کی نہایت واضح حرکاتی زبان ہے۔ صدیوں کا عرصہ گذرنے کے بعد یہ اس قدر شکستہ اور دشوار ہو گئی ہے کہ اوسط قابلیت کا ایکٹر اس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے دس سے بارہ سال تک صرف کرتا ہے۔

اس ملک کے راجوں اور مہاراجوں کے ہاں بھی یہ دستور تھا کہ وہ اپنے کتھا کلی رکھتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً دربار میں مذہبی کھیل دیکھا کرتے تھے انہی کی بدولت اُن پر مذہبی اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا تھا۔ لیکن مغربی خیالات کی

نشر و اشاعت کے ساتھ ڈرامے کی اس قدیم وضع کے ساتھ بھی دلچسپی کم ہوگئی ہے، اور اس وقت بہت کم لوگ اس کی سرپرستی پر آمادہ ہوتے ہیں۔

اس فن کو زندہ رکھنے کے لئے ایک متحدہ کوشش کی ضرورت ہے۔ ولاٹھول کا ارادہ تھا کہ وہ مدرسا، حرکات کی تدریس کے لئے ایک درسگاہ قایم کردے اور ایک تماشا گاہ بنائے جس میں یہ کھیل دکھلائے جائیں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے ایک لاٹری کا انتظام کیا تھا جس سے وہ حسب ضرورت روپیہ اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے اس وقت اس لاٹری کے انعامات تقسیم ہونے والے تھے اور بہترین کتھاکلی کھیل دکھانے کے لئے وہاں جمع ہو چکے تھے۔ بہت سے تو اسی دن پہنچے جس دن کھیل کو شروع ہونا تھا اور ہم یہ سُن کر بہت حیران ہوئے کہ وہ ایک دوسرے سے ناآشنا ہونے کے باوجود کسی طرح کی تیاری کے بغیر باہم کام کریں گے۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کس طرح کامیاب ہوں گے!

پہلی رات ہم اپنی قیام گاہ سے کھیل کی کامیابی کے متعلق کئی شکوک لے کر نکلے جب ہم پنڈال کے قریب پہنچے تو ڈھول کے شور سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ دروازے سے داخل ہونے پر ہمیں ایک آدمی نظر آیا جو نصف دائرے کے سٹیج پر پکھاوج لئے ہوئے کانسی کے ایک بڑے برتن کے سامنے کھڑا تھا۔ اس برتن سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ وہ آدمی پرجوش انداز میں دلکش راگ الاپ رہا تھا، اور اس کے ساتھ ایک لڑکا ایک گھنٹی اور ایک بوڑھا جلاجل بجاتا تھا۔

سٹیج کے سامنے ہمیں معزز مہمانوں کی حیثیت سے آرام کرسیاں بیٹھنے کے لئے دی گئیں جہاں بیٹھ کر ہم کھیل کی تیاری کی تفصیلات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ ہر چیز نمایاں طور پر سادہ لیکن دلکش تھی سٹیج کے دونوں کناروں پر کیلے کے دو سبز درخت گڑے ہوئے تھے اور رنگدار کاغذ کا ایک بڑا چھتر چھت کا کام دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کسی طرح کے منقش پردے نہ تھے۔ عقبی حصہ سنہری بھورے رنگ کی چٹائیوں سے سجایا گیا تھا جو ناریل کے پتوں کو کوٹ کر بنائی گئی تھیں روشنی کے لئے سٹیج کے سامنے گھی کا چراغ جلایا گیا تھا۔ جس کی روشنی بعد میں نہایت موثر اور مفید مطلب ثابت ہوئی۔

تینوں راگیوں کی نگاہیں آگ پر مرکوز تھیں اور ان کا راگ ہر لحظہ پرجوش اور طربناک ہوتا جا رہا تھا۔ آخرکار ایک بلند و بالا نغمے کے ہنگامہ کے بعد وہ دفعتہً خاموش ہوگئے اور حاضرین پر حیرت کا عالم طاری ہوگیا یہ اُس سلسلے کا آغاز تھا جس کی آیندہ کڑیاں زیادہ جاندار رنگین اور واقفیت پر مبنی تھیں۔

ننگی چھاتیوں والے دو آدمی ایک رنگدار پردہ اٹھالائے اور اسے اسٹیج کے سامنے لے کر کھڑے ہوگئے۔ اس کے پیچھے ہمیں ان لڑکیوں کی جھلک نظر آ رہی تھی جو نصف دائرے میں اپنے ساز لئے کھڑے تھے اور اُن آدمیوں سے بو جا کرا رہے تھے جو پردے کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، لیکن اُن کے پاؤں کی منظم حرکات کا اعلان وہ نغمہ رقص کر رہا تھا جو پاؤں سے بندھی ہوئی جھانجھ سے پیدا ہو رہا تھا۔

آخرکار پردہ ہٹایا گیا اور چار اپسرائیں یعنی رقص کرنے والی چار آسمانی پریاں ہمارے سامنے نمودار ہوئیں۔ انہوں نے بڑے بڑے سفید لہنگے اور چیت قمیصیں پہن رکھی تھیں اور ان کے سروں پر ایک مربع ٹوپی کے اوپر سے ہلکے گلابی رنگ کے نقاب شانوں تک لٹک رہے تھے۔ وہ تمام مرد تھے۔ لیکن ان کے چہرے نہایت دلکش اور نظر فریب گھونگھٹ کر عورتوں کی طرح گلابی بنائے گئے تھے۔ اُن کے سینوں پر گلے میں سے ہوتا ہوا ایک سنہری کپڑا جھلمل جھلمل کر رہا تھا اور اس کے نیچے نسائیت کے مخصوص نشان سرخ رنگ کی دو خوشنما چھاتیاں نظر آ رہی تھیں۔

مالابار میں عورتیں ان کھیلوں میں حصہ نہیں لیتیں۔ اس لئے ان کا کام مردوں کو کرنا پڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ وہ کس روحانی وقار سے تمام کام کرتے ہیں وہ حقیقی عورت بننے کی کوشش نہیں کرتے اور اس طرح تمام ناخوشگوار اور دو بھاتی حرکات سے محترز رہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسمانی نسائیت کی بجائے عورتوں کی عادات اور جذبات کا عکس حاضرین کے سامنے پیش کریں۔ اس لئے ان کی نقل عام عورت سے زیادہ شعوری، منظم اور نمایاں ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں سے کسی طرح کی نسائی رعنائی کم نہیں ہوتی۔ بلکہ بسا اوقات عام حالات سے بڑھ جاتی ہے۔

ان چار اپسراؤں کا کھیل ایسی شادابی اور رعنائی، ایسے مزاح اور لطافت اور ایسے جذبات کا حامل تھا کہ اس کو بیان کرنے کی ہر ممکن کوشش ناکامیاب رہے گی۔ وہ عالم بالا سے رکمن گاڑا مہاراجہ ادد مہ کے باغ میں نازل ہوئی تھیں۔ جو جذبات تحیر و مسرت ان کے دل میں اس جنت ارضی کو دیکھ کر پیدا ہوئے تھے اُن کو وہ الفاظ کے بغیر بولتے ہوئے

بجز العقول اشاروں اور خاموش حرکات رقص کے ذریعے ظاہر کر رہی تھیں۔ راگی عقب میں کھڑے ہوئے وہ اشلوک پڑھ رہے تھے جن کی ترجمانی ان کے اشارے کر رہے تھے۔ اور دف اور جلاجل کی تھاپ اور جھنکار کے ساتھ ان کی حرکات رقص جاری تھیں۔

اپسراؤں نے پہلے اپنے پرلطف سفر کا حال بیان کیا اور پھر اپنے خوف اور طفلانہ ابتہاج، اپنی کمزوری اور بزدلی، اپنی رقابت اور حیرانی اور اپنی حیاانگیز اکڑ اور حجاب کا اظہار کرنے کے لئے نہایت ہی لطیف اشاروں سے کام لیا۔ ہم نے ہر ایک اشارے اور ہر ایک حرکت کا جو ملاحظہ کیا۔ پھولوں کے گجروں سے سجے ہوئے ہاتھ گویا ہو گئے۔ اور اپسرائیں محو رقص تھیں کبھی ایک دوسرے کے متوازی رقص کرتی ہوئی چلی جاتیں کبھی ایک دوسرے کی مخالف سمت میں چلتیں کبھی بل کھاتی ہوئی جھک جاتیں اور کبھی کمر کو لچکا کر ایک دائرے میں گھومنے لگتیں۔ الغرض اس طرح انھوں نے ایک مہاراجہ کے باغ میں چار لڑکیوں کے چوری چوری آنے اور ہمیشہ وہاں رہنے کی خواہش کرنے کی حکایت کو نہایت دلچسپ طریقے سے بیان کیا۔

لیکن ہمیں یہ اقرار کرنا پڑا کہ ہم پورے طور پر ان اشاروں کے رموز سے محظوظ نہیں ہو سکے۔ ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمیں آج تک اس کا علم ہی نہ تھا کہ انسانی ہاتھ کیا کیا کام کر سکتے ہیں اور نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ انسانی بدن میں موسیقی اور قوت بیان کس قدر موجود ہے اس جاں نواز موسیقی سے متاثر ہو کر انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جسم پر بھی انسان کا ہر طرح کا بس چلتا ہے۔ اور اس کی تربیت کرنے سے غیر معمولی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان اس کے مادی وجود سے بھی پرے چلا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کی ہر حرکت ایک روحانی جذبے کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ان ایکٹروں کا جسم بچپن ہی سے مذہبی مدرسوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ تنفس اور ضروری مشقیں کرنے سے صرف ایک مفید مطلب آلہ ہی نہیں بن جاتا بلکہ روح کا نہایت ہی نمایاں اور مکمل نمونہ بن جاتا ہے۔ اور اس کو دیکھنے سے باطنی زندگی کے تمام اسرار و غوامض کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔

جب وہ کھیل کرتے ہیں تو ان پر نغمہ زندگی کی وہ حالت تاثر و کیف طاری ہو جاتی ہے جس کو وہ ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ عالم انجذاب و محویت میں وہ اپنی آنکھیں کچھ اس طرح اندر کی طرف کر لیتے ہیں جیسے بیرونی دنیا کا وجود ہی ان کے لئے کالعدم ہو گیا ہے اور ان کی ہستی تمام و کمال اس کردار میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے جس کی نمائندگی وہ کر رہے ہیں۔

جب اپسراؤں کا رقص ختم ہوا تو پردہ تھامنے والے دو آدمیوں نے اسٹیج کو پھر ڈھانپ دیا۔ پردے کے پیچھے ایک سرخ رنگ کا چھتر سٹیج پر بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دف کی گرج بڑھتی جاتی تھی۔ آدمیوں نے آہستہ آہستہ پردہ گرا دیا۔ پہلے ایک مخروطی شکل کی لمبی سی ٹوپی نمودار ہوئی پھر کبودی رنگ کا ایک مصنوعی انسانی چہرہ سامنے آیا جس کے گرد چاولوں کی مایا کا ایک ہالہ بنا ہوا تھا۔ اس چہرے کے نقوش جنوبی ہند کے مجسموں کی طرح تھے۔ دفعتہً اس چہرے میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور اس کی آنکھیں دائیں بائیں حرکت کرنے لگیں۔ بھویں عجیب انداز میں سکڑنے اور تننے لگیں اور ہونٹ ہلنے لگے۔ یہ ہستی جس کا ہم سے اس طرح تعارف کرایا گیا تھا کرشن کا باپ واسدیو تھا اس نے ہاتھ باندھ کر مقدس آگ کے سامنے دعا کی۔

پردہ اٹھا دیا گیا اور وہ غائب ہو گیا۔ جب پھر پردہ گرایا گیا تو اسی طرح کے دو چھوٹے بچے نظر آئے۔ ایک کے چہرے کا رنگ نیلا تھا اور ایک کا گلابی۔ وہ دونوں معصومانہ انداز میں غیر معمولی محویت کے ساتھ آگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ کرشن اور اس کا بھائی بلرام تھے۔ انھوں نے بھی دعا کی اور پردہ اٹھا دیا گیا۔

اس کے بعد پردہ بالکل ہٹا دیا گیا اور کھیل شروع ہو گیا۔ تماشائیوں کی بائیں جانب ایک چوکی پر یوگی "سندی پانی" عالم استغراق میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گیروے رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کی ننگی چھاتی پر اس کی سیاہ داڑھی پھیلی ہوئی تھی اور سر پر بکھرے ہوئے بالوں کی ایک گانٹھ نظر آ رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا رہا حتیٰ کہ ایک طرف سے واسدیو کرشن اور بلرام کو لے کر آ پہنچے۔ ان تینوں کے لباس بالکل مختلف تھے۔ وہ سفید دھوتیاں پہنے ہوئے تھے جن کے کنارے رنگدار تھے ان کی قمیضیں نہایت چست اور سرخ اور سفید رنگ کی تھیں کھیل کا آغاز واسدیو کی عقیدتمندانہ التجا سے ہوا جس نے گرو سے درخواست کی کہ وہ لڑکوں کو اپنے گھر پر مذہبی کتابوں کی تعلیم دے اور انہیں دنیاوی امور کے لئے تیار کرے۔ باپ ایک طویل عرصے تک اشاروں سے

باتیں کر رہا تھا حتیٰ کہ گرو مہاراج نے ایک طرف مڑ کر بچوں کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا۔ گرو کا جواب بھی اسی طرح کا فصیح و بلیغ اور پُرتکلف تھا۔ اُس نے بیان کیا کہ اس کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جو سمندر میں ڈوب کر مر گیا تھا اور اب ان بچوں کو اپنے گھر میں رکھنے سے اسے انتہائی مسرت حاصل ہوگی اور اس طرح وہ اپنا غم بھلا سکے گا۔ اُس کے چہرے پر خشونت، غرور اور کسی قدر شقاوت کے آثار نمایاں تھے۔ اور اُس کی انگلیوں اور ہاتھوں کی حرکات میں ایک عجیب انداز استغنا تھا۔ بچے ہاتھ باندھے ہوئے ایک طرف مؤدب کھڑے تھے۔ باپ نے انہیں قریب بلایا، اور اس کے بعد تعارف، سفارش، رخصت، شکریے اور دعا کی غیر مختتم رسمیں ادا کی گئیں۔

گھریلو زندگی کا ایک غیر دلچسپ واقعہ جذبات و تاثرات کے کچھ موزوں ساتھ پیش کیا گیا کہ وہ ایک دلچسپ اور کامیاب تمثیل بن گئی۔ مسرت اور غم، امید اور افسوس، اعتبار اور ذمہ داری اور اطاعت اور شکریے کے مختلف جذبات عقیدت و ایقان کے امتزاج سے کچھ اس قدر واضح طور پر بیان کئے گئے کہ پدرانہ شفقت اور خلوص کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔

کرشن کے بچپن کے ایک اور واقعے کی تفصیل سنئے۔ ایک دن گرو کی بیوی اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں کرشن سے شام کا کھانا پکانے کے لئے لکڑیاں لانے کو کہتی ہے۔ وہ لڑکے کو تاکید کرتی ہے کہ چونکہ جنگل خطرناک ہے۔ اس لئے تنہا نہ جائے اور اس کے علاوہ اس علاقہ میں نہ جائے جہاں جنگلی شکاری رہتے ہیں۔ لیکن کرشن نڈر اور بے خوف بچہ ہے اور اپنی شخصیت کی عظمت سے بے خبر اپنے ہم جماعت کشل کو ساتھ لے کر جنگل میں جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ دونوں جنگل میں گھومتے رہتے ہیں لیکن جنگل اتنا گھنا ہے کہ انہیں شام کی آمد کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ کچھ عرصے کے بعد کشل خوف کرنے لگتا ہے۔ اور کرشن سے مراجعت کی درخواست کرتا ہے لیکن کرشن کوئی خوف محسوس نہیں کرتا اور ایک ماں کی سی شفقت سے کشل کا حوصلہ بڑھا کر اسے وہیں بٹھا دیتا ہے اور تنہا آگے بڑھتا ہے۔ اس وقت وہ جنگل کے ایک ایسے حصہ میں پہنچ گیا ہے جہاں جنگلی جانوروں کی کثرت ہے

اس موقع پر گانا بند ہو گیا۔ کیونکہ اب کرشن اپنے دلی جذبات کا اظہار اپنی حرکات سے کر رہا تھا۔ دف اور جلاجل کی جھنکار اس وقت اُس کی حرکات کا ساتھ دے رہی تھی۔ مناظر اور الفاظ کی مدد کے بغیر اس وقت یہ اکیلا اشارات اور حرکات سے گھنے جنگل کی ہیبت اور تاریکی میں درندوں کی حرکت کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔ تماشائی یہ محسوس کرتا تھا کہ اُسے مست ہاتھی نیند سے جاگتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ خوفزدہ پرندے اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہیں، سانپ سرعت سے راستہ کاٹ کر گزر رہے ہیں، اور شیروں کی آنکھیں تاریکی میں چمک رہی ہیں۔ مختصر یہ کہ کرشن کی آمد سے سارے جنگل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ جب وہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے درحقیقت اس کے آگے بڑھنے کے ساتھ جنگل میں جگہ کھلتی جا رہی ہے اور کرشن بے خوف ہو کر ان جگہوں میں جھانک رہا ہے۔ جب وہ اسٹیج پر صرف چند قدم چلتا ہوا آگ کے قریب پہنچ گیا تو ہم نے یوں محسوس کیا جیسے وہ جنگل میں کئی میل طے کر چکا ہے اور راستہ کھو گیا ہے۔ پھر ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ اب اس پر کوئی ناگہانی مصیبت آنے والی ہے۔ دفعتہ وہ دم بخود ہو کر کھڑا ہو گیا، اور اُس نے انگلی اٹھا کر دور کسی طرف اشارہ کیا — اس وقت مرتعش شعلے کا عکس رنگیں اس کے نورانی چہرے پر رقص کر رہا تھا اور ہم ہمہ تن انتظار بنے ہوئے تھے۔ . . . . .

پردہ اٹھا کر اس منظر کو ڈھانپ دیا گیا۔ اور پردہ کے پیچھے اہرمنی رقص شروع ہو گیا۔ ڈھول کی گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی خوفناک چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ اور ایک بہت بڑی ٹوپی اور نیزے کا سرا بھی حصے سے نظر آتا تھا۔ یکایک دو خوفناک ہاتھوں سے پردہ کو دبا کر نیچے کر دیا گیا۔ دونوں آدمیوں نے پردے کو بحال رکھنے کی ناکام کوشش کی لیکن راکشش کے غضب کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی اور اس نے پردے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اس کے باوجود وہ پردے کو دونوں سروں سے پکڑ کر اُسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس حالت میں جب کہ راکشس کا آدھا جسم نظر آ رہا تھا اور آدھا چھپا ہوا تھا ہمیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جھاڑیوں سے نکل کر کسی ایسی چیز پر حملہ کرنا چاہتا ہے جس نے اُسے برافروختہ کر دیا ہے۔ اس کا چہرہ ہیبت ناک طور پر سیاہ تھا، اور اس کے دو لمبے لمبے دانت جبڑوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر شیطانی علامات مثلاً دو سفید گیند اس کے ماتھے اور ناک پر بھوت تھے۔ اس کا باقی لباس بالکل سیاہ تھا لیکن اس کی وضع قطع بھی دوسرے لباسوں کی طرح ہی تھی۔

اب جنگل میں ہمیں دیکھ کر راکشس کرشن کی آمد کا منتظر ہے۔ اور قاتلانہ جذبۂ مسرت سے دیوانہ ہوکر بیہودہ جنگلی رقص شروع کر دیتا ہے اس اثنا میں کرشن نہایت متانت سے معصومانہ انداز میں سٹیج پر آتا ہے اور مرعوب انگیز لجاجت سے راکشس کو راستہ دینے کے لئے کہتا ہے۔ راکشس اُسے روک لیتا ہے اور اشتعال انگیز لہجے میں کرشن سے کہتا ہے کہ اُسے جنگل میں قدم رکھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کرشن جواب دیتا ہے کہ وہ ایک دیہاتی لڑکا ہے۔ اور لکڑیاں جمع کرنے آیا ہے وہ اُس کی خوفناک شکل سے بالکل متاثر نہیں ہوتا اور لکڑیوں کا گٹھا زمین پر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے پھر طنزآمیز انداز میں اپنے حریف کی طرف دیکھتا ہے۔ اس بے پروائی کے مظاہرے سے راکشس غصے سے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کرشن کو چور وغیرہ کے ناموں سے پکار کر دعوتِ مبارزت دیتا ہے۔

کرشن مردانہ وار مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بازو تان کر اپنے حریف کی طرف اشارہ کرتا ہے اُس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں جذبہ غضب سے مرتعش ہوکر آنے والی تباہی کا اعلان کر رہی ہیں۔ وہ راکشس کے گرد چکر لگانا شروع کرتا ہے۔ اور جب بازو بلند کر کے ایک ٹانگ پر کودتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے راستہ میں حائل ہونے والی ہر چیز کو فنا کر دے گا۔ پھر وہ آگ کے قریب ہوکر اپنے ہاتھ شعلے سے گذارتا ہوا اپنی آنکھوں کی پتلیاں ایک مکمل دائرہ کی شکل میں پھرا کر اپنی عالمگیر قوت کا اظہار کرتا ہے۔

اس کے بعد لڑائی شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ لڑائی عام کشتی کی صورت میں نہیں ہوتی بلکہ موسیقی کی تال کے ساتھ یہ ایک باقاعدہ حملہ ہوتا ہے پھر مراجعت ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے گرد گھونسہ تان کر چکر لگائے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو آگے اور پیچھے دھکیلا جاتا ہے اور انسانی شکل اور حرکات سے اہرمنی اور روحانی قوتوں کی عظیم الشان جنگ کی تمثیل پیش کی جاتی ہے بالآخر راکشس گھٹنوں کے بل گر پڑتا ہے۔ اور کرشن اپنے دشمن کے سر پر اپنا پاؤں رکھ کر اپنی فتح کا اعلان کرتا ہے۔

کرشن کا روپ بھرنے والا ایکٹر تمثیل میں مرکزِ توجہ تھا۔ وہ ایک کامیاب رقاص تھا، اور رنگدر ا کا ماہر تھا۔ اس کی ظاہری سنجیدگی حد درجہ جاذبِ نگاہ تھی، اور اس کے ہونٹوں یا انگلیوں کی خفیف سے خفیف جنبش ہزارہا معانی کی ترجمان تھی۔ کوئی اشارہ غیر ضروری نہ تھا۔ اور کوئی حرکت ناموزوں نہ تھی یہاں تک کہ مکمل سکون کے وقت بھی اس کے چہرے پر جذبات کی فراوانی کا اس قدر اظہار رہتا تھا کہ تمام فضا الفاظ سے لبریز نظر آتی تھی۔ وہ اپنے ضبط اور ارادی سنجیدگی کے باوجود ہر اس جذبے کا حامل نظر آتا تھا جس کی تخلیق ایک بہترین جذبات پرور انسان کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اُس کا تخیل نہایت بلند پرواز تھا۔ وہ غیر مختتم طور پر نازک اور عمدہ تفاصیل کو حالات کے مطابق بیان کرتا رہا۔ یوں سمجھئے کہ وہ ایک عظیم الشان صناع تھا۔ چونکہ کرشن کا کردار اُسے بہت مرغوب تھا اس لئے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کرشن کی روح اس میں حلول کر گئی ہے۔ وہ عجائبات کی دنیا میں بے خوف اور نڈر ہوکر طنزیہ انداز میں چلتا پھرتا تھا۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں سے زیرکی، اعتماد اور روحانی الفت کی بارش ہو رہی تھی، اور گاہے گاہے اُس کا چہرہ روحانی انوار سے جگمگا اٹھتا تھا۔

ہمارے لئے وہ ایک دیوتا تھا، لیکن کتنا گمنام اور غیر معروف دیوتا تھا۔ اُس کا نام کسی طرح بھی مشتہر نہ ہوا تھا۔ اور غالباً وہ مہاراجہ کے عام ملازموں کی طرح پندرہ روپیہ ماہوار کا ملازم تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمام عمر اس صوبے سے باہر نہ آئے، اور نہ شاید وہ باہر آنا چاہتا ہو۔ وہ اپنی گھریلو زندگی پر قانع نظر آتا تھا۔ اُسے شہرت اور نمود کی خواہش نہ تھی۔ ہم لوگ فنی شہرت کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے لئے اس کا وجود معجزہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

کتھاکلیوں کی ایک رات کے تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے سے ضخیم کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں ہم متواتر پانچ راتوں تک اُن کا تماشا دیکھتے رہے۔ انسانی، اہرمنی اور روحانی حیات کے افسانوں کے ان گوناگوں مزاحیہ، المیہ اور دردناک مناظر کے تماشے سے ہم پر اس قدر محویت طاری رہتی کہ ہم ایک لمحے کے لئے بھی اسٹیج سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکتے۔ ہم ایسا محسوس کرتے تھے جیسے ہمیں کوئی طاقت ارضی حدود سے پرے کھینچ کر لے گئی ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں چند ایک واقعات کے سوا اور کچھ درج نہیں ہو سکا۔ اسی لئے شاید قارئین پورے طور پر محظوظ نہ ہو سکے ہوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس فن میں اتنی عظیم الشان

رعنایاں تھیں جن سے مغرب اب تک آشنا نہیں۔ البتہ قدیم یونانی المیہ میں اس کی نظیر شاید دستیاب ہو سکے

ڈرامائی فن کی تاریخ اور اس کی ابتدائی مذہبی حیثیت کا مطالعہ کرنے کے لئے کتھاکلیوں کے اصول اور روایات کا بنظر غائر مطالعہ کرنا ضروری ہے غالباً دنیا کے کسی حصے میں ڈرامے کی اصلی شکل اور اس کے عناصر کے جزئیات کو اس طرح قایم رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی جس طرح مالابار کے مذہبی ڈراموں میں یہ کوشش کی گئی ہے اور فن مدرا جس کی تشہیر مندومت کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے غالباً یہیں سے سیکھا گیا ہے۔

کمبودیا، سیام، جاوا اور بالی میں تمثیلوں کے اندر اسی طرح کی مدرا حرکات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن وہاں اس کی حیثیت مختلف ہے وہاں حرکات سے الفاظ کی نمایندگی نہیں کی جاتی بلکہ وہاں خاموش ڈرامانے انفرادی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور بالخصوص رقص کو ان ڈراموں میں بہت زیادہ دخل ہے۔ وہاں جمالیاتی لحاظ سے اس فن کو اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ گاہے گاہے ان کی تمثیلات قدرتی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہیں۔

لیکن مالابار میں ایسا نہیں کتھاکلی اپنی حرکات کو جمالیاتی لحاظ سے بہترین اسلوب میں پیش کرتے ہوئے بھی قدرتی رعنائی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کا رقص صرف ڈرامے کی پرجوش زبان کا کام دیتا ہے اپسراؤں کے متذکرۃ الصدر رقص میں عکارت کی پاکیزگی کر نسائی خوبصورتی کی بہترین تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اس میں تصنع کو ذرہ بھر بھی دخل نہیں ہوتا۔ اور یہ کلیتہً اور براہ راست لڑکیوں کے عام جذبات کی نمایندگی کرتا ہے۔

کتھاکلیوں کا فن آج تک مبتذل اور ہوس پرور دہ جذبات کی نمایش کے لئے استعمال نہیں کیا گیا، اور آج تک اسی قدیم طریقے پر اپنے وطن، مذہب اور رسوم کے درمیان موجود ہے۔ یہاں تک کہ وہاں کے لوگوں کے سوائے حفظ اسرار کے باعث غیر ممالک کے لوگ بھی اس کو سیکھ نہیں پائے۔ یہ ایک فنی معجزہ ہے جس سے لوگ اپنے دیوتاؤں اور ابطال کو ہر زمانے میں زندہ صورتوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

نسیم رضوانی

غزل

پہلو میں ایک حشر اٹھا کر چلے گئے
وہ کائنات درد بسا کر چلے گئے

ہر فرد انجمن کا تحیر میں غرق ہے
محفل میں شعبدہ سا دکھا کر چلے گئے

اُن راستوں پہ بارشِ انوار ہو گئی
محشر بدوش جن سے وہ آ کر چلے گئے

میں ہوں کہ صبح و شام تمہاری ہی یاد ہے
تم ہو کہ مجھ سے آنکھ بچا کر چلے گئے

جن جنبشوں سے مرگ کی حاصل تھیں لذتیں
کیوں اُن کو تم سکوت بنا کر چلے گئے

افسوس اور یاس ہے انجامِ کارِ عشق
یہ بات اک نظر میں بتا کر چلے گئے

اک عمر ہو گئی ہے اس عالم میں اے شمیم
جو خواب میں بھی آئے رلا کر چلے گئے

شمیم جمیلی بی اے

ہجر کی ایک رات

آج بیمار ترا کل سے ہوا ہے بے کل — رات کٹتی ہے کسی طرح نہ آتی ہے اجل
بے قراری کا ہے اصرار کہ اب لے نہ قرار — ناتوانی کا تقاضا ہے کہ کروٹ نہ بدل
ضبطِ الفت کا ہے ایما کہ نہ ہوں تر پلکیں — جوشِ رقت کا اشارہ ہے کہ بھر دے جل تھل
سوزِ پروانہ یہ کہتا ہے کہ مر بھی کہیں جسد — شمع کہتی ہے نہیں اور غمِ ہجر میں جل
آس کہتی ہے کہ جی وعدۂ فردا سے نہ ہار — یاس کہتی ہے بس اب جسم سے اے روح نکل
عہد یا عہد کا کہتا ہے کہ لے صبر سے کام — شوق کہتا ہے کہ اس وقت نہیں اس کا محل
دل کا ہے قول شبِ آخر ہے سنبھالا لے لے — درد کہتا ہے کوئی لاکھ سنبھالے نہ سنبھل
عشق لاتا ہے کوئی شکوہ زباں تک جو کبھی — حسن کہتا ہے کہ ظالم نہ بہت زہر اگل
ایسی کچھ آگ لگی ہے کہ الٰہی توبہ — دل ہے جلتا ہوا انگارہ تو سینہ منقل
جی میں آتا ہے سرِ شام ہی دے دیجئے جاں — صبح کرنی شبِ غم کی تو ہے اک طولِ امل
تارِ اشکوں کا نہیں شام سے ٹوٹا اب تک — دل پہ چھائے ہیں وہی رنج و الم کے بادل
ہو چکی قاصدِ ناشاد کے آنے سے بھی یاس — اب تو بیمار ہے بس منتظرِ پیکِ اجل
حسرتیں روتی ہیں ارمانوں سے مل مل کے گلے — کائناتِ دلِ عاشق میں پڑی ہے ہلچل
ہچکیاں نزع کی آنے لگیں کھنچتی ہیں رگیں — حل ہو کب دیکھئے یہ عقدۂ مالا ینحل
دیکھتا جو ہے وہ منہ پھیر کے کہتا ہے یہی — ہو بھی جائے کہیں یہ روز کا قصہ فیصل
اسی انداز سے بیمار بھی ہے اور نڈھال — جس طرح رات مصیبت کی گئی ہو کچھ ڈھل
دیکھنے والوں سے ڈوبی ہوئی نبضوں کا ہے قول — اور بچ جائے یہ شاید کوئی ساعت کوئی پل
جھلملاتا نہیں رہ رہ کے چراغِ سحری — گل ہوا چاہتا ہے ہستیِ عاشق کا کنول
اس طرف صبح کا چمکا ہے فلک پر تارا — عرقِ موت ادھر ماتھے پہ آیا ہے نکل

چشمِ بیمار ہے وا شکلِ درِ بیت اللہ
جلوہ آرا سرِ بالیں ہیں امامِ اول

صدق جائسی

مہتون

(۱)

بچپن کا ذکر ہے جب میں کہ چار پانچ ہم جماعت لڑکے ابا سے پڑھنے اور سبق یاد کرنے آیا کرتے تھے، مل جل کر پڑھنے لکھنے اور ساتھ کھیلنے کودنے سے ہماری دوستی بڑھتی گئی، رفتہ رفتہ کچھ ایسے گھلے ملے گویا سب ایک ہی خاندان کے بچے ہیں۔

یوں تو گھر آنے والے سب ہی لڑکوں سے میرا بھائی چارا تھا، لیکن خاص کر سید فضل علی شاہ کی اور میری تو کچھ ایسی میزان بیٹھی بالکل ایک جان و قالب ہو گئے۔ جب دیکھو ساتھ ہیں، کیا مجال جو گھڑی بھر بھی جدا ہونا چاہیں، حد ہے کہ ہم دونوں دوست کلاس، گھر، محلہ، گلیوں، بازاروں اور میلے تماشوں میں ملنے جلنے کے خواب بھی دیکھا کرتے تھے یعنی سوتے جاگتے ہماری یگانگت دور نہ ہوتی تھی۔

ایک روز ہم کئی لڑکے کھیلتے کھیلتے اپنے محلے سے دور نکل گئے، اس جگہ پہنچے جہاں اونچے درخت کے چبوترے پر چند قبریں بنی تھیں، سایہ کے سبب سے ہم سب چبوترے پر جا بیٹھے، مزے میں بات چیت کر رہے تھے، اچانک گوری شنکر نے میری پیٹھ پر ایک گھونسہ رسید کیا۔

میں نے جو جھلا کر کہا:۔

کیوں یہ کیا ہے؟

تو بولا:۔

ارے یار! دیکھ تو..... وہ..... کیسی خوبصورت لڑکی..... کیا مزے سے چلی آ رہی ہے..... آہاہاہا.....

کیونکہ بات کرتے کرتے اس نے ایسی بیہودہ حرکت کی تھی، مجھے بڑا تاؤ آیا، دیدے پھاڑ کر کہا:۔

اُلّو کہیں کا!

اب وہ ہم سے کوئی دس پانچ قدم رہ گئی، اور ہماری ہی طرف آ رہی تھی۔

عادت کے مطابق مجھے اسی وقت گوری شنکر سے گتھم گتھا ہو جانا چاہئے تھا، مگر لڑکی پر نظر پڑتے ہی میں تو جوں کا توں رہ گیا گویا وہاں ہوں ہی نہیں۔

کیا میں نے کبھی خوبصورت لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں! غلط!!

تو کیا وہ بے حد حسین تھی، ہرگز نہیں!

پھر اس کا اثر مجھ پر کیوں ہوا!

یہ بات نہ میں اس وقت سمجھ سکا تھا نہ اب ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہوں۔

وہ اسی رفتار سے نکل چلی گئی، یہ ہوشربا نظارہ چند سیکنڈ سے زیادہ قایم نہ رہ سکا۔ اتنی دیر میری طرح دوسرے لڑکے بھی بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔

اس لڑکی کا سراپا میرے دل پر نقش ہو گیا، گو شاید پوری پوری سمجھ نہ ہونے کے سبب سے مجھ پر دیوانگی تو طاری نہیں ہوئی تاہم ایک قسم کی وارفتگی ضرور تھی۔

اس کے بعد دوسرے لڑکے تو بدستور باتیں کرتے گئے، اور میں بھی ہاں میں ہاں ملاتا رہا، لیکن میری افسردگی دور نہ ہوئی، یہاں تک کہ ہم سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

جس طرح کم سنی کے تقاضے سے ذرا توجہ ہٹنے پر بچہ سب کچھ بھول بھال کر بہل جایا کرتا ہے۔ گھر پہنچ کر مجھ پر اتنا گہرا اثر تو نہ رہا، لیکن رہ رہ کر لڑکی میری آنکھوں میں پھر پھر جاتی تھی، بغیر کسی خیال کے کتنی ہی بار یاد آئی، ایسا معلوم ہوا چھم چھم کرتی سامنے سے چلی آ رہی ہے۔

رات کا کھانا کھا کر سویا تو اس غفلت میں جب مجھے تن بدن کا ہوش نہ تھا، اصل نظارہ کا یقین دلانے والا خواب دیکھتے دیکھتے علی الصباح میری آنکھ کھلی۔

دو تین دن اس طرح گذرے کہ چلتے پھرتے بولتے چالتے اس لڑکی کا تصور اس طرح آ گیا گویا سچ مچ وہی سامنے موجود ہے، پھر ایک روز میں اور فضل علی شاہ جا رہے تھے، وہ لڑکی دور فاصلہ سے آتی دکھائی

دی، فضل علی شاہ نے کچھ گھبراہٹ کے سے لہجہ میں کہا۔

ارے! فہیم! یار وہ اس دن والی لڑکی آرہی ہے!!!

میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ جی چاہتا تھا جلدی سے ادھر اُدھر ہو جاؤں تاکہ آمنا سامنا نہ ہو۔ لیکن قریب کوئی گلی کوچہ نہ ہونے کے سبب سے راستہ نہ ملا، اور وہ اسی انداز سے پاس آتے آتے دو ڈھائی قدم فاصلے سے نکل گئی، جیسے کوئی ڈر جائے۔ میری صورت پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں، جب وہ کافی دور ہوگئی تو فضل علی شاہ بولا۔

نہ جانے کون ہوگی، کیوں یار کیسی ہے!

میں "ہاں"

(۲)

ہم دونوں گیارہ گیارہ سال کے تھے، اور لڑکی اندازاً تیرہ ساڑھے تیرہ سال کی ہوگی، بڑی قبول صورت، صندلی صندلی رخساروں پر شباب کا غازہ، محراب نما ملتے پر ترچھی آڑی کمنواں بھوئیں، ستھواں ناک، بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے موتی کوٹ دئے، آبدار سیاہ پتلیاں، دیہاتی عورتوں کی طرح بہت بہت سا کاجل لگا ہوا، ناک میں یہ بڑی لونگ، کانوں میں چاندی کے جھمکے، گلے میں ہنسلی، ہیل، سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے میں آرسی، انگلیوں میں چھاپ چھلے، پیروں میں پیچن، بچھوئے، چوڑی کور کا لہنگا پہنے، چوندری اوڑھے، سال چھ مہینے کی سسرال میں آئی دلہنوں کی طرح آدھا گھونگھٹ کاڑھے، شرمائی لجاتی سی نکلا کرتی تھی۔

یا تو وہ کچھ ناؤ بھاؤ لنگ کرتی تھی، یا شاید عادتاً اس کی چال میں انسان کو وارفتہ کردینے والی ایک ہلکی سی لچک تھی، چلتے وقت، جھجک، شوخی، حجاب اور عنفوان شباب کے الہڑپن میں بکھرے پچھوؤں کی جھنکار سے ہر طرف ستم چھا جاتا تھا۔

پہلے تو جب کبھی وہ آتی جاتی دکھائی دیتی، تو میں خواہ مخواہ شرما سا جایا کرتا تھا، نگاہیں نیچی سے اونچی نہ ہوتی تھیں، چاہتا تھا کسی لڑکے کے سامنے یہ نہ نکلا کرے، لیکن ناغہ کر کر کے بار بار سابقہ پڑنے سے مجھ میں اتنی دلیری آگئی کہ کبھی کبھی سب کی نظریں بچا بچا کر کن انکھیوں سے اُسے دیکھ لیا کرتا تھا۔

قرینے سے وہ لڑکی کاچھن سی معلوم ہوتی تھی کیونکہ اُس طرف کاچھی[1] ہی رہتے تھے، میں نے اُسے گلیوں ہی میں گذرتے ہوئے دیکھا، اس کا گھر مجھے نہیں معلوم تھا، اور نہ میں نے کسی سے دریافت ہی کیا، گھر پوچھا تو درکنار لڑکے اس کا ذکر کرتے تو میں ٹال دیا کرتا تھا، گویا ایسی باتوں کی کچھ ضرورت نہیں، حالانکہ وہ مجھے بہت بھاتی تھی، اس کا خیال آجانے سے میرا جی خوش ہو جایا کرتا تھا، کیونکہ اس حالت میں نہ تو وہ شوخ لڑکے ہوتے تھے۔ اور نہ لڑکی کو دیکھ کر پیدا ہو جانے والا ہیجان

میری حالت بدستور رہی، اور فضل علی شاہ کے مزاج میں بھی کچھ فرق نہ آیا لیکن گوری شنکر، گوکل، اور جگل کشور کو نئی نئی شرارتیں سوجھنے لگیں، وہ لوگ روز بروز بے باک ہوتے گئے، اسے آتے دیکھ کر کبھی آپس میں ہنستے، کبھی رانیں اور تالیاں بجا بجا کر تانیں اڑاتے تاکہ یہ ان کی طرف دیکھے تو اُسے جھینپائیں۔

اب دونوں سے نظر ملتے ہی شرما جایا کرتی تھی، اس کا دل دھڑک جاتا تھا کہ ہائے یہ کمبخت مل گئے، مجھے چھیڑیں گے، اس واسطے جہاں تک ہوتا، آتے آتے الٹے پیروں پلٹ جاتی اور پھر کسی راہرو کی آڑ لیتی گلی کے دوسرے رُخ سے جھجکتی ہوئی نکلتی۔

دو ایک بار جو اس کا یہ طور دیکھا، تو ان لونڈوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا، کہ جب وہ ادھر آنے لگتی، تو پٹھے گویا خیر مقدم کر رہے ہیں، ایک ایک دو دو کر کے راستے کے دائیں بائیں مودب کھڑے ہو جاتے، اگر میں منع کرتا الٹا میرا منہ چڑاتے اور زیادہ اودھم مچاتے

ایک دن جو وہ آئی، تو مجھ سمیت تمام لڑکے مکان کی آڑ میں ہوگئے۔ جوں ہی وہاں سے گذری فوراً ایک نکل کر چلایا۔

"ہٹ جانا سامنے سے، سرکاری سواری آتی ہے"۔

اس نے جو پلٹ کر دیکھا، جھٹ پٹ اس مقام کے دروازے میں چھپ کر خوب ہنسے۔ دو چار روز میں جو وہ ملی تو اتفاقاً گلی میں کوئی نہ تھا، پھر کیا تھا موقع ہاتھ آیا، پہلے تو تین چار لڑکے زور زور سے کھانسے، اس نے جو جل کر دیکھا اور ناک بھوں سکیڑی، فوراً سب نے اٹینشن ہو کر فوجی طریقے کا سلام کرلیا۔

وہ بڑی تنتنائی اور اول فول بکتی تیز تیز قدم رکھتی ہوئی بڑھی، ادھر یہ غول بھی اس کا پیچھا کرنے کو تھا، اتنے میں چند ایسے بزرگ گلی کے سرے پر آتے دکھائی دئے جن کے خوف سے روح قبض ہوتی تھی، لہٰذا سب کے سب گلی کی دوسری سمت دوڑ لگ گئے!

---

[1] ایک قسم کی لمبی بھنڈی [2] ترکاریوں کی کاشت کرنے والے

اس طرح معاملہ رفع دفع ہوا اور نہ بڑی کٹ بد پائی

جہاں تک خیال آتا ہے، میری طرح اور لڑکے بھی خاص کر اس کی ٹوہ میں تو نہیں رہتے تھے، اسی واسطے کئی کئی دن اس کا ذکر تک نہ آتا تھا، اور یقیناً اس سے کسی کو دشمنی بھی نہیں تھی، مگر جب کبھی وہ مل جاتی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ منزور بالضرور اسے دق کرتے، اور اس کی ہنسی پر دے قہقہے پر قہقہہ۔

ہماری حرکتوں سے اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ہمیں دیکھتے ہی بغیر کسی چھیڑ چھاڑ کے بھی وہ دور سے بڑبڑانا شروع کر دیتی تھی:۔ نگوڑے ومڑے آ رہے ہیں، اب موت پڑے مجھے پریشان کریں گے، ان کا کالا منہ ہو جائے یہ غارت ہو جائیں۔

(۳)

ہم لوگ، غوث پورہ کے ایک محلے میں جا رہے تھے یکایک معلوم ہوا دھوبے چیتے کی بہو کنوئیں میں گر پڑی، وہ جو بہت سے آدمی بھاگتے جا رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہو لیے، اور دوڑ کر اس پرانے کنوئیں تک پہنچے جس کے آس پاس مرد عورت کا اژدحام تھا۔

ہم جو پہلے بھیڑ بھاڑ میں ریل پیل کرتے ہوئے کنوئیں کی جگت پر چڑھے، تو کیا دیکھا کہ چار پانچ موٹے موٹے رسے پانی تک لٹکے ہوئے ہیں، اور ایک رسے سے چھینکے کی طرح بندھی ہوئی ٹوکری پر اسی لڑکی کو بٹھایا جا رہا ہے۔

ایک تو جاڑے، دوسرے پانی میں بھیگنے سے ہاتھ پاؤں ٹھٹھر گئے، تیسرے جان کا خوف، چوتھے کئے کی ندامت، پانچویں طعنہ زنی و رسوائی کا دھڑکا، ادھر دم بھی نہ نکلے، بدحواس ہو گئی کچھ کرتے دھرتے نہ بنے، کتنی ہی دفعہ لوگوں نے پکڑ پکڑ کر اسے ٹوکری میں بٹھانا چاہا۔ اور وہ قلابازی کھا کھا گئی بیچاری بے طرح ڈبکوں ڈبکوں کرتی اور حلق پھاڑ پھاڑ کر ہائے مری ہائے مری چیختی تھی۔

آخر بہ دقت تمام بورے کی طرح اسے لادا گیا، اور دو تین آدمی سہارا دیئے اچھی طرح سنبھالے رسوں کے بل اوپر کھینچے گئے، جوں ہی ٹوکری قریب آئی دو ایک مضبوط آدمیوں نے نہایت ہوشیاری سے نکال کر کنوئیں کی جگت پر رکھا، وہ مارے خفت ہاتھ پاؤں سکیڑ کچھوا ہو گئی۔

آہا گھونگھٹ کاڑھ کر نیچی نگاہیں کئے ہوئے چلنے والی لڑکی کا ڈوپٹہ ندارد تھا، کرتی تار تار ہو گئی، بال بکھرے ہوئے، آڑ غائب، آرسی کا شیشہ چکنا چور، کئی ایک چوڑیاں ٹوٹی ہوئیں، خوف اور سردی سے تھر تھر کانپے، رال کے ریلے چل رہے، اوپر سے لوگ ٹوٹے پڑیں، وہ ہنگامہ مچا ہوا کہ اچھے خاصے آدمی کے اوسان خطا ہو جائیں۔

ادھر ایک کرارا سا بڈھا جو خود کو بوجھ بجھکڑ کا باوا سمجھتا تھا، ہٹو ہٹو کرتا، لوگوں کو ریلتا پیلتا آ موجود ہوا، فوراً لڑکی کو الٹا کر کے اوندھے منہ لٹا دیا، اور جلدی سے اس کی کمر پہ گھٹنا جا دونوں بازو پکڑ کر زور سے اوپر کو کھینچے، بس جناب لڑکی تھی کہ لگی اڑ زڑ کر کے قے کرنے، اس وقت جو لوگوں کی ٹھیلم ٹھیلا دھکیلم دھکیلا ہوئی ہے میرے تمام لڑکوں کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر جگت سے نیچے اتار دیا گیا، کہ اس گڑبڑ میں ایک آدھ کنوئیں میں جا پڑا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

گو ہم سب لڑکی کے پاس سے بھگا دیئے گئے، مگر ایسا تماشا چھوڑ کر ٹل کیسے سکتے تھے، ادھر ادھر ہی غل مچاتے رہے، تھوڑی سی دیر میں لڑکی کے منہ سے بڑا پانی نکلا، دیکھتے دیکھتے مٹکا سا پیٹ پچک کر جوں کا توں جیا پانی ہو گیا، اب اس کو ایک موٹا دھسٹ کمبل اوڑھا دیا گیا، اور وہ سمٹی سمٹائی ان پاٹوروں[۱] کی طرف لی جائی گئی، جن میں کاچھی کرمی رہتے تھے۔

شاید اب اس کے پیٹ میں پانی وانی تو بالکل نہ رہا ہوگا، البتہ مارے ٹھنڈ کے بیچاری کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی، لوگوں میں صلاح ہوئی، کہ آس پاس آگ جلائی جائے گرمی پا کر ٹھیک ہو جائیگی کوئی رائے دینے لگا، نہیں ابھی پانی باقی ہے الٹا کر کے تھوڑی دیر کمر سہلانی چاہیئے۔

ایک صاحب پوچھنے لگے :۔

کیوں جی ! یہ گری کیسے ؟

دوسرے نے جواب دیا۔

اجی آج کل کی عورتوں سے خدا بچائے، بڑی حرافہ ہیں، پہلے

---

[۱] وہ گوا یعنی گنداری زبان میں کوستی تھی، گو وہ کوسنے بڑے مزے دار ہیں لیکن اس خیال سے کہ سب محفوظ نہ ہو سکیں گے اردو میں لکھ دئے [۲] اعزازی خطاب [۳] پتھر کی چادر کو ٹپیا یا پاٹ کہتے ہیں، پچھواڑے کی طرف اونچی اور آگے کے رخ نیچی چار دیواری پر جوڑائی میں پتھر کے شہتیر رکھ کر پتھر یا چھپر کی طرح پاؤں کی چھت بنائی جاتی ہے۔

بڑی نند سے، پھر جو دانتا ساس نے روٹھ کر دھڑام سے کنوئیں میں جاگری۔

تیسرا۔ ہے ہے! پھر کسی نے دیکھ لیا ہوگا لوگ آگئے۔

دوسرا۔ دیکھتا کون، وہاں کوئی ہوتا تو بھلا گرنے ہی کیوں دیتا۔

چوتھا۔ اچھا! تو پھر خبر کیسے ہوئی، لوگوں کو!

دوسرا۔ یہ بھی کچھ مشکل ہے۔ ارے میاں گرتے تو گر پڑی، پھر لگا جو ایک غوطہ تو لگی پران چھوڑ کر چلانے:۔

ہائے مری، ہائے میں ڈوبی۔ دوڑنا میرا دم نکلا، ہائے ہائے میں گر گئی ....

پہلے صاحب (قہقہہ لگا کر، خوب! پھر گری ہی کاہے کو تھی!

دوسرا۔ یوں ہی ساس نند پہ دھونس بٹھانے کے لئے!

چوتھا۔ بہت اچھے رہے۔

اس کی چارپائی کے اردگرد لوگ باگ اسی طرح کھچر کھچر کرتے رہے، حتیٰ کہ اسے کچھ کچھ افاقہ ہونے لگا، ایک بار کروٹ بدلتے بدلتے اس نے کھولی جو آنکھ، ہم سب سامنے کھڑے نظر آئے بس فوراً کسی نے سلام کیا۔ کوئی ہنسا، ایک نے کھوپڑی گھما کر دیئے ٹھسکانے کہ اچھا شیطانی اب ذرا ہوشیار رہو، دوسرا ہاتھ ترچھا کر کے زور زور سے ہلانے لگا۔ ٹھیر جا تیرا فیصلہ ہی نہ کیا ہو تو نام نہیں۔

وہاں عورت پر مردنی چھا گئی، کہ ہائے غضب، ان کمبختوں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اب خیر نہیں۔

(۴)

پانچ چھ دن بعد ایک جگہ جاتے جاتے اچانک کچھ چمک سی پڑ کر میری آنکھیں چوندھیا گئیں، ڈالی جو اس طرف کو نظر تو وہی لڑکی چلی آرہی تھی، یہ اُسی کی آرسی کا عکس تھا۔

دوسرے لڑکوں نے بھی اس کو دیکھ لیا، اکدم سب کی زبان سے نکلا:۔

ارے! وہ آئی"

ادھر لڑکی جو کسی دھن میں محو تھی ہمیں دیکھ کر بے طرح جھجکی پھر کچھ سنبھل کر بدحواسی کے سے عالم میں ہم پر رحم طلب نگاہیں ڈالیں، گویا التجا کرتی ہے، کہ دیکھو مجھے نہ چھیڑنا! اس عاجزی کا اثر صرف مجھ پر ہی نہیں سب پر ہوا ہوگا، لیکن واہ رے لڑکپن، ذرا دھیان نہ دیا، بلا سوچے سمجھے اک دم شرارت سوجھی، بجائے درگذر کے گلے منہ آئی بکنے:۔

لو صاحب! وہ آئیں.... بے حیا بے غیرت ....

کمبخت کنوئیں میں گر کر بھی نہ مری ....

اجی! یہ کیا مرتی ہے، مردہ کھانی .....

کیوں ری! تو ہی تھی کیا! ..... اُس دن .....

اور نہیں تو کیا اس کی خالہ تھی ....

اُفوہ! کیا کیا تلملائی ہے، کس کس طرح چیخی تھی، ہائے مری، ارے میں ڈوبی، دوڑنا میرا دم نکلا...

پھر مری نہیں کمتی!

اور گرے گی کنوئیں میں

پہلے تو اس نے برابر سے بُرا بھلا کہا، خوب کوسا کاٹا، جب اکیلی جان اتنوں کا کچھ نہ کر سکی اور چھٹکارے کی کوئی صورت نہ تھی تو تنگ آمد بجنگ آمد دیوانیوں کی طرح پتھر لے کر دوڑی، یہاں کیا کم تھے، فوراً مقابلہ کو تیار ہو گئے، خیر گذری چند آتے جاتوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا، ورنہ بڑا فضیحتہ ہوتا۔

جب وہ وہاں سے چلی گئی، اور کوئی دوسرا بھی نہ رہا، تو ہم لوگوں نے خوب ڈٹ ڈٹ کے قہقہے لگائے اور یہی ذکر کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس کے بعد جہاں کہیں بھی وہ لڑکی ملتی، ہمیں دیکھ کر سہم جاتی، اُس کے ہر انداز سے ظاہر ہوتا تھا، کہ ارے کمبختو! کیوں ستاتے ہو، کسی طرح جان بھی چھوڑو گے، تم نے تو میری ناکہ بندی کر رکھی ہے، اب کہاں جاؤں!

اس کی بے بسی پر کتنی ہی بار مجھے ترس آیا، فضل علی شاہ اور گوری شنکر بھی پسیجے، مگر ہم میں ایک لڑکا تھا "عاشق حسین" لکھنؤ کا رہنے والا، نہایت شوخ، شیطان کا چچا، اسے ان قصوں میں تمام لڑکوں کا استاد سمجھنا چاہیئے، اس کی وجہ سے فوراً سب شرارت پر آمادہ ہو جاتے تھے، پہلے تو کچھ ہچکچاتا پھر وہ بھی لڑکی کے جھنجھلانے، پتھر پھینکنے، اور لڑکوں کے چیخنے چلانے کا مزہ ہی نہیں لینے لگتا، بلکہ گڑ بڑ بھی مچاتا تھا۔

لڑکی سمجھ کر فضل علی شاہ اور میں نے اسے پتھر سے تو کبھی نہیں مارا، البتہ ہنسی ہمیں ہی سب سے زیادہ آتی تھی، اور شاید لڑکی کو ہمارے

ہنسنے کا رُخ دوسرے لڑکوں کے پتھر پھینکنے کے غصے سے کم نہ ہوتا تھا اگر وہ ان کے پتھر پھینکنے سے طیش میں آتی تو ہمارے ہنسنے پر بھی آگ بگولہ ہو ہو جاتی تھی۔

بتدریج ہم نے اس کے دماغ میں ایسا خلل ڈالا، کہ جونہی ہمارے سامنے آتی، بغیر چھیڑے بھی پتھر مارنا شروع کر دیتی، ہم میں سے کبھی کبھی ذرا بچا کر کہ کہیں لگ نہ جائے، پتھر تو کوئی لڑکا ہی پھینک دیتا تھا، ہاں تالیاں بجا بجا کر غل خوب مچاتے تھے۔

اسے یہ سڑن آئی......

پورانے کنوئیں کی چڑیل دیکھو!

ذرا اپنے اپنے بچے سے ہوشیار رہنا، ورنہ ہم نہیں جانتے کہ یہ ڈائن کلیجہ چبا جائے گی۔

ایک بار اس نے جو گھبرا کر پتھر پھینکا، تو کھٹ سے میرے گھٹنے میں لگا۔ بس ادھر تو میں نے گھٹنا پکڑا، ادھر وہ ایک ہکسکتہ کے سے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، اب خواہ وہ اس وجہ سے ڈری ہو کہ یہ لڑکا کسی قدر غنیمت تھا، سو افسوس! میں نے پتھر مار کر اسے بھی دشمن بنا لیا، مگر اس کی بھولی بھالی صورت پریشان دیکھ کر میں سمجھا کہ بیچاری مجھ پر کڑھ رہی ہے، اوہ!! اس کو میری چوٹ کا کتنا درد ہے۔ بھئی اب میں کبھی ہنسا بھی نہ کروں گا، یہ لونڈے ٹبے شیطان ہیں کسی کو ایسا بھی کیا ستانا کہ دل دُکھ جائے۔

(۵)

کچھ ٹھیک یاد نہیں کتنی مدت یہ شغل جاری رہا، پھر ہم وہاں سے دوسرے محلے میں اٹھ گئے کوئی ایک سال بعد وہ گھر چھوڑ کر مُنڈی کے بازار میں جا رہے، یہاں دو ڈھائی سال ہی خیر سے گذرے ہوں گے، ایسا سلسلہ شروع ہوا، ڈھنگ ہی بگڑ گیا، رنج و راحت کے کتنے ہی دور ہوئے بچپن کے دوست تیتر بیتر ہو گئے۔ آخر افسوسناک انقلابات دیکھ کر افسردہ دل برداشتہ خاطر میں وطن سے نکل کھڑا ہوا، اور دیس بدیس مارا مارا پھرنے لگا۔

اس دوران میں "بینا جنکشن" پر اتفاقاً سردار نہالکر صاحب مل گئے، بے حد خوشی ہوئی، باتوں باتوں میں کہیں سردار اسکول کا ذکر چھڑ گیا، دیگر دوستوں کا بیان کرتے کرتے سردار صاحب نے کہا کہ راجہ چمن سنگھ صاحب کاشی والے ریاست کی طرف سے ٹرنیری کالج لاہور بھیجے گئے ہیں، ان سے ملے مہینوں ہو گئے۔

اس سرسری ملاقات کے بعد سردار نہالکر صاحب نے گوالیار کا رخ کیا اور میں ساگر چلا گیا۔

سنِ شعور کو پہنچنے اور نیرنگیٔ زمانہ کے تاثرات سے آشنا ہونے کے باعث میری حالت ہی کچھ اور ہو گئی، بچپن کے معاملات دور جا پڑے تھے، اب اس شوخی اور ولولے کی ہوا بھی نہ تھی، جب کبھی آلامِ دنیا سے ذرا دم لینے پر اس لڑکی کا خیال آتا، میں اپنی بے وقوفیوں پر کبھی ہنستا کبھی خجل ہوتا تھا گھنٹوں طرح طرح کے خیالی طلسم سے مجھ پر ایک عجیب محویت طاری رہتی تھی۔ سوچتا تھا۔

میں نے اسے کیوں ستایا...... واہ واہ وہ کیسی بھولی صورت کی تھی...... افسوس! بیچاری دل میں کیا کہتی ہوئی....... اس کے تصور سے ہی باغ باغ ہو جاتا تھا.....

لیکن جب اُسے رنج پہنچایا تو وہ کیونکر یقین کر سکتی ہے...... نہیں نہیں اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا اصلی جذبہ اس سے پوشیدہ نہیں......

یہ سب کچھ سہی بیشک میرے قصور وار ہونے میں کلام نہیں تاہم یہ بھی سچ ہے کہ میں جب بھی شرارتیں کرنے کے بعد دل ہی دل میں اس کے خیالی پیکر سے معافی مانگا کرتا تھا، اور اب بھی ہاتھ جوڑ کر تیری منتیں کرتا ہوں منتون!

اے اس وقت کی بھولی بھالی بے قصور لڑکی تو میری خطائیں معاف کر دیجیو!

منتون! رحم کر!! یہ سمجھ کر کہ بچپن میں ایسا ہو ہی جاتا ہے اُس وقت مجھے بُرے بھلے کی تمیز کہاں تھی۔

غرض جب کبھی سوتے جاگتے اس لڑکی کا تصور بندھ جاتا۔ میرے دماغ میں متضاد اشکال کے گوناگون مناظر گشت کیا کرتے تھے اور میں کچھ کھو سا جایا کرتا تھا۔

(۶)

بڑی آوارہ گردی کے بعد بھوپال پہنچا، تقریباً چھ سات مہینے وہاں پڑا رہا، پھر جو منہ اٹھا لاہور کا رُخ کیا، سردار نہالکر صاحب کی بات یاد تھی، خیال آیا کہ لو بھئی اب راجہ چمن سنگھ صاحب سے ملنا چاہیئے، ونزیری کالج کے ہوسٹل میں جا کر معلوم ہوا کہ آج کل گرمیوں کی چھٹیاں

میں، دو مہینے بعد کالج کھلے گا۔

دو مہینے بھی ختم ہو گئے راجہ چمن سنگھ صاحب سے ملاقات ہوئی انھوں نے بتایا کہ راجہ لوک پال سنگھ صاحب بھی میو آرٹس اسکول میں کام سیکھنے آئے ہوئے ہیں۔ گنپت روڈ پر مکان لیا ہے۔ بازار پیسہ اخبار میں میرا قیام تھا، شام کو گنپت روڈ سے گذرتے وقت راجہ لوک پال سنگھ صاحب کا مکان معلوم کیا، اس وقت وہ وہاں موجود نہ تھے، دوسرے پھیرے میں ملے۔

راجہ لوک پال سنگھ صاحب سے سردار اسکول گوالیار۔ میں تو کچھ زیادہ ربط ضبط نہ تھا، لیکن وطن سے اتنی دور مل کر بہت جلد تعلقات ترقی کر گئے، یہاں تک کہ آخر انہوں نے سو ہزار حیلوں سے مجھے اپنے پاس ہی رکھ لیا، کہ بھئی ہم وطن اور پرانا ملنے جلنے والا ٹھہرا ساتھ ہی رہے تو اچھا ہے۔

کچھ تو لاہور کی آب و ہوا موافق نہ آئی، کچھ بے پروائی اور بد پرہیزی راجہ صاحب کو کھانسی کی شکایت ہوئی، اور بے غوری کی وجہ سے بڑھتی گئی، جب مرض نے طول کھینچا تو گوالیار جانے کی صلاح ہوئی اس طرح ۱۹۱۷ء میں ان کے ساتھ میں بھی وطن کو پلٹا۔

ادھر ان کے چچیرے بھائی مہاراجہ بھگونت سنگھ صاحب نگرورہ والے بھی سخت علیل ہونے کی وجہ سے لشکر میں تھے، لہذا ہم انہیں کے پاس لشکر جا اترے۔ لیکن کیونکہ گوالیار سے میرا خاص تعلق ہے اس واسطے اکثر عزیز و اقارب اور دوست احباب کو ملنے گوالیار آیا جایا کرتا تھا۔

ان دنوں مجھے خود بخود وہ لڑکی بار بار یاد آنے لگی، اس یاد میں کتنی ہی دفعہ تو میرا دل بے قابو سا ہو گیا، ایک مرتبہ پچھلی رات وہ گیارہ سال کی عمر والا سا خواب جو لڑکی کو پہلی دفعہ دیکھنے پر دیکھا تھا دیکھتے دیکھتے صبح ہی صبح میری آنکھ کھل گئی۔

اس کے بعد یہ رنگ ہوا کہ جدھر دیکھوں وہ لڑکی، آنکھیں بند کرنے پر بھی ہرگز نہ ہٹتی تھی۔ اس وقت مجھے کیا محسوس ہو رہا تھا، کس طرح بیان کروں، میری روح کس دردآمیز مزے میں ہلکی ہلکی جنبش کر رہی تھی شاید۔

اب اتفاق دیکھئے گھر سے جو نکلا، تو بغیر کسی سبب کے اسی گلی سے گذرا جہاں پہلے پہل وہ لڑکی نظر آئی تھی۔ اس وقت جیسے ابھی کی بات ہو، فوق سے وہی منظر میرے سامنے آ گیا، مجھے خود ہیبت جا بجا ان لڑکوں کی صورتیں جھلکتی ہوئی دکھائی دیں اور دل میں ایک گدگدی سی ہونے لگی۔

حالانکہ فضل علی شاہ ۱۳۳۳ھ میں انتقال کر چکا تھا، اور دوسرے لڑکوں میں سے جو بھی تھے وہ خبر نہیں کہاں کہاں ہوں گے۔۔۔۔۔

اتنے میں اسی قبروں کے چبوترے والے اونچے درخت کا سایہ جو پڑا، تو گویا ہزار چند روشنی ہو گئی، تصورات حقیقی مشاہدات نظر آنے لگے۔

گلی مڑتے مڑتے ایک سخت ٹھوکر سے میری نظر اٹھی، مجھ کو دس بارہ قدم آگے کوئی عورت گود میں بچہ لئے جا رہی تھی، چوندری اوڑھے آٹھ نو سال کی ایک لڑکی، اور پانچ برس کا ایک لڑکا بھی اس کے ساتھ تھے۔

کیونکہ میری رفتار کسی قدر تیز تھی، ہر قدم پر یہ فاصلہ کم ہو گیا آہٹ پا کر ناگاہ لڑکی نے مڑ کر دیکھا۔

میں ششدر رہ گیا۔۔۔۔ اُف! وہ تو ہو بہو میرے خیالی پیکر کا عکس نکلی، اب عورت بھی نزدیک تھی جوں ہی اس نے رُخ پلٹا، ایکدم دونوں کی نظریں نیچی ہو گئیں، دو تین سیکنڈ کا وقفہ دے کر پھر ملیں۔ مجھے اس کی کنپٹی کا ننھا سا تل دکھائی دیا، بے اختیار زبان سے نکلا:

ارے!۔۔۔۔ جھنتون!!

ادھر عورت بولی۔

آہا۔۔۔ بھیا تم ہو!

گو عنفوان شباب کی شگفتگی و شوخی، متانت و افسردگی میں تبدیل ہو چکی تھی، تاہم مجھے دیکھ کر ایک پر افسوں تبسم سے اس کا چہرہ ایسا کھلا میری روح تازہ ہو گئی، اس وقت ہماری نظروں نے ایک دوسرے پر جو اثر کیا فرشتے نہیں جان سکتے۔

اس کے جذبات تو وہ جانے ہاں! کہہ سکتا ہوں کہ میری حالت ضرور قابل رحم تھی، مرا جاتا تھا کہ ایک نعرہ کر کے اس سے لپٹ جاؤں اسے خود میں جذب کر لوں، مگر دنیا کی معاشرت اور غارت گر تہذیب اس مخلصانہ یک رنگی میں سنگ گراں سے حائل تھی۔

اس پر یہ دھڑکا کہ چند قدم سے زیادہ مہلت کا امکان نہ تھا، دفعتہً لاکھوں کروڑوں ارمان امڈ پڑے، کس کس سے لڑتا کیسے کیسے سنبھالتا آخر نہ جانے کیوں، وہی بچپن کی معصوم فطرت غالب آ گئی۔

نغمہ تھراتے ہوئے ہونٹوں سے نکلا۔

مہتون! تو وہی ہے نا!!

ادھر اس کی شمشیر نما ابرو میں ناراضگی کا ہلکا سا کھنچاؤ تھا، اُدھر ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ کھیل گئی، پتلیاں حرکت میں آئیں ایک جھجک کے ساتھ ذرا ترچھی ہو کر بولی۔

تسے ہوا تمہیں ابھی تک وہ بات یاد ہے..... بھیّا!!

آہ! اتنے میں چوراہا آگیا، اور لوگوں کے ڈر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام کرتے بہ حسرت و یاس ہم اِدھر اُدھر ہو گئے۔

ان دنوں راجہ لوک پال سنگھ صاحب کا مرض بہت الجھ گیا تھا، اتنی فرصت نہ ملی کہ اس کی جستجو کرتا، یوں ہی کلیجہ مسوس مسوس کر رہ گیا، راجہ صاحب کو صحت کلی نہ ہونے پائی تھی، چھٹی ختم ہو جانے کی وجہ سے مجھے ان کے ہمراہ لاہور جانا پڑا۔

چار چھ مہینے بعد مقدرات نے مجھے اور راجہ صاحب کو بھی ساتھ نہ رہنے دیا، کچھ ایسے وجوہ ہوئے کہ ہم ایک دوسرے سے دور نکل گئے۔

۱۹۳۴ء میں جو گوالیار آیا، تو یہاں کی ہر چیز بدلی ہوئی پائی، بہت سے عزیز اور دوست احباب معدوم ہو گئے۔ شکر ہے راجہ لوک سنگھ صاحب موجود ہیں، اور خدا کے فضل سے ویسے ہی مخلص جیسے پہلے تھے۔

ایک روز اس لڑکی کا خیال آ کر میرا دل اُلٹ پلٹ ہونے لگا بصد ارمان اس محلے میں پہنچا، تو نہ وہ مکانات ہیں نہ وہ مکیں کسی اور ہی طرح کی مخلوق چلتی پھرتی ملی۔

وہ پرانا کنواں اندھا پڑا ہے، واٹر ورکس قائم ہو جانے کے سبب سے لوگوں نے توجہ ہٹالی، کوئی بھول کر بھی اس پر نظر نہیں ڈالتا۔

خدا جانے وہ لڑکی، وہ کامنی مہتون کہاں گئی، اس وقت تو کنوئیں میں گر کر بھی زندہ نکل آئی تھی۔

فہیم بیگ چغتائی

ہم

ہم مظہرِ عشق ہیں ہم ہی [illegible] ہیں
ہم [illegible] وجود ہیں ہم ہی معدوم ہیں
ہم کیا ہیں بجز خدا کا اک حکم
[illegible] محکوم ہیں
لیکن

دم

[illegible] دم سمجھتے ہیں
اس دم کو ہم اپنا دم و [illegible] سمجھتے ہیں
[illegible] وقت [illegible]
[illegible] ساری [illegible]
[illegible] سمجھتے ہیں
دم کے دم [illegible] سب کو ہم [illegible]
یہ ایک دم [illegible]

احمد حسین امجد

تجلّیات

پردۂ عیش میں غم رقصاں ہے عشرت کے کاشانے میں
غم کا بھیس بدل کر خوشیاں بیٹھی ہیں غم خانے میں

کس نے جلایا؟ کون جلا ہے؟ کیا کہیے جب ایک ہی سوز
روشن شمعِ محفل میں ہے مضطر ہے پروانے میں

موت ہے برحق باری باری آخر سب کو مرنا ہے
لیکن فرق ہے اہلِ ہوس اور عاشق کے مرجانے میں

کتنا دلکش! کتنا رنگیں الفت کا افسانہ ہے
بیت گئی ہے عمر ہماری بس اس ایک افسانے میں

دل کو ایک خرابہ پاکر ناداں اس کو چھوڑ گیا
ہم نے لیکن ڈھونڈ لیا ہے گنج اسی ویرانے میں

شیخ نہیں ہے محرمِ الفت اس کو حرم میں رہنے دو
اس بیگانۂ درد کو تم کیوں لے آئے میخانے میں

ذکرِ خدا کا بھی کب چھوڑا نام خدا کا لے لے کر
ہر بت کو جی کھول کے پوجا ہم نے اس بتخانے میں

بے شک صہبائی کا فسانہ اک رنگین افسانہ ہے
خونِ جگر کی رنگینی ہے لیکن اس افسانے میں

اثر صہبائی

جنگ اور مفکّرین عالم

(انسدادی تدابیر کے لئے علمی مدد کا سوال)

حال ہی میں ایک عالمگیر علمی و ادبی جماعت "پی۔ای۔این" کلب (P. E. N. CLUB) کے نام سے قایم ہوئی ہے

"P" انگریزی حرف پی سے مراد شعراء (POETS) ڈرامہ نگار (PLAY-WRIGHTS) وغیرہ ہیں۔

"E" انگریزی حرف "ای" سے مراد ایڈیٹر صاحبان (EDITORS) مضمون نویس (ESSAYISTS) وغیرہ ہیں۔

"N" انگریزی حرف "این" ناول نویس حضرات (NOVELISTS) خبر رساں اور خبر نویس لوگ (NEWS-REPORTERS) وغیرہ ہیں۔

اس جماعت میں تقریباً تمام دنیا کے مشہور مفکّرین (INTELLECTUALS) شامل ہیں۔ ادیب۔ شعراء۔ ایڈیٹر۔ ناول نویس اور دیگر اہل قلم اور اہل زبان اور اہل علم و ہنر اس کے رکن ہیں اگرچہ اس کلب کی زبان انگریزی ہے، اور وہ اس کی عالمگیر مقبولیت کی وجہ سے ہے لیکن دنیا کی ہر بڑی زبان کا مصنف و مفکر اس جماعت کے دائرہ میں شریک ہوسکتا ہے اس جماعت کے ارکان میں اس وقت انگلستان۔ امریکہ۔ فرانس۔ جرمنی۔ سپین۔ اطالیہ۔ روس۔ ہنگری۔ رومانیہ۔ اور ایشیا کے اکثر ممالک کے مصنفین اور مفکرین شامل ہیں۔ ہندوستان میں بھی گذشتہ سال اس کی شاخ بمقام بمبئی بن گئی ہے اور اس کی جانب سے ایک مختصر انگریزی رسالہ بھی شایع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ علمی و ادبی کام کرنے والوں اور دماغی اکابر کی یہ پہلی جماعت اور منظم ادارہ ہے جسے حقیقی معنوں میں عالمگیر ہونے کا فخر حاصل ہے اس کے ارکان میں ممکن الحصول حد تک قومی عصبیت اور وطنی جذبات پروری مٹادی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس میں تمام دنیا کے اہل دماغ ایک سطح پر آکر دنیا کی بھلائی کے ذرائع سوچتے ہیں۔ اس کی صدارت مختلف مشہور اہل قلم مثلاً برنارڈ شا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز۔ گالسورادی (آنجہانی) لنکا ڈاہیران۔ بیرن ران لیف ہروارڈ اور نکلسن سیوش وغیرہ وغیرہ مشاہیر کرچکے ہیں آج کل اس کا صدر جرمنی کا شہرۂ آفاق مفکر و فلسفی سر ایمل لڈوگ (EMIL LUDWIG) ہے ہر سال اس کا سالانہ جلسہ کسی مرکزی مقام پر ہوتا ہے اور وقتاً فوقتاً کچھ اور اجتماعات منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں "پی۔ای۔این" کلب کی ایک کانفرنس دنیا کے امن کے موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی اور اس سلسلے میں صدر موجودہ سر ایمل لڈوگ مشہور جرمنی مصنف و فلسفی نے جو تقریر جنگ کو روکنے کے مطالب پر کی وہ اس قابل ہے کہ دنیا کے تمام مصنفین، مفکرین اور ادبا و شعراء اس پر غور کریں۔ ہر ملک کے اکابر اور سماجی کام کرنے والوں کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ سوچیں کہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے سے کس طرح امن عالم کو قایم کرسکتے ہیں اور دنیا کو ہولناک جنگ سے بچا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مفکرین و مصنفین عالم دنیا میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کردیں، جنگ کے خلاف عالمگیر جذبات پیدا کردیں اور اس قدر زبردست مدافعت اس فتنۂ عالم کی کریں کہ اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے تو دنیا اس دیو کے چنگل سے نجات پاسکتی ہے۔

سر ایمل لڈوگ نے جنگ کو دور کرنے اور مفکرین عالم کی امداد حاصل کرنے کے موضوع پر گفتگو شروع کرتے ہوئے فرمایا۔

چونکہ جمیعتہ الاقوام نے اپنے عمل سے یہ بات ظاہر اور ثابت کردی ہے کہ وہ جنگ کو روکنے سے

قاصر ہے اس لیئے ہم (مفکرین) کو اب پردے کار آنا چاہیئے اور عملی طور پر یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ سائنس سے زیادہ طاقت ور اور دور رس اثر ہیں"۔

سب لوگ اس جدید خیال پر چونک پڑے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ عالمگیر جنگ کو روکنے کے لیئے تمام دنیا کے اہل دماغ اور اہل قلم حضرات کو مل کر ایک متحدہ محاذ پیش کرنا پڑے گا۔ یہ خیال سینکڑوں لوگوں کے دماغ میں آ چکا تھا لیکن ایک منظم نظریئے کی صورت میں جس طرح پیش کیا گیا اسے تمام کلب کے ارکان نے اور باہر کی دنیا نے دلچسپی کے ساتھ سنا۔ جرمن مفکر نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

ہمیں جنگ کا سیلاب بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ گذشتہ سالوں میں ہماری ذمہ داریاں اس قدر اہم نہ تھیں جس قدر ان چند سالوں میں بڑھ گئی ہیں۔ آج سے بیس سال پہلے دنیا کے مفکرین اور اہل دماغ نے کان دبا کر اسلحہ کے سامنے سر جھکا دیا اور جنگ شروع ہو گئی لیکن اس دفعہ ہم لوگوں کو دماغی فوقیت سامنے لا کر اور سینہ سپر ہو کر اسلحہ کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنا چاہیئے اور اگر اسلحہ نے دنیا کے امن کو برباد کرنا چاہا تو دماغ آگے بڑھ کر اپنی تمام قوتیں اس کے انسداد کے لیئے صرف کر دے گا اور ہم اہل دماغ اور اہل فکر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ جو کانفرنس تخفیف اسلحہ کے نام سے ہوئی تھی وہ بھی ناکام رہی اور اس نے ثابت کر دیا کہ جنگ نہیں رک سکتی اور اس وجہ سے مفکرین عالم کے لیئے ایک بڑا اہم معاملہ انسانی گروہ کا حفاظت کے سامنے آ گیا ہے۔ اور اب ہم کسی چشم پوشی اور وطنی عصبیت کو روا نہیں سمجھ سکتے اس وقت دنیا کا بیشتر سرمایہ اسلحہ کی رفتار کو ترقی دینے اور اسلحہ کو نت نیا جامہ پہنانے کی کوشش میں صرف ہو رہا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات و مواثیق پر بھی ذاتی اثرات اور اقتصادی الجھنیں سایہ فگن ہیں اور کوئی معقول نتیجہ امن عالم کے قیام کے لیئے برآمد نہیں ہو سکتا اس لیئے ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر کوئی تدبیر سوچیں۔ اس وقت سرمایہ، محنت اور وطن تین چیزیں دست و گریباں ہیں اور ۱۹۱۴ء میں بھی یہی حالت تھی۔ اس وقت مفکرین عالم اور مصنفین کی جماعت آزاد تھی اور اب بھی نظری طور پر آزاد اور بے لاگ ہے۔ مگر عملی دشواریاں ہماری راہ میں بھی حائل ہیں تین مفکرین عالم وطن، سرمایہ اور محنت کے جابرانہ تسلط اور امن سوز کشمکش سے بہت بڑی حد تک آزاد ہیں اور اس کرہ کے رہنے والوں کی امن طلب نگاہیں اگر کسی طرف اٹھ رہی ہیں تو وہ ہمارا طبقہ ہے"۔

ایمل لڈوگ نے دنیا کے امن کو قائم کرنے اور جنگ کے اثرات کو دور کرنے کے لیئے جس چیز کو تجویز کیا ہے۔ اس پر اگر سنجیدگی کے ساتھ عمل کیا جائے اور اسے تمام دنیا کے مفکرین اور مصنفین اہل دماغ حضرات کی مدد اور عملی تائید حاصل ہو جائے تو جنگ کا خطرہ دور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جنگ کو روکنے کے لیئے ایک "دماغی حربہ" کے عنوان سے مسٹر لڈوگ نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ مقصد یہ ہے:۔

چونکہ تمدن عالم کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ جنگ سے لاحق ہو رہا ہے اس لیئے ہمیں یعنی دنیا کے تمام مفکرین اور اہل علم کو مل کر ایسی زبردست اور قوی الاثر طاقت پیدا کر لینی چاہیئے کہ اگر جنگ شروع ہو بھی جائے تو ہم ایسا رویہ اختیار کر سکیں کہ جنگ کی تباہ کاریاں حتی الوسع انسانی آبادی کے لیئے کم ہو جائیں اور یہ بدنصیب سایہ ہمارے اوپر سے جس قدر جلد دور ہو سکے ہو جائے۔ جنگ کے خلاف زبانی گفت و شنید اور وعظ و تقریر سے کوئی کام نہیں بن سکتا اور اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ اس لیئے ہمیں جنگ کے خلاف زبانی حملے کرنے کی بجائے ایک جدید حربہ سے کام لینا چاہیئے۔

جنگ عظیم کے بعد معاہدات ہونے شروع ہوئے ایک قوم نے دوسری قوم کو ڈرا دھمکا کیا

ترغیب وتحریص سے کر معاہدات کرائیے اور
طرح طرح سے فایدے حاصل کیے۔ دنیا کی آیندہ
جنگ کو دور کرنے کے لیے معاہدات و مواثیق کچھ
کام نہیں بن سکتا اس کے لیے "جوابی عمل" کی ضرورت
ہے کیونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اگر کوئی قوم اسلحہ جات
بڑھا رہی ہو اور اس کے جواب میں زیادہ اسلحہ
بڑھانے کی جستجو کی جائے تو یہی مسلک اضافہ اسلحہ
سے باز رکھ سکتا ہے اور ردِ عمل پیدا ہونے لگتی ہے اس
طرح کرنے سے اقوام کی کشمکش کو حتی الوسع کم کیا
جا سکتا ہے۔

جب تک ایک قوم کے لیے دوسری قوم کا
خطرہ موجود ہے اسلحہ کا اضافہ نہیں ہو سکتا جونہی
ایک ملک میں اسلحہ کا اضافہ شروع ہو دوسرے ملک
میں اس سے دو قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے
اس "جوابی عمل" سے پہلا ملک اس پر آمادہ ہو جاتا ہے
کہ وہ سابقہ اسلحہ پر ہی قناعت کرے اور اس میں اضافہ
نہ کرے۔ معاہدات کو ہر وقت توڑا جا سکتا ہے لیکن
جوابی خطرہ کی موجودگی سے ایک قوم کو دوسری قوم
سے ہمیشہ خدشہ رہتا ہے اس لیے یہ حربہ بہت
مفید ثابت ہو سکتا ہے اور عملی طور پر اس کی کامیابی
ہمارے سامنے بارہا آ بھی چکی ہے۔

جمعیۃ الاقوام کی بے بسی پر رائے زنی کرتے ہوئے اہل
علم سے درخواست کی ہے۔

جنیوا کا خواب پریشان ہو چکا ہے جن اقوام
نے مل کر اس خواب کے سنہری تار تیار کیے تھے
انھوں نے ہی ان تاروں کو توڑ دیا ہے اور
وہ سب جنگ پر تلی ہوئی ہیں۔ اس وقت
تو صرف اہل دماغ اور اہل علم و اہل قلم حضرات
مل کر ہی جنگ کے امکانات کو دور کر سکتے ہیں
اور اگر بفرضِ محال جنگ شروع بھی ہو جائے
تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اسے کیونکر بند کرایا جائے
اور کیا رویہ اختیار کیا جائے بعض لوگ کہتے ہیں
کہ اہلِ قلم اہلِ سیف کو جنگ سے باز نہیں رکھ
سکتے۔ ہم لوگ سوچ بچار ہی میں رہیں گے اور
یورپ کے ۲۹ جنگی محاذوں پر سے کسی ایک پر
رات کے وقت بم گرا دیا جائے گا اور جنگ چھڑ
جائے گی۔ بیشک۔ ہم اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ
اہل قلم جنگ کی آمد کو نہیں روک سکتے ہیں سوچنا
یہ بھی ہے کہ اگر جنگ ہو بھی جائے تو ہمیں کیا کرنا
چاہیئے۔ اور پُرامن باشندوں کے لیے ہمارے
پاس کیا پروگرام ہے۔ اگر ہم لوگ جنگ کی شروعات
سے عین قبل ایک عالمگیر اظہار داشت (مینی فیسٹو)
شائع کر کے جنگ سے دست برداری کا اعلان
کر دیں اور اپنے اپنے ملک میں جنگ کے اثرات
کو دور کرنے اور اس کو جلد از جلد ختم کرنے اور
کرانے کے لئے زور دیں اور عملی مدد کریں تو اس
نحوست کی ہولناکی کم کی جا سکتی ہے اور بہتر نتائج
کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں جنگ
یورپ کی طرح اس وقت خاموش نہیں رہنا چاہیئے
بلکہ بیچ میں کود کر کوئی ایسا ذہنی اور تمدنی انقلاب
پیدا کر دینا چاہیئے کہ اہل سیف اور اہل اسلحہ بے
دست و پا اہل فکر کی طاقت سے آگاہ ہو جائیں۔
کیا دنیا کے بڑے بڑے جرنیلوں کے مقابلہ پر
ہمارے ویلز۔ ہمارے برناڈ شا۔ ہمارے سنکلیر
ہمارے ڈوئڑاسکی۔ ہمارے ٹیگور اور ہمارے دیگر
ادبی و علمی سیارے کچھ کم حیثیت رکھتے ہیں جیسا
یہ اپنی کتابوں سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے
دماغوں میں ہیجان و اضطراب اور انقلاب و تغیر
پیدا کر سکتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہم ان حضرات
کے دماغی حربہ کو جنگ کے انسداد اور مدافعت
کے لیے استعمال نہ کریں ـــــ"

جنگ کو روکنے کے امکانات پر بحث کرتے ہوئے مسٹر

لڈوگ سے فرمایا۔

جنگ کے شروع ہونے پر یا اس سے عین قبل کوئی اعلان اس قسم کا کرنا جس میں وزرائے جنگ یا وطنی مجالس کے نمایندگان سے جنگ کو روکنے کی یکسانہ اپیل ہو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جنگ کو روکنے کے لیے جنگ ہی کرنی پڑے گی۔ جنگ کے امکانات دور کرنے کے لیے جس کی تیاریاں سالہا سال سے ہو رہی ہوں، والٹیر یا کانٹ کا معقول یا فلسفہ پیش کر کے بزعم خود غلط وزرائے حرب کو ہم خیال نہیں بنایا جاسکتا اس کے لئے کسی مزید اقدام کی ضرورت ہوگی۔

وہ حربہ یا طریقہ کار یہ ہے کہ علم و ذہانت انسانیت کے نام پر تمام دنیا کی طاقتوں سے اور خاص کر ان دُول سے جو برسرپیکار ہوں یہ درخواست کی جائے کہ جنگ شروع کرنے سے قبل وہ ایک کھلی ہوئی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کریں یہ عدالت ایک ثالث کی سی حیثیت کی ہو جو صرف اس بات کا فیصلہ کرے کہ کونسی طاقت برسرِ حق ہے اور کونسی طاقت جابر ہے اور خواہ مخواہ لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہے اور بہانے تلاش کر رہی ہے اگر کسی طاقت یا اتحادی طاقتوں نے اس نوع کے عالمگیر آزاد ثالث اور حَکَم کو تسلیم نہ کیا یا اس کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا تو اسے جابر طاقت سمجھ لیا جائے گا اور دنیا کے امن اور دنیا کی عقل اور علم و ہنر کی حفاظت کے نام پر اس جابر طاقت یا اتحادی طاقتوں کے خلاف ایک زبردست جارحانہ اور مدافعانہ اقدام عمل کیا جائے گا۔

جمعیتہ الاقوام اس معاملہ میں پہلے ہی بے دست و پا ثابت ہو چکی ہے اس دفعہ علمائے انسانیت "پی۔ ای۔ این" (P. E. N) کلب کی وساطت سے حکم بنائیں گے اور کسی ایک طاقت یا گروپ کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کریں گے پھر تمام دنیا سے یہ درخواست کی جائے گی کہ وہ اس طاقت یا گروپ کے خلاف جوابی اور مدافعانہ جنگی نقل و حرکت کریں اور اس دھمکی کے بغیر جنگ کو نہیں روکا جا سکے گا۔

میرا یہ خیال ہے کہ صورت حال اس قسم کی ہوگی:۔

جنگ کو روکنے کے لئے مظلوم اور حملہ زدہ اقوام ایک مشترکہ دشمن ایک دشمن انسانیت و دشمن امن کے خلاف صف آرا ہو جائیں گی علمائے علم و ہنر اپنی اپنی ہنرمندی کو کام میں لائیں گے اور جابر کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کریں گے یا اسے سنجیدگی کا احساس کرائیں گے اور وہ خواہ جنگ کو روکنے پر مجبور ہوگا۔ حملہ آور طاقتوں کے اہل علم بھی متحد ہو کر مظلوم اقوام کے اہل علم کے مقابلہ پر صف آرا ہوں گے اور آئندہ جنگ میں علم و ہنر جس درجہ صف آرا ہوں گے وہ تلواروں کی روایتیں جنگ سے زیادہ ہولناک ہوں گی۔

جنگ شروع ہونے سے عین قبل ایک عالمگیر کانگرس ہوگی جس میں تمام دنیا کے علما اور دماغی کام کرنے والے جمع ہوں گے اور جنگ اگر چھڑ بھی گئی تو ہم سب اپنے اپنے حلقوں اور طبقوں میں ایسا زبردست کام کریں گے کہ اہل سیف دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ ہم لوگ جنگ کو اگر روک نہیں سکیں گے تو اسے فوراً ختم ضرور کرا دینگے اگرچہ جمعیتہ الاقوام اس معاملہ میں ناکام ہو چکی ہے لیکن "پی۔ ای۔ این" کلب جو ایک عالمگیر ادارہ اہل علم کی ہمگیر جماعت ہے ضرور برسرِعمل آئے گی اور دنیا کو دکھا دیگی کہ سیف کے مقابلہ پر قلم کس طرح فتح یاب ثابت ہوتی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر ایمل لڈوگ کا یہ ولولہ انگیز اعلان تمام دنیا کے اہل علم اور علمائے انسانیت کے لیے ہمت افزا ہے اور یہ خیال کہ سیف کے مقابلہ پر قلم کو لایا جائے اور دنیا کے امن کو اس طرح بچایا جائے ایک نادر خیال ہے لیکن جہاں تک علم کی بے بسی اور آلات حرب کی ترقی و تیزی کا تعلق ہے وہ سب کو معلوم ہے لیکن مسٹر ایمل لڈوگ نے جس چیز کی طرف توجہ مبذول کی ہے وہ رائے عامہ ہی اور ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ رائے عامہ اور خاص کر ہر ملک کے سمجھدار رائے دہندگان اور ٹیکس دہندگان کی رائے قوی الاثر ہوتی جا رہی ہے اور اگر جنگ کو روکنے کے لئے مصنفین اور علمائے انسانیت مل کر رائے عامہ کو ہموار کریں اور جنگ کے ناگزیر طور پر شروع ہو جانے کی حالت میں اسے فوراً ختم کرنے کیلئے قلم کا جوابی حملہ کیا گیا تو یقین ہے کہ قلم کی طاقت ہولناک آلات حرب اور زہریلی گیسوں اور توپوں کی ہولناکی کو یک جنبش مغلوب کر دے گی اور انسانیت کی حفاظت اور امن کی حفاظت اور علم و فن کی حفاظت کا انتظام ایسا ہو جائے گا جیسا اس وقت تک تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ زندہ باد اہل قلم! زندہ باد اہل علم!! زندہ باد اہل ہنر!! زندہ باد امن عالم!

ظفر قریشی بی اے دہلوی

اے دلِ افسردہ!

اے دلِ افسردہ پینے کی بہاریں آگئیں
کالی کالی بدلیاں پھر آسماں پر چھا گئیں
دامنِ کہسار سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی
نبضِ خس میں زندگی کا خون دوڑانے لگی
موتیے کے پھول گلزاروں میں لہرانے لگے
لالۂ و نسریں کے جلوے رنگ پہ آنے لگے

~~~

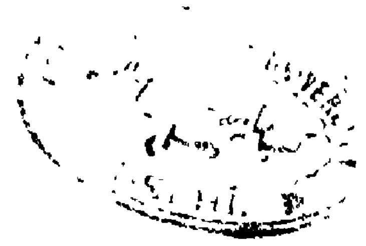
ہے کنارِ آب دریا ماہ پاروں کا ہجوم
جس طرح شاداب راتوں میں ستاروں کا ہجوم
کالے کالے آنچلوں میں اُن کے چہرے نور پاش
گہرے گہرے بادلوں میں بجلیوں کا ارتعاش
گلبدن، گل پیرہن، مہتاب رخ، ناز آفریں
دل ربائی کی اداکاری میں اعجاز آفریں
صحنِ گلشن میں اداؤں سے قدم دھرتے ہوئے
صحنِ گلشن کو حریفِ تختِ جم کرتے ہوئے
کچھ لگاوٹ، کچھ حیا، کچھ شوخیوں کا اضطراب
اپنے سائے سے گریزاں اپنے سائے سے حجاب

دلبری کے سب طریقے سادگی کے رنگ میں
سادگی کے سب طریقے دلبری کے رنگ میں

اے دلِ افسردہ اے کم بخت اے حسرت نصیب
اے فریبِ حسن کے پامال! اے فرقت نصیب
تو ہے اور اس بے وفا کی بے وفائی کے گلے!
بے وفائی کے گلے! دردِ جدائی کے گلے
ہر طرف اک عالمِ کیف و طرب چھایا ہوا
اور تو اے بدنصیب شوق! مرجھایا ہوا
کیسے کیسے مہ جبیں ہیں نور ریز برق تاب
دلنوازی کے لئے بے تاب ہے جن کا شباب
ان حسینوں کے اشاراتِ محبت دلفروز
جن کے جلوے دلربا ہیں جن کی طلعت دلفروز

دلبری کے کیسے کیسے نکتہ داں موجود ہیں
سجدہ کرنا ہو تو کتنے آستاں موجود ہیں

عابد لاہوری
~~~



خودمختار دوشیزہ

انگلستان کی ایک جھلک

"یہ کیا ہے!" میں نے دوسرا گلاس ختم کرتے ہوئے پوچھا۔ بولتی نہیں۔ "یہ کیا ہے!....."

اس کے سرخ ہونٹ وہکنے لگے سارا چہرہ شرارت کے نور سے تلملا اٹھا صاف وشفاف چہرے پر سُرخی جھلکنے لگی۔ چہرہ مسرت آمیز جذبات کا آئینہ تھا اس نے اپنے سرخی مائل سنہری بالوں کی خوبصورت اور پیچ در پیچ لٹ کو کان کے پاس کرتے ہوئے ساحرانہ انداز سے کہا۔ مسکراہٹ کو روکتے ہوئے آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے اپنا سر میرے بالکل ہی قریب لاتے ہوئے۔ سر سے گویا ملاتے ہوئے۔ رازدارانہ۔ ساحرانہ۔ مکارانہ لہجہ میں، کپکپاتی ہوئی آواز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔ خالی گلاس کو ایک انداز سے میری آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے:۔

"یہ نہیں..... پیارے احمق..... یہ نہیں بلکہ تھا" گلاس الٹا کرکے رکھ دیا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ گلاس خالی تھا۔ اس میں اس وقت کچھ بھی نہ تھا میں نے کہا:۔

"کیا تھا؟....."

"جیز کا نغمہ! خدا کی پناہ قلب اور خون کو حرکت دینے والا۔ بیٹھے بٹھائے اس کی نیچی تلی گت پر رگ رگ پھڑکتی ہے۔ ہم بال روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے پری وشوں کا مجمع ہر ایک اپنے محبوب کے ساتھ حرکت میں تھا۔ پوئٹری آف موشن[1] (Poetry of Motion) جس کو ہمارے یہاں ناچ یا رقص کی ذلیل اصطلاح سے یاد کرتے ہیں! انہیں جانتے کہ جس وقت حرکات وسکنات نظامِ شعری کے ماتحت فنِ عروض وقوافی کی پابندی کے ساتھ راگنی کا ساتھ دیتے ہیں تو نتیجہ کس قدر شیریں اور ہوشربا ہوتا ہے!

میرے سوال کا جواب اس نے یہ دیا کہ حیرت کے دل ربا ترنم کے ساتھ ساتھ وہ گانے لگی۔ اس قدر آہستہ کہ سوائے ایک ہلکے ترنم کے میں بھی کچھ نہ سن سکا۔ ایک ہلکی سی جھنجھناہٹ تھی۔ مسکراہٹ سے چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں غضب کی چمک۔ راگنی اور شراب! میں کوئی بچہ نہ تھا۔ یہ کم بخت ایک قسم کی ہلکی شراب تھی۔ جس کا دوسرا گلاس میں ختم کر چکا تھا میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ یہ شراب ہے۔ مگر نہیں غلط۔ شراب خود کہہ دیتی ہے کہ میں شراب ہوں۔ پہلے گلاس تک تو مجھے کہنے کو شبہ تھا۔ دوسرے گلاس پر یقین مگر تجاہل عارفانہ سے کام لینا پڑا؟ وہ جانتی تھی کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی اور نہ کبھی پیوں گا۔

* * * * * *

بہت جلد بال روم کا سین ایک رنگین ومتزلزل خواب معلوم ہونے لگا۔ میرے حسین ہمدم کی خوبصورت تصویر آنکھوں کے ذریعہ دل میں گھستی معلوم دی۔ میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا۔ وہ میرے سر سے سر جوڑے گویا میری آنکھوں میں غوطہ کھائے بیٹھی تھی۔ عطر سے مہک رہی تھی۔ اس کی گرم گرم سانس میرے لئے کیا تھی! عجیب دلکش سماں تھا۔ سارا بال روم حسن اور نغمہ کے زور سے پھڑک رہا تھا۔ چشم زدن میں نغموں کی شیریں فضا میں بال روم عیدگاہ معلوم طور کا سامان آرایش اور جھاڑ وفانوس جھوم رہا تھا۔ پیانو سے نغمہ کی دلدوز برچھیاں نکلنے لگیں۔ ساز کے پردوں سے آتشین لپٹ نکلتی معلوم دی۔ میں نے اپنے دل نشین دوست کو دیکھا۔ اس کی خوبصورت اور نشیلی آنکھوں میں سرور تھا اور میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ جونہی......

[1] رقص کا خاص بامعنیٰ یا "منظم الحرکات" یا بالفاظ دیگر حرکتیں جو مل کر نظم بنائیں۔

رعنائی!..... چہرہ پر اُس کے خفیف مسکراہٹ کی لرزش تھی اور نوجوان سینۂ نغمہ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ دب دب کر اُبھر رہا تھا

"آہ!" میں نے کہا "پیارے دوست، تم کس قدر دلچسپ ہو"

اُس نے مسکرا کر کہا۔ "واقعی!"

میں نے کہا "میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ گویا وہ مجھے جھپٹ سے گئی ایک دم سے۔ میری کمر میں ہاتھ ڈالا "جز" کی گت پر از خود ہم دونوں گویا ایک دوسرے کے آغوش میں.... آہا آہا!... رزرکتے ہوئے! تملاتے! اچھلتے ہوئے گنگناتے چلے، گٹار کے نغمے..... بنجو کے تاروں پہ..... لرزش سے جھنجھناتے چلے..... تھرکتے ہوئے.... ساز کی خاشی میں سمٹتے ہوئے!... بین کی دھونکنی سے اُبھرتے..... جھنا جھن پہ بنجہ جھکتے..... "زفارف" پر سر کو نچتے ہوئے.... کشاکش میں کاندھے رگڑتے ہوئے..... کپڑوں کی جھم جھم!.... جھروں کی چم چم!...... دمکتے ہوئے ... چکتے ہوئے.... نور کی چتونوں سے جھپکتے چلے!... متحرک!... متزلزل.. لرزاں! رقصاں! افتاں! خیزاں! ساز کے ساتھ گٹکریاں کھاتے۔ گرہ لگاتے۔ زندہ دلوں کے متزلزل و متلاطم سمندر کے ہوشربا زیر و بم میں گم ہو گئے..... اللہ رے بے خودی! الاماں! خدا محفوظ رکھے! خون میں حرکت! جی میں حرکت! دل میں حرکت! دماغ میں حرکت۔ خیال میں حرکت! خود مجسم حرکت۔ رقص نہیں بلکہ حرکت کا خون تھا جسے "جز" کا قوی اور مضبوط دلِ نغمہ کی طاقتور رشہ رگ کے ذریعہ ہر دھڑکن کے ساتھ پھینک رہا تھا جو موجیں سی مارتا ہر شخص کو حرکت دیتا تھا۔ اسی دھڑکن سے ایک جنبش پیہم تھی! جنبش نغمہ! حرکت! رقص! رقص! سارا ہال، دم مست ہو کے جھوم رہا تھا! اور یہ حرکت کس قدر پُر کیف کس قدر شیریں کس قدر دلربا اور دلکش تھی!..... کیا کہنا ہے! مشرق میں اُلّو بولتا ہے۔ مغرب میں کیا ہے! ہندیوں سے یعنی ہم سے پوچھئے نہیں بلکہ کسی مولوی سے سہی کہ سجدہ کدھر منہ کر کے کریں..... مغرب!

(۲)

انگلستان کی جما دینے والی سردی تھی۔ غلیظ کہرا اور رابہ۔ کوئی بھلا مانس باہر نہیں نکل سکتا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں آتشدان کے سامنے بیٹھا صاحب خانہ کی دلچسپ لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں۔

معلوم ہوا کہ کوئی صاحب باہر مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ اندر نہیں آتے۔ بس کھڑے کھڑے مل لیں گے۔ میں نے کہا کون ہے تو معلوم ہوا۔ "کوئی بڈھا خبطی" میری زبان سے نکلا۔ بڈھا تھا اور میں اُٹھا۔

کوئی ساٹھ برس یا چھپنسٹھ کی عمر ہوگی کھتئی رنگ کا سوٹ پہنے۔ ایک طوفان زدہ نائٹ کیپ۔ چہرہ سرخ مگر ناک اور بھی سرخ۔ انگارہ۔ مونچھیں سفید مگر پائپ کے تمباکو کے دھوئیں نے بھورا کر دیا تھا۔ پتلون ٹانگوں سے معہ مبالغہ ڈیڑھ گز بڑا جس کی وجہ سے معلوم ہو کہ اس شخص کی ہر ٹانگ میں کئی گھٹنے ہیں، نہ سہی یہ تو کم از کم گھٹنے کا محل وقوع تو معلوم کرنے میں قطعی دشواری ہو۔ آنکھیں نیلی۔ چہرہ باوجود بڑھاپے کے خوبصورت ناک و نقشہ ہی پاکیزہ کشیدہ قامت۔ چہرہ بتا دے کہ گٹھیا کا مریض۔

نہایت ہی رُکھائی سے بات چیت ہوئی بڈھے میاں نے میرے نام کی مجھ سے تصدیق چاہی اور میں نے اثبات میں جواب دیا تو ذرا چہرہ کو سنجیدہ بنا کر انھوں نے انتہائی انگریزی سادگی سے کہا۔ جو کچھ کہا میں اس کا ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں ورنہ اصل لطف تو انگریزی ہی میں ممکن تھا۔ خیر وہ بولے:۔

"لُک ہیر بوائے[1] تمہاری لڑکی (محبوبہ) کون ہے؟ کیا میں اس کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟"

میں حقیقت کی تہہ کو پہنچ گیا۔ میں نے کہا۔ "جنابِ من۔ معاف کیجیے گا میری کوئی محبوبہ نہیں، ہاں میری دوست ملنے والیاں کئی خوبصورت لڑکیاں ہیں۔"

"اُن میں کوئی خاص بھی ہے!"

میں نے مکاری سے کہا "سب خاص ہیں۔"

"اولڈ بوائے" بڑے میاں جھلا کر بولے۔ "میں بھی کبھی تمہاری طرح نوجوان تھا اور..... اور... مکار بھی۔ تمہاری ملنے والیوں میں کوئی سب سے زیادہ خوبصورت بھی ہوگی!"

میں نے عیاری سے کہا "کوئی کسی کو خوبصورت خیال کرتا ہے اور کوئی کسی کو یہ تو اپنی اپنی نظر ہے"

بڑے میاں جھلا کر بولے:۔

"میں اوپر اُدھر جھاڑیاں خالی نہیں جھاڑتا۔ سن لو کان کھول کر۔ میں ایلی کا باپ ہوں........!"

بات کاٹ کر میں نے تصنع سے کہا۔ "اوہو! آپ میری پیاری دوست کے باپ مسٹر ایلیٹ ہیں۔ میں بیحد خوش ہوا جناب کی خدمت میں

[1] اے نوجوان ادھر دیکھو یعنی مخاطب کرنے کا محاورہ ۱۲

نیاز۔

بڑے میاں خفا ہو کر بولے "تم... تم اس کے ساتھ ساتھ گھومتے ہو۔ بہت گھومتے ہو۔ راتوں میں.... رات گئے تک" "معاف کیجے گا۔ معاف کیجے گا" میں نے کہا "جی۔ جی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ گھومتی ہیں۔ یہی مطلب ہے جناب کا نا!..."

"تم اُسے جگہ جگہ لے جاتے ہو"

میں نے کہا "غالباً وہ مجھے جگہ جگہ لی جاتی ہیں۔ میں انہیں نہیں لے جاتا۔ یہ آپ نے کیسے فرمایا! میں ان کے ساتھ پھرتا ہوں یا وہ! وہ مجھے لے جاتی ہیں یا نہیں؟"

بڑے میاں بولے "خیر بات ایک ہی ہے تو مطلب میرا یہ ہے کہ میں یہ ہرگز نہیں پسند کرتا کہ میری لڑکی بغیر میری اجازت کے اجنبی لڑکوں کے ساتھ اس آزادی سے رات گئے تک گھومتی رہے میں نہیں چاہتا کہ وہ تم سے ملے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اُسے جگہ جگہ لئے پھرو ابھی مجھے کل ہی معلوم ہوا کہ ایک رقص کے جلسہ میں وہ ضرورت سے زیادہ آزادی کے ساتھ تمہارے گلے میں باہیں ڈالے کھڑی تھی..... یہ ناقابل برداشت ہے"

میں نے کہا "جناب من میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ آپ اگر اپنی صاحبزادی کو روکنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ خود انہی سے کہئے۔ غالباً آپ کا حق ان پر زائد ہے۔ وہ آپ کے احکام کی پابند ہوں معاف کیجے میرے اوپر آپ کی حکم برداری لازمی نہیں۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ وہ مجھ سے نہ ملیں اور اپنے ساتھ مجھے جگہ جگہ نہ لئے پھریں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ تجربہ کار ہو کے مجھے دبانا چاہتے ہیں خود آپ کی لڑکی جب نہیں مانتی تو میں کیوں کر آپ کے احکام کی تعمیل پر مجبور کیا جا سکتا ہوں؟"

بڑے میاں جل کر بولے "مگر تم اس کے ساتھ یہ حرکتیں جاری نہیں رکھ سکتے۔ تم میری بھولی بھالی لڑکی کو آوارہ کر دوگے"

میں نے جل کر کہا "قبلہ من میں کالا ہوں کہ وہ؟ میں خوبصورت ہوں کہ وہ؟ میں ان کو بگاڑ سکتا ہوں یا وہ مجھے! مجھے وہ احمق بنا سکتی ہیں یا میں ان کو! میں بھولا اور معصوم ہوں یا وہ؟ میں قابل الزام ہوں یا وہ؟..... دیکھیے اور انصاف کیجیے.....!"

یہ کہہ کر میں نے اپنے چچا صاحب قبلہ کا خط ان بڑے میاں کے ہاتھ میں دیا۔ شفیق چچا جن کی صاحب زادی کے دست خوبصورت پر مجھ کو ابھی ایمان لانا باقی تھا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ اس میں کیا لکھا ہوگا! اپنے ہونے والے داماد کو ایک شخص کیا لکھ سکتا ہے جبکہ داماد ولایت میں ہو اگر ان انگریز بڑے میاں کی حسین و دلربا صاحب زادی بھولی بھالی اور معصوم نہیں تو یہ خاکسار اپنے شفیق چچا کی نظروں میں معصوم تر تھا۔ چچا صاحب قبلہ کو بے حد اندیشہ تھا کہ کہیں یہ نازنینان فرنگ مجھ بھولے بھالے اور معصوم نوجوان کو آوارہ نہ بنا دیں۔ ان کی چالاکیاں عیاریاں سحر یب کاریاں ایسی ہیں کہ میرا بچنا دشوار ہے جس طرح یہ بڑے میاں نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کی بھولی بھالی لڑکی کو لئے پھروں اسی طرح قبلہ چچا صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بھتیجے یعنی خاکسار کو ایسی سی کوئی ولایتی لڑکی لئے پھرے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مغربی تیتریاں مجھے آوارہ کر دیں گی لہذا مجھے ان سے بچنا چاہئے۔

اس بڈھے انگریز نے سب کا سب خط غور سے پڑھا۔ پائپ منہ سے نکال کر کرسی پر پیر رکھتے ہوئے بولا "آہم.... م.... م..."

بھویں چڑھا ئیں۔ "مجھ سے پوچھا۔ یہ کون ہیں؟

میں نے جواب دیا۔ یہ میرے چچا ہیں!"

"تو کیا یہ سب یورپین لڑکیوں کو ایسا ہی سمجھتے ہیں!"

"میں کیا جانوں" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مگر کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ایلی سے اب نہ ملو۔ اب تو اور بھی نہ ملو"

"..... بالفاظ دیگر وہ مجھ سے نہ ملیں!... جی ہاں ٹھیک ہے بہتر ہے کہ وہ مجھ سے اب تو اور بھی نہ ملیں۔ تو آپ ان کو تاکید کر دیں کہ وہ مجھ سے نہ ملیں اور نہ مجھے جگہ بہ جگہ لئے پھریں ورنہ آپ کا خیال ہے..... بالفرض میرے چچا آپ کی پیاری صاحبزادی کو لکھیں!... رہ گیا میں۔ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ میری عزیز ترین دوست ہیں میرا ان کا یہ رشتہ نہیں کہ میں اُن سے کہوں کہ..... ."

بات کاٹ کر وہ بولے:۔

"تم ہندوستانی لوگ.....!"

میں خاموش رہا۔

وہ بولے "ہم لوگ ہندوستانیوں کو قطعی پسند نہیں کرتے"

میں نے کہا "اجی قبلہ کب سے!..... بالکل!"

وہ بولے "ہم واقعی ہندوستانیوں کو پسند نہیں کرتے"

"اور ہندوستان کو؟"

"ہندوستان بھی ناپسند ہے۔"

"اور پھر ہماری چھاتی پر سوار ہو۔ جان چھوڑو ناہماری....."

بات کاٹ کر وہ بولے "کتنے ہندوستانی ہماری لڑکیوں سے میل رکھتے ہیں اور محبت کرتے ہیں اور پھر کتنے ان میں سے شادی کی نیت رکھتے ہیں اور پھر کتنے ان میں سے شادی کرتے ہیں۔ شاید دس فی صدی بھی ہماری لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے۔ ارادہ ہی شادی کا نہیں رکھتے۔ پھر ایسی صورت میں ہماری لڑکیوں سے کیوں ملتے ہیں اور پھر وہ بھی کیسے؟ جیسے تم میری ایلی سے ملتے ہو۔ سخت قابل اعتراض ... قابل نفرت .... ناقابل برداشت ...... کان کھول کر سن لو۔ یہ صورت حال جاری نہ رہنا چاہئے۔ میں سب سن چکا۔ بہتر ہے کہ آئندہ تم ایلی کے ساتھ نہ نظر پڑو...."

"...... بالفاظ دیگر وہ میرے ساتھ نظر نہ پڑیں تبلطی...

ٹھیک.... اس کا مناسب انتظام فرمائیں۔

"مائی لیڈ....." برہم ہوکر بڈھے نے کہا "تم جوان ہو۔ در میں بوڑھا ہوں ورنہ ابھی تم کو معلوم ہو جاتا کہ راستی کیا ہوتی ہے۔ تم جذبات کا خیال نہیں کرتے۔ ایک بھولی بھالی لڑکی کو خراب کرنے کے درپے ہو......"

میں نے برامان کر کہا "غالباً اس قسم کے الفاظ میں سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ قابل احترام بزرگ۔ آپ بچہ نہیں ہیں۔ نہ آپ کی بچی بچہ ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے پڑھی لکھی ہے آزاد ہے۔ خود مختار ہے۔ اپنا برا بھلا خود بہتر جانتی ہے۔ آپ نے اس کو سمجھایا؟ اچھا کیا نہیں مانتی؟ وہ خود جانے۔ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کی صاحب زادی صاحبہ ماشاء اللہ نہ صرف نوجوان اور خوبصورت ہیں بلکہ نہایت ہی سمجھدار ہوشیار، عقلمند اور صائب الرائے ہیں۔ احمق نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں تو نہ میرے بس کی بات نہ آپ کے۔ یہ بھی آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرے اوپر آپ کا زور نہیں چل سکتا۔ میں اپنے فعل کا خود مختار ہوں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ مجھ سے ایسی باتیں کریں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ براہ کرم جائیے اور معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔"

بڑے میاں کی حالت یہ سن کر غیر ہو گئی۔ بے بسی نے غصہ کو دبانے پر مجبور کیا۔ ہونٹ چبا کر رہ گئے۔ تاؤ کھا کر رہ گئے۔ گھٹ کر رہ گئے۔ کہنے لگے "والڈ[1] آئے گا تب وہ تم سے ہندوستانی طریقہ پر معاملہ فہمی کرے گا کیا جب بھی تم راہ راست پر نہیں آؤ گے؟"

میں نے کہا "خوش آمدید، خوش آمدید مسٹر والڈ کو، میں ہمیشہ معاملہ فہمی کے لیئے تیار ہوں۔"

"غالباً تم اس تکلیف دہی کا خیال نہ کرو گے۔"

"اوہ!" میں نے معذرت کو قبول کرتے ہوئے کہا۔ "ہرگز نہیں ہرگز نہیں....."

"خدا حافظ....."

"خدا حافظ....."

مجھے غالباً اس انگریز بڈھے سے ہمدردی تھی۔ ایک گونہ تکلف کے ساتھ اپنی کرخت اور "رگھٹیا دی" ٹانگوں سے وسکی کے نشہ میں پینگ سے لیتا ہوا چلا جا رہا تھا دھواں چھوڑتا۔ پائپ گڑیڑاتا ہوا میں اس کو دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ سڑک پر کہرے کے دھند میں غائب ہو گیا۔

(۳)

اس واقعہ کے کوئی دو ہفتہ بعد کا ذکر ہے کہ ایلی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میں پارک کی طرف جا رہا تھا۔ ایک دم سے ہمارا راستہ ایک تنومند نوجوان نے سامنے سے روک لیا ایلی ایک دم سے ذرا پیچھے ہو گئی۔ یہ شخص نہایت ہی وجیہ۔ متناسب الاعضاء، دھاریدار وضعدار سوٹ پہنے ذرہ ترچھی ٹوپی لگائے۔ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کی طرف انگلی اٹھا کر مجھ سے بولا:-

تم جانتے ہو یہ تمہاری ساتھی لڑکی کون ہے؟..... تم جانتے ہو کہ یہ تمہارے ساتھ کون احمق لڑکی ہے!..... درک کر "میری بہن ہے"

میں نے کہا۔ "تو پھر میں کیا کروں!"

میں کیا کروں! .... کیا میں بتاؤں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے!

"بہتر ہے" میں نے کہا "گو میں خود جانتا ہوں" میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا "مگر ہاں آپ بتائیں اور ضرور بتائیں!"

"تم اس وقت اسے کہاں لیئے جاتے ہو؟" وہ چیخ کر بولے۔

میں نے کہا "بالفاظ دیگر یہ مجھے اس وقت لے جا رہی ہیں!... شاید یہ خود بتا سکیں۔"

"یہ فرض آپ کا ہے نہ کہ اس احمق لڑکی کا۔" وہ ذرا زور دے کر بولے

میں نے کہا۔ "جناب من! مجھے اپنے تمام فرائض کا نہ صرف علم بلکہ احساس بھی ہے۔ اور غالباً ان فرائض کی سبکدوشی کے بارگراں سے آپ کے

[1] میرے نوجوان!

ہندوؤں کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔۔۔ مطلب یہ کہ ہونا چاہیئے تھا ویسے آپ کی مرضی۔ مگر فی الحال ہم دونوں اس موقعہ پر کوئی عمل "بد مزگی" کے خوشگوار امکان پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"مگر آپ پر واضح ہو جانا چاہیئے کہ یہ بے وقوف لڑکی میری چھوٹی بہن ہے۔"

میں نے کہا "واضح ہو گیا۔"

"اچھا تو پھر میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اسے روز کیوں لیے پھرتے ہو۔"

"پھر وہی!" میں نے کہا "بالفاظ دیگر یہ مجھے روز کہاں لیے پھرتی ہیں! شاید کہ یہ خود بتا سکیں۔"

وہ بولے "اچھا یوں ہی سہی تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے ہندوستانیوں سے نفرت ہے۔" (منہ بگاڑ کر)

میں نے کہا "میں دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آیندہ آپ قابل نفرت ہندوستانیوں سے بات بھی نہ کریں بلکہ اسی دم اس پر عمل درآمد کریں۔ کیا آپ ایسا نہ کریں گے!"

وہ تیز ہو کر بولے "لک ہیر! ادھر دیکھو! میں اس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں ہوں بس خیریت اسی میں ہے۔۔۔۔۔۔ یہ راستہ ہے۔" واپسی کا راستہ انگلی اٹھا کر! سیدھے تیر کی طرح بھاگ جاؤ۔۔۔۔۔۔ کوئیک ۔۔۔۔۔۔"

اس کی غصہ سے آنکھیں لال ہو گئیں۔ نوجوان انگریز سخت غضبناک تھا مگر خوش قسمتی سے انگریز جتنا مضبوط اور توانا ہوتا ہے اسی مناسبت سے بیوقوف بھی ہوتا رہتا ہے۔ یہ انگریز بھی تھے اور مضبوط بھی۔ پھر میں بھی مٹی کا بنا ہوا نہیں تھا۔ مگر حق اس کی طرف تھا۔ میں حتی الوسع دبنا ہی چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے یہ بدتمیزی ان کی برداشت کی اور کہا۔

"مائی لارڈ۔ آپ کا زور بیان سر آنکھوں پر۔ مگر کیا میں عرض نہیں کر سکتا کہ ان الفاظ کو آپ واپس لیں۔ بجائے مجھے حکم دینے کے بہتر ہے کہ آپ اپنی دلچسپ اور شیریں بہن کو حکم دیں کہ وہ آپ کے ساتھ چلی جائیں یہ سیدھا راستہ ہے ۔۔۔۔۔"

(میں نے انگلی اٹھا کر کہا) "میں یہیں کھڑا رہنا۔ تنہا کھڑا رہنا زیادہ پسند کروں گا۔ آپ جائیں دونوں بھائی بہن "کوئیک مارچ"۔۔۔۔"

یہ بات ان کے انگریزی دماغ میں آ گئی اور زور سے بہن سے بولے۔

"کم آن ایلی!"

بہن صاحبہ خاموش رہیں۔ مگر ایک قدم اور پرے ہٹ گئیں۔

DONT BESILLY!

"ڈونٹ بی سلی۔۔۔" (احمق پن نہ کرو) وہ بولے۔

بہن بولی "کانٹ یو لک ٹو یور اون افیرس" (کیا تم خود اپنے معاملات میں مشغول ہونا پسند نہ کرو گے" (بہ نسبت اس کے کہ میرے معاملات میں دخل دو)

تن کر بولے "اب زیادہ احمق نہ ہو۔۔۔۔۔ شیمپین پی پی کر مدہوش ہو کر حبشیوں کے ساتھ ناچنا قطعی قابل اعتراض ہے۔"

برہم ہو کر بہن بولی۔ ذرا چیخ کر "کانٹ یو لک ٹو یور ان تھنگس۔ بیٹ فر لون" (مجھے چھوڑ دو اور اپنے معاملات دیکھو)

بہن سے شکست کھا کر اب بھائی صاحب بہادر میری طرف پھر متوجہ ہوئے۔ بولے۔ "غالباً اب تم کچھ ٹھوس اور مادی چیز پسند کرو گے" اپنی مٹھی کا گھونسا بناتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔

میں نے کہا "ضرور۔ مادی بھی اور غیر فانی بھی" اتنا کہہ کر میں اڑنگا لگانے کے امکان کی طرف متوجہ ہوا۔ انگریز جب اپنے سے قدرے مضبوط مل جائے تو چاہیے کہ "گھونسا بچاؤ اور اڑنگا لگاؤ" والے اصول پر عمل کرو۔ فتح ہو گی۔ اگر تم نے گھونسا بچا لیا۔ تو جس طرف بھی اڑنگا لگا دو گے۔ شراب کے نشہ میں اسی طرف لوٹ جائے گا۔ کم از کم ایک دفعہ تو ضرور ہی گر جائیگا مگر سب سے لئے ایک اور مصیبت تھی۔ میں ایلی کے سامنے اس کے بھائی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر پٹنا تو اور بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اور بھی خراب ہوتا۔

غضبناک انگریز نے کچکچا کر گھونسا مارا۔ ایک۔ دو۔ تین پہلا خالی گیا۔ دوسرا میرے کندھے پر اوچھا سا لگا۔ تیسرا اس کی بہن نے پکڑ لیا۔ مگر وہ بھائی سے لپٹ پڑی۔ میری اور اپنے بھائی کے بیچ میں آ گئی۔ اس کے بھائی کا قابل اعتراض رویہ دراصل ایک انگریز دوشیزہ کی غیور طبیعت کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ خود غور فرمائیے۔ کیا ان کے نوجوان ملنے والوں کا یہی حشر ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہی ہے۔ تو پھر انگلش سوسائٹی کا نظام ہی برہم ہو جائے گا۔ ہر عاشق شادی سے قبل دوران کورٹ شپ ہی پٹ جائے! یہ پروگرام تو سخت "ان انگلش" ہوا۔ اس نے بگڑ کر بھائی سے کہا:۔

"والٹر۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ بس۔ خبردار جو میرے معاملات میں دخل دیا۔"

"مت بکو تم" بھائی نے پیر پٹخ کر کہا "۔۔۔۔ یہ کالا حبشی۔۔"

"پھر تم کون؟" بہن چمک کر بولی "کیوں۔ کیا تم ایمانداری سے کہہ سکتے ہو کہ تم سے تمہاری "پگڑی" گرمتول نجو بہ کے باپ نے کتنی دفعہ تاکید سے کہا ہے کہ اُس کی لڑکی سے نہ ملو۔"

"تو پھر؟" والٹر نے کہا۔

"کیا تم نے اُس ہونے والی صفت ہونے والے خسر سے یہی نہیں کہہ دیا۔ کہ منع کرلو اپنی لڑکی کو۔ اور کیا وہ مان گئی؟ کیا وہ اب تم سے نہیں ملتی۔ کیا وہ تمہاری زوجہ نہیں بنے گی؟ کیا تمہارا ہونے والا خسر تم سے نہیں ہار گیا؟"

والٹر نے کہا "تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب میرا یہ ہے کہ تم جاؤ یہاں سے۔"

"والٹر نے کہا "تمہارے اس سیاہ فام دوست (یعنی خاکسار) کا سر پھاڑنے سے قبل؟"

میں نے احتجاج بلند کیا "تم اپنے بھائی کو منع کرو" باوجودیکہ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز الفاظ سننے کے لئے میں تیار تھا۔ لیکن میں نے ایملی سے کہا "میں اب برداشت نہیں کرسکتا۔"

والٹر نے کہا۔ میری طرف حقارت آمیز نظر ڈالتے ہوئے "میں اپنی بہن کو ایک سیاہ فام انسان کے ساتھ معاشقہ کرتے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ میرے لئے تو یہ ناقابلِ برداشت ہے۔"

تیز ہوکر ایملی بولی "والٹر تم اپنی زبان کو روکو۔ میں ہرگز کسی سے معاشقہ نہیں کرتی۔ اور کروں تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں تمہاری طرح ریاکار نہیں ہوں۔ میں معاشقہ کروں گی۔ تم مجھے کس کا ڈر ہے۔ بہتر ہے۔ تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میرا کوئی عزیز دوست لازمی نہیں کہ میرا عاشق بھی ہو۔ اور اگر بالفرض ہو بھی تو تم ہمارے درمیان نہ پڑو۔"

والٹر نے کہا "تمہارا کالا جنگلی دوست۔۔۔۔"

میں تڑپ کر تیزی سے آگے بڑھا۔ گویا حملہ کروں گا۔ مگر ایملی نے مجھے روک لیا۔ اُس نے جھلا کر بھائی سے کہا "تمہاری عقل میں کچھ فتور ہے۔ والٹر تم اپنی وہسکی میں پانی زیادہ ملا کر پیا کرو۔۔۔ بہتری اب اسی میں ہے کہ تم جاؤ اپنے راستہ۔ اگر نہیں! لو ہم خود جاتے ہیں۔۔۔۔۔"

ہم دونوں اس لڑاکے والٹر کو وہیں چھوڑ کر واپس چلے۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ کھڑا رہا۔ جیب میں ہاتھ ڈالے "وہسکی کی ترنگ میں کھڑا جھوم رہا تھا۔ ہمیں دونوں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا۔ مڑ مڑ کر ہم نے اُسے دیکھا۔ ہنسے اور ہنس ہنس کر اسے دیکھا۔ قہقہے لگائے۔ جب ذرا دور نکل گئے۔ تو ایک دفعہ پھر مڑ کر دیکھا۔ ایک دم سے ایملی رک گئی۔ اور اُس نے پکارا:۔

"والٹر۔ والٹر۔۔۔ صلح کرتے ہو۔ صلح۔ صلح۔۔۔۔ کرتے ہو؟"

سر ہلا کر والٹر نے کہا "نو۔۔۔ و۔۔۔ و" (انگلی کے جھٹکے سے اپنی بیزاری ظاہر کرتے ہوئے)

ایملی نے کہا "میں تمہاری منگیتر کے باپ کو کنجوس نہ کہوں گی۔۔۔۔۔۔"

والٹر نے کہا "نو۔۔۔۔ و۔۔۔ و۔"

"والٹر دوبارہ سوچو۔۔۔۔ صلح کرتے ہو۔۔۔"

والٹر نے پھر وہی جواب دیا "نو۔۔۔۔ و۔۔۔۔و۔۔۔ بھاگ جاؤ۔۔۔!"

ایملی نے کہا "میں پھر اُسے (والٹر کی منگیتر کو) سر جگہ چھپکلی کہوں گی۔۔۔۔"

والٹر نے گھبرا کر کہا "تم ہرگز ایسا نہیں کرسکتیں" (آگے بڑھ کر) تم اُسے کئی آدمیوں کے سامنے خوبصورت تسلیم کرچکی ہو۔ وعدہ کرچکی ہو کہ چھپکلی نہ کہو گی۔ اس کی شہادت موجود ہے۔"

"مگر میں اُسے چھپکلی ضرور کہوں گی۔"

والٹر آگے کو بڑھتے ہوئے "تمہاری اس ناشائستہ حرکت سے اُس کے نازک دل کو صدمہ پہنچنے کا سخت اندیشہ ہے۔ تم ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتیں۔ بھلا سوچو تو اس کا باپ کیا کہے گا دل میں!"

"مگر میں اُسے چھپکلی ضرور کہوں گی۔۔۔۔ اس کے باپ کو منحوس اور کنجوس کہوں گی۔"

والٹر اور آگے بڑھ چلے تھے۔ کہنے لگے "میری پیاری بہن تو ابھی ابھی صلح کرنے کو کہہ رہی تھی۔ یہ تجھے کیا ہوگیا؟"

"پیارے والٹر صلح کرتے ہو؟"

"ہم لڑے کب تھے؟" والٹر نے کہا۔

میری طرف اشارہ کرکے ایملی نے والٹر سے کہا۔

"پیارے بھائی کیا تم میرے دوست سے تعارف حاصل نہ کروگے؟"

اوہ! انگریزی کی سادہ لوحی یا شراب کے نشہ ان دونوں میں سے ایک پر ضرور قربان جائیے! یہ سوز والٹر مجھ سے سچ مچ صاف دل ہوکر مصافحہ کررہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا واقعی اس کا دل کینہ سے پاک تھا۔

"غالباً ہم بہترین دوست ہیں۔" چلتے ہوئے والٹر نے کہا۔

"اوہو!" میں نے کہا "قطعی۔ اس میں شک کی گنجائش کسی طرف سے نہیں۔"

ایملی نے بھائی سے کہا "غالباً ہم دونوں خودمختار اور سمجھ دار ہیں۔ اور اپنے معاملات کو خود بہتر سمجھتے ہیں۔"

والٹر نے اس کو تسلیم کیا۔ درحالیکہ وہ بہن کی شکایات آزادی سن کر محض تین دن کے لئے حرف گیری کی غرض سے خاص طور پر اپنے والد بزرگوار کی فرمائش پر آئے تھے۔

والٹر اپنی راہ چلا گیا اور ہم۔ ہم دونوں؟ نہ پوچھئے۔ جی میں آتا تھا کہ اس دلچسپ واقعہ کی نوعیت پر غور کریں۔ اور قلابازیاں کھائیں بسیدھے ہم دونوں ہوٹل میں پہنچے ناشتہ کیا ہلکا۔ اور پھر وہاں سے ایک جوئے گھر کے شائل کو بنظر استحسان دیکھتے ہوئے بال روم کے دروازہ تک تو اپنے پیروں پر رہے۔ اور پھر اندر داخل ہوتے ہی "جیز" کے نغموں کی حرکت کی وجہ سے سر کے بل!.... فقط

عظیم بیگ چغتائی

شعر

دیارِ غرب کی مٹی کچھ ایسی چکنی ہے

بڑے بڑوں کے قدم بھی پھسلتے جاتے ہیں

آج کی رات!

چاندنی رات ہے جوانی پر

دستِ گردوں میں ساغرِ مہتاب! نور بن بن کے چھن رہی ہے شراب

ساقیٔ آسماں پیالہ بدست میں شرابِ سرور سے سرمست

فکرِ دوزخ نہ ذکرِ جنت ہے میں ہوں اور تیری پیاری صورت ہے

رس بھرے ہونٹ مدبھری آنکھیں!

کون فردا پہ اعتبار کرے کون جنت کا انتظار کرے

جانے کب موت کا پیام آئے یہ مسرت بھی ہم سے چھن جائے

دامنِ عقل چاک ہونے دے آج یہ قصہ پاک ہونے دے

غم کو ناپا ئیدار کردیں ہم موت کو شرمسار کردیں ہم

لب سے لب یوں ملیں کہ کھو جائیں جذب اک دوسرے میں ہو جائیں

میں رہوں اور نہ تو رہے باقی!

کس قدر دلنشیں ہیں لب تیرے بادۂ احمریں ہیں لب تیرے

تیرے ہونٹوں کا رس نہیں ہے یہ آبِ کوثر ہے انگبیں ہے یہ

شہد کے گھونٹ پی رہا ہوں میں آج کی رات جی رہا ہوں میں

آج کی رات پھر نہ آئے گی!

حفیظ ہوشیارپوری

برہن کا گیت

اُڑجا دیس بدیس

رے طوطے اُڑ جا دیس بدیس

میں جاؤں تجھ پر بلہاری
برہ کی میرے لگی کٹاری
روٹھ گئے موسے گردھاری

چلے گئے پردیس
رے طوطے اڑ جا دیس بدیس

تارے گن گن رات بتاؤں
دن میں پل بھر چین نہ پاؤں
آنسو پیتی رہوں غم کھاؤں

لے جا یہ سندیس
رے طوطے اڑ جا دیس بدیس

مل جائیں تو اُن سے کہنا
دوبھر ہو گیا تم بن رہنا
تج دیا سارا گہنا وہنا

جوگن کا ہے بھیس
رے طوطے اڑ جا دیس بدیس

اندرجیت شرما

قوتِ ارادہ

(۱)

علم النفس میں ارادہ ایک مشکل اور پیچیدہ موضوع سمجھا جاتا ہے
زمانۂ قدیم سے فلاسفہ اس مسئلے میں مختلف الآرا رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ
انسان کو اپنی راہِ عمل تلاش کرنے کی قدرت حاصل ہے اور جب مخالف اصول
پیشِ نظر ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے یہ بھی دیکھا کہ
انسان صرف اپنی جبلی خواہشات و میلانات ہی کا غلام نہیں ہے بلکہ اس میں
یہ بھی صلاحیت موجود ہے کہ شدید ترین خواہشات پر قابو پا سکے اور یہ بھی امکان
ہے کہ تقاضائے فطرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے میلاناتِ طبعی کے مقابلے
میں مدافعانہ قوتوں کی پسپائی قبول کر لے۔ علما نے اس حقیقت کی تفسیر میں
اختلاف کیا ہے بعض لوگوں نے اسے عقل کی جانب منسوب کیا ہے کیونکہ
ان کے خیال میں شرافت علم و معرفت سے جداگانہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی
بعض اصحاب نے اس کا انتساب وجدان و ضمیر کے ساتھ کیا ہے اور
بعض اسے ایک خاص قوتِ نفسی کا مظہر خیال کرتے ہیں جس کا نام انہوں
نے "ارادہ" رکھا ہے ایک عجیب استبدادی قوت جو موقع پاتے ہی دو
متعارض نفسی قوتوں میں مداخلت کرتی ہے اور کسی ایک کے ساتھ شامل
ہو کر اس کا پلہ بھاری کر دیتی ہے۔

لیکن جدید علم النفس کی رو سے ان آرا میں اس حقیقت کی پوری
[illegible] موجود نہیں ہے جو ہمارا موضوعِ بحث ہے۔ بطور مثال ایک واقعہ پر
غور فرمائیے کسی ہفتہ وار اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ بمبئی میں ایک پارسی
خاتون کا نقدی کا بٹوا جیب سے گر گیا۔ خاتون پولیس میں اطلاع دینے گئی
وہاں اس نے اپنا بٹوا موجود پایا۔ تھانیدار نے بتایا کہ بٹوا ایک غریب مزدور
لڑکا دے گیا ہے جو قریب کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس نے یہ
بھی بتایا کہ لڑکے کا باپ آج کل بیکار ہے۔ اس کے باوجود لڑکے نے بٹوا
تھانے تک پہنچا دیا اور بٹوے کی نقدی کے مقابلے میں شرافت و امانت کو
زیادہ عزیز سمجھا اس بچے کی طبیعت میں یقیناً دو مختلف رجحانات کی جنگ برپا
ہوئی ہوگی۔ ایک روپیہ ہوگا اور اس کے ساتھ محتاج والدین کی قابلِ رحم حالت
لذاتِ زندگی کے حصول، ہم جنسوں کے سامنے اظہارِ تفاخر کا موقع حاصل ہونے
اور پھر کسی بازپرس کا اندیشہ بھی نہ ہونے کا تصور ہوگا! اور دوسری طرف دیانت
کی مخفی طاقت اُسے مجبور کر رہی ہوگی کہ ان تمام چیزوں سے قطع نظر کر کے
بٹوا پولیس کے حوالے کر دے تاکہ وہ اس کے مالک کو واپس کیا جا سکے۔
سوال یہ ہے کہ امانت داری فریبِ نفس پر کس طرح غالب آئی! کیا اس لیے
کہ یہ جذبہ فی نفسہٖ دوسرے تمام جذبات سے قوی تر ہے؟ ہرگز نہیں!
اس لیے ضروری ہے کہ کوئی دوسری قوت اس کے ساتھ شامل ہو گئی ہو
جس نے اسے غالب بنا دیا ہو۔ یہ "دوسری قوت" کیا ہے؟

اگر کہا جائے کہ قوتِ عقل ہے تو ہمیں بہت سے ایسے مجرم
ملیں گے جو جرم کرتے وقت اپنے جرم کی نوعیت اور ناجوازی سے پوری
طرح واقف تھے! اگر کہا جائے کہ وہ قوت ارادہ تھی تو پھر سوال پیدا
ہوتا ہے کہ "قوتِ ارادہ" کیا چیز ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ کیونکر پیدا
ہوتی ہے؟ کسی ایک جذبہ سے اشتراکِ عمل کر کے اسے دوسرے جذبات
پر کس طرح فوقیت دے دیتی ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات جن پر سطورِ آئندہ
میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس تفصیل کا جو آئندہ کی جائے
گی اجمال یہ ہے کہ ارادہ یعنی "وہ قوت جس کے ذریعہ سے ہم اپنی جبلتوں
کی سرکوبی کرتے ہیں" خود ہماری جبلتوں ہی کی امداد پر قائم ہے جس
طرح حکومت افراد کے اجتماعی ارادے سے اقتدار حاصل کر کے افراد ہی
پر حکمرانی کرتی ہے اسی طرح نفس جبلتوں کی اجتماعی قوتوں سے استمداد
کر کے انفرادی جبلتوں ہی پر فرماں روائی کرتا ہے!

(۲)

فلاسفۂ قدیم کا عقیدہ تھا کہ انسانی زندگی میں جبلتوں کے اثرات
غیر اہم ہیں اور ادنیٰ درجہ کے حیوانات کی رہنمائی جبلتیں کرتی ہیں اور انسان
عقل و ذکاوت کے اشاروں پر چلتا ہے لیکن اب بیشتر علما کا یہ خیال
ہو گیا ہے کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان بھی جبلتوں کا پیرو ہے۔
یہی وہ اکسانے والی قوت ہے جو ہمارے اندر تحریکِ عمل پیدا کرتی ہے

دریہی وہ قوت ہے جو ہمارے اغراض حیات کی تجدید کرتی ہے۔ عقل کا صرف یہ کام ہے کہ ان اغراض کے حصول کے ذرائع معلوم کرے۔ ہم میں اور ادنی درجہ کے حیوانات میں فرق اتنا ہے کہ ان حیوانات کی جبلتیں صرف محدود اور متعین احوال کی جانب رہنمائی کرتی ہیں جن میں تصرف کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن انسانی جبلتوں سے مراد وہ میلانات ہیں جو مخصوص حالات پیدا ہونے پر مقررہ مقاصد حاصل کرنے کے لیئے انسان کو عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان مقاصد تک رسائی کے مختلف و متعدد راستے ہو سکتے ہیں جن کا حصر ممکن نہیں اور عقل ان میں سے بہترین و مناسب ترین راستے کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ جبلت ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے و عقل تلاش وسائل میں امداد کرتی ہے۔ جبلت سے ہمارے اندر حصول غذا کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور عقل ہمیں اس کے حصول کے ذرائع بتاتی ہے جبلت خطرے کے وقت فرار و نجات کی جانب رہنمائی کرتی ہے اور عقل نجات کے وسائل اور آلات جنگ ایجاد کرتی ہے۔ جبلت ایک رفیق زندگی کی ضرورت ثابت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اپنے بچوں کو ہر مصیبت سے محفوظ رکھنا اور اُن کی حمایت کرنا چاہیئے نیز ہم جنسوں کے ساتھ مقابلہ و مسابقت کی جانب مائل کرتی ہے۔ اور عقل وہ ذرائع مہیا کرتی ہے۔ جو ان مقاصد تک پہنچا سکیں۔ ہمارا ترقی یافتہ تمدن، ہماری عظیم الشان صنائع اور ہمارے تمام چھوٹے بڑے کارنامے در اصل جبلت ہی کے کرشمے ہیں۔ جو اسی طرح ہماری رہنمائی کرتی ہے جس طرح پرندوں کی جبلت انہیں انڈے سینے، بچے نکالنے اور اس مقصد کے لئے مصائب برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جبلتیں ہماری مخفی قوتوں کی مظاہر ہیں جو فطرت کے مقاصد حقیقی کی تکمیل کی غرض سے مناسب وسائل اختیار کرنے کے لیئے ہمیں مسلسل و متواتر اُبھارتی رہتی ہیں۔ فطرت کے یہ مقاصد حقیقی دو ہیں:۔

"حفظ ذات" اور "بقائے نوع"

معترض کہہ سکتا ہے کہ کیا عادت ہمیں اسی طرح بہت سے افعال کی ترغیب نہیں دیتی جس طرح جبلت ترغیب دیتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عادت در اصل جبلت کی خدمت گذار ہے جب مجھے میری جبلت نے کسی عمل کی ترغیب دی اور میں اس خواہش کو پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا، اور مجھ سے یہ عمل اسی طرح متعدد مرتبہ صادر ہوا اور میں ہر مرتبہ اپنی جبلت کی تشنگی رفع کرتا رہا تو یہ عمل میری عادت بن جائے گا۔ گویا عادت محض جبلت کے مقاصد پورا کرنے کے ایک خاص طریقہ کا نام ہے۔ باقی رہی قوت ترغیبی تو وہ حالات کے لحاظ سے خود جبلتوں کی رہین منت ہوتی ہے۔

یہ جبلتیں نفسی تاثرات سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ جب خطرے سے فرار ہونے کی جبلت بیدار ہوتی ہے تو عادتاً اسی کے ساتھ خوف کے تاثرات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب جنگ کی جبلت بیدار ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ غصہ کے تاثرات بھی رونما ہوتے ہیں اور جب ممتا کی جبلت بیدار ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ شفقت کے تاثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تمام اہم جبلتوں کے ساتھ ساتھ کوئی خاص تاثر ضرور رہتا ہے۔ جب جبلت بیدار ہوتی ہے تو وہ تاثر بھی اپنا رنگ دکھلاتا ہے اور جب وہ تاثر ابھرتا ہے تو اس کے ساتھ مناسبت رکھنے والی جبلت بھی جوش میں آتی ہے۔ اسی لیئے تاثرات کا انسان کے مسلک پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس کی تاثیرات محتاج بیان نہیں ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص حالت غضب یا حالت خوف میں فلاں کام کر گزرا، اور کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اسی قسم کے کسی فعل کی ترغیب دینا چاہتا ہے تو اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس شخص کے اندر ایسے تاثرات پیدا کر دیئے جائیں جو اس کام کے حسب حال ہوں۔

بعض علماء نے جبلتوں کو ان کے مناسب حال تاثرات کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے۔ ہم ان کو نام بنام شمار کرنا نہیں چاہتے بلکہ صرف دو جبلتوں کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں جنھیں اخلاق و ارادہ کی تعمیر میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان جبلتوں کے نام ہیں "غلبہ" اور "اطاعت"۔ اول الذکر جبلت انسان کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ دوسروں پر غلبہ و تسلط حاصل کرے، اپنے ہم سروں سے آگے بڑھ جائے، اور لوگوں کی تحسین و توصیف کا مستحق قرار پائے۔ دوسری جبلت اُسے ترغیب دیتی ہے کہ اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھے، اگر کسی دوسرے کو کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں برتر سمجھے تو اُس کا اتباع کرے اور اپنے نفس میں اعتراف عظمت و اطاعت لطولت کی پسندیدگی کے جذبات پرورش پانے دے۔ جب فرد دوسرے افراد یا اجتماع سے ٹکراتا ہے تو فریق ثانی کی برتری یا زیردستی کے احساس کے مطابق اس کے اندر ان دونوں میں سے ایک جبلت

بیدار ہو جاتی ہے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ فرد مینئیہ اجتماع کو ایک قوت
عظیم محسوس کرتا ہے اور اس قوت کے سامنے اسے اپنا نفس حقیر نظر
آتا ہے۔ چنانچہ وہ اجتماع کی اطاعت کی جانب جھک جاتا ہے۔ اور
اُس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ حیات انسانی
میں غلبہ اور اطاعت کی جبلتوں کے اثرات تقویت پا کر بہت ہمہ گیر
اور دور رس ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض علمائے تحلیل نفسی نے
ہمارے تمام افعال کا سرچشمہ جبلت غلبہ و خواہش قوت کو قرار دیا ہے

(۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبلت ہی وہ بنیادی اور ابتدائی مادہ
ہے جس سے خلق وارادہ کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ
انسان عمر بھر اپنی روش میں فطرتاً جبلی ترغیبات ہی کا تابع رہتا ہے کیونکہ
اگر یہ صورت حال ہو تو انسان وقت و حالات کا بندہ بن کر رہ جائے اور
بلند مقاصد کے لئے کوئی کام نہ کر سکے نہ اس کے اعمال ماضی و مستقبل
سے کوئی ارتباط رکھیں۔ اس لئے کہ اس کا ہر عمل وقتی موثرات کا تابع
ہو جو فوراً رونما ہو کر اس کی جبلتوں کو بیدار کر دیا کریں اور اُس کی زندگی
بے راہروی اور غیر ذمہ داری کا مجموعہ بن جائے جو پست درجہ کے حیوانات
کی زندگی سے مختلف نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ تجربات انسان کے جبلی
رجحانات کو ہمیشہ منظم کرتے رہتے ہیں اور اُسے سکھاتے رہتے ہیں
کہ جبلت کی ترغیبات پر عمل کرنے سے پہلے غور و فکر کرے۔ اس راستہ
میں اہم ترین مرحلہ جذبات کی تکوین ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے فرض
کیجئے کہ ایک بدمزاج معلم اپنے کسی شاگرد کو زد و کوب کرنے کا عادی ہو
جاتا ہے۔ وہ جب لڑکے کو سزا دیتا ہے تو اُس کے دل میں خوف کا تاثر
پیدا کر دیتا ہے تسلسل و تواتر کی بنا پر یہ تاثر معلم کی ذات سے وابستہ
ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صرف اُس کا سامنے آ جانا طالب علم کو خوف زدہ
کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ جاتی
ہے کہ جب معلم کا خیال آتا ہے شاگرد خوف محسوس کرنے لگتا ہے اور اس
امر کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ معلم کو دیکھے۔ اس طرح معلم کے بارے
میں شاگرد کی روش اور اس کا احساس ایک خاص انداز اختیار کر لیتا ہے
معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معلم کی مارپیٹ شاگرد
کے دل میں کینہ اور غصہ پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسی ناانصافی دیکھتا
ہے جس سے مفر نہیں۔ اس کی تکرار سے شاگرد کے نفس میں معلم کی صورت کے
ساتھ غصہ کا تاثر اور مقابلہ کا جذبہ مربوط ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح مرور
ایام کے ساتھ معلم کی ذات تاثرات و ترغیبات نفسیہ کے مجموعے کی تخم ریزی
کر دیتی ہے جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں۔ اس لئے
ہم کہہ سکتے ہیں کہ معلم شاگرد کے لئے ایک شدید بغض کے جذبہ کا موضوع
بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب شاگرد کے دل میں گندگی اور جھوٹ کا تصور
تکلیف و تحقیر کا احساس متواتر پیدا ہوتا ہے تو اُس کے نفس میں ان چیزوں
کے خلاف نفرت کا جذبہ پرورش پاتا رہتا ہے۔ اور جب حساب کے اسباق
اُس کے اندر لذت و سرور پیدا کرتے ہیں تو اس کے دل میں علم حساب سے
رغبت کا جذبہ نشو و نما پاتا ہے تاثرات کی طرح جذبات محسوس ہو کر زائل
نہیں ہو جایا کرتے بلکہ وہ ایک مستقل نفسی حالت ہے جس سے مختلف ایسے
تاثرات پیدا ہو جاتے ہیں جو جذبہ کے موضوع سے باعتبار مناسبت تعلق
رکھتے ہوں۔ چنانچہ جب میں کسی سے محبت کرتا ہوں تو اُسے دیکھ کر خوش ہوتا
ہوں، اس کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، اس کی عدم موجودگی
میں اُس کا مشتاق رہتا ہوں، جب اُسے کوئی خطرہ لاحق ہو تو اس کی مدد
کرتا ہوں اور جب کوئی اس پر زیادتی کرے تو اس کی مدافعت کرتا ہوں
البتہ انسان کے جذبات تبدیل ضرور ہوتے رہتے ہیں لیکن جب تک
جذبات قائم ہیں خواہشات و ترغیبات جو اُن سے پیدا ہوتی ہیں وہ بھی
اٹل ہیں۔ بہر حال جذبات وقتی جبلی ترغیبات کے مقابلہ میں زیادہ دیرپا ہوتے
ہیں، خصوصاً بڑے انسانوں کے جذبات۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی
مسلک کی تنظیم اور اس کی مستحکم و مستقل بنیادوں پر تعمیر میں جذبات کی تکوین
ایک اہم مرحلہ ہے۔ گزشتہ سطور سے واضح ہوتا ہے کہ جذبات صرف
مادیات پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ کبھی معنوی تصورات بھی ان کی اساس و بنیاد
بن جاتے ہیں اور اخلاقی جذبات بھی اسی نوعیت میں داخل ہیں۔ یہ ایسے
جذبات ہوتے ہیں جن کا خمیر کسی فضیلت سے تیار ہوتا ہے۔ مثلاً عدالت
امانت، صداقت، یا ایثار سے۔ چنانچہ بعض اوقات انسان عدالت کو اتنا
ہی عزیز رکھتا ہے جتنا اپنی اولاد یا اپنے وطن کو۔ یہ جذبات بھی اسی طرح
نشو و نما پاتے ہیں جس طرح دوسرے جذبات۔ چنانچہ ان کی تکوین دو
اسباب پر منحصر ہوتی ہے، یعنی

(۱) فکر کا جذبہ کے موضوع کو واضح طور پر محسوس کر لینا، اور
(۲) اس موضوع پر چند تاثرات کا جمع ہو جانا۔

دوسرا سبب جذبہ کے نشو و نما پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے خصوصاً

جذبات کے ابتدائی دور میں، زندگی میں اخلاقی جذبات کی قوت وتاثیر کا کلی فکر پہ اتنا انحصار نہیں ہوتا جتنا ان تاثرات اور جبلی ترغیبات کی قوت پر جو اخلاقی فضا کے ارد گرد جمع ہو جاتی ہے، دوسرے درجے میں اس مسلک کی مزاولت پر انحصار ہوتا ہے جو ان جذبات سے مطابقت رکھتا ہو۔

(۴)

اب ہم اخلاق و ارادہ کی نشو و نما کے آخری مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں ہمارے پیش نظر ایک ایسی شخصیت ہے جس میں جبلی و اکتسابی ترغیبات پائی جاتی ہیں۔ یہ ترغیبات مستقل جذبات کی صورت میں منظم ہو چکی ہیں لیکن یہ منظم اور مستقل اخلاق نہیں ہیں کیونکہ ان جذبات سے جو ترغیبات و رجحانات پیدا ہوتے ہیں وہ بسا اوقات باہم متعارض ہو جاتے ہیں۔ وہ رجحان جو انانیت کی جانب میلان سے پیدا ہوتا ہے بعض دفعہ اس جذبے سے پیدا ہونے والے رجحان سے متعارض ہو جاتا ہے جو باپ کے دل میں اپنے بچوں کے لیے نشو و نما پاتا ہے اور صداقت کی محبت کبھی شہرت کی محبت سے متصادم ہو جاتی ہے ہر رجحان کی قوت اس جذبہ کی قوت کے تابع ہوتی ہے جو اس کا پشت و پناہ ہو۔ جب ایک جذبہ بجائے خود قوی ہو اور دوسرا ضعیف اور دونوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو دوسرے جذبات اور من حیث المجموع حیات انسانی کے ساتھ ان دونوں جذبات کے تعلقات سے قطع نظر کرتے ہوئے قوی جذبہ ضعیف جذبہ کو مغلوب کر لیتا ہے کیونکہ اخلاق ابھی تک کامل ہم آہنگی اور باقاعدگی سے محروم ہیں۔ باقاعدگی کا آخری درجہ یہ ہے کہ ان تمام ترغیبات کو ایک ہی کسوٹی پر کسا جائے اور انہیں ایک ایسی قوت کا تابع کر دیا جائے جو ایک ترغیب کے ساتھ شامل ہو کر اُسے دوسری پر غالب کر سکے۔ جو انسان مضبوط قوت ارادہ رکھتا ہو ضروری ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مستقل اور سامی نصب العین بھی ہو جس کی پشت پناہی کسی قوی جذبہ سے اس طرح ہوتی ہو کہ یہ جذبہ اپنے ماسوا پر غالب آ کر انسان کو ان تمام ضمنی ترغیبات سے بے نیاز کر دے جو اس جذبے سے متناقض ہوں۔ یہ تعریف جس طرح ایک ایسے بخیل پر صادق آتی ہے جس کے اخلاق پر روپیہ کی محبت نے غلبہ پا لیا ہو اُسی طرح ایک ایسے مقدس انسان پر بھی منطبق ہوتی ہے جو تمام لوازم زندگی میں سے صرف شرافت کو انتخاب کر لیتا ہے لیکن بخیل کا ارادہ اگرچہ قوی ہوتا ہے اور اس میں کافی جاذبیت ہے مگر اس کی وسعت محدود ہے اور توازن اس کے اثرات کو کم کر دیتا ہے ایک کامل ارادہ تک پہنچنے کے لیے لازمی ہے کہ جذبہ غالبہ ایک وسیع جذبہ ہو اور قوی ہونے اور اہم جبلتوں پر مبنی ہونے کے ساتھ اس کے اثرات زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہوں۔ ان شرائط کو پورا کرنے والا صرف ایک جذبہ ہے یعنی "تشخص" یا "عزت نفس" کا جذبہ! یہ وہ جذبہ ہے جو ہر فرد کے افکار میں اس کی شخصیت کے متعلق ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جس وقت انسان دوسرے اشخاص اور دوسری چیزوں سے دو چار ہو، اپنے قوے اور اپنی صفات کا احساس کرے، اپنے اعمال میں مختار ہونے کا شعور پیدا کرے اور اپنی قیمت کا اندازہ کرے یہ تصور انسان کے تجربات کے دوران میں ان دو جبلتوں سے ملحق ہو جاتا ہے جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے یعنی "جبلت غلبہ" "جبلت اطاعت"! اس طرح ایک نہایت قوی جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کی قوت جماعت و افراد کے ساتھ انسان کے ہر اتصال پر بڑھتی جاتی ہے۔ یہ اتصال خواہ عملی ہو خواہ تخیلی کیونکہ یہ اتصال ہمیشہ دونوں میں سے کسی ایک بنیادی جبلت کو جو جذبات میں موجود ہوتی ہے بیدار کر دیتا ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جذبہ تشخص شخصی زندگی میں ایک فعال قوت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جو انسان کو ہمیشہ اس امر پر ابھارتا رہتا ہے کہ وہ اجتماع کے احترام و قدر شناسی کا مورد قرار پائے۔ وہ خود صرف اپنی ذات اور اپنی مرضی کا احترام کرتا ہے اور اس میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اپنے افعال میں زندگی کے اس نصب العین کی پیروی کرے جو خود اس نے قایم کیا ہو تشخص یا عزت نفس کا یہ جذبہ ہی اخلاق کی بنیاد اور ارادہ کی اساس ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے ارادہ سے کام لیا تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اپنے دل میں چند متعارض خواہشات پائیں اور ان میں سے کسی ایک خواہش کو پورا کرنے سے باز رہا۔ ان ترغیبات کے وزن پر غور کیا جو اس خواہش کو تقویت دے رہی تھیں اور ہر ترغیب کو اپنے تشخص کے تصور کے مقابلہ میں رکھ کر جانچا۔ چنانچہ جو ترغیب اس تصور پر زیادہ منطبق ہوئی اس کی قوت کو تشخص کی قوت سے تقویت دے دی اور اس طرح اس کو دوسری ترغیبات پر غالب کر دیا۔ اس لڑکے نے جس نے اپنے افلاس اور والدین کی بیکاری کا خیال نہ کرتے ہوئے پارسی خاتون کا بٹوا پولیس کے حوالہ کر دیا۔ ایسا اس لیے کیا کہ اس کے جذبہ تشخص نے دوسرے کا مال لینے سے انکار کیا۔ زندگی میں اس کی بہت سی مثالیں مل سکیں گی۔ بہت سے شریف خیال نوجوان ملیں گے جو کسی قوی مادی خواہش کے زیر اثر جادۂ صواب سے بھٹکنے کے قریب ہو گئے مگر آخری لمحے میں انہوں نے چشم تصور سے دیکھا کہ ہم مدہوشی اور

آلودگی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ہیں اس حال میں دیکھ رہے ہیں یا کم از کم خود اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر شرمندہ ہو رہے ہیں یکایک اُن میں عزتِ نفس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انہیں ایک زبردست قوت عطا کر دیتا ہے جو نفسِ امارہ پر غالب آجاتی ہے یہی قوت جسے جذبہ تشخص کی اعانت حاصل ہوتی ہے اور جس کا اصل سرچشمہ جبلات ہماری ہے "قوتِ ارادہ" کہلاتی ہے

(۵)

اس سلسلہ کو ختم کرنے سے پہلے ارادہ کی تربیت کے متعلق مختصراً کچھ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں صحیح اور قوی ارادہ امورِ ذیل پر منحصر ہے:

(۱) انسان نے اپنی زندگی کے لیے ایک واضح لائحہ عمل مرتب کر لیا ہو اور اسی کے ساتھ اپنی ذات کے لیے ایک بلند نصب العین بھی مقرر کر لیا ہو۔ اس لائحہ عمل کے لیئے اہم بات یہ ہے کہ وہ قابلِ عمل ہو اور اس سے ایک مضبوط وحدت صورت پذیر ہوتی ہو یعنی شخصی خواہشات یا وہ ترغیبات جو عمل کی جانب مائل کر سکیں اس لائحہ عمل میں اسی ترتیب کے ساتھ ہوں جو جماعتی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہوں۔ جب انسان اس لائحہ عمل کو مرتب کرے تو انہیں ہمیشہ مدِ نظر رکھے

(۲) یہ لائحہ عمل کسی قومی اخلاقی جذبہ کی بنیاد بن سکے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کو تاثرات و ترغیباتِ جبلی کی قوت سے مربوط کر دیا جائے۔

(۳) انسان میں کوئی ایسا شخصی طاقت ور جذبہ وجود ہو جو بوقتِ ضرورت اس اخلاقی جذبہ کو تقویت پہنچا سکے۔ تجربات شاہد ہیں کہ کسی کا ارادہ کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو لیکن جب تک اس میں شرافت اور عزتِ نفس کا کوئی احساس باقی ہے وہ اصلاح پذیر ہو سکتا ہے جب یہ احساسِ شرافت زائل ہو جائے تو اس کے ارادہ اور اخلاق سے ہاتھ دھو لینا چاہئے۔

(۴) انسان کو ضبطِ نفس کا عادی ہونا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ اُس کے دل میں جو خواہش پیدا ہو اُس کے پورا کرنے میں فوراً مصروف ہو جائے۔ بلکہ غور و فکر کر کے اپنی شخصیتِ کاملہ کے مقابلہ میں اس خواہش کی قیمت کا اندازہ کرنا چاہیئے۔ جذبہ تشخص کو اتنی مہلت دینا چاہیئے۔ کہ وہ اس ترغیب کی تائید کے لئے جو اس خواہش میں مرکوز ہے اپنی قوتیں مجتمع کر سکے۔

یہ آخری شرط بسا اوقات مشکلات پیدا ہونے کا باعث بن جاتی ہے بعض مرتبہ آدمی کے لیئے یہ آسان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل مرتب کرے۔ لیکن اس پر عمل پیرا ہونے سے قاصر رہتا ہے۔ یا تو اس لیئے کہ وہ بالطبع جلد باز ہوتا ہے اور اس کے لئے ضبطِ نفس آسان نہیں ہوتا یا وہ ترغیبات جو لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے میں معارض ہوتی ہیں غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کے مرتب کردہ لائحہ عمل میں اُس کی تمام خواہشات کی تکمیل کا سامان موجود ہو بلکہ بعض خواہشات کے مقابلہ میں جو بلند نصب العین سے متعلق ہونے کے باعث زیادہ قیمت رکھتی ہیں دوسری خواہشات کو قربان کرنا لازمی ہے۔ یہ ترغیبات جو نظر انداز کر دی جاتی ہیں ظہور و غلبہ کے لئے موقع کی منتظر رہتی ہیں اور کبھی یہ اتنی قوی ہوتی ہیں کہ ارادہ اور جذبۂ تشخص اُن کے مقابلہ میں مغلوب ہو جاتا ہے۔

اس کا علاج دو امور پر منحصر ہے۔ اول یہ کہ ان میلانات کی اصلاح کی جائے اور اس قوت کو جو ان میلانات کی پشت و پناہ ہو دوسری جانب مصروف کر کے انہیں ضعیف کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ضبطِ نفس کی مسلسل مشق کی جائے۔ اور اس بات کی عادت ڈالی جائے کہ انسان صرف اپنے ارادے اور مرضی سے اس راستہ پر گامزن ہو جس پر اُس کی شخصیتِ کاملہ اُسے چلانا چاہے۔ یہاں تک کہ یہ عادت اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ مشق و تمرین سے انسان اپنے نفس پر اتنا قابو پا سکتا ہے کہ سخت ترین مواقع پر اس کی اصلیت ... تھام کر سکے۔ ہمارے خیال میں تمام مذاہب نے "روزہ" اسی مقصد سے ضروری قرار دیا ہے

(ترجمہ)

منظور سروش (بھوپالی)

دعوتِ طرب

بہار آئی ہے عیش اڑانے کے دن ہیں | گھٹا چھائی ہے کیف اٹھانے کے دن ہیں
غمِ حور و غلماں کو دل سے بھلا کر | حسینوں سے آنکھیں لڑانے کے دن ہیں

یہ بادل یہ بارش یہ ٹھنڈی ہوائیں | مے و جام سے لو لگانے کے دن ہیں
یہ رنگیں بہاریں یہ رنگیں فضائیں | گل و مل کا ساغر چلانے کے دن ہیں
قیودِ شریعت سے آزاد ہو کر | درِ میکدہ کھٹکھٹانے کے دن ہیں
جبینِ عبادات سے ہاتھ دھو کر | خرابات میں عیش اڑانے کے دن ہیں

مساجد نشینو! مساجد کو چھوڑو | کہ طاعات سے جی چرانے کے دن ہیں
معابد گزینو! معابد کو چھوڑو | کہ زہد و ورع بھول جانے کے دن ہیں
دمِ صبح تسبیح باری کے بدلے | غزلہائے مستانہ گانے کے دن ہیں
سرِ شام طاعت گزاری کے بدلے | مئے ناب کے خم لنڈھانے کے دن ہیں

شریعت کے جور و ستم سہنے والو! | شریعت سے پیچھا چھڑانے کے دن ہیں
طریقت کو راہِ رضا کہنے والو! | طریقت کو بالا بتانے کے دن ہیں
لگاتار تانیں اڑانے کی رت ہے | لگاتار گانے بجانے کے دن ہیں
لگاتار پینے پلانے کی رت ہے | لگاتار چھلکنے چھلکانے کے دن ہیں

بت اور بتکدے سے حذر کرنے والو! | نڈر بتکدے میں در آنے کے دن ہیں
سجودِ خدا میں بسر کرنے والو! | حضورِ بتاں سر جھکانے کے دن ہیں
سمن رو نگاروں کو ہمراہ لے کر | گلستاں میں چکر لگانے کے دن ہیں
مے آشام یاروں کو ہمراہ لے کر | چمن پر تسلط بٹھانے کے دن ہیں

خدا سے تعلق کو چندے گھٹا کر | بتوں سے روابط بڑھانے کے دن ہیں
وہ یارِ حسیں شاملِ دوستاں ہے | نصیبِ تمنا جگانے کے دن ہیں

وہ شوخِ طرحدار پھر مہرباں ہے | غمِ شوق کی داد پانے کے دن ہیں

پیو اور پی کر نڈر ہو ندا دو | کہ پی کر نڈر ہو ندانے کے دن ہیں

اٹھو اور بساطِ تعیش بچھا دو | بساطِ تعیش بچھانے کے دن ہیں

اٹھو اور مے و جام گردش میں لا دو | مے و جام گردش میں لانے کے دن ہیں

غرورِ تزہد بہت بڑھ چلا ہے | تزہد کو نیچا دکھانے کے دن ہیں

زمانہ تورّع سے تنگ آ چکا ہے | تورّع کا قصہ چکانے کے دن ہیں

چلو چل کے باغوں میں دھومیں مچائیں | کہ باغوں میں دھومیں مچانے کے دن ہیں

چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں | کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

اٹھو اور مکائد کی ہستی مٹا دو | مکائد کی ہستی مٹانے کے دن ہیں

بڑھو اور مفاسد کی تعمیر ڈھا دو | مفاسد کی تعمیر ڈھانے کے دن ہیں

پیو اور غمِ ہر دو عالم بھلا دو | غمِ ہر دو عالم بھلانے کے دن ہیں

پیو اور سہارِ طبیعت مٹا دو | سہارِ طبیعت مٹانے کے دن ہیں

معاصی کی لذت سے نا آشنا ہو! | معاصی سے لذت اٹھانے کے دن ہیں

مناہی کی قوت سے نا آشنا ہو! | مناہی سے بگڑی بنانے کے دن ہیں

بلا خوف ناچو، بلا خوف گاؤ | نڈر ناچنے اور گانے کے دن ہیں

اٹھ آزادِ حق کوش موقع ہے جلدی اٹھ | کہ اوہام پر فتح پانے کے دن ہیں

حکیم آزاد انصاری

عورت کی طاقت

(۱)

نئی روشنی نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کا چراغ گل کر دیا لیکن فطرت کی وضعداری اس کی دست برد سے محفوظ رہی۔ رات اور دن کا التزام وہی ہے۔ چاند اور سورج اپنی اپنی باری میں ناغہ نہیں پڑنے دیتے ایک کے بعد دوسری رت پابندیٔ وقت کے ساتھ آتی جاتی ہے ساون بھادوں میں شگفتگان چمن کے مطابق اپنی ساری بہار کے ساتھ چل چلاؤ ایک کر دیتا ہے بادل امنڈ امنڈ کر آتے ہیں گھنگھور گھٹائیں دوڑتی پھرتی ہیں پپیہا "پی کہاں" "پی کہاں" رٹ لگا کر ایام عشرتِ فانی کی کسک کو تازہ کر دیتا ہے اور درد دل کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا وہ جھولے ہوا ہو گئے، وہ پکوان پکانے رہے وہ ماہ جبیں کہاں وہ ملار کی الاپ کیا ہوئی۔ یہ تو برسات کال نہیں برکھا رت ان تمام لوازمات کا نام تھا۔ صرف برسنے کو تو برسات نہیں کہتے۔ یہ بات نہیں تو برسات چشم فلک سے گرا ہوا ایک آنسو ہے اور بس۔

زمین پر یہ خاک اڑتی دیکھ کر طبقۂ آسمانی میں ولولہ پیدا ہوا اندر بگڑ گئے ان کے ماتھے پر بل دیکھ کر بادل گرجا بجلی کوندی۔ ہوا نے پر و بال نکالے اور سمندر نے زمین کی گوشمالی پر کمر باندھ لی۔ رات بھیگی ہوئی تھی۔ لوگ "علیٰ قدرِ قسمت" انگنائیوں دالانوں چھتوں پر خواب راحت کے مزے لے رہے تھے کہ اندر کی سینا نے ان کا آرام و سکون درہم برہم کر دیا۔ اور ایک "حشر بداماں" طوفان باد و باراں کا ہنگامہ برپا ہو گیا غریبوں کے گھر تو گرنے ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ اور وہ پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ پیرِ فلک ذرا ان پر مشق ستم کر لیا کرے۔ اس لئے ان کے مکانوں کا گرنا ان کی جھونپڑیوں کا کسی کے کاشانۂ اقبال میں سما جانا غرض ان کی ہر تکلیف ہر مصیبت قانون فطرت کے عین مطابق ہے لہٰذا وہ کسی توجہ کے مستحق نہیں لیکن بیچارے دولتمندوں کی حالت قابل رحم تھی۔ کروٹ بدل بدل کر کہیں اونگھ سی آئی تھی۔ وہ بھی اچاٹ ہو گئی۔ اب "ان نیناں میں نندیا کہاں" گنگناتے بھور ہو جائے گی" چاندنی کا حلیہ بگڑ گیا۔ محل کی بنیادیں ہل گئیں بیگم صاحبہ کی مہندی کا بڑا لکھا ہوا تختہ ڈھل گئے۔ [illegible] میں باغ کے چند درخت گر پڑے۔ یہ ایسی خونچکاں مصیبت ہے جس کی مثال تاریخ بغاوت ہند میں بھی نہیں ملتی۔

(۲)

صبح کی صداقت پر خورشید نے اپنی طلائی مہر ثبت نہ کی تھی کہ نواب سلیمان قدر رحیم۔ اے۔ بی۔ سی۔ ایل بار ایٹ لا کے ننھے صاحبزادے انا کی انگلی سے لگے پائیں باغ میں چہل قدمی کے لئے گئے۔ وہاں باغبان نے ہلڑ مچا رکھا تھا۔ اور چند تناور درختوں کی لاشوں پر کھڑا ماتم کر رہا تھا جو گذشتہ شب کے طوفان کی بھینٹ چڑھے تھے۔ یہ نقشہ دیکھ کر بچے سہم سے گئے۔ اور انھوں نے سمجھا کہ جب اتنے بڑے درختوں کی یہ گت بنی ہے تو ان کے چھوٹے چھوٹے پودوں کے چمن کا تو خدا حافظ ہے۔ وہ بیم و رجا کی ایک دنیا ساتھ لے کر بڑھے اور یہ دیکھ کر پھولے نہ سمائے کہ ان کا چمن لہلہا رہا ہے ایک پتہ تک کو چشم زخم نہیں پہنچا۔ خوش تو ہوئے مگر ان کے نیرنگِ دہر سے ناآشنا دل کے لیے یہ امر معما بن رہا تھا کہ طاقت ور اور بھاری بھرکم درخت تو طوفان کی تاب نہ لا سکیں اور ان کے نازک اندام پودے اس امتحان میں پورے اتریں اور طوفان کی طاقت کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ ان کا تجربہ اسی حد تک تھا کہ دھان پان کی نزاکت کی نسبت قوی ہیکل تنومندی مدافعت کی زیادہ اہل ہوتی ہے اُن کا مشاہدہ ارتقا کی اس معراج پر نہ پہنچا تھا کہ وہ بلا منت کسی مشکل کشا کے اس گتھی کو سلجھا سکیں اس لئے انہوں نے یہ دقیقہ بڈھے باغبان کی عمر رسیدہ عقل و دانش کے حوالے کیا۔ اس نے ایک حسرت آمیز نگاہ گرے ہوئے درختوں پر ڈالی اور پھر بیزار نظر سے چمن کو دیکھا سرمایہ دارانہ موازنہ تو کچھ اور رکھتا تھا۔ مگر استصواب کی نوعیت نے صرف اس جواب پر قناعت کی "چھوٹے میاں نربل کا اللہ بیلی ہوتا ہے۔ جب جھکڑ آتا ہے تو بڑے بڑے درخت اس سے دو ٹکریں لڑنے کے لئے سر اونچا کر کے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ مگر منہ کی کھا کر آن واحد میں اُد

کونڈ مُذوت کرتے ہیں اس کے خلاف چھوٹے پودے جن کی نشو و نما سربلندی اور سایہ آوری کے مثل نہیں ہوتی بلکہ ان کی نزاکت و نفاست دل آویزی و نظر فریبی میں ان کی بقا مضمر ہوتی ہے۔ اپنی منشائے حیات کو فراموش نہیں کرتے وہ اپنی تخلیق کے ماحول میں رہ کر مدافعت کا سامان پیدا کرتے ہیں سربکف ہو کر مقابلے کے لیے کھڑا ہونا ان کے حسن نزاکت کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ نزاکت و رعشوہ گری کو اپنا سپر بناتے ہیں۔ اور ہوا کا رخ دیکھ کر جھک جاتے ہیں جھونکا نکل جاتا ہے تو عید کشیدہ ہو کر وقف تبسم اور رعنائی ہو جاتے ہیں یہ نزاکت بذاتہ ایک بے پناہ طاقت ہے جس کا مقابلہ کرنا قدرت کے بس میں نہیں۔

(۳)

نواب سلیمان قدر ایک پرانے خاندان کے نام لیوا ہیں۔ شاہی میں ان کا خاندان بڑے زوروں پر تھا۔ معتمد ہزاری تک ہی نہیں۔ بلکہ قلمدان وزارت بھی ان کے گھر کئی دفعہ آیا۔ انتزاع سلطنت کے ساتھ گو وہ شان نہ رہی گر ہاتھی لٹیگا بھی تو سوا لاکھ کا معاملہ تھا۔ تعلقہ کے علاوہ بنک بھر پور تھا۔ نواب مرحوم نے اندر باہر کی مخالفت کو بالائے طاق رکھ کر سلیمو میاں کو سر سید کے درس میں بھیج دیا۔ سلیمو کو پڑھنے کا کچھ ایسا چسکا لگا کہ منتہی ہونے پر بھی سیر نہ ہوئے۔ اور ولایت کی راہ لی۔ جہاں سے وہ بیرسٹر ہو کر لوٹے۔ اس زمانہ میں خاص کر مسلمانوں میں بیرسٹر کبریت احمر۔ آب حیات۔ پارس۔ سیمرغ یا عنقا کا حکم رکھتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ جس طرف نکل جاؤ بیرسٹروں کی دو تین ہوام تہ ویز جنہیں عرف عام میں بورڈ کہتے ہیں۔ زلف یار کی طرح لٹکتے نظر آئیں گے۔ شادی ہوئی تو یار دوست یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ با ایں تعلیم مغربی یہ حضرت کنگنے سے لے کر مہندی اور مہندی سے سہرے تک کی رسوم ادا کرنے پر تیار ہیں لوگ تو پہلے ہی حیران تھے کہ ولایت سے آ کر بھی شیروانی اور سلیم شاہی جوتے کے استعمال سے احتراز نہیں۔ اور اب جو وہ اگلے وقتوں کی بوسیدہ رسوم کے احیا پر اتر آئے تو کئی ضعیف الاعتقاد ان کے کج فرنگ کو شک آمیز نگاہ سے دیکھنے لگے لیکن مرورِ ایام نے اس گتھی کو کھول دیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ نواب صاحب گنگا جمنی تمدن کے حامی ہیں اور اپنی طرزِ معاشرت سے مغرب اور مشرق کو بغل گیر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کا ثمر ہے کہ مردانہ میں اگر صوفہ کوچ اور میز زینت آرا ہیں تو حرم سرا میں چاندنی میز فرش۔ گاؤ تکیہ تخت زیب دہ ہیں۔ سواری کے ذیل میں بروہیم اور فٹن کے ہم عنان سکھپال ہوادار اور ناگن ڈیوڑھی سے نکلتے ہیں۔

(۴)

بچے ابھی باغ سے نہ لوٹے تھے کہ نواب صاحب غسلخانہ سے برآمد ہوئے۔ اور حسن دان کے سامنے بال بنانے لگے بیگم چھالیا کاٹنے میں محو تھیں مگر کام کاج کی ہدایات برابر جاری ہو رہی تھیں آئینہ نے ایک تصویر کے ٹوٹ جانے کی غمازی کی پھر کر دیکھتے ہیں تو واقعی ایک تصویر کا چوکٹا چکنا چور ہو گیا ہے اور صرف تصویر فرش میں رقص کر رہی ہے "یعنی شب کی آندھی اس تصویر کے سر رہی۔ بے پروائی کی بھی حد ہوتی ہے اور مزا یہ کہ اب تک کسی نے دیکھا تک نہیں۔ ۵۰ روپے تو خیر مگر وہ کاریگر اب کہاں اور نہ جو گیا تھا آیا نکل گیا۔ نہ کوئی ٹھور نہ کوئی ٹھکانا۔ گھر بھر میں بس ایک ہی کام کی چیز تھی غارت ہو گئی ذرا سی غفلت سے مسٹر ڈکنسن نے لاکھ منتیں کیں مگر میں نے ٹکا سا جواب دے دیا ایک لشکر دوڑ رہا ہے گھر میں اصیلوں اور باندیوں کا مگر ساری کی ساری کام چور" بیگم نے ایک ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے نواب صاحب کی طرف دیکھا۔ مگر یہ چلتا ہوا جادو بیکار گیا اور نواب صاحب کے چہرے نے اثر پذیر ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ بیگم نے آنکھیں سروتے میں گاڑ دیں اور چوکھٹے کی شان میں نواب کا قصیدہ سننے لگیں یہ خاموشی عدم تعاون کی دلیل نہ تھی۔ یہ سکوت بے اعتنائی یا "جواب جاہلاں" پر محمول نہ تھا۔ بلکہ وہ اس شعلہ کو ہوا دینا نہیں چاہتی تھی۔ اور اس طرح اسے اوپر ہی اوپر ٹلنے کے درپے تھی۔ اس نے گنی نہ سادھی تھی۔ بلکہ کبھی کبھار لب کشائی بھی ہوتی تھی مگر اس کا آہنگ اعلان جنگ نہ تھا۔ بلکہ اس میں اعترافِ شکست کی جھلک نظر آتی تھی۔ اتنے میں بچے آ گئے اور باپ کے تیور دیکھ کر وہاں سے چھٹ گئے ؎

دنیا تمام بازی شطرنج باز ہے
مہروں کی طرح ایک کے ہے ایک زد پر (صبا)

(۵)

اس پریشان خاطری میں کچہری کا وقت آ گیا۔ نواب صاحب جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ کہ کچہری کے سررشتہ دار اعلیٰ آ گئے۔ جن کے نواب صاحب سے مراسم دوستانہ تھے۔ اور انھوں نے چھوٹتے ہی کہا حضرت آج

کچہری کا خیال دل سے نکال دیجئے صاحب دورے چلے گئے
سماعت نہیں ہوگی۔

خوب رہی ایک اہم مقدمہ میں پوری تیاری کر چکا تھا سب کیا کرایا
اکارت گیا۔

شب کی آندھی معاذاللہ! ساری عمر میں پہلی بار ہے۔ ہاں آپ
نے سنا صاحب کی کوٹھی پر

نہیں تو.....

گول کمرے کے طرف شیشہ چور چور ہو گئے کوئی سات ہزار
پر پانی پھر گیا۔

صاحب نے کیا کیا؟

یہ ایک ہی کہی۔ کرتے کیا طوفان کے خلاف وارنٹ نکالتے
"خوب شد اسباب خود بینی شکست" کہا اور مسکرا کر نکل گئے۔

آخر نوکروں کو تو سرزنش کی ہوگی!

"کس خطا پر طوفاں کی روک تھام ان کے بس کی نہ تھی۔

سررشتہ دار چلتے ہوئے۔ ادھر نواب صاحب کا ذہن منتقل ہوتے ہوتے تصویر
کی طرف آیا لیکن اب غصہ کی جگہ ندامت نے لے لی تھی۔

آخر اس میں بیگم کا کیا قصور تھا۔ جو میں اس پہ برس پڑا اور اللہ
کی بندی نے دم نہ مارا۔ ایسا تو رذائل بھی نہیں کرتے بڑی غلطی
ہوئی اتنا غصہ ہی کیا کوئی اور ہوتی تو ڈولی مدت کی میکے پہنچ چکی
ہوتی! اسی ادھیڑ بن میں نواب اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ تصویر
چوکٹے میں لگی ہوئی اپنی جگہہ پر موجود ہے۔ بے اختیار منہ سے نکل
گیا کہ ہیں تصویر!

بیگم بولی جی ہاں ہیں ذکر کرنا بھول گئی تھی۔ میں نے اسے
بازار بھیجا تھا اتفاق سے وہی کاریگر مل گیا۔ اور پندرہ روپے میں
چوکٹا بن کر آ گیا۔

نواب صاحب۔ میں پندرہ روپے میں! اور میں پچاس روپے دے
چکا ہوں۔

بیگم۔ آپ ہوئے نواب اور ہمارا رتبہ ہوا کنیزوں کا۔ جیسا
گاہک دیکھا ویسے ہی دام لے لئے۔

نواب صاحب کچھ کھونے سے گئے اور حرم سرا کی پوری
حکومت بیگم کے حوالے کر کے باہر آئے۔ جی ہاں دل ناتواں
کے مقابلہ کے یہی تیور ہوتے ہیں۔

نور الٰہی
محمد عمر

تمنائے فراق

مجھے تم سے کیوں محبت ہے!
کیا اس لیئے کہ تم سے ساری دنیا محبت کرتی ہے۔ تم
کل عالم کے محبوب ہو؟!
تمہاری یاد میں ایک سرور ہے!
تمہارے تصور میں اک لطف ہے!
تمہارے فراق میں اک لذت ہے!
تمہاری جدائی میں اک کیف ہے!
پیارے محبوب۔!
کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہمیشہ کے لیئے مجھ سے جدا رہو؟
...... اور میں ان کیفیتوں سے لطف اندوز ہوتا رہوں جو تمہارے
فراق نے محبت کے ہاتھوں میری زندگی سے وابستہ
کر دی ہیں! میرے دل کی تمنا ہے کہ میرے ہوش و حواس
کی تمام متاع تمہارے ہجر کی لذت گیریوں پر یوں ہی نچھاور
ہوا کرے!!

(ترجمہ)

طفیل احمد بدر امروہوی

ستارے

سراپا چشمِ بینا بن کے کس کی راہ تکتے ہو؟ | فلک پر سو بہ سو کس کی محبت میں بھٹکتے ہو؟
سیہ آرائیاں دے دی ہیں کس کے عشق نے تم کو؟ | یہ کس کی آگ میں کندن کی صورت تم دمکتے ہو؟
وہ موتی چھپ رہے ہیں جو سمندر کے اندھیروں میں | تم ان کا عکس ہو نیلی فضاؤں میں چمکتے ہو
وہ گل ہو جن کو اونچی شاخ پر کھلنا پسند آیا | وہ غنچے ہو کہ رفعت کے گلستاں میں چٹکتے ہو
فلک کے نورِ دیدہ تم فلک کے تم جگر پارے | فلک کی گود میں شب بھر مچلتے ہو ہمکتے ہو
فلک کے درہم و دینار و دولت تم خزینہ تم | فلک کی جیب میں کس حسن سے شب کو کھنکتے ہو
زمیں والوں کو جب تاریکیاں مایوس کرتی ہیں | پئے تسکینِ خاطر آسماں میں تم چمکتے ہو
بھلا ان دوریوں میں ٹمٹمانے سے تمہیں حاصل؟ | میں تنہا راہ گم کردہ ہوں تم تنہا بھٹکتے ہو

تمہارا رنگ ہنگامِ سحر کیوں اڑتا جاتا ہے
وہی شب بھر وہی تم آہ کیوں روتے سسکتے ہو؟

ح۔ب

شعرائے ایران اور جدید تحریکات

وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو وقت کی ضروریات کو سمجھے اور ان کے پورا کرنے کی کوشش کرے، حالاتِ زمانہ سے غافل ہو کر چین سے زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ اس دنیا میں افراد اگر جہالت کے جرم میں معمولی سزا پا کر چھٹکارا پا جائیں تو یہ ان کی خوش قسمتی ہے لیکن اقوام، و انواع کے لئے قدرت کا اٹل قانون یہ ہے کہ تقاضائے وقت نہ پہچاننے کی سزا موت سے کم نہیں، جو قوم زمانہ کا ساتھ نہیں دیتی اور نہ حالاتِ زمانہ کو سمجھ کر ان پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس کی تباہی یقینی ہے، دنیا اس کلیہ سے شعراء کے طبقہ کو مستثنےٰ کرنے کی عادی ہے، کیونکہ حقیقی شاعر ایک لحاظ سے اپنے عہد کا پیغمبر مانا جاتا ہے اور پیغمبر قانونِ وقت کی زد میں نہیں آتا، لیکن یہ خیال غلط ہے، ہر پیغمبر اپنے معاصرین کو حالاتِ زمانہ کے مطابق تعلیم دیتا ہے، شاعر کی پیغمبرانہ "حیثیت" کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے "تنزل الہام" کی "شانِ نزول" پیش کرے،

شاعر قدامت پسند ہوتا ہے کیونکہ انسانی فطرت کے مرکزی اصول جن کی وہ تعلیم دیتا ہے، مرورِ زمانہ سے نہیں بدلتے، حسن کی دلکشی کا اثر جو ابتدائے آفرینش میں تھا اب بھی وہی ہے، اجتماعی زندگی کی عادت انسان نے ہزاروں سال گذر جانے پر بھی ترک نہیں کی، حیات و موت کے مسائل پر دنیا ابتدا میں بھی خیال آرائی کرتی تھی۔ اور اب بھی کرتی ہے۔ لیکن اب دنیا میں ایسے نمایاں تغیرات رونما ہوئے ہیں کہ حیات و موت کی ہیئت ہی بدل گئی ہے، انسانی زندگی اب وہ نہیں جو ایک ہزار سال پہلے تھی، انسانی فطرت اگرچہ وہی ہے۔ جو پہلے تھی لیکن جن مسائل سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے ان کی نوعیت اس قدر بدل گئی ہے کہ اب قدامت پسندی کسی حالت میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی، قدامت پسند کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو ایک چشمے سے پانی پینے کا عادی ہو اور اس کا خیال نہ کرتے ہوئے کہ چشمے میں ایک سانپ مرا پڑا ہے، اور اس کا زہر چشمے میں پھیلا ہے، معمول کے مطابق وہیں سے پانی پینے کی کوشش کرتا ہے اور کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا۔

فارسی شاعری کی مثال ایک صاف چشمے کی تھی جس سے مدت تک اہلِ ذوق پیاس بجھاتے رہے لیکن ہوائے دہر سے یہ چشمہ متعفن ہو گیا، اشرار نے اسے غلاظت سے پاٹنے کی کوشش کی، اور طبقہ شعراء کے نادان افراد اپنے اعمال کے نتائج سے بے خبر ہو کر اسے کثافت سے لبریز کرتے رہے، اہلِ ذوق بدستورِ سابق آنکھ بند کئے چشمے کا استعمال کرتے رہے لیکن جب اس غلطی کے ہولناک اثرات ظاہر ہونے لگے تو انہیں مجبوراً آنکھ کھولنا پڑی اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ایرانی شاعری آلِ سامان کے دور سے خاندانِ قاچار کے زوال تک ایک ہی روش پر قائم رہی لیکن تہذیبِ مغرب کی یورش نے ایران میں بھی تہلکہ مچا دیا، دولِ یورپ کی ہوسِ ملک گیری نے ایران کا تختہ الٹنے کی کوشش کی، سیاسیات اور تہذیب کی زبردست رَو کے سامنے ایرانی قدامت پسندی بھی نہ ٹھہر سکی۔ روس اور انگلستان کا جارحانہ اقدام ایران کے لئے ایک تازیانہ تھا جس نے اسے خوابِ غفلت سے چونکا دیا، ناموسِ وطن اور آزادی کی عزیز متاع کو خطرے میں دیکھ کر ایرانیوں کے لئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا ممکن نہ تھا۔ زمانہ کی گردش نے ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا اور وہ رندِ سرمست جو پیمانے اور چشمِ یار کی گردش کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے کابینہ اور پرسنل کی شکایت میں لب کشا ہو گئے۔

عصرِ حاضر کے ایرانی شعرا کا سنگ دل معشوق ایک ترک زادہ غلام نہیں بلکہ اس کی جگہ ایک شاطر او رزمانہ ساز سیاست دان نے لے لی ہے۔ فتنۂ تاتار اور اس کے اثرات محو ہو گئے ہیں۔ اب چنگیزی

غارت گروں کی جگہ ایرانی مت فروشوں اور یورپی مدبرین نے لے لی ہے۔ فارسی غزل اب صرف عشق و محبت کا بازیچہ نہیں بلکہ سیاسی حالات کی آئینہ دار بھی بنتی جا رہی ہے۔ فرخ خراسانی اور عارف قزوینی جو ایران جدید کے ترجمان ہیں اپنی غزلوں کو سیاسی خیالات کی نشر و اشاعت کا ایک آلہ سمجھتے ہیں۔

جب انگلستان اور روس نے قاچاریوں کی بدنظمی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور ایران کی تقسیم کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط کئے تو ایرانیوں کی غیرت جوش میں آئی اور انہوں نے اپنے ارباب حل و عقد کی نالائقی اور مدبرین یورپ کی بے ایمانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ عارف قزوینی جو موجودہ ایران کا ایک شیدا ایران شاعر ہے اس طرح قاچاریوں کے تدبر کا ماتم کرتا ہے۔ یہ گویا سیاسی غزل کی ابتدا ہے

چہ کرد عشق تو با جز زگفتنم آں کرد | بہ من کہ دورہ شوم قجر با ایراں کرد
تیرے عشق سے جو میرا حال زار ہو گیا ہے | وہ بیان سے باہر ہے جس طرح قاچاریوں کے مظالم سے ایران کی زبان عاجز ہے
خدا چو طرۂ زلفت کند پریشانش | کسے کہ مملکت و ملتے پریشاں کرد
خدا اسے تیری زلف کے طرہ کی طرح پریشان کرے | جس نے ایک سلطنت اور قوم کو تباہ کیا ہے
الٰہی آنکہ بہ ننگ ابد دچار شود | ہر آں کسے کہ خیانت بہ ملک ساساں کرد
خدا کرے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو | جس شخص نے ساسانیوں کے ملک ایران میں خیانت کی ہے
بہ دست شیر غیور دراز دست بگو | کہ خصم ملک ترا جز و انگلستاں کرد
لمبے ہاتھوں والے غیور شیر سے کہو کہ | دشمن نے تیرے ملک کو انگلستان کا ایک جزو بنا دیا ہے
چو چغد بر سر ویرانہ ہائے شہ عباس | نشست عارف و لعنت بروح خاقاں کرد
شہ عباس کے کھنڈروں میں عارف چغد کی | طرح تنہا بیٹھا ہوا خاقان کی روح پر لعنت بھیج رہا تھا

جنگ عمومی کے دوران میں جب اتحادیوں نے ایران میں اپنی فوجیں بھیجیں اور قیصر ولیم نے جو اتحادیوں سے برسرپیکار تھا اسلامی ممالک کی حفاظت کا اعلان کیا تو فرخ خراسانی جیسے شعرا کو اس صورت حالات سے دلچسپ تشبیہیں ہاتھ آئیں۔ فرخ اپنی ایک غزل میں معشوق کی بدخوئی اور سنگدلی کو روسیوں اور انگریزوں کے مظالم سے تشبیہ دیتا ہے۔

اے بچہ زادگان بریطانی | بنمودہ پیشہ مکر و فسوں سازی
وے چوں بتان مہ رخ پارسی | عادت بناز کردہ و طنازی
وے کردہ خو چو روس بہ بدخوئی | چندیں بکفر زلف چہ می نازی
اندیشہ دار از آنکہ بر مظلوم شکوہ ات | نزد ولیم پادشہ غازی

ترجمہ۔ اے معشوق تو انگریزوں کی طرح مکار اور فسوں ساز ہے، اور پیرس کے مہ لقا بتوں کی طرح ناز و ادا کا عادی ہے اور روس کی طرح جفا کا خوگر ہے، تو کفر زلف پر کیوں اتنا نازاں ہے یقین جان لے کہ میں تیری شکایت قیصر ولیم شاہ غازی کے سامنے لے کر جاؤں گا۔

دستوری نظام بھی سیاسی غزل کے لئے ایک موزوں موضوع ثابت ہوا ہے۔ ملک الشعراء بہار دل کو ایک مملکت سے تشبیہ دیتا ہے۔ اور دلرباؤں کو مجلس شوریٰ کے ارکان سے تشبیہ دے کر پوچھتا ہے کہ وہ دستوری نظام کی خلاف ورزی کیوں کرتے ہیں۔

دلفریباں کہ بکابینۂ دل جا دارند | مستبدانہ چرا قصد دل ما دارند
دلبراں خود سر و سر جائی و روسی معتقد | ورنہ در خانۂ غیر از چہ سبب جا دارند
گاہ لطف است و خوشی گاہ عتاب است و خطاب | تا چہ از ایں ہمہ پلٹیک تقاضا دارند
در پناہ سر زلف تو بہارستانے است | کہ درو ہیئت دل مجلس شوریٰ دارند

ترجمہ۔ معشوق جو دل کے کابینہ میں متمکن ہیں کس لئے ایک جابر بادشاہ کی طرح دل پر مظالم توڑتے ہیں جیسیں خود رائے اور سرکش ہیں اور ان میں روسیوں کی عادات ہیں ورنہ غیر کے گھر کیوں جاتے کبھی لطف و کرم ہے اور کبھی عتاب و رنگ ہے میں، وہ کب تک ان سیاسی چالوں سے کام لیتے رہیں گے، تیری زلف کی پناہ میں ایک بہارستان ہے جہاں دل جمع ہو کر مجلس شوریٰ منعقد کرتے ہیں۔

ترکوں کی تاخت و تاراج ضرب المثل ہے، جب قفقاز کے محاذ پر روسی اور ترک برسرپیکار تھے اور دونوں دشمنوں کا مدعا قفقاز کے علاقہ پر قبضہ کر کے مخالف کی فوج کو گھیر لینا تھا تو ترکوں نے اپنے ہمسایہ ایرانیوں کے ملک میں اپنی فوجیں بھیج کر ایران کو بھی محاذ جنگ بنا دیا۔ بہار نے ترکتازی کی پرانی تشبیہ کو اصلیت کا رنگ دے کر ایک ندرت پیدا کر دی ہے۔

بچہ قانون اسیہ نازت اے ترک پسر | در حدود دل یاراں ہمہ
اے ترک زادہ! کس قانون کے تحت تو نے اپنے دوستوں کے دل کو تاراج کے لئے مخصوص کر لیا ہے

قوم پرستی کی تحریک نے فارسی شاعری کی نوعیت بدل دی ہے۔ پہلے غزل ہی اس کی کائنات تھی لیکن وطنیت کے جذبات نے اس کا خاتمہ کر دیا ہے اور اس کی ہیئت بھی تبدیل کر دی ہے قصیدہ و

اصناف سخن بھی سیاسی تحریکات سے متاثر ہوئے ہیں، اگرچہ خاقانی، انوری اور فرخی جیسے استادوں کی تقلید اب بھی کی جاتی ہے لیکن موضوع پہلے سے نہیں رہے اور طرزِ بیان میں بھی نمایاں فرق آگیا ہے، فرخی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں وہ اپنے ترک غلام سے کہتا ہے کہ اب جنگ ختم ہوگئی ہے لباسِ جنگ اتار اور رنگین کپڑے پہن، چنگ اٹھا، شراب کا پیالہ لا اور دادِ طرب دے۔ تیری مشکیں زلفیں اس لئے نہیں کہ جنگ کے گرد و غبار سے آلودہ ہوں اور تیرا چاند سا چہرہ اس لئے نہیں کہ میدانِ جنگ میں سیاہ ہو جائے، ملک الشعراء بہار اسی قصیدہ کا جواب لکھتا ہے لیکن چونکہ زمانہ بدل چکا ہے اور ایران شاہِ معزول محمد علی جو روس کی شہ پاکر ایران کا حملہ آور ہوا ہے، کے مقابلہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس لئے وہ قصیدہ میں عیش و عشرت سے توجہ ہٹا کر جنگ کی تعریف کرتا ہے اور اسے حیاتِ ملت کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔

مے فرو ہل ز کف اے ترک و بیکسو نہ چنگ | جامہ جنگ فرو پوش کہ شد نوبتِ جنگ
بادہ را روز بسر شد، بنہ بادہ ز دست | جنگ را نوبت بگذشت، بنہ چنگ ز جنگ
رخ برافروز و رخ خصم بیندای بہ عبیر | قد برافروز و قد خصم دوتا ساز چو چنگ
از بر دوش تفنگ افگن و آسودہ گذر | لختے آں دو سرِ زلف سیہ غالیہ رنگ
نہ کہ آں زلف تبہ گردد از گرد مصاف | نہ کہ آں رخ سیہ گردد از دود تفنگ
زلف تو مشک است اگر و نفرساید مشک | رخ تو ماہ است از دود نگیرد مہ رنگ

ترجمہ اے ترک شراب کے پیالہ کو ہاتھ سے پھینک دے اور چنگ کو ایک طرف رکھ دے۔ جنگ کا لباس پہن۔ کیونکہ جنگ کا وقت آپہنچا، شراب کا عہد گذر گیا، شراب کو ہاتھ نہ لگا، جنگ کا وقت آپہنچا، چنگ کو ہاتھ میں نہ لے، اپنے چہرے کو چمکا اور دشمن کو روسیاہ کر، تن کر کھڑا ہو جا اور دشمن کی کمر کو چنگ کی طرح جھکا دے، کندھے پر بندوق اٹھا اور اپنی مشکیں زلفوں کا خیال نہ کر، جنگ کی گرد سے تیری زلفوں کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا، اور بندوق کا دھواں تیرے منہ کو تاریک نہیں کرے گا۔ کیونکہ تیری زلفیں مشک ہیں اور تیرا منہ چاند ہے۔

شاعر کو اپنے رفیق کے ظاہری اوصاف سے انکار نہیں، وہ اس کے حسن و خوبی کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی اسے مردانگی کے جذبات سے لبھانا چاہتا ہے، اس سے کہتا ہے کہ تو ایک آہوئے صحرا ہے لیکن میں نے تجھ سا کوئی ہرن نہیں دیکھا جو شیر کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ تو ہرن ہے لیکن اس دشت میں پلا ہے جس کے ہرن شیر کے ہم آہنگ ہوتے ہیں، تو خطۂ ایران کا ہرن ہے جس کی فتح کے نقوش خدا نے ہر پتھر پر ثبت کئے ہوئے ہیں۔ کشورِ ایران جہاں کیومرث اور ہوشنگ جیسے نامور پیدا ہوئے، جہاں جمشید اور کیخسرو جیسے عظیم الشان بادشاہوں نے بزمِ عشرت کو فروغ دیا جس کی خاک سے گشتاسپ اور دارا جیسے اکابر پیدا ہوئے، جس کے مایۂ ناز فرزند اردشیر نے رومانیوں کا سر جھکا دیا، جس کے بادشاہ شاپور نے شاہِ روم کی مشکیں کسوادیں، اور بہرام جس کے حضور میں شاہانِ زمن پابجولاں آتے تھے، ایران جس کا ذرہ ذرہ ایسے بہادروں کے کارناموں کا شاہد ہے، وہی تیرا وطن ہے۔ ایران کو صفویوں اور ساسانیوں کا عہد زریں یاد ہے اور پھر نادر قلی جیسے جہانگیر شجاعوں پر بھی اسے ناز ہے، جنہوں نے مشرق و مغرب میں اس کے نام کو روشن کیا، اگرچہ نادر شاہ کا محبوب مشغلہ جنگ تھا۔ اور اس کے عہد میں ایران کو امن نصیب نہ ہوا لیکن اس نے اس کی شوکت کو دوبالا کر دیا۔

گرچہ بد دولتِ ایران بگہ نادر شاہ | ہمہ تیغ و ہمہ تیر و ہمہ رزم و ہمہ جنگ
نیک از آں رزم بد ایران را آسایشِ بزم | ہم از آں جنگ بد ایراں را آرایش و ہنگ

ایرانی اپنے ملک کو اہل یورپ کے ہاتھوں لٹتے دیکھتے ہیں، اور اپنی قدیم عظمت کو یاد کر کے سر دھنتے ہیں۔ فرخ خراسانی

دریغ شد در رہ کہ آباد کشور سیروس | تبہ شد از ستم انگلیس و کینۂ روس
کہ بار شدند ہما چیرہ کہ نیاگانشاں | بخاک پای نیاگان ما زدندے بوس

ایرانیوں کی مصیبت ان کے عظیم الشان بزرگوں کی یاد تازہ کر دیتی ہے، کیخسرو، دارا، شاپور، اردشیر اور دوسرے ایرانی بادشاہ انہیں اپنی عظمت کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں اور یہ کہتے سنائی دیتے ہیں۔

این خرابہ قبرستان نہ ایرانِ ماست | این خرابہ ایران نیست ایران کجاست!
یہ اجڑا ہوا ملک ہمارا ایران نہیں ہو سکتا، | یہ ایران نہیں، پھر ایران کہاں ہے!

یاس و ناامیدی کے عالم میں امید کی ایک شعاع تاریکی کو چیرتی ہے۔ پیغمبر ایران زرتشت کی روح آتی ہے اور اس طرح شاہانِ ایران کو خطاب کرتی ہے۔

اے جوانمردانِ عالمگیر خفتہ در مغاک | نامتان تابندہ در آفاق و خود در زیر خاک
جائے دارد گر چہ دلتنگید از ایران کنوں | زیں پسینہائے در آورد چہ در از خود برون
حیف نیروزادگانِ خسرو کشور کشائے | دست بشمشیر نابردہ در آئینہ ریا
خیرگی بنگر کہ در مغرب زمیں غوغا بپاست | ایں ہمی گوید کہ ایراں از من آں گوید مراست

* * * * * * *

در اروپا آسیا را قسمت بنداشتند | ہر یک اندر خورد دانش چنگالہا برداشتند
بچہ کاخر تخجند کوہ در حلقوم کاہ | گرکہ ایں لقمہ فرو بردند نمی من سیاہ!

ایران کے نامور فرزند قبر میں سوئے ہوئے ہیں، ان کا نام دنیا میں روشن ہے لیکن ان کا ٹھکانا خاک تلے نیچے ہے قبر میں ان کا دل ایران کی محبت سے آزردہ ہو جاتا ہے اور اپنے نااہل فرزندوں کی روش دیکھ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔ افسوس ہے کہ بادشاہوں کی اولاد کے ہاتھ میں آج تلوار نہیں ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ مغرب میں ایران کو دبوچنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں اور اس کی تقسیم پر جھگڑے ہو رہے ہیں یورپ والے ایشیا کو ایک لقمہ سمجھتے ہیں اور ہر ایک اپنے پنجے تیز کر رہا ہے، زرتشت کی روح ہجوم ناامیدی کو درہم برہم کرتی ہوئی کہتی ہے کہ میں ایران کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ یورپ والے اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایشیا ایک ایسا لقمہ ہے جو ان کے حلق میں نہیں سما سکتا ایشیا کی گود میں ایسے فرزند پل رہے ہیں، جو اپنے اسلاف کا نام روشن کریں گے اور اپنے وطن کو آزاد کر کے رہیں گے۔

ازیں گہوارہ تا چندے دگر فرزند چند | سر برآرد سر بسر ایراں از ایشاں سر بلند
بعد ازیں اقبال ایران را دگر افسوس نیست | لکہ در سرنوشت کشور سیروس نیست

ایران میں قوم پرستی کی تحریک نے گبر و مسلمان کی قیود کو توڑ دیا ہے۔ مسلمان کیانیوں اور ساسانیوں کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں، اور پرانی ایرانی تہذیب کے احیا کے لئے سرگرم کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے لئے ماضی کا ایران آنے والے مستقل اور سربلند ایران کا پیش خیمہ ہے۔ رضا شاہ پہلوی کے زیر سایہ پہلوی عہد کے نقوش پھر چمکنے لگے ہیں، چونکہ ایران کا تاجدار اپنے پہلوی نسب پر فخر کرتا ہے اس لئے اس کی رعایا کو بھی پہلوی تہذیب و تمدن کو اپنانے میں کوئی عار نہیں، وہ مدائن، بیستون اور استخر کے کھنڈروں کو دیکھتے ہیں اور کسریٰ کی شوکت کو یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہیں، مذہب نے انہیں پرانی روایات سے بیگانہ نہیں بنایا۔ وہ پہلوی بادشاہوں پر نظمیں لکھتے ہیں، ایران کو کشور سیروس کہتے ہیں اور پرانی پہلوی زبان کو زندہ کرنے کی کوششیں بھی کرتے ہیں، عبدالعظیم خاں گرگانی اور دوسرے شعرانے خالص پہلوی میں نظمیں لکھی ہیں، حسام زادہ اور حسین دانش نے پازرگاد (شاہان ایران کے پہلے پایہ تخت) اور مدائن پر نظمیں لکھی ہیں۔ ایرانیوں میں قومی تحریک اس قدر پھیلی ہے، کہ انہیں ہر بات میں ساسانی اثر نظر آتا ہے، حتیٰ کہ سیاست کا ہر درس انہیں ساسانی کھنڈروں میں لکھا نظر آتا ہے، سید اشرف الدین، محمد علی شاہ معزول کو رعایا پروری کی طرف اس طرح توجہ دلاتا ہے کہ اسے کہتا ہے دیکھو طاقِ کسریٰ پر کیا لکھا ہے۔

گوشۂ طاقِ کسریٰ نوشتہ | شاہِ عادل بود چوں فرشتہ
خاکش از عدل و احساں سرشتہ | مملکت را بود اعتسا بے

بعض ایرانیوں کو وطن پرستی میں اس قدر غلو ہے کہ انھوں نے احکامِ اسلام کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اور نسلی منافرت پھیلانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، روشن دماغ ایرانی تو ترک، افغان اور عرب کو برادر ملت سمجھ کر عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن بعض انتہا پسند قومی تعصب سے گمراہ ہو کر ملی رشتہ کو منقطع کرنے کے درپے ہیں، اس فریق میں عارف قزوینی ترکوں اور فرخ خراسانی عربوں کی مخالفت میں پیش پیش ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۱۶ء میں ترکوں نے روسیوں کو قفقاز کے محاذ پر پے در پے شکستیں دیں اور نواح کو دشمن سے خالی کرانے کے لئے آذربائیجان پر بھی عارضی قبضہ کر لیا، ایرانی وزیر وثوق الدولہ نے مصلحت وقت کے پیش نظر کہا کہ آذربائیجان ایران کا عضوِ معطل ہے اور اگر یہ ہاتھوں سے نکل جائے تو کوئی غم نہیں، اس پر عارف قزوینی نے طیش میں آکر کہا کہ زرتشت کا وطن مالوف اور اسے وثوق الدولہ عضوِ فلیج کہے، خدا وثوق الدولہ پر فالج گرائے اور اس کی زبان گنگ ہو جائے

جاں بر خی آذربائجاں باد، ایں مہدِ زرتشت، مہد اماں باد
(مہد اماں باد)
سزا کہ کوعضو فلج گفت، عضوش فلج کو، لالش زباں باد
(لالش زباں باد)
تکیۂ ایراں تو، شہیدِ ایراں تو، امیدِ ایراں تو
دیدہ دیر رفانت از روانِ پاکاں باد

صبا زمن بگو بہ اہلِ تبریز | کہ اے ہمہ چو شیر شرزہ خونریز
ز ترک و از زبانِ ترک پرہیز | زبان فراموش کنید گفت زرتشت کراہت
خموش آتش مکنید، خرش آتش مکنید۔

ایک اور نظم میں اس طرح اس کا غصہ ترکوں پر برستا ہے۔

زترک ایں عجب نیست | چہ کہ اہل نام و نسب نیست
قدم بخانۂ کیخسرو | ایں زشرطِ ادب نیست

زبان ترک از برائے از قفا کشیدن است
صلاح پائے ایں زبان زمملکت بریدن است

فرخ خراسانی کی عرب دشمنی کی وجہ یہ ہوئی کہ بغداد کے ایک جریدے نے ایرانیوں کے بارے میں بعض نا ملایم الفاظ استعمال کیے، فرخ ان دنوں بغداد ہی میں مقیم تھا، غصہ میں جامہ سے باہر ہوگیا اور ایک قصیدہ میں عربوں کو بے نقط سنائیں، عربوں کو چور، مکار، پلید اور نابکار کہا، اور یہاں تک کہہ گیا کہ

تنہا نہیں عراق نہ ہر جا عرب کند | نجد و حجاز و تونس و مصر عرب بباد

پوردِ داؤد جیسے وسیع نظر شعرا بھی اس تعصب سے بری نہیں، وہ ایران اور ہندوستان کے پارسیوں کو متحد کرنے میں اس قدر منہمک ہے کہ اسے عربوں اور ان کی ادبیات سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔ اور وہ کسی طرح ایران میں عربی اثرات کے دیکھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

ایران میں عربی اثرات کی جگہ فرانسیسی اور انگریزی تعلیم و تمدن نے لے لی ہے، سوویٹ روس بھی ہمسایہ کی حیثیت سے ایران کی معاشرتی زندگی میں دخل دیتا رہتا ہے، لینن اور مارکس کے خیالات کی اشاعت ایران کے تعلیمی حلقوں میں ہوتی رہتی ہے۔ بعض نوجوان شعرا لینن کے اس قدر گرویدہ ہوگئے ہیں، کہ وہ اسی کی پیروی میں ایران کی نجات سمجھتے ہیں، ایران میں امرا کے خلاف نفرت کا جذبہ روز بروز زور پکڑ رہا ہے کیونکہ ملک کی تباہی کے ذمہ دار زیادہ تر یہی لوگ تھے، امرا کی رشوت ستانی اور غربا پر ان کی مشق ستم نے ایران کی تباہی میں کوئی کسر نہ چھوڑی، یہی لوگ ملک میں مضبوط حکومت قائم کرنے میں سدراہ ہوتے تھے، یہی غریبوں کے حقوق مارنے میں پیش پیش ہوتے تھے، یہی ملک میں اصلاحات کی مخالفت کیا کرتے تھے، اور یہی ہر نازک موقع پر ملک سے غداری کیا کرتے تھے، اسی صورت حالات نے حبیب یغمائی کو امرا کی مخالفت پر کمربستہ کردیا ہے، آپ اس کے اشعار پڑھئے تو یہی محسوس کریں گے کہ گویا لینن بول رہا

ہے، وہ مساواتِ حقوق پر زور دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ جب تک امیر غریب اور غریب امیر نہ ہوجائیں گے ایران کی حالت بہتر نہیں ہوگی، امرا جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر عیش کرتے ہیں دولت کے مستحق نہیں، غریب جو اپنا خون اور پسینہ ایک کرکے پیٹ پالتے ہیں امرا سے بہتر ہیں اور ان سے زیادہ دولت و ثروت کے حقدار ہیں، کارفرما اور کارگر کی منازعت بھی اسی قبیل سے ہے۔

ایرج میرزا اور نصر اللہ خاں فلسفی کے عقائد یہ ہیں کہ جب تک ایک شخص خود اپنے بازو میں زور پیدا نہیں کرتا اس کے لئے دنیا سے انصاف کی توقع فضول ہے، قدرت قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے اخلاقی قیود کو حائل نہیں ہونے دیتی، قانونِ قدرت یہ ہے کہ جو کمزور ہے مٹ جائے گا۔

قاعدہ ہے کہ جب ایک فرد یا قوم کو پے در پے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کے لئے یہ خیال کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ حق ہی کو فتح ہوتی ہے، اور بدی کا غلبہ عارضی ہوتا ہے جس کا مقصد صرف صبر و رضا کا امتحان کرنا ہوتا ہے، بیسویں صدی کے ہنگامہ آرا دور سے گذرتے ہوئے ایرانیوں کے عقائد متزلزل ہوگئے رعدی اور نصر اللہ خاں فلسفی کی شاعری کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ زندگی بہتر ہے یا موت، رعدی

بودن بہتر و یا نبودن بہتر | بودن باید یا نبودن باید
قومے گویند عمر خواب و خیال است | گفتۂ ایشاں مگر شنودن باید
و زہمہ کوشش باید بریدن پیوند | روز و شب اندر جہاں غنودن باید

می بندام بکنج عزلت ماندن | یا بہ بیضیائے خود نمودن باید

فلسفی کا قلب بھی انہی جذبات سے لبریز ہے وہ سرد و گرم روزگار کے تجربہ کے بعد کہتا ہے

افسانۂ عمر سخت محنت زاست | آں بہ کہ فسانہ مختصر گیرم

مشرق کی پستی کا نتیجہ ابتدا میں یہ ہوا کہ ایشیا والوں کو ہر بات میں اہل یورپ کا کمال نظر آنے لگا اور وہ مغرب کو ہر بات میں افضل سمجھنے لگے لیکن انقلابات زمانہ نے اس خوش اعتقادی کا خاتمہ کردیا، پہلے ہر بات میں مشرق اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا تھا اور مغرب کی برتری کے

گیست گلا نامعو.

اے فرنگی !اتفاق و عدم و منعت مال تو — عدل و قانون و مساوات و عدالت مال تو
نعل عالمگیری و جنگ و جلادت مال تو — حرص و بخل و کینہ و بغض و عداوت مال ما است
خوب راحت عیش و عشرت ناز و نعمت مال ما است

شیعی از ما بابی از ما بہائی و بابلیوں از تو — دہری از ما صوفی از ما کمنت و قانون از تو
فرقہ و ہما ہمہ از ما اشتی و باتوں از تو — گم شد اے احمق مجاز از تو حقیقت مال ما
حور و غلمان و انہار و جنت مال ما است

اہل یورپ کی مادی برتری سے کسی کو انکار نہیں لیکن جو شخص تہذیب مغرب کے سراب سے اپنی تشنگی بجھانا چاہے اس کو غافل کہنا بجا نہیں۔ میثاق روس و انگلستان اور جنگ عمومی کے واقعات نے اہل مغرب کے اخلاق کا پول کھول دیا اور تہذیب مغرب کی بھیانک اور ہولناک روش عالم آشکار ہو گئی۔ کمالی اصفہانی ان پُرجوش الفاظ میں تہذیب نو کے جرائم کا ذکر کرتا ہے۔

یک وادی ہولناک غدار — کز خنجر نیستش بجز خون
با نام حقوق و عدل رخسار — آراستہ بر نگارش افسون
چوں شاہد دل کشش بہ بازار — در جلوہ بیاید و ہمی چون
اے کاش کہ پردہ فی شعار کار — تا چند زنی تو نعل وارون
یورش بہ چہ رنگ آسمان را

ادیب السلطنت عطائی روس کی خانہ برانداختن کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ کیا یہی تہذیب ہے جس پر اہل مغرب نازاں ہیں کیا یہی اخلاق ہے جس پر اہل یورپ فخر کرتے ہیں کیا یہی نئی روش ہے جسے وہ سب دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس زمانہ کو عہد زریں کس طرح کہا جا سکتا ہے میں نے تو ایسا تاریک دور نہ دیکھا ہے نہ اس جیسے منحوس عہد کا تصور کر سکتا ہوں۔

عہد ما را عصر نورانی ہمی خوانند کس — غیر تاریکی نمی بینم بکوہ و دشت و تل

دعوئ انساں پرستی وانگہے آزار نوع — ادعای حق شناسی وانگہے بت در بغل
پیروان دین عیسی را چرا از فکر روح — این چنیں یکبارہ خاطر شد بہ دنیا مشتغل

شاعر کہتا کہ مسیح علیہ السلام تو مردوں کو زندہ کرتے تھے لیکن ان کے انسان کش پیروؤں کا وتیرہ کیا ہے؟

ہر کجا چشمے است بینا بیکنندش زود کور — ہر کجا پائے است پویا افگنندش در وحل

Congres Napoleon Peter the Great

الغیاث اللہ از چشم میدارند تا بر ہم زنند — ملک جمشید و فریدوں را نبے طول امل

نقصہ ترک سلاح آنگاہ تشہیر سلاح — کنگرہ صلح و صفا آنگاہ آغاز جدل

ایران کا ظریف شاعر روحانی مغرب کی ظاہر پرستی کا خاکہ اچھی طرح اڑاتا ہے۔ وہ پیرس کے بے ہودہ فیشن اور مغرب زدہ خواتین کے اسراف کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ مغرب پرست نوجوانوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیتا ہے اور اس طرح اپنے سادہ ہم وطنوں کے لئے تفریح کا سامان بہم کرتا ہے۔

وطنیت، مغربیت اور اس کے رد عمل کی تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں تحریک نسواں کو بھول نہ جانا چاہئے ایران کے سرکردہ شعراء اور زعماء آزادی نسواں کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ شعراء کی اکثریت پردہ کی مخالف ہے اور اسے دختر کشی سے تعبیر کرتی ہے۔ تعدد ازدواج کو بدترین گناہ کہا جاتا ہے۔ ملا اور تنگ دل مشائخ جو عورتوں کی آزادی کے خلاف ہیں مورد طعن کئے جا رہے ہیں۔ شعراء ملاؤں اور رجعتیوں پر پھبتی ہوئی پھبتیاں کہتے ہیں۔ جلال الملک ایرج میرزا کو پردہ کے متعلق ایک مزے کی تشبیہ ہاتھ آئی ہے۔

گفتم من کہ این دنیا بہشت است و بہشت حور در لفافہ رشتہ است

آگے چل کر کہتا ہے کہ ہم ایک خربوزہ خریدنا چاہتے ہیں تو دیکھ بھال کر خریدتے ہیں لیکن جس کے ساتھ ہمیں تمام عمر بسر کرنی ہوتی ہے اس کی صورت تک سے آشنا نہیں ہوتے۔ یہ ملاؤں کی شرارت کا نتیجہ ہے کہ متاہل زندگی جسے بہشت آرزو ہونا چاہئے قید کا ... ہو

در ایران تا بود ملا و مفتی — بروز بدتر از ایں ہم ہبینی

محمد کسائی کہتا ہے کہ ایران کی نصف آبادی مردہ ہے۔ اگر عورتوں کو حقوق نہیں ملتے اور اسے راہ عمل پر گامزن ہونے کا موقع نہیں دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایران کی نصف آبادی کو زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ کیا مضحکہ خیز قانون ہے جس نے عورتوں کو تو گھروں میں بند کر دیا ہے اور لمبی لمبی داڑھیوں والے حاجیوں کو آزاد کیا ہے۔

در ملکتے کہ زن اسیر است — و اندر کفن سیاہ ملفوف
در ملکتے کہ زن بحبس است — واں حاجی ریش جرمہ مکشوف

زن چیست بجاست ہکو و چرا پس — در کوچہ و شہر خود نمایست

زن نیست درین دیار ورنہ | گر ہست چرا بشہر پا نیست
گہ گہ در کوچہ یک سیاہی | می بینم لیک جز دو پا نیست
او بے حقوقِ خود نبردہ است | گر زندہ بود بحکم مردہ است
اولیٰ است بر او نماز میّت | تا بے حقوقِ خود نبردہ است

زمانہ کی روز افزوں ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قوم راہِ ترقی میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دے، قوم کا ہر فرد ملک کی بہبودی کے لئے اپنے تمام مساعی وقف کر دے، اگر کسی قوم کی عورتیں عضوِ معطل کی طرح ہیں تو وہ ضرور ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جائے گی ضرورتِ وقت یہ ہے کہ عورتیں تعلیم حاصل کریں، مردوں کی طرح آزاد ہوں، پارلیمنٹ اور دوسری مجالس میں شرکت کریں اور ہر بات میں مردوں کا ہاتھ بٹائیں، اگر اس کے لئے پردہ ترک بھی کرنا پڑے جب بھی قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر ہمیں خوش ہونا چاہیئے، کیونکہ عورت کی بہترین متاع عفت ہے نہ کہ چادر و برقع،

شیخنا! نوبتِ تحصیلِ زنان ہست امروز | با توے فاضلہ یک رکن جہان است امروز
صحبت از شرکت در پارلمان است امروز | چادر و پیچہ دگر نقصِ زنان ست امروز
شیخنا عفت با داشتن چادر نیست
یا اگر ہست پس آن قحبہ با چادر کیست!

تعددِ ازدواج کے لئے مغرب میں تو یہ جواز ہے کہ وہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے لیکن وہاں قانون نے اسے ممنوع قرار دیا ہے، مشرق میں جہاں عورتوں اور مردوں کی تعداد قریب برابر ہے تعددِ ازدواج کی کوئی مستحسن دلیل پیش نہیں کی جاسکتی، بلکہ اسے عورتوں پر ایک ناروا ظلم سمجھنا چاہیئے۔ علاوہ بریں یہ عورتوں کی زندگی ہی کو تلخ نہیں بناتا بلکہ ملک کی حالت پر بھی اس کے اثرات خوشگوار نہیں ہوتے اور مرد کی حالت کا تو پوچھنا ہی کیا، فرات

مردیکہ دو زن گرفت دخوں گردد | حالش زغم و غصہ دگرگوں گردد
ہر کس کہ بہ دل مہرِ دو لیلیٰ دارد | آشفتہ تر از ہزار مجنوں گردد

ایران کی موجودہ شاعری میں ملوکیت اور جمہوریت، محنت اور سرمایہ کی کشمکش کا نقشہ نظر آتا ہے، مشرق و مغرب کی آویزش اور وطنیت کی تحریک جو اس آویزش کا نتیجہ تھی۔ دورِ حاضر کی فارسی شاعری کی روحِ رواں ہے قدیم ایران کی تہذیب کا احیا اور مناظرِ قدرت سے دلچسپی بھی وطنیت کی تحریک کا ایک شاخسانہ ہے، شاعری اب سیاسی اور اقتصادی تحریکات اور معاشرت کے مسائل سے الگ تھلگ نہیں، بلکہ اب ہر شاعر ملکی تحریکات میں گرمجوشی سے حصہ لیتا ہے، شاعری اب محض عشق و محبت، نیاز و ناز، اور عشوہ و ادا کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ زندگی کا ہر مسئلہ اب اس کے احاطہ میں داخل ہو گیا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عشق کے جذبات اب بالکل مردہ ہو گئے ہیں اور حسن پرستی کی رسم دنیا سے اٹھ گئی ہے، اگرچہ شاعر اب غمِ عشق ہی میں نہیں، غمِ روزگار میں بھی مبتلا ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی کوئی پھول سا چہرہ نظر آتا ہے تو بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، سالار

بتانِ پارسی ایں گونہ گر خرام کنند | خرامِ سروِ چماں در چمن حرام کنند
بماہ چہرہ چو زلفِ سیہ بر افشانند | صباحِ دل شدگاں را سیہ چو شام کنند
عیاں کنند شبے گر ہلالِ ابرو را | ز شرمِ حلقہ بگوشے مہِ تمام کنند

عطاء اللہ کلیم

رباعی

وہ جام کہ قوتِ روح و جان ہے ساقی | وہ جام کہ عیشِ جاوداں ہے ساقی
وہ جامِ طربناک پلا تو، کہ ہنوز | زیرِ مژۂ یار نہاں ہے ساقی

سعید احمد اعجاز

رباعیات

(۱)

ساقی نہ شراب ہے نہ مستی نہ سرود
نغمے ہے نہ جنون و عشق کا ہے نہ وجود
[illegible] اس میں نہ مجھ کو خیال اے دل ناداں
جب [illegible] پیالہ ہی کا ہے مقصود

(۲)

اب جام نہ خمار سے ہے سر مستی کا
اوج ہے نہ پیالہ پینے کا
عازم ہے [illegible] محروم
ان نالہ کشوں میں ہے [illegible] مستی کا
معلوم نہیں حال ہے

(۳)

ہلکی سی پھوار اور سرکنا ابر دریا
یا صبح بہار اور سرکنا ابر دریا
یا [illegible] محروم
قسمت سے ملتی ہیں سرکنا ابر دریا
ساون اشجار اور سرکنا ابر دریا

(۴)

دم [illegible] یار ساقی کا بھرتا ہے
حیراں ہوں کہ دل میرا کیا کرتا ہے
خوف اس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن
الزام گناہ سے بہت ڈرتا ہے

تلوک چند محروم

بے بسی

افرادِ تمثیل

تین بیٹیاں ۔ نانا ۔ باپ ۔ رشتے کے ماموں ۔ خادمہ

منظر:۔ دیہاتی وضع کے ایک پرانے گھر کا کمرہ ۔ کمرے میں مدھم روشنی ۔ ایک دروازہ دائیں طرف ، ایک بائیں طرف ۔ اور پوشیدہ دروازہ کونے میں ، عقبی حصے میں رنگین شیشوں والی کھڑکیاں جن میں سبز رنگ نمایاں ہے ۔ شیشوں والا ایک دروازہ برآمدے میں کھلتا ہے ۔ ایک کونے میں لمبا سا گھنٹہ ، ایک چراغ روشن ہے ۔

تینوں بیٹیاں ۔ یہاں آجائیے نانا ابا روشنی میں بیٹھ جائیے ۔

نانا ۔ مجھے تو یہاں کچھ زیادہ روشنی معلوم نہیں ہوتی ۔

باپ ۔ ہم برآمدے میں چلیں یا اسی کمرے میں بیٹھے رہیں ؟

ماموں ۔ کیا یہیں بیٹھا رہنا بہتر نہ ہوگا ؟ سارے ہفتے بارش ہوتی رہی ہے اور راتیں پُرنم اور سرد ہیں ۔

بڑی لڑکی ۔ پھر بھی تارے تو چمک رہے ہیں ۔

ماموں ۔ تارے ۔۔۔۔ ان سے کیا فایدہ !

نانا ۔ یہیں ٹھہرنا بہتر ہے ۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہونے والا ہے ۔

باپ ۔ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ۔ خطرہ گزر گیا اور وہ بچ گئی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔

نانا ۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے ۔

باپ ۔ یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں !

نانا ۔ میں نے اس کے کراہنے کی آواز سنی تھی

باپ ۔ مگر ڈاکٹروں نے تو ہمیں ان کی صحت کا یقین دلایا ہے ۔

ماموں ۔ تم تو خوب جانتے ہو کہ تمہارے خسر خواہ مخواہ ہمیں گھبرایا کرتے ہیں

نانا ۔ اس لیے کہ میں بصارت سے محروم ہوں اور تمہاری طرح دیکھ نہیں سکتا ۔

ماموں ۔ تو پھر آپ کو ہم پر اعتماد کرنا چاہیئے ، اُن پر جو دیکھ سکتے ہیں ۔ آج سہ پہر کو تو ان کی حالت بہت اچھی نظر آرہی تھی ۔ وہ اب آرام سے سو رہی ہیں ، اور ہم اس پہلی پُرسکون شام کو برباد نہیں کرنا چاہتے جسے قسمت نے ہمارے راستے میں لا ڈالا ہے ۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مطمئن ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے ، بلکہ آج شام کو بغیر کسی خوف کے ہم تھوڑا سا ہنس بول بھی سکتے ہیں ۔

باپ :۔ یہ حقیقت ہے ، اس خوفناک جاپے کے بعد سے آج پہلا موقع ہے کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے اپنے گھر میں آسودہ ہوں ۔

ماموں :۔ گھر میں جب ایک دفعہ بیماری آجاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اجنبی زبردستی خاندان میں گھس آیا ہو ۔

باپ :۔ اور ہاں اُسی وقت اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ غیروں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے ۔

ماموں :۔ تم بالکل سچ کہہ رہے ہو ۔

نانا :۔ تم مجھے اپنی بچی کے پاس کیوں نہیں جانے دیتے ۔

ماموں :۔ آپ خوب جانتے ہیں ۔۔۔۔ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے ۔

نانا ۔ آہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ۔۔۔۔

ماموں:۔ پریشاں ہونا معمولی سی بات ہے

نانا:۔ (بائیں جانب کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

ہماری آواز تو اس کی نیند میں مخل نہیں ہوگی

باپ:۔ ہم بہت زور سے باتیں نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ دروازہ

بہت دبیز ہے اور ایک خادمہ ان کے پاس ہے۔ اگر ہماری

وجہ سے زیادہ شور ہوگا تو وہ آکر ہمیں ضرور منع کر دے گی۔

نانا:۔ (دائیں جانب کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

ہماری آواز سے بچہ تو بے آرام نہیں ہوگا!

باپ:۔ نہیں نہیں۔

نانا:۔ وہ سو رہا ہے؟

باپ:۔ ہاں شاید

نانا:۔ کوئی جا کر دیکھ آئے تو بہتر ہے۔

ماموں:۔ تمہاری بیوی سے زیادہ مجھے تمہارے بچے کی طرف سے

پریشانی ہے اُسے پیدا ہوئے کئی ہفتے گزر گئے مگر اس نے

مشکل ہی سے اب تک کوئی جنبش کی ہوگی اس سارے عرصہ

میں وہ ایک دفعہ بھی نہیں رویا! وہ تو بالکل موم کی گڑیا معلوم

ہوتا ہے۔

نانا:۔ میں سمجھتا ہوں وہ بہرا ہوگا —— گونگا بھی، شاید ——

رشتے کے بھائی بہنوں میں شادی اگر ہوتی ہے تو عام طور سے

یہی نتیجہ نکلتا ہے۔۔۔۔۔ (خاموشی)

باپ:۔ جو تکلیف اس نے اپنی ماں کو پہنچائی ہے اُسے دیکھتے ہوئے

میں اس بچہ کا بدخواہ سا ہو گیا ہوں۔

ماموں:۔ نادانوں کی سی باتیں نہ کرو اس بیچاری ننھی سی جان کا کوئی

قصور نہیں ہے کیا وہ کمرے میں بالکل تنہا ہے!

باپ:۔ ہاں ڈاکٹر کی رائے نہیں ہے کہ وہ آئندہ اپنی ماں کے کمرے

میں رہے۔

ماموں:۔ لیکن انّا تو اس کے پاس ہے نا؟

باپ:۔ نہیں، وہ تھک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے آرام کرنے گئی

ہے، پچھلے دنوں اُس نے بہت محنت کی۔ ناہید ذرا جا کر دیکھنا

سو رہا ہے یا نہیں۔

بڑی لڑکی:۔ بہت اچھا، ابّا۔

(تینوں بہنیں اٹھتی ہیں اور ساتھ میں ہاتھ ڈالیں دائیں جانب کے کمرے

میں چلی جاتی ہیں)

باپ:۔ تمہاری آپا کب آئیں گی!

ماموں:۔ میرا قیاس ہے کہ نو بجے تک آجائیں گی۔

باپ:۔ اب تو نو بج چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آج رات کو آجائیں

گی۔ میری بیوی اُن سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہیں۔

ماموں:۔ وہ آئیں گی ضرور۔ کیا یہ پہلا موقع ہوگا کہ وہ یہاں آئیں گی؟

باپ:۔ وہ اس گھر میں پہلے کبھی نہیں آئیں۔

نانا:۔ کیا تمہیں کچھ پریشانی نہیں ہے۔

ماموں:۔ ہمیں پریشانی کس بات کی ہو؟ اس کا بار بار ذکر کرنے سے آخر

فایدہ کیا، اب کسی بات کا خطرہ نہیں ہے۔

نانا:۔ تمہاری آپا تم سے بڑی ہیں؟

ماموں:۔ وہ ہم سب سے بڑی ہیں۔

نانا:۔ مجھے نہیں معلوم مجھے کیا چیز تکلیف پہنچا رہی ہے مجھے بے چینی

سی ہو رہی ہے کاش تمہاری آپا یہاں ہوتیں۔

ماموں:۔ وہ ضرور آئیں گی۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا۔

نانا:۔ کاش یہ رات جلد ختم ہو جائے۔

(تینوں لڑکیاں واپس آتی ہیں)

نانا:۔ کیا وہ سو رہا ہے؟

بڑی لڑکی:۔ جی ہاں نانا ابّا، خوب گہری نیند

ماموں:۔ اس انتظار میں ہم کیا کریں!

باپ:۔ انتظار کس کا؟

ماموں:۔ آپا کا۔

باپ:۔ ناہید تمہیں کوئی آتا تو دکھائی نہیں دے رہا!

بڑی لڑکی:۔ (کھڑکی میں سے جھانک کر) نہیں ابّا

باپ:۔ چمن میں کوئی نہیں ہے! چمن نہیں نظر آ رہا ہے!

بڑی لڑکی:۔ جی ہاں ابّا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور سرو کے جنگل تک

مجھے چمن نظر آ رہا ہے۔

نانا:۔ اور تمہیں کوئی آتا نظر نہیں آ رہا؟

بڑی لڑکی:۔ کوئی بھی نہیں نانا ابّا۔

ماموں:۔ آج کی رات کیسی ہے؟

بڑی لڑکی:۔ بہت اچھی۔ آپ کو بلبلوں کی آواز سنائی دے رہی

ہے۔

ماموں :۔ ہاں، ہاں

بڑی لڑکی :۔ چمن میں ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں!

نانا :۔ چمن میں ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں!

بڑی لڑکی :۔ جی ہاں۔ درختوں میں خفیف سی جنبش ہے

ماموں :۔ مجھے تعجب ہے کہ آپا ابھی تک یہاں نہیں آئیں۔

نانا :۔ مجھے اب بلبلوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔

بڑی لڑکی :۔ نانا آبا میرا خیال ہے کہ چمن میں کوئی آیا ہے۔

نانا :۔ وہ کون ہے!

بڑی لڑکی :۔ میں نہیں جانتی مجھے کوئی نظر نہیں آرہا

ماموں :۔ کیونکہ وہاں کوئی نہیں ہے۔

بڑی لڑکی :۔ چمن میں کوئی نہ کوئی ضرور آیا ہوگا۔ بلبلوں نے ایک دم سے چہکنا چھوڑ دیا۔

نانا :۔ مگر مجھے تو کسی کے آنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔

بڑی لڑکی :۔ تالاب کے قریب سے کوئی ضرور گزر رہا ہے۔ کیونکہ راج ہنس خائف نظر آرہے ہیں۔

دوسری لڑکی :۔ تالاب کی ساری مچھلیاں ایک دم سے تہ میں بیٹھ گئی ہیں۔

باپ :۔ تمہیں کوئی نظر تو نہیں آرہا!

بڑی لڑکی :۔ جی نہیں آبا۔

باپ :۔ لیکن تالاب پر تو چاندنی ہے۔ . . . .

بڑی لڑکی :۔ جی ہاں، مجھے راج ہنس خائف نظر آرہے ہیں۔

ماموں :۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بہن ہی سے ڈر رہے ہیں۔ وہ چھوٹے دروازے میں سے داخل ہوئی ہوں گی۔

باپ :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کتے کیوں نہیں بھونکے۔

بڑی لڑکی :۔ محافظ کتا اپنی کوٹھری کے پیچھے مجھے نظر آرہا ہے راج ہنس تالاب کے دوسرے کنارے کا رخ کر رہے ہیں۔ . . . . .

ماموں :۔ وہ میری بہن سے ڈر رہے ہیں۔ میں جا کر دیکھتا ہوں (آواز دیتا ہے) آپا! آپا کیا تم آرہی ہو؟ . . . . وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے

بڑی لڑکی :۔ مجھے یقین ہے کہ چمن میں کوئی آیا ضرور ہے۔ آپ دیکھیں گے

ماموں :۔ لیکن اگر وہ ہوتیں تو میری آواز کا جواب ضرور دیتیں۔

نانا :۔ بلبلوں نے پھر چہکنا شروع کر دیا ہے نا، ناہید؟

بڑی لڑکی :۔ مجھے تو ایک کی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی۔

نانا :۔ سب چپ چاپ ہیں؟

باپ :۔ قبر کی سی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔

نانا :۔ کوئی اجنبی ہی ہوگا جس سے وہ خائف ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اگر کوئی گھر کا آدمی ہوتا تو وہ چہکنا بند نہ کرتے۔

ماموں :۔ ان بلبلوں پر آپ کا یہ مباحثہ آخر کب تک جاری رہے گا!

نانا :۔ ناہید کیا ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں؟

بڑی لڑکی :۔ شیشوں والا دروازہ کھلا ہوا ہے نانا آبا۔

نانا :۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سردی کمرے میں گھس رہی ہے۔

بڑی لڑکی :۔ چمن میں کچھ جھونکے آرہے ہیں نانا ابا۔ اور گلاب کی پتیاں گر رہی ہیں۔

باپ :۔ اچھا تو دروازہ بند کر دو۔ اب بہت دیر ہو گئی۔

بڑی لڑکی :۔ بہت اچھا آبا. . . مجھ سے تو دروازہ بند نہیں ہوتا۔

دوسری دونوں لڑکیاں :۔ ہم سے تو دروازہ بند نہیں ہوتا۔

نانا :۔ کیوں! آخر کیا ہوا دروازے کو میری بچیو۔

ماموں :۔ آپ اس قدر عجیب لہجے میں کیوں کہہ رہے ہیں میں جا کر ان کی مدد کرتا ہوں۔

بڑی لڑکی :۔ ہم سے یہ پوری طرح بند نہیں ہوتا۔

ماموں :۔ سیل کی وجہ ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اسے دھکیلیں۔ کوئی چیز اسے روک رہی ہے۔

باپ :۔ بڑھئی کل آکر اسے ٹھیک کر جائے گا۔

نانا :۔ کیا بڑھئی کل آئے گا؟

بڑی لڑکی :۔ جی ہاں نانا آبا تہہ خانہ میں اسے کچھ کام کرنا ہے۔

نانا :۔ وہ گھر میں غل مچائے گا۔

بڑی لڑکی :۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ چپکے چپکے کام کرے۔

(ایک دم سے ایسی آواز سنائی دیتی ہے جیسے کوئی درانتی تیز کر رہا ہو)

ماموں :۔ یہ آواز کس کی ہے؟

بڑی لڑکی :۔ مجھے ٹھیک تو معلوم نہیں، شاید مالی ہوگا مجھے صاف نظر نہیں آرہا۔ وہ گھر کے سائے میں ہے۔

باپ :۔ مالی گھاس کاٹنے جا رہا ہے۔

ماموں :۔ کیا وہ رات کو گھاس کاٹتا ہے؟

باپ:۔ کل تو ار منا؟ —— ہاں میں نے دیکھا تھا کہ گھر کے چاروں طرف بڑی بڑی گھاس اُگ آئی ہے۔

نانا:۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی درانتی اتنا شور مچا رہی ہے جتنا۔۔

بڑی لڑکی:۔ وہ گھر کے پاس ہی گھاس کاٹ رہا ہے۔

نانا:۔ آپ کیا وہ تمہیں نظر آرہا ہے؟

بڑی لڑکی:۔ جی نہیں نانا ابا۔ وہ تاریکی میں کھڑا ہے۔

نانا:۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری بچی کو جگا دے گا۔

ماموں:۔ ہمیں تو مشکل ہی سے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

نانا:۔ مجھے ایسا سنائی دیتا ہے گویا وہ گھر کے اندر ہی گھاس کاٹ رہا ہے۔

ماموں:۔ مریضہ اس کی آواز نہیں سن سکے گی کوئی خطرہ نہیں ہے۔

باپ:۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آج رات کو چراغ ٹھیک ٹھیک نہیں جل رہا۔

ماموں:۔ اس میں تیل کم ہے۔

باپ:۔ آج ہی تو میرے سامنے اس میں تیل بھرا گیا ہے۔ جب سے کھڑکی بند ہوئی ہے یہ ٹھیک نہیں جل رہا۔

ماموں:۔ شاید چمنی صاف نہیں ہے

باپ:۔ ابھی ٹھیک ہوا جاتا ہے۔

بڑی لڑکی:۔ نانا ابا سو گئے۔ وہ تین رات کے جاگے ہوئے ہیں۔

باپ:۔ وہ پریشان بہت رہتے۔

ماموں:۔ وہ ہمیشہ بہت پریشان ہوا کرتے ہیں بعض دفعہ انہیں عقل کی بات سمجھاؤ تو نہیں سمجھتے۔

باپ:۔ اس عمر میں ایسی باتیں لائق درگذر ہیں۔

ماموں:۔ خدا جانے اس عمر میں ہم کیسے ہوں گے! کتنی عمر ہوگی؟

باپ:۔ اسی کے پیٹے میں ہیں۔

ماموں:۔ پھر تو انہیں عجیب عجیب باتیں کرنے کا حق حاصل ہے۔

باپ:۔ وہ بھی اور نابینا لوگوں کی طرح ہیں۔

ماموں:۔ مگر سوچتے بہت ہیں۔

باپ:۔ ان کے پاس وقت بہت ہوتا ہے۔

ماموں:۔ انہیں اور کرنا ہی کیا پڑتا ہے۔

باپ:۔ اور اس کے علاوہ ان کا خیال بٹانے کے لئے کوئی چیز نہیں ہوتی۔

ماموں:۔ یہ بڑی کٹھن بات ہوتی ہوگی۔

باپ:۔ بظاہر وہ اس کے عادی ہو چکے ہیں۔

ماموں:۔ میں تو اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔

باپ:۔ ایسے لوگ یقیناً قابل رحم ہوتے ہیں۔

ماموں:۔ یہ نہ جاننا کہ کوئی کہاں ہے، یہ نہ جاننا کہ کوئی کہاں سے آیا ہے، یہ نہ جاننا کہ کوئی کہاں جا رہا ہے، اس لائق نہ ہونا کہ دن اور رات میں تمیز کر سکیں یا جاڑے اور گرمی میں امتیاز کر سکیں —— اور ہمیشہ تاریکی ہی تاریکی میں تو ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں کیا یہ قطعی لاعلاج ہے!

باپ:۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے

ماموں:۔ مگر وہ بالکل اندھے تو نہیں ہیں؟

باپ:۔ اگر بہت تیز روشنی ہو تو وہ پہچان لیتے ہیں۔

ماموں:۔ ہمیں اپنی عزیز آنکھوں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔

باپ:۔ انہیں اکثر عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔

ماموں:۔ بعض اوقات تو ان کی باتیں اجیرن ہو جاتی ہیں۔

باپ:۔ وہ جو کچھ سوچتے ہیں کہہ دیتے ہیں

ماموں:۔ مگر وہ سدا ایسے تو نہیں تھے؟

باپ:۔ نہیں کبھی وہ بالکل ہماری طرح معقول تھے کبھی کوئی عجیب بات نہیں کہتے تھے —— [illegible] افزائی حد سے زیادہ کرتی ہے۔ وہ ان کے [illegible] جواب دیئے چلی جاتی ہے۔۔

ماموں:۔ ان کی ہر بات کا جواب نہ دینا بہتر ہوگا۔ یہ لو [illegible] مثال ہے (دس بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

نانا:۔ (جاگتے ہوئے) کیا میرا رخ شیشوں والے دروازے کی طرف ہے؟

بڑی لڑکی:۔ آپ کو اچھی طرح نیند آئی نانا ابا؟

نانا:۔ کیا میرا رخ شیشوں والے دروازے کی طرف ہے؟

بڑی لڑکی:۔ جی ہاں نانا ابا۔

نانا:۔ اس دروازے کے آگے تو کوئی کھڑا نہیں ہے؟

بڑی لڑکی:۔ جی نہیں نانا ابا مجھے تو کوئی نظر نہیں آرہا۔

نانا:۔ میں نے جانا کہ کوئی منتظر کھڑا ہے۔ کوئی نظر نہیں آرہا ہے

بڑی لڑکی:۔ کوئی نہیں نانا ابا۔

نانا:۔ (باپ اور ماموں سے) اور تمہاری آپا ابھی تک نہیں آئیں!

ماموں:۔ اب تو بہت دیر ہو گئی۔ وہ نہیں آئیں گی انھوں نے اچھا نہیں کیا۔

باپ:۔ مجھے ان کی طرف سے تشویش ہونے لگی ہے

(ایک آواز سنائی دیتی ہے جیسے کوئی آرہا ہو)

ماموں:۔ لو وہ آرہی ہیں۔ تم نے سنا!

باپ:۔ ہاں کوئی پیچھے گھر میں داخل ہوا ہے۔

ماموں:۔ ہماری آپا ہی ہوں گی۔ میں نے ان کے قدموں کی آواز سے پہچان لیا۔

نانا:۔ میرے کانوں میں تو ایسی آواز آئی ہے جیسے کوئی چپکے چپکے قدم اٹھاتا ہو۔

باپ:۔ وہ بہت چپکے سے داخل ہوئی ہیں۔

ماموں:۔ وہ جانتی ہیں کہ یہاں ایک مریضہ ہے۔

نانا:۔ مجھے اب کچھ سنائی نہیں دے رہا۔

ماموں:۔ وہ سیدھی اوپر آئیں گی نیچے انہیں بتا دیا جائے گا کہ ہم یہاں ہیں۔

باپ:۔ میں خوش ہوں کہ وہ آگئیں

ماموں:۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آج رات کو ضرور آئیں گی۔

نانا:۔ بڑی دیر لگا دی انھوں نے اوپر آنے میں

ماموں:۔ بہرحال ہوں گی وہی۔

باپ:۔ ہم اور کسی کے تو منتظر ہیں بھی نہیں۔

نانا:۔ مجھے تو نیچے کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی

باپ:۔ میں ملازمہ کو بلاتا ہوں۔ معلوم ہو جائے گا کیا بات ہے (گھنٹی کی رسی کھینچتا ہے)

نانا:۔ مجھے تو کسی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آرہی ہے۔

باپ:۔ ملازمہ اوپر آرہی ہوگی۔

نانا:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔

باپ:۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر آرہی ہے۔

نانا:۔ مجھے تمہاری آپا کے قدموں کی آواز آرہی ہے

باپ:۔ مجھے تو صرف ملازمہ کے چلنے کی آواز آرہی ہے۔

نانا:۔ تمہاری آپا ہی ہیں! تمہاری آپا ہی ہیں!

(چھوٹے دروازے پر کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

ماموں:۔ وہ پچھلے زینے کے دروازے کو کھٹکھٹا رہی ہیں۔

باپ:۔ میں خود جا کر کھولوں گا (دروازے کو تھوڑا سا کھولتا ہے ملازمہ باہر کھڑی نظر آتی ہے) کہاں ہو تم؟

خادمہ:۔ یہاں سرکار۔

نانا:۔ تمہاری آپا دروازے پر کھڑی ہیں؟

ماموں:۔ مجھے تو صرف ملازمہ نظر آرہی ہے

باپ:۔ یہ تو صرف خادمہ ہے (خادمہ سے) وہ کون تھا جو ابھی ابھی گھر میں آیا تھا؟

خادمہ:۔ گھر میں آیا تھا؟

باپ:۔ ہاں ابھی ابھی کوئی آیا تھا!

خادمہ:۔ اندر تو کوئی بھی نہیں آیا سرکار

نانا:۔ یہ کون اس طرح سرد آہیں بھر رہا ہے؟

ماموں:۔ خادمہ ہے ہانپ رہی ہے

نانا:۔ کیا وہ رو رہی ہے؟

ماموں:۔ نہیں تو، وہ آخر رونے کیوں لگی؟

باپ:۔ (خادمہ سے) ابھی ابھی کوئی اندر نہیں آیا تھا؟

خادمہ:۔ نہیں سرکار

باپ:۔ مگر ہم نے تو ایسی آواز سنی ہے جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہو!

خادمہ:۔ وہ تو میں دروازہ بند کر رہی تھی۔

باپ:۔ کیا وہ کھلا ہوا تھا!

خادمہ:۔ جی ہاں سرکار

باپ:۔ اتنی رات گئے دروازہ کیوں کھلا پڑا تھا؟

خادمہ:۔ سرکار مجھے تو معلوم نہیں۔ میرے بعد کوئی باہر گیا ہوگا سرکار......

باپ:۔ تمہیں ہوشیار رہنا چاہئے — دروازے کو مت دھکیلو تم جانتی ہو یہ کھلنے میں کس قدر شور مچاتا ہے!

خادمہ:۔ مگر میں نے تو اسے چھوا بھی نہیں سرکار

باپ:۔ مگر تم دھکیل تو رہی ہو۔ اس طرح دھکیل رہی ہو گویا کرے کے

اندر آنے کی کوشش کر رہی ہو۔

خادمہ:۔ مگر سرکار میں تو تین گز پر کھڑی ہوں۔

باپ:۔ اتنے زور سے مت بولو۔۔۔

نانا:۔ کیا تم روشنی بجھا رہے ہو!

بڑی لڑکی:۔ جی نہیں نانا ابا

نانا:۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دم سے گہری تاریکی ہو گئی ہو۔

باپ:۔ (خادمہ سے) اب تم نیچے جا سکتی ہو مگر سیڑھیاں اترنے میں شور نہ مچانا۔

خادمہ:۔ میں نے سیڑھیوں پر بالکل شور نہیں مچایا۔

باپ:۔ میں جو تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم نے شور مچایا تھا۔ آہستہ آہستہ اتر جاؤ ورنہ تم اپنی بیگم صاحبہ کو جگا دو گی اور اگر اب کوئی آئے تو اُس سے کہہ دینا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔

ماموں:۔ ہاں کہنا ہم گھر پر نہیں ہیں۔

نانا:۔ (کانپ کر) تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئیے۔

باپ:۔ سوائے میری بہن اور ڈاکٹر کے۔

ماموں:۔ ڈاکٹر کب آئے گا؟

باپ:۔ نصف شب سے قبل وہ نہ آسکے گا۔

(وہ دروازہ بند کر دیتا ہے۔ گھنٹہ گیارہ بجاتا ہے)

نانا:۔ وہ اندر آ گئی ہے؟

باپ:۔ کون!

نانا:۔ خادمہ

باپ:۔ نہیں، وہ نیچے چلی گئی ہے۔

نانا:۔ میں یہ سمجھا تھا کہ وہ میز کے قریب بیٹھی ہے۔

ماموں: خادمہ!

نانا:۔ ہاں

ماموں:۔ کیا خوب!

نانا:۔ کمرے میں کوئی نہیں آیا ہے؟

باپ:۔ نہیں، اندر کوئی نہیں آیا۔

نانا:۔ اور تمہاری آپا یہاں نہیں ہیں؟

ماموں:۔ آپا نہیں آئیں۔

نانا:۔ تم مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو!

ماموں:۔ آپ کو دھوکا!

نانا:۔ ناہید خدا کے لیے مجھ سے سچ سچ کہو۔

بڑی لڑکی:۔ نانا ابا، نانا ابا، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

نانا:۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے مجھے یقین ہے کہ میری بچی کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہے۔۔۔

ماموں:۔ کیا آپ خواب دیکھ رہے ہیں؟

نانا:۔ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔۔۔۔

ماموں:۔ اس صورت میں تو آپ ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

نانا:۔ ناہید مجھے سچ سچ بتاؤ۔

بڑی لڑکی:۔ مگر ہم نے تو آپ سے سچ سچ کہہ دیا ہے، نانا ابا!

نانا:۔ تم اپنی معمولی آواز میں نہیں بول رہی ہو۔

باپ:۔ یہ اس وجہ سے کہ آپ نے اسے ڈرا دیا ہے۔

نانا:۔ تمہاری آواز بھی بدلی ہوئی ہے۔

باپ:۔ آپ گھبرا گئے ہیں۔

(وہ اور ماموں آپس میں ایسے اشارے کرتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نانا کے حواس خمسہ جاتے رہے)

نانا:۔ میں خوب سمجھ رہا ہوں کہ تم ڈر رہے ہو۔

باپ:۔ مگر ہم آخر ڈرتے کس سے ہیں؟

نانا:۔ تم مجھے کیوں دھوکا دینا چاہتے ہو؟

ماموں:۔ آپ کو کون دھوکا دینا چاہتا ہے؟

نانا:۔ تم نے چراغ کیوں گل کر دیا؟

ماموں:۔ مگر چراغ تو گل نہیں کیا گیا اب بھی اتنی ہی روشنی ہے جتنی پہلے تھی۔

بڑی لڑکی:۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چراغ کی روشنی کم ہو گئی ہے۔

باپ:۔ مجھے اب بھی اتنا ہی نظر آرہا ہے جتنا پہلے نظر آرہا تھا۔

نانا:۔ میری آنکھوں پر تو پتھر کی سلیں رکھی ہیں۔ بچو، مجھے بتاؤ یہاں کیا ہو رہا ہے! خدا کے لئے مجھے بتاؤ تم جو دیکھ سکتے ہو۔ میں تنہا ہوں اس بے انتہا تاریکی میں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے پاس کون بیٹھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔ ابھی ابھی تم کانا پھوسی کر رہے تھے!

باپ:۔ کانا پھوسی تو کسی نے بھی نہیں کی۔

نانا:۔ تم نے دروازے پہ چپکے چپکے باتیں کی تھیں

باپ:۔ جو کچھ میں نے کہا وہ آپ نے سن ہی لیا۔

نانا:۔ تم اپنے ساتھ کسی کو کمرے میں لائے تھے! .....

باپ:۔ لیکن میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ کمرے میں کوئی نہیں آیا۔

نانا:۔ تمہاری آپا آئی ہیں یا پادری؟ تمہیں نہیں چاہیئے کہ مجھے دھوکا دو۔ ناہید! اندر آنے والا کون تھا؟

بڑی لڑکی:۔ کوئی نہیں نانا آبا۔

نانا:۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش تمہیں نہیں کرنی چاہیئے میں جانتا ہوں کہ میں کیا جانتا ہوں ـــ یہاں ہم سب کتنے آدمی ہیں؟

بڑی لڑکی:۔ ہم چھ ہیں جو میز کے قریب بیٹھے ہیں نانا آبا۔

نانا:۔ تم سب میز کے قریب ہو!

بڑی لڑکی:۔ جی ہاں نانا آبا۔

نانا:۔ کیا تم یہاں ہو حشمت!

باپ:۔ جی ہاں۔

نانا:۔ کیا تم یہاں ہو صولت!

ماموں:۔ جی ہاں، بلاشبہ میں اپنی روزانہ کی جگہ پر ہوں یہ تو کوئی خطرے کی بات نہیں ہے نا؟

نانا:۔ کیا تم یہاں ہو یاسمین!

منجھلی لڑکی:۔ جی ہاں نانا آبا۔

نانا:۔ کیا تم یہاں ہو صوفیا!

چھوٹی لڑکی:۔ جی ہاں نانا آبا

نانا:۔ کیا تم یہاں ہو ناہید!

بڑی لڑکی:۔ جی ہاں، آپ ہی کے پاس تو بیٹھی ہوں نانا آبا۔

نانا:۔ اور وہ کون ہے جو وہاں بیٹھا ہے!

بڑی لڑکی:۔ "وہاں" سے آپ کا کیا مطلب ہے نانا آبا! وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے

نانا:۔ یہاں یہاں ـــ تمہیں میں!

بڑی لڑکی:۔ لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے نانا آبا!

باپ:۔ ہم آپ سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں کوئی نہیں ہے!

نانا:۔ لیکن کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا ـــ کسی کو بھی!

ماموں:۔ واہ واہ! آپ مذاق کر رہے ہیں!

نانا:۔ میرا تو اس وقت مذاق کو جی نہیں چاہ رہا۔ میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں۔

ماموں:۔ تو پھر اُن کا یقین کر لیجیے جو دیکھ سکتے ہیں۔

نانا:۔ (بے اطمینانی سے) مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی یہاں آیا ہے ..... میرا خیال ہے کہ میں زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہوں گا

ماموں:۔ ہم آپ کو آخر دھوکا دیں کیوں؟ بھلا اس سے فایدہ کیا ہوگا؟

باپ:۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ آپ سے سچ سچ کہیں.....

ماموں:۔ ایک دوسرے کو دھوکا دینے سے فایدہ کیا ہوگا!

باپ:۔ غلط فہمی میں آپ زیادہ عرصے تک مبتلا نہیں رہیں گے۔

نانا:۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس تاریکی کو چیر ڈالوں۔ ..... (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

باپ:۔ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟

نانا:۔ وہاں.....

باپ:۔ آپ اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟

ماموں:۔ آج رات تو آپ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔

نانا:۔ مجھے تو تم سب کے سب عجیب نظر آتے ہو۔

باپ:۔ کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے!

نانا:۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا تکلیف ہے۔

بڑی لڑکی:۔ نانا آبا، نانا آبا! آپ کو کیا چاہیئے نانا آبا!

نانا:۔ میرے ہاتھوں میں ننھے ننھے ہاتھ دو میرے بچیو!

تینوں لڑکیاں:۔ بہت اچھا نانا آبا۔

نانا:۔ بچیو، تم تینوں کی تینوں کیوں کانپ رہی ہو!

بڑی لڑکی:۔ ہم تو بالکل بھی نہیں کانپ رہے نانا آبا۔

نانا:۔ میرا خیال ہے کہ تم تینوں کانپ رہی ہو۔

بڑی لڑکی:۔ ہم تو بالکل بھی نہیں کانپ رہے نانا آبا۔

نانا:۔ میرا خیال ہے کہ تم تینوں کا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔

بڑی لڑکی:۔ بہت دیر ہو گئی نانا آبا، اور ہم تھکے ہوئے ہیں۔

باپ:۔ تمہیں سو جانا چاہیئے، اور بہتر ہوگا کہ نانا آبا اب خود بھی قدرے آرام کریں۔

نانا:۔ مجھے آج رات کو نیند نہ آئے گی۔

ماموں:۔ ہم ڈاکٹر کا انتظار کریں گے۔

نانا:۔ مجھے صحیح واقعہ کے لئے تیار کرو۔

ماموں:۔ لیکن صحیح واقعہ تو کوئی ہے ہی نہیں۔

نانا:۔ تو پھر میں نہیں جانتا کہ بات کیا ہے!

ماموں: میں آپ سے کہتا ہوں کہ کوئی بات نہیں ہے!

نانا:۔ کاش میں اپنی غریب بچی کو دیکھ سکتا!

باپ:۔ مگر یہ تو آپ کو اب معلوم ہے کہ یہ ناممکن ہے انہیں خواہ مخواہ جگانا نہیں چاہیئے۔

ماموں: آپ کل انہیں دیکھ لیں گے۔

نانا:۔ اس کے کمرے میں کسی قسم کی آواز نہیں ہے!

ماموں:۔ کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دیتی!

نانا:۔ مجھے اپنی بچی کو دیکھے ہوئے بہت عرصہ گذر گیا!۔۔۔ میں نے کل شام کو اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیئے تھے مگر میں اُسے دیکھ نہ سکا!۔۔۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیسی ہے۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا وہ کیسی ہے۔۔۔۔ مجھے خبر نہیں اب اس کا چہرہ کیسا ہے۔۔۔ ان ہفتوں میں وہ بدل گئی ہوگی!۔۔۔ میں نے اس کے رخساروں کی ننھی ننھی ہڈیاں ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھی تھیں۔۔۔ سوائے تاریکی کے میرے اور اس کے درمیان اور کچھ نہیں ہے! میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔۔۔ تم سب کے سب بیٹھے اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے میری مردہ آنکھوں کو دیکھتے رہتے ہو اور تم میں سے کسی ایک کو بھی مجھ پر ترس نہیں آتا!۔۔۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا چیز ستا رہی ہے۔۔۔ جو کچھ مجھ سے کہنا چاہیئے مجھ سے کوئی نہیں کہتا۔۔۔۔ جب کسی کے خواب بھی کسی چیز پر مرکوز ہو جائیں تو اس چیز سے ڈر لگنے لگتا ہے۔۔۔۔ مگر تم آخر کیوں نہیں بولتے!

ماموں:۔ جب آپ ہم پر یقین ہی نہیں کرتے تو پھر ہم کیا بولیں!

نانا:۔ تم ڈرتے ہو کہ کہیں تمہارے دل کی بات تمہارے منہ سے نہ نکل جائے!

باپ:۔ چھوڑیئے اس کو عقل کی باتیں کیجئے

نانا:۔ تم مجھ سے بہت عرصے سے کوئی بات چھپا رہے ہو!۔۔۔۔ گھر میں کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔۔۔ لیکن اب میں سمجھ چلا ہوں۔۔۔ تم مجھے بہت عرصے سے دھوکا دیتے رہے ہو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے کبھی کچھ نہ معلوم ہوگا!۔۔۔ بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جب میں تم سے کم اندھا ہوتا ہوں، جانتے ہو!۔۔۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے تمہیں کانا پھوسی کرتے نہیں سُنا۔۔۔ گویا تم کسی ایسے آدمی کے گھر میں ہو جس کو پھانسی دے دی گئی ہو۔۔۔ آج رات کو میں جو کچھ جانتا ہوں اُسے اپنے مُنہ سے نکالنا نہیں چاہتا۔۔۔۔ لیکن مجھے صحیح واقعہ کا علم ہو کر رہے گا!۔۔۔ میں اس کا انتظار کروں گا کہ خود تم مجھ سے سچی بات کہہ دو۔ مگر باوجود تمہاری رازداری کے مجھے ایک طویل عرصے سے اس کا علم ہے!۔۔۔ اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ تم سب مُردوں سے بھی زیادہ زرد پڑے ہوئے ہو!

تینوں لڑکیاں:۔ نانا آبا! نانا آبا! کیا بات ہے نانا آبا؟

نانا:۔ بچیو، میں تمہارا ذکر نہیں کر رہا نہیں، میں تمہارا کوئی ذکر نہیں کر رہا۔۔۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم تو مجھ سے سچ ہی بولو گی ۔۔۔ اگر وہ تمہارے قریب نہ ہوں!۔۔۔۔ اور اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بھی دھوکا دے رہے ہیں۔ تم دیکھ لو گی بچیو۔۔۔ تم دیکھ لوگی!۔۔۔۔ کیا میرے کانوں میں تم سب کے رونے کی آواز نہیں آ رہی!

باپ:۔ کیا میری بیوی فی الحقیقت اس قدر بیمار ہے؟

نانا:۔ مجھے اب دھوکا دینے کی کوشش بے سود ہے۔ پانی اب سر سے گزر چکا، اور مجھے تم سے زیادہ صحیح واقعے کا علم ہے!۔۔۔

ماموں:۔ مگر ہم بھی اندھے نہیں ہیں۔ ہمارے دیدے بھی پٹ نہیں ہو گئے

باپ:۔ کیا آپ اپنی بیٹی کے کمرے میں جانا چاہتے ہیں؟ اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جانا چاہیئے۔۔۔ کیا آپ جانا چاہتے ہیں؟

نانا:۔ (ایک دم سے مطمئن ہو کر) نہیں نہیں۔ اب نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔

ماموں:۔ دیکھا آپ نے۔ آپ کس قدر غیر معقول باتیں کر رہے ہیں۔

نانا:۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ کوئی انسان اپنے خیالات کا اپنی زندگی میں اظہار کرنے سے کس قدر قاصر رہا!۔۔۔۔۔۔ یہ آواز کس کی ہے؟

بڑی لڑکی:۔ چراغ ہوا سے بھڑک رہا ہے نانا ابا۔

نانا:۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بھڑک رہا ہے ——— بہت!

بڑی لڑکی:۔ سرد ہوا اسے ستا رہی ہے ....۔

ماموں:۔ سرد ہوا تو بالکل نہیں ہے۔ کھڑکیاں بند ہیں۔

بڑی لڑکی:۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ بجھ رہا ہے۔

باپ:۔ تیل ختم ہو گیا ہے

بڑی لڑکی:۔ وہ بالکل بجھ گیا۔

باپ:۔ ہم اس طرح اندھیرے میں نہیں بیٹھ سکتے۔

ماموں:۔ کیوں نہیں؟ ——— میں تو اس کا خوب عادی ہوں۔

باپ:۔ میری بیوی کے کمرے میں ایک چراغ ہے۔

ماموں:۔ جب ڈاکٹر ہو کر چلا جائے گا تو ہم اُسے اٹھا لائیں گے۔

باپ:۔ خیر ہمیں یہاں خاصہ تو نظر آ رہا ہے۔ باہر سے روشنی آ رہی ہے۔

نانا:۔ کیا باہر روشنی ہے؟

باپ:۔ یہاں سے زیادہ

ماموں:۔ میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ تاریکی ہی میں باتیں کرنی پسند کروں گا۔

باپ:۔ میں بھی اسی کو ترجیح دیتا ہوں (خاموشی)

نانا:۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھنٹہ بہت شور مچا رہا ہے ....

بڑی لڑکی:۔ یہ اس لئے معلوم ہو رہا ہے کہ ہم اب بول نہیں رہے نانا ابا۔

نانا:۔ لیکن تم سب کے سب چپکے کیوں ہو؟

ماموں:۔ کس چیز کے متعلق آپ چاہتے ہیں کہ ہم باتیں کریں؟ ---- آج شب کو تو آپ کچھ عجیب ہی عجیب بنتے جا رہے ہیں۔

نانا:۔ کیا کمرے میں بہت اندھیرا ہے؟

ماموں:۔ یہاں زیادہ روشنی نہیں ہے۔ (خاموشی)

نانا:۔ میری طبیعت بگڑ رہی ہے ناہید۔ کھڑکی ذرا سی کھول دو۔

باپ:۔ ہاں بیٹی کھڑکی ذرا سی کھول دو مجھے خود ہوا کی کمی محسوس ہو رہی ہے (لڑکی کھڑکی کھولتی ہے)

ماموں:۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بہت دیر تک بند بیٹھے رہے ہیں۔

نانا:۔ کیا کھڑکی کھلی ہوئی ہے

بڑی لڑکی:۔ جی ہاں نانا ابا چوپٹ کھلی ہوئی ہے۔

نانا:۔ کسی کو خیال بھی نہیں آسکتا کہ وہ کھلی ہوئی ہے باہر کوئی ہلکی سے ہلکی صدا بھی نہیں ہے۔

باپ:۔ خاموشی غیر معمولی ہے!

بڑی لڑکی:۔ فرشتہ بھی گر چلے تو اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دے جائے!

ماموں:۔ اسی وجہ سے تو مجھے دیہات پسند نہیں ہے

نانا:۔ کاش مجھے کوئی آواز سنائی دے جائے۔ ناہید اب کیا بجا ہے؟

بڑی لڑکی:۔ آدھی رات ہوا چاہتی ہے نانا ابا۔

(ماموں کمرے میں ٹہلنا شروع کرتا ہے)

نانا:۔ یہ کون ہے جو اس طرح ہمارے قریب چل پھر رہا ہے؟

ماموں:۔ میں ہوں جناب میں ہوں! میں تھوڑی سی چہل قدمی کرنی چاہتا ہوں۔ آپ نہ ڈریئے (خاموشی) ——— لیکن میں بیٹھا جاتا ہوں — مجھے نظر نہیں آتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں (خاموشی)

نانا:۔ میرا تو یہاں دم گھٹا جا رہا ہے۔ کاش میں کہیں اور جا سکتا!

بڑی لڑکی:۔ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں نانا ابا؟

نانا:۔ میں نہیں جانتا کہاں ——— کسی اور کمرے میں کہیں بھی کسی جگہ!

باپ:۔ ہم کہاں جا سکتے ہیں؟

ماموں:۔ اب تو اتنی دیر ہو گئی ہے کہ کہیں آ جا نہیں سکتے۔

(خاموشی۔ وہ میز کے گرد ساکت بیٹھے رہتے ہیں)

نانا:۔ ناہید یہ میں کس کی آواز سن رہا ہوں؟

بڑی لڑکی:۔ کوئی نہیں ہے نانا ابا۔ پتوں کے گرنے کی آواز ہے ——— جی ہاں، برآمدے میں پتے گر رہے ہیں۔

نانا:۔ ناہید جا کر کھڑکی بند کر دو۔

بڑی لڑکی:۔ بہت اچھا نانا ابا۔

(وہ کھڑکی بند کر دیتی ہے اور واپس آ کر پھر بیٹھ جاتی ہے)

نانا:۔ مجھے سردی لگ رہی ہے (خاموشی۔ تینوں بہنیں ایک دوسرے کو پیار کرتی ہیں) اب مجھے یہ کس چیز کی آواز آ رہی ہے؟

باپ:۔ تینوں بہنیں ایک دوسرے کو پیار کر رہی ہیں۔

ماموں:۔ مجھے یہ تینوں آج شب کو بہت زرد نظر آرہی ہیں (خاموشی)

نانا:۔ اب یہ کس چیز کی آواز آئی؟ ناہید!

بڑی لڑکی:۔ کسی کی نہیں نانا ابا! میں نے صرف اپنے ہاتھ ہلائے تھے

(خاموشی)

نانا:۔ اور یہ!....

بڑی لڑکی:۔ مجھے نہیں معلوم نانا ابا.. شاید میری بہنیں کچھ کانپ رہی ہیں!....

نانا:۔ مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے میری بچیو۔

(چاند کی ایک کرن رنگین شیشے کے کونے میں سے گزر کر کمرے میں ادھر ادھر عجیب وغریب روشنی ڈالتی ہے۔ گھنٹہ بارہ بجاتا ہے۔ آخری ضرب پر ایک مدھم سی آواز سنائی دیتی ہے جیسے کوئی جلدی میں اٹھ کر کھڑا ہو)

نانا:۔ (بہت خوف سے کانپ کر) یہ کون ہے جو اٹھا ہے؟

ماموں:۔ اٹھا تو کوئی بھی نہیں!

باپ:۔ میں تو نہیں اٹھا!

تینوں لڑکیاں:۔ اور نہ میں! --- اور نہ میں! --- اور نہ میں!

نانا:۔ ابھی ابھی کوئی میز کے قریب سے اٹھا ہے!

ماموں:۔ چراغ روشن کرو!...

(بچے کے دائیں جانب کے کمرے میں سے خوف کی چیخیں بلند ہوتی ہیں منظر ختم ہونے تک یہ چیخیں مسلسل سنائی دیتی ہیں)

باپ:۔ بچے کی آواز سنو!

ماموں:۔ اس سے پہلے تو وہ کبھی رویا ہی نہیں!

باپ:۔ چلو چل کر اسے دیکھیں!

ماموں:۔ روشنی! روشنی!

(اسی لمحے میں بائیں جانب کے کمرے میں عجلت آمیز اور بھاری بھاری قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے --- پھر موت کی سی خاموشی --- وہ خوف سے گونگے بنے سنتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ لمپ کی روشنی اس کمرے میں پڑتی ہے۔ مسیحی خادمہ دروازے میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کا لباس سیاہ ہے اور سر جھکائے ہوئے صلیب کا نشان بناتی ہے اور اس طرح بیوی کی موت کا اظہار کرتی ہے۔ وہ سمجھ جاتے ہیں اور فوری خوف کی وجہ کر کچھ سمجھ میں چند لمحوں کے لئے نہیں آتا کہ کیا کریں پھر خاموشی سے مرنے والی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ماموں چوکھٹ پر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ تینوں لڑکیاں پہلے داخل ہو جائیں۔ اندھا آدمی اکیلا رہ جاتا ہے۔ گھبرا کر اٹھتا ہے اور اندھیرے میں میز کے گرد ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ تلاش کرتا ہے۔

نانا:۔ تم کہاں جا رہی ہو! --- تم کہاں جا رہے ہو؟ --- لڑکیوں نے مجھے بالکل اکیلا چھوڑ دیا ہے!

(میٹرلنک) ---- ختم شد ----

شاہد

تیاگ

مجھے تمام دن تیری یاد سے احتراز لازم ہے!

دن بھر میں تیرے خیال کو جسے میں آسمان کی بلندیوں کی نیلاہٹ اور راگ کے میٹھے سروں میں بھی نہاں پاتا ہوں اپنے اس ٹوٹے ہوئے دل سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

لیکن ان خیالوں کے پیچھے جو میرے سینے میں امڈے رہتے ہیں تیرا حسین خیال پوری تجلی سے مستور رہتا ہے۔

آہ میرے لئے اظہار ناممکن ہے اور تجھ سے احتراز لازم

مگر جب نیند طویل اور تھکا دینے والے دن کو ختم کر دیتی ہے اور رات مجھے اس پہرے سے جو دن بھر میں تیرے خیال پر لگائے رکھتا ہوں چھٹکارا دلاتی ہے تو میں اپنی فرزانگی کی زنجیروں کو اس طرح علیحدہ رکھ دیتا ہوں جیسے دن کے کپڑے اور اپنی پہلی خواب میں دوڑ کر تجھ سے لپٹ جاتا ہوں۔

(ایلس مینل)

محمد اقبال

بی اے (علیگ)

وجدانِ روح

نظر میں، روح میں، دل میں سمائے جاتے ہیں
تمام عالمِ امکاں پہ چھائے جاتے ہیں

ہر اک قدم کو وہ منزل بنائے جاتے ہیں
تعینات کی وسعت بڑھائے جاتے ہیں

نشانِ بتکدۂ دل مٹائے جاتے ہیں
وہ اپنے کعبۂ دیریں کو ڈھائے جاتے ہیں

جو اٹھ سکے تھے نہ خود حسن کے اٹھائے سے
وہ پردہ ہائے دوئی اب اٹھائے جاتے ہیں

جو گر سکے تھے نہ خود عشق کے گرائے سے
وہ سب حجابِ محبت گرائے جاتے ہیں

چھپا چھپا کے جنہیں مصلحت نے رکھا تھا
وہ جلوے اب سرِ محفل دکھائے جاتے ہیں

سنبھل کہ اے نگہِ شوق بزمِ دوست ہے یہ
یہاں خرابِ نظر آزمائے جاتے ہیں

نہ پوچھ کارگہِ عشق کا طلسم، نہ پوچھ
قدم قدم پہ تماشے دکھائے جاتے ہیں

پتہ نہیں کہیں ان کا اور ان کے دیوانے
تصورات کی محفل سجائے جاتے ہیں

کہاں کی لغزشِ پا اب یہ حال ہے ساقی
کہ سر سے تا بقدم ڈگمگائے جاتے ہیں

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

یہ قصرِ حسن ہے آتشکدہ محبت کا
بجائے شمع یہاں دل جلائے جاتے ہیں

جگر بھی شق ہے یہاں شدتِ تجلی سے
وہ دیکھتے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں

ستم کا بوجھ تو اٹھ ہی گیا محبت میں
ہم ان کا بارِ کرم بھی اٹھائے جاتے ہیں

تمام عالمِ محسوس کانپ اٹھتا ہے
جب آنکھ سے کہیں آنسو بہائے جاتے ہیں

ہمارا حال تو دیکھا ہمارا ظرف بھی دیکھ
نگاہ اٹھتی نہیں غم اٹھائے جاتے ہیں

تلاش لازمۂ عاشقی نہیں ساغر
نہ ڈھونڈنے پہ بھی وہ ہم میں پائے جاتے ہیں

ساغر (نظامی)

برنارڈ شا — دوست اور مخالف کی حیثیت سے

برنارڈ شا کو بہت کم لوگ دوست کی حیثیت سے جانتے ہیں کیونکہ وہ ادیبوں سے عموماً اس طرح کتراتا ہے جس طرح کہ ڈیوک آف ولنگٹن اپنے سپاہیوں سے گریز کرتا تھا۔ نہ صرف ادیبوں ہی کو وہ نظرانداز کرتا ہے بلکہ ہر قسم کی سوسائٹی سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ وہ کسی کلب میں نہیں جاتا اور نہ دعوتوں میں عام طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ملاقاتوں کے لیئے وہ کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سوسے زیادہ وزٹنگ کارڈ استعمال نہیں کئے وہ سواری نہیں کرتا شکار نہیں کھیلتا ٹینس، کرکٹ یا کسی کھیل میں دلچسپی نہیں لیتا۔ اور نہ ایسا کام کرتا ہے جس میں کسی دوسرے کی شرکت ضروری ہو

کہا جاتا ہے کہ شا اور آسکر وائلڈ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے دونوں کا مطمع نظر ایک تھا اور اکثر موقعوں پر دونوں نے ایک ہی طرز عمل اختیار کیا۔ لیکن شا کی شخصیت آسکر وائلڈ سے بڑھی ہوئی ہے۔ حالانکہ شا بہت رحمدل ہے لیکن اس کے افلاس سے اس کو بے حد نفرت ہے وہ اس خیال سے بہت پریشان ہوتا ہے کہ کہیں سارے یورپ کے مفلس اس پر دھاوا نہ بول دیں۔ چونکہ کسی زمانہ میں افلاس کی مصیبت اس پر بھی پڑ چکی ہے اس لیے دوبارہ افلاس کے گرداب میں پھنس جانے کے خیال سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ آسکر وائلڈ نے شا کی بہن کو کہیں گاتے ہوئے سنا اور اتنا متاثر ہوا کہ لیڈی وائلڈ شا کی بہن کو کھانے پر بلانے کیلئے مجبور ہوئی اسی سلسلے میں شا اور آسکر کی پہلی ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ عرصہ بعد جب شا نے "سوشلزم" پر خطبہ پڑھا تو آسکر بھی سامعین میں موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سے متاثر ہو کر آسکر نے THE SOUL of MAN under Socialism لکھی۔

جب آسکر قید خانے بھیج دیا گیا اور لوگوں میں تھوڑا سا انتشار رہا تو شا نے اس کی رہائی کے لیئے حکومت کو توجہ دلانے کی غرض سے مسودہ تیار کیا۔ آسکر کا بھائی شا سے ملا اور اس مسودہ کا ذکر کیا تو شا نے کہا کہ اس محضر پر سوائے اس کے اور اسٹیورٹ ہیڈلام کے کوئی دستخط نہ کریں گے اور چونکہ یہ دونوں بدنام ہیں اس لیئے فایدہ کے بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ولی وائلڈ آسکر کا بھائی، خاموش ہو گیا اور شا کے مسودہ کا حال وہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوا قید میں آدھی سزا بھگتنے کے بعد آسکر کی صحت خراب ہو گئی۔ فرانک ہیرس (FRANK HARRIS) اس کی رہائی کی کوشش میں مصروف ہوا۔ قید خانہ کے اعلیٰ عہدہ دار نے ہیرس کو مشورہ دیا کہ اگر بارہ مشہور ادیب ایک محضر پر دستخط کریں اور ہوم سکرٹری کو آسکر کی رہائی کی طرف متوجہ کریں تو کامیابی کا امکان ہے کوشش کے باوجود ہیرس بارہ ادیبوں کو متفق الخیال کرنے میں ناکام رہا اور جب وہ شا کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "میں اس کے لئے موزوں نہیں ہوں۔ بھاری بھر کم ادیبوں کے دستخط لو"

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جب شکاگو کے ہنگامہ کرنے والوں کو سزائے موت سنائی گئی تو شا نے ان کی تائید میں ایک محضر تیار کرنے کی کوشش کی اور اس پر سوائے آسکر کے دستخط کے اور کسی کے دستخط لے نہ سکا۔ باوجود اس کے شا اور آسکر کے خیالات کے درمیان ایک عمیق خلیج حائل تھی آسکر کا مشہور ڈراما Importance of being Earnest شا کی نظروں میں کوئی خاص بات نہ رکھتا تھا۔ جہاں آسکر آرٹ کے متعلق گفتگو کرتا ہے شا اس کو فضول بکواس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ شا کے خیال میں آسکر اسٹائل کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے بہ نسبت نفس مضمون کے "پہلی چیز" ایک دفعہ شا نے آسکر کے متعلق لکھا "جو ہم کسی نئے نوکر سے دریافت کرتے ہیں وہ اس کی ایمانداری اور جفاکشی کا صداقت نامہ ہے کیونکہ یہ چیزیں دنیا میں کم ہیں اور فراست اور ذہانت چوہوں کی طرح عام ہیں" حالانکہ دنیا کہتی ہے کہ ذہین بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی بہت کم۔

سنہ ۱۹۲ء میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہیرس کی کتاب "آسکر کی سوانح" بہت مشہور رہوئی ایک فلم کمپنی آسکر کے متعلق فلم بنانا چاہتی



اميل لدوك



برنارد شا





تھی اور اس نے اس کی تیاری کا کام ہیرس کے سپرد کیا۔ لیکن اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح خواہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو۔ شا کو بھی اس میں شریک کر لیا جائے اور اس کے لئے وہ چھ سو پونڈ دینے کے لئے آمادہ تھی۔ ہیرس نے اپنی بیوی کے نام کیبل (cable) کیا کہ وہ شا سے مل کر اس کا تصفیہ جلد کرے لیکن ہر دفعہ جب آپ شا کے نام ضروری کیبل کریں آپ کو یقیناً پوسٹ کارڈ کے ذریعے سے جواب ملے گا۔ مگر اتفاقاً اس دفعہ ایک طویل خط ہیرس کو ملا جس کا دلچسپ اور ضروری حصہ حسب ذیل ہے :-

. . . . اول یہ کہ میں آسکر وائلڈ کا فلم تیار کرنے کے معاوضہ میں بلکہ صرف اشتہار میں اپنا نام دے کر دس ہزار پونڈ لے سکتا ہوں۔ میرے میز کی دراز میں اس قسم کی خواہشات موجود ہیں کہ اگر میں سال میں صرف دو فلم بھی تیار کر دوں تو بیس ہزار پونڈ حاصل کر سکتا ہوں اور پھر پانچ سال کی گارنٹی کے ساتھ۔ ایک مہینہ بلکہ ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گذرتا جبکہ کوئی نہ کوئی مفلس مصنف میری عاجزی نہیں کرتا کہ میں اس کی کتاب پر دیباچہ لکھ کر اس کی زندگی کا ورق الٹ دوں۔ ایسی صورت میں آپ کی یہ کوشش کہ میں آپکا شریک کار ہو جاؤں آپ کو بے ضرورت تشکریہ کا مستحق بناتا ہے۔

دوسرے یہ کہ میں شادی شدہ ہوں۔ اور میری بیوی میرے کاروبار میں برابر کی شریک ہے وہ اپنا روپیہ امور خانہ داری پر خرچ کرتی ہے اور میں اپنا روپیہ بینک میں رکھواتا ہوں۔ آپ کی فرم کی طرف سے میرے نام کا معاوضہ دس ہزار پونڈ مقرر ہے۔ اس لئے تنہا میں اس میں کمی بیشی کرنے کا حق نہیں رکھتا

تیسرے یہ کہ گو میں نے آسکر کی سوانح' پر جو کچھ لکھا ہے اس کے حقوق محفوظ کرا لئے ہیں مگر میری تحریر میں آسکر کی زندگی سے متعلق کوئی واقعہ محفوظ نہیں ہوا۔ اسی لئے کوئی فلم آسکر کی زندگی کے متعلق میرے "پیش لفظ" کی مدد کے بغیر بھی مکمل ہو سکتا ہے۔ نہ میں ہیرس کو آسکر کے متعلق فلم تیار کرنے سے روک سکتا ہوں اور نہ فلم کمپنی کے کاروبار میں دخل دے سکتا ہوں البتہ اپنے نام کی وقعت گھٹانے سے فلم کمپنی کو روک سکتا ہوں۔

. . . . . میری دانست میں اس قسم کا فلم اور خصوصاً سا حال کے ادیب کا ماحول صحیح طور پر فلم میں پیش کرنا بہت مشکل ہے اور اگر صحیح ماحول نہیں پیش کیا گیا تو ادیب کی شخصیت کا خون ہوگا۔

. . . . اگر فلم کمپنی نے میرا نام استعمال کیا تو میں اس پر قانونی بجلیاں گراؤں گا۔ آپ اس ڈھنگ سے کام لے کر فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر فلم کمپنی نے میرا نام استعمال کیا تو آپ کا نام جاذب نظر نہ رہے گا اور اس طرح آپ کو نقصان پہنچے گا . . .

شا لوگوں کو خوش رکھنے کا خواہشمند نہیں ہے بلکہ اس کو معلوم ہے کہ انہیں کس طرح دشمن بنایا جا سکتا ہے اور وہ اس کو ایک بڑے آدمی کا کمال سمجھتا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے "دوست کے ساتھ یہ سمجھ کر زندگی کرو کہ وہ ایک نہ ایک دن تمہارا دشمن ہو سکتا ہے اور دشمن کے ساتھ یہ خیال کر کے سلوک کرو کہ وہ کبھی نہ کبھی دن تمہارا دوست ہو سکتا ہے" دوسری جگہ وہ ہمیں آگاہ کرتا ہے "ایسے آدمی سے ہوشیار رہو جو تمہارے پتھر کا جواب پتھر سے نہ دے کیونکہ وہ نہ خود معاف کرتا ہے اور نہ تم کو معافی چاہنے کا موقع دیتا ہے"

شا کا خیال ہے کہ دنیا نے اس کے متعلق جو کچھ بھی سمجھا ہے وہ حقیقت سے بہت کم ہے۔ دراصل اپنی قیمت سے وہ خوب آگاہ ہے اسی لئے جب آپ اس کے منہ پر تعریف کریں تو وہ بلا تکلف "انکساری" اور "شرمیلے پن" سے بے نیاز ہو کر بڑے شد و مد کے ساتھ اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہے۔ مگر یہاں ایک چیز یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شا مخالفت کے مقابلہ میں نسبتاً بہت زیادہ اپنے آپ کو سراہتا ہے۔ اس کے سامنے کہا جائے کہ وہ شیکسپیئر سے کم درجہ رکھتا ہے تو اپنے آپ کو شیکسپیئر سے اتنا اونچا بتائے گا کہ آپ کا دماغ چکرانے لگے گا۔ برخلاف اس کے اگر کوئی اس کے آگے اعتراف کرے کہ وہ یقیناً شیکسپیئر سے بڑا ڈرامہ نگار ہے تو اپنی تعریف میں نسبتاً کم غلو کرے گا۔ کیونکہ میریڈتھ meredith کی طرح اس کا خیال ہے کہ ضرورت سے زیادہ اعزاز اس شخص کے لئے فایدہ مند نہیں ہے جو اس دنیا میں رہنا چاہتا ہے اور کام کرنا چاہتا ہے۔

جنھوں نے شا کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور اس کو منہ پھٹ اور ایک حد تک گستاخ خیال کرتے ہیں وہ اگر پہلی مرتبہ شا سے ملنے جائیں تو اول اپنے آپ کو ہر قسم کے طعن و تشنیع سننے پر آمادہ کر لیتے ہیں اور ہر قسم کی دریدہ دہنی کی توقع رکھ کر اس کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ لیکن اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ اپنی امیدوں کے خلاف ایک مہربان، مہذب اور متبسم چہرہ اپنے سامنے دیکھتے ہیں تو ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس کے بات کرنے کا خاص انداز دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ جس طرح اس کے خیالات وزنی ہوتے ہیں اسی طرح اس کی آواز بھی بھاری ہوتی ہے اور الفاظ پر ضرورت کے لحاظ سے بہت زور دیتا ہے۔ بار بار ٹانگوں کو حرکت دیتا ہے اور ایک کو دوسرے پر رکھتا ہے۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالتا اور نکالتا ہے صوفے کے کبھی کونہ پر پہنچ جاتا ہے کبھی بیچ میں نہایت وقار کے ساتھ بیٹھتا ہے اور کبھی پشت کا سہارا لے کر آرام لیتا ہے۔ وہ گھنٹوں گفتگو کر سکتا ہے مگر اس درمیان میں کبھی کبھی قہقہوں کی مدد لیتا ہے۔ کسی نے اس کے متعلق کہا ہے "وہ سونے کا دل رکھتا ہے جس کو وہ بڑی چالاکی سے چھپاتا ہے" کہنے والے کا اشارہ غالباً شا کی فیاضی کی طرف ہے جبکہ اس نے "ڈریم" کے کوئلہ کھودنے والوں کے لئے سستے مکانات بنانے کی غرض سے تیس ہزار پونڈ دیئے تھے۔

شا کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت مخالفتوں اور حملوں کا جواب متانت اور سنجیدگی بلکہ اپنے مخصوص مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں دیتا ہے۔ کتنی دفعہ ہنری آرتھر جونز نے اس کو "غدار" "کمینہ" "احمق" وغیرہ کے زہریلے الفاظ کی "دی مارننگ پوسٹ" کے ذریعے سے بارش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شا اس سلوک سے متاثر ہی نہیں ہوتا اور وہی اپنے مخصوص انداز میں جونز کو یقین دلاتا تھا کہ وہ ابھی اس کو ایک مہربان دوست ہی سمجھتا ہے۔

جارج سلوسٹر ویرک GEORGE SYLVESTER VIERICK کو جنگ کے زمانہ میں کسی امریکی ادبی ادارہ سے خارج کر دیا گیا تھا۔ شا نے اس کی مدد کے لئے دخل دینا شروع کیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ کسی مصنف کو ادبی ادارہ سے محض اس کے سیاسی خیالات کی وجہ سے علیحدہ کر دینا بڑی غلطی ہے کیونکہ ایسا کرنے میں ادبی ادارہ کی حیثیت سیاسی پارٹی کی ہو جائے گی اس کے جواب میں برنارڈ شا کو جو خط ملا وہ یہ تھا:-

"جناب من!

...... آپ کا خط مورخہ ۱۵ر جنوری ملا جس میں آپ نے ادبی ادارہ کے ممبروں کے اخراج پر بحث کی ہے۔

میں امریکہ میں رہتا ہوں اور امریکی ادبی ادارہ کے معاملات میں کسی اینگلو آئرشمین ANGLO-IRISHMAN کو دخل در معقولات کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

آزاد ملک والوں کے گھریلو معاملات میں کسی باہر والے کی مداخلت بے ضرورت اور ناشائستہ کہی جائے گی۔

مخلص

بی. پالسن

شا بھلا اس لب و لہجہ کو کب برداشت کر سکتا تھا۔ جواب دیا:-

"جناب من!

آپ کے خط مورخہ ۷ر فروری سے مجھے امید بندھ رہی ہے کہ آپ شاید مجھے انکم ٹیکس کی وہ رقم جو ۱۹۳۱ء سے میں امریکی خزانہ میں داخل کر رہا ہوں واپس دلا سکیں گے۔ چونکہ امریکی حکومت کا انحصار اس اصول پر ہے کہ بغیر نمائندگی کے ٹیکس نہ لیا جائے۔ اس لئے اگر آپ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ مجھے امریکی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے تو یقیناً میں بھی اپنی انکم ٹیکس کی رقم واپس لینے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

اور جب تک اس کا تصفیہ ہوتا رہے مجھے حق حاصل ہے کہ میں کسی بھی امریکی معاملات میں اپنی رائے کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا رہوں۔

برسبیل تذکرہ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ انگریز ہیں! آپ کے خط کے انداز سے انگریزوں کا بھونڈا مذاق ظاہر ہوتا ہے۔

مخلص

برنارڈ شا

ہیرس شا کے قدیم دوستوں میں سے تھا لیکن جب ہیرس نے سوانح لکھنے کے سلسلے میں اس سے چند سوالات کئے تو شا نے جواب دیا:-

..... تم نے جو سوالات کئے ہیں جن کا جواب ایک کتاب کی شکل میں ہوگا تم اس کو مخصوص سوانح نگار کی فضول طرز میں مرتب کر دو گے اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم مجھ میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہو کیا تم کو نہیں معلوم کہ شا اور شیکسپیر جیسی ہستیاں روح نہیں رکھتیں؟ ہم تمام روحوں کو سمجھتے ہیں اور تمام عقیدوں کو پہچانتے ہیں اور ہم ان کو ڈرامائی شکل میں پیش کرتے ہیں لیکن ہم میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی ......

...... تم نہیں جانتے کہ میں کس قسم کا انسان ہوں اگر وقت ہے تو بتلاؤں کہ واقعات کیا ہیں؛ اور وہ تمہارے لئے کس قدر پریشان کن ہیں۔ مجھے افسوس کہ وقت نہیں ہے اس لئے سوانح نگاری کے خیال سے باز آؤ (میں مذاق نہیں کر رہا ہوں بے وقوف آدمی!) بلکہ حقیقت کا اظہار ......

تمہارا
شا

دوسرا خط ملاحظہ ہو۔

ایک امریکی فرم نے تمہاری کتاب "برنارڈ شا" کا اشتہار دیا ہے جس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ یہ کتاب میری اجازت سے شائع ہو گی اور اس میں پندرہ ہزار الفاظ میرے قلم سے بھی ہوں گے۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ سوائے ہنڈرسن کے کوئی اور سوانح میری اجازت سے شائع نہیں ہو گی۔ اگر تم نے میرا ایک لفظ بھی شائع کیا تو میں عدالتی چارہ جوئی کروں گا۔ میں تمہاری کتاب تمہارے لئے لکھ کر دینا نہیں چاہتا۔ میری دلچسپی اور تمہاری شہرت کا راز "تم اپنی کتاب کس طرح لکھتے ہو" میں پوشیدہ ہے میں نے جو کچھ اپنے متعلق لکھا ہے۔ اس کی جھلک بھی نہیں دکھائی دی ہے جس کو کہ میں خود کسی دن شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں میری سوانح لکھنے پر اصرار ہے تو تم اس کو اپنے الفاظ میں لکھو میرے الفاظ میں نہیں۔ کوئی بے وقوف بھی پبلشرز سے یہ کہہ کر کہ میں نے لکھی ہے کتاب شائع کرا سکتا ہے۔ تمہارے پبلشرز کو چاہئے کہ وہ میرے "پندرہ ہزار الفاظ" اور "میری اجازت" والے فقرے واپس لے لے۔ تم یقیناً اس قابل ہو کہ میرے ایک لفظ کے بغیر بھی سوانح مرتب کر سکتے ہو۔ اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں تمہیں اس پر مجبور کرنے کی کوشش کروں گا۔ آسکر وائلڈ کی سوانح سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ تم نے اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ اور چونکہ تین فی صدی سے زیادہ میری تصانیف تمہاری نظر سے نہیں گذریں اس لئے تم کو چاہئے کہ مجھے انسان کی حیثیت سے پیش کرو نہ کہ مصنف کی حیثیت سے۔ میں اس سے زیادہ اور کوئی خطرناک پیکر کا خیال نہیں کر سکتا کہ شا اور ہیرس خلط ملط کر دئے گئے ہوں۔ اس کے علاوہ کتاب میں ہمارے ہمعصروں کا بھی نقشہ ہونا چاہئے اور یقیناً اس کام کو تم کر سکتے ہو۔ ..

مخلص
شا

شا کا یہ طرز عمل اس شخص کے ساتھ تھا جس نے شا کو نقاد کی حیثیت سے سب سے زیادہ SATURDAY REVIEW میں روشناس کرایا جو اس کا پرانا دوست تھا اور جس کی ادبی شہرت بے شمار کتابوں کی وجہ سے خصوصاً سوانح نگاری کے سبب سے دور دور تک پہنچ چکی تھی عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی ہستی کا سلوک اپنے سوانح نگار کے ساتھ نسبتاً اچھا ہوتا ہے سوائے باسول BOSUEL کی عجیب و غریب مثال کے ادبیات عالم میں بہت کم ایسی مثالیں ملیں گی۔

شا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اضداد کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ جس شور کے ساتھ اس نے سوانح کی مخالفت کی تھی اس سے کیا امید ہو سکتی تھی مگر خود ہی اس نے حسب خواہش سارا مواد فراہم کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں بعض ایسی چیزوں کا اعتراف کیا جو حقیقت میں ہیرس کے لئے بالکل نئی تھی اور جس کی روشنی میں وہ شا کی تصویر دنیا کو دکھا سکتا تھا۔ اتفاق دیکھئے کہ ہیرس نے اس کی سوانح ختم کی لیکن ابھی شائع

کرنے پایا تھا کہ اس دنیا میں پہنچ گیا جہاں کہ ایک دن شا کو پہنچنا تھا۔ شا نے کتاب کی اشاعت کا انتظام اپنے ذمے لیا اور کتاب کے آخر میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اس طرح جس کی اس نے کسی زمانے میں بڑے زور وشور کے ساتھ مخالفت کی تھی اسی کو اسی خوبی سے حرف بہ حرف پورا کر دکھایا۔ گو کہ شا نے ہیرس کے خیالات کو اور نہ ہی اس کی تنقید کو حالانکہ وہ اکثر جگہ سخت ہو گئی ہے حذف نہیں کیا لیکن کتاب کے آخر میں اس کا صاف طور پر ذکر کر دیا کہ ہیرس نے اس کی حقیقی عادات کو سمجھنے میں غلطی کی۔ ہیرس کا خیال تھا کہ برنارڈ شا کی تصویر کھینچنے میں اس نے نہایت دیانتداری اور بے تعصبی سے کام لیا ہے سچے تاثرات اور صحیح خیالات جو اس کے دل و دماغ میں تھے بلا کم و کاست پیش کر دیئے ہیں ہیرس شیکسپیئر کے معتقدین میں سے تھا اور کسی وقت بھی شا کو شیکسپیئر کے برابر تسلیم کرنے پر راضی نہ تھا مگر شا ہر دفعہ اپنی فوقیت جتانے پر تلا ہوا نظر آتا تھا۔

بہر حال شا دوست اور مخالف کی حیثیت سے عجیب و غریب ہے۔ جارج مور کے خیال میں شا ایک بورڈنگ ہاؤس کا مسخرہ ہے۔ ہنکر (HUNEKER) کہتا ہے "شا ایک بے پروں کا فرشتہ ہے جس کی طبیعت ایک بوڑھی نوکرانی کی سی ہے"۔ (DE CASSERES) کی رائے ہے کہ وہ والٹیر کی پانچویں کاربن (CARBON) کاپی ہے جو کبھی بھی اعلیٰ شخصیت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے مزاج میں حزنیہ عنصر نہیں ہے مختصر یہ کہ شا ہر زاویۂ نظر سے علیحدہ شخصیت نظر آتا ہے۔ اس لیے ہر شخص کا خیال اس کے متعلق جداگانہ ہے۔

سید بادشاہ حسن حیدرآبادی

غزل

قصۂ غم مرا طنز اثر انگیز نہ ہوا
ہاں یہ ڈر ہے کہ جبیں تیری عرق ریز نہ ہو

مجھ پہ محدود رہے برق فشانی میری
آہ جاں سوز ہو نالہ شرر انگیز نہ ہو

دیکھ اس حسنِ فسوں ساز کو سو بار مگر
راز افشا کہیں اے دیدۂ غم ریز نہ ہو

اس طرح مٹ کہ کوئی اور ہی عالم بن جائے
وہ بھی کیا ذرۂ ہستی کہ جہاں خیز نہ ہو

کون پہنچے دلِ مغموم کی گہرائی تک
محوِ پرسش جو تمہاری نگہِ تیز نہ ہو

ساری ہستی رہے معمورۂ آتش بن کر
دل میں ہو سوز نفس کیوں شرر انگیز نہ ہو

وہ ہوس ہے جسے تحقیرِ محبت منظور!
وہ محبت ہے جو ہرگز ہوس آمیز نہ ہو

شکوۂ کشمکشِ زیست ہے بے جا حاجی
زندگانی ہی نہیں جو الم انگیز نہ ہو

حاجی سرحدی

رباعی

چاکِ دلِ صد چاک تو سی لینے دے
اک جامِ فراغ آج تو پی لینے دے
دنیا سے ہمیشہ کا سفر ہے اے موت!
دو چار دن اور بھی جی لینے دے

نجم ندوی بی اے

بیتے ہوئے دنوں کی یاد

(۱)

ناؤ چاند، آکاش تھا ساگر، تارے کھیون ہار تھے پیارے

میری رام کہانی سن کر جاگ اٹھے تھے نیند کے ملتے!

کاش وہ راتیں پھر بھی آتیں، کاش وہی دن پھر بھی آتے!

(۲)

درشن جل کی خاطر جلتے درشن پیاسے پریم دوارے

جھوٹی دنیا کو تج دیتے، اپنی دنیا آپ بساتے!

کاش وہ راتیں پھر بھی آتیں، کاش وہی دن پھر بھی آتے!

(۳)

پریت کے آگے پریتم پیارے جھوٹ ہیں رشتے ناتے سارے

من کو تمہارے ہیں اپناتا میرے جی کو تم اپناتے!

کاش وہ راتیں پھر بھی آتیں، کاش وہی دن پھر بھی آتے!

(۴)

پلکوں پر یوں نیر چمکتے جیسے امبر پر ہوں تارے

رو رو نین گنواتے ساجن! اپنی اپنی دسا سناتے!

کاش وہ راتیں پھر بھی آتیں، کاش وہی دن پھر بھی آتے!

حفیظ ہوشیارپوری

امتحان

جس وقت میں نے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔ اگر ہمارے مدرسہ کے مولوی صاحب رحلت فرما جاتے تو پھر میری ملازمت کا سوال فوراً حل ہو جاتا لیکن مولوی صاحب سے اتنی وقت کی پابندی کی توقع فضول تھی بلکہ خطرہ تھا کہ مولانا ایک سال تک نہیں مرتے۔ کیونکہ ایک دفعہ انھوں نے ایک سبق کے دوران اونٹ کی سخت جانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر مجھے بھی ایک سال کے لئے کسی ریگستان میں چھوڑ دیا جائے تو میں انشاءاللہ صرف اپنی چربی پر گذارہ کر سکتا ہوں۔

یہی مسئلہ جب گھر والوں اور قریبی رشتہ داروں کے سامنے پیش ہوا تو مولوی صاحب کی شتر مزاجی خصوصاً ان کی زندہ رہنے کی طاقت سے بہت ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ اور ایک دعا کے ذریعے جس کے مانگنے میں سارے قبیلے کے ہاتھ بلند تھے، خدا تعالیٰ کی توجہ اس امر کی طرف دلائی گئی کہ "اے خدا ہمارے قصبے کے سکول میں ایک مولوی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ میں کئی سال تک ریگستان میں بے آب و دانہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ گویا وہ نہ صرف تیرے اونٹ کا شریک بنا ہے بلکہ تیرے عزرائیل سے بھی ٹکراتا ہے لہذا خدایا اسے فی الفور غارت کر دے۔"

دعا میں کافی مبالغے سے کام لیا گیا تھا لیکن میں سمجھا سب کچھ بے فائدہ ہے۔ ایسے ہی کیا جا رہا ہے لہذا میں خاموشی سے شریک رہا۔ ایک جانب سے ایک رشتہ دار جن کے دماغ کی بناوٹ قانونی سی تھی بول اٹھے۔ "جناب ہم بھول گئے مولوی صاحب کو مروانا بھی قبل از وقت ہے ان کے جانشین کو منشی فاضل ہونا لازم ہے۔ ابھی لڑکا ابھی مڈل پاس ہے بہتر یہی ہے کہ بالفعل دعا واپس لے لی جائے اور اس سال لڑکا کوشش کر کے منشی فاضل کا امتحان پاس کرے۔" حاضرین پر اس ترمیم کا بے حد اثر ہوا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کو مولوی صاحب کے خلاف اجارہ نا ایک سال کے لئے ملتوی قرار دیا گیا۔ اور مجھے ہدایت کر دی گئی کہ بس سال کے اندر اندر منشی فاضل بن جاؤ اور ضرور بن جاؤ۔ ورنہ تم پر پکٹنگ کی جائے گی۔ ایک رشتہ دار جو جیل سے تازہ تازہ واپس آئے تھے، فرمانے لگے "اگر لڑکا منشی فاضل ہو جائے۔ تو مولوی صاحب والی رکاوٹ میں دور کر دوں گا۔" گویا آئندہ سال خدا کے سامنے معاملہ پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ گھر میں ہی انتظام ہو گیا تھا۔

اب باوجودیکہ مدرسہ کی حکومت کا شاندار مستقبل میرے سامنے تھا۔ امتحان پاس کرنے کی شرط سن کر میں اس قدر نڈھال ہو گیا۔ گویا کسی لاری نے مجھے کچل دیا تھا۔ اگر منشی فاضل کسی زہر کا نام ہوتا تو میں کھانے کو تیار تھا۔ اگر کسی توپ کا نام ہوتا تو میں لڑنے پر رضامند تھا لیکن منشی فاضل کے امتحان سے مزاحم ہونا مجھ جیسے آدمی سے بالکل غیرفطری مطالبہ تھا۔ مجھے کسی قسم کا امتحان پاس کرنے پر مامور کرنا میرا نہایت ہی بے جا مصرف تھا۔ کیونکہ امتحان میرے مزاج کو قطعاً موافق نہیں آتے تھے اور یہ کوئی من گھڑت بات نہ تھی۔ مدرسے کی زندگی میں تقریباً ہر سال اس بات کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن گھر والے تھے کہ میری گذشتہ زندگی کو صلوٰۃ کہہ کر مجھے امتحان میں جھونک رہے تھے۔ اب جو آدمی تجربہ سے فائدہ نہ اٹھائے کس قدر احمق ہوتا ہے لیکن گھر والے تھے کیا کہتا۔

میں نے سوچا۔ بچپن میں فیل ہونا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لوگ کہہ دیتے تھے۔ بچہ ہی تو ہے ابھی پڑھ لے گا۔ پاس ہونے کا فکر کرے تو اپنی نشوونما کا ستیاناس کر دے۔ لیکن اب جوان تھا فیل ہو جانا ایسی بدنامی تھی جس کا ملازمت کے علاوہ شادی پر بھی اثر پڑ سکتا تھا۔ ویسے فیل ہونا کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی کہ فیل ہو لیتا اور یہ حسرت کبھی باہر نکال چکا تھا۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا کہ اب امتحان دیا تو اس شرط پر دوں گا کہ پاس ہونے کا پیشگی یقین ہو جائے۔ اس غرض کے لئے مجھے اپنی فارسی کی قابلیت کا اندازہ لگانا ضروری تھا۔ کہ آیا منشی فاضل کے امتحان کی متحمل ہو سکے گی یا نہیں۔ لیکن قابلیت کا اندازہ لگاتا تو کیسے؟ ان مغربی سائنس دانوں کی بدمذاقی دیکھئے کہ گرمی سردی معلوم کرنے اور دودھ پانی کی تمیز کرنے کے آلے تو بنا دیئے ہیں۔ لیکن قابلیت ناپنے کا آلہ بنانے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی۔ اور

ہمارے دیسی پیر بھی عورتوں کے جن اتار سکتے ہیں۔ ہونے والے بچوں کی تذکیر و تانیث کا پتہ دے سکتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ طالب علم منشی فاضل کے امتحان کے قابل ہے یا نہیں لہٰذا اب بڑی مشکل تھی کہ اپنے آپ کو لایق کہتا یا نالایق۔ اگر صرف اس بات کو دیکھا جاتا کہ میں ایک مڈل پاس نوجوان تھا اور اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا کہ یہ مڈل پاس کرنا کتنے سالوں کی محنت کا نتیجہ تھا تو میں بلاشبہ قابل ِزمان تھا لیکن بعض اوقات جب اس طرز استدلال سے "لایق" کہلانے لگتا۔ تو گذشتہ پچیس سالوں کی تاریخ آنکھوں کے سامنے آجاتی سارے مکاری و دروغ گوئی کا احساس ہوتا اور جھٹ اپنی نالایقی کا اقرار کر دیتا میں نے سوچا کہ میں اپنی ڈائری میں کبھی کبھی اپنی قابلیت پر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ چلو ڈائری سے ہی اپنی قابلیت کا اندازہ لگائیں۔ اگر قابل ثابت ہوا تو امتحان دے دوں گا۔ ورنہ کینسل کرا لوں گا

چنانچہ نہایت شوق اور تیزی سے اپنی قانونی ڈائری نکالی اور ایک ریاکار تسبیح خواں کی طرح ورق پر ورق الٹنا شروع کیا لیکن حیران تھا کہ وہ صفحہ نہ ملتا تھا جہاں میری قابلیت پر روشنی ڈالی گئی تھی ان صفحات میں کہیں تو ریلوے سفر کے متعلق ہدایات درج تھیں جن میں لوٹا پاس رکھنے پر خاص زور دیا گیا تھا۔ کہیں ڈاک خانے کے قواعد رقم تھے۔ جن کے ضمن میں کوپن اور رجسٹریاں کے تعلقات پر بھی بحث کی گئی تھی۔ کہیں قتل۔ چوری اغوا۔ ڈکیتی و دیگر جرائم کی نوعیت و سزا پر روشنی ڈالی گئی تھی اور کہیں طلاق نامہ۔ راضی نامہ۔ کرایہ نامہ و دیگر نامے لکھنے کی تعلیم دی گئی تھی یعنی یہ ڈائری نہ تھی تعزیرات ہند تھی جس کا کوئی صفحہ ڈائری کا کام دیتا تھا۔ اس کے مطالعہ سے ایک دفعہ تو مجھے خیال پیدا ہو گیا کہ کیوں نہ ایک جعلی سا وکیل بن جاؤں۔ مولوی صاحب کی جگہ لے کر داڑھی کے سوا کیا ہاتھ آئے گا۔ لیکن دفعتہً ایک ہمسائے میں رہنے والا وکیل یاد آگیا۔ جس سے کوئی ہوٹل مشورہ لینا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ اور عدم استعمال کی کمی سے دفتر ہی میں زنگ آلود ہو رہا تھا۔ بس اُسے علم وکالت کا یہی فائدہ تھا کہ کبھی اپنے شریر بچوں کو ڈرا لیتا تھا۔ کہ تم مداخلتِ بے جا میں زیر دفعہ ۴۴۸ گرفتار ہو سکتے ہو تو کبھی دست دراز بیوی کو دھمکا لیتا تھا۔ کہ اگر ایک اور جوتا مارا تو تم زیر دفعہ ۳۵۲ قابلِ دست اندازی پولیس ہو جاؤ گی چنانچہ میں نے ایسے عبرتناک پیشہ سے توبہ کی اور اپنی قابلیت کی جستجو میں ڈائری کی پھر ورق گردانی شروع کر دی۔ اچانک میری نگاہ اس صفحہ پر پڑی جہاں میری فارسی دانی کی کیفیت درج تھی۔ ملاحظہ ہو۔

"۱۲ر فروری۔ آج کل امتحانوں کا موسم نہیں لیکن قابلیت تھنوں کے رستے بہہ رہی ہے۔ خصوصاً فارسی دانی میں تو اس سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے گویا دماغ میں شیخ سعدی گھس گئے ہیں۔ کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اب بول چال فارسی شعروں ہی میں کر سکوں گا۔ جہاں کہیں جی ہاں کہنا ہو منہ سے "بلے" آرتے ہی نکلتا ہے۔ کاش ایران میں جنم لیا ہوتا۔ ہندوستان میں تو میرا وجود ایسا ہی ہے۔ جیسے یکہ و سبع صحرا میں تنہ گل لالہ"

یہ حوصلہ افزا فقرہ پڑھا تو میں نے سوچا کہ اگر یہ واقعی درست ہے تو امتحان پاس کرنا بڑی معمولی چیز ہے۔ اتفاقاً ڈائری کے اوراق الٹتے الٹتے بیع نامہ و مناکحت نامہ کے درمیان ایک اور صفحہ نظر آیا۔ جس پر اپنی شان میں کچھ رقم تھا۔

"۱۵ر اپریل کل صبح امتحان ہے۔ فارسی دانی کا نشہ جو غضب کا چڑھا ہوا تھا۔ اس سرعت سے اتر رہا ہے جیسے کھلے پنجوں کا پاجامہ۔ سامنے دیوار پر لکھا ہے۔

مترس از بلائے کہ شب درمیاں

لیکن دماغ پر حضرت آزاد مسلط ہیں۔

کل صبح امتحان ہے دراپی جان ہے

فارسی دانی کا یہ عالم ہے۔ کہ تمام فارسی زبان فعل نہی نظر آتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ بدولت لعیب امداد جاہل مطلق ہیں"

یہ عبارت ذرا دل شکن سی تھی لہٰذا جلد جلد ورق الٹے ایک اور صفحہ پر کچھ در مدح خود لکھا تھا۔ اسے پڑھا۔

"۱۰ر مئی۔ آج مڈل کے امتحان کا نتیجہ نکلا ہے۔ لوگوں کو یقین سی نہیں آتا لیکن میں ایمانا پاس ہوں۔ فارسی میں بھی ہوں چند سر پھرے سرکاروں نے مشہور کر رکھا ہے۔ کہ مجھے کئی خیراتی نمبروں کا احسان مند ہونا پڑا حالانکہ حقیقت میں صرف تین چار نمبروں کی ضرورت تھی۔ خیراتی تو نہیں بھلا ہم کوئی خیرات لینے والے ہیں۔ بہر حال ہماری کامیابی کا پورا اعتبار فقیر دادا جان ہی کو ہے۔ اسی لیے تو انہوں نے "کریما بہ بخشا" کا ایک قلمی نسخہ انعام دیا ہے جسے فر فر پڑھتا جاتا ہوں آخر

مل پاس ہوں مذاق تھوڑا ہی ہے۔ آج پھر ہندوستان
اور ہندوستانی ذرا اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ دل ایران کے
لئے تڑپ رہا ہے۔"

یہ پڑھنے کے بعد ہماری قابلیت بہت مسلم تھی۔ آخر کوئی شک کرتا
تو کیسے کرتا امتحان پاس کر لیے تھے انعام لے لئے تھے۔ کریے پڑھ ڈالے تھے
الغرض ڈائری کی رو سے بس فارسی پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ چھینکتے کھانستے
بھی فارسی میں تھے۔ چنانچہ ہم نے امتحان کا ڈر دل سے بالکل نکال پھینکا۔
اور یہ فرض کرنا شروع کر دیا کہ ہم تقریباً ہم شہری فاضل ہیں نوکر کو حکم دیا
کہ ہمارے جسم سے ہندوستانی لباس فوراً اتار لو۔ وہ حکم بجا لایا تو ہم دادا
جان کی عباو قباو جبہ و دستار زیب تن و سر کرتے ہوئے ایک قد آدم آئینہ
کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ آئینہ میں ایک ایسے انسان کا عکس نظر آیا
جو گویا ابھی کنار رکنا باد سے واپس آیا ہو۔ یہ شگون سراسر حوصلہ افزا تھا
میں نے سوچا آج اتفاقاً فارسی جون بدل لی ہے۔ چلو اس کا باقاعدہ امتحان
ہی کیوں نہ لے لیں۔ چنانچہ امتحان لینا شروع کیا

میں۔ "نام شما چیست؟"
(جواب) "نام من رستم است"
میں۔ "چہ خوردہ؟"
(جواب) "نان خوردہ ام"
میں۔ "یہ کرد کیا ہے؟"
(جواب) ماضی استمراری
میں۔ "مصدر کی کیا علامت ہے؟"
(جواب) "فارسی مصدر کا جانو یہ نشاں
تن یا دن ہے اس کے آخر میری جاں"
میں کوئی نظم سناؤ
(جواب) "کریما بہ بخشائے برحال ما
کہ ہستم اسیر . "
میں نہیں کوئی دوسری
(جواب) دلا ہر کہ بنہاد خوان کرم
بشد نام دار جہان کرم
میں "جاؤ رستم تم پاس ہو۔ تم یقیناً فارسی زبان کے رستم بن کر رہو گے
بلکہ رستم زماں"

میں پاس ہو کر اتنا خوش ہوا کہ دروازہ بند کر کے ایک قلا بازی کھائی
اور اس حقیقی حرکت کے بعد ہمارا شوق رستم زمانی ہمیں کشاں کشاں مولوی
صاحب کے حضور میں لے گیا۔ اگرچہ ہمارا امتحان کا ارادہ بالکل مولوی
صاحب کی بربادی کا ارادہ تھا لیکن امتحان کی ہدایات کے لئے ہم ان ہی
کے محتاج تھے اور ہماری درخواست ان کی وساطت سے ہی لاہور
پہنچا تھی۔

سکول کی زندگی میں کسی مطلب کے لئے ہم مولانا سے بہت کم
ہمکلام ہوتے تھے۔ ہماری اُن سے صرف متفرق باتیں ہی ہوا کرتی تھیں۔
اگر کوئی مطلب کی بات کہنا بھی ہوتی۔ تو پہلے پندرہ بیس منٹ جیلے گوش گذار کرتے
اس دن بھی حسب دستور عرض کیا

مولانا۔ رستم زماں بننے کا کیا طریقہ ہے۔"
کہنے لگے "تحقیق رجوع کرو گا ما پہلوان کی طرف۔ ہم عفی عنہ اس
سے مطلقاً آگاہ نہیں۔"
میں نے کہا "حضرت میں نے استعارے میں عرض کیا تھا۔ فارسی زبان
کا رستم مقصود تھا"
کہنے لگے۔ "تو تحقیق پاس کرو امتحان منشی فاضل یونی ورسٹی کا۔ پندرہ
روپے لیں گے"۔
میں نے کہا "پندرہ روپے آپ مانگ رہے ہیں۔ یا خانقاہ پر چڑھانے
ہیں؟"
کہنے لگے۔ "تحقیق فیس لینا ہمارا کام نہیں اس ضمیر کا مرجع رجسٹرار ہے۔"
اس کے بعد انھوں نے مجھے چھپی ہوئی فارم دی جسے پُر کر کے میں
نے رجسٹرار کو معہ مبلغات بھیج دیا۔ ادھر اعزا و اقربا نے محنت شاقہ کی تاکید یں
شروع کر دیں۔
کوئی کہتا۔ "حضرت پندرہ روپے نقد فیس دی ہے۔ دل لگا کر پڑھنا
فیل ہو گئے تو واپس نہ ملیں گے۔"
کوئی صاحب فرماتے۔ "یونیورسٹی کا امتحان ہے۔ سکول نہیں
کہ ابا جان سے پرچہ حل کرا کے مولوی صاحب کی بیوی کی معرفت بدلوا
لیا۔ ذرا ہوش سے تیاری کرنا"
کوئی حضرت اس طرح گوہر بار ہوتے "خاندان کی ناک ہے۔ رکھو
بھی تم۔ کاٹو بھی تم"
وہ مجلس دیدہ مہربان کہتے۔" مولوی صاحب کی بیوی کو تو ہم صبر

جمیل بخش دیں گے لیکن اگر تم فیل ہو گئے۔ تو مولانا کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔

لیکن میرے ذہن میں اتنا جلد کتابوں کا کیڑا ہو جانا قبل از مرگ واویلا تھا۔ رول نمبر کے آنے تک تو یقیناً میں عام انسانوں کی طرح تھا۔ اور اس کے بعد اگر کثرتِ مطالعہ سے میری انسانیت پر انقلاب آنا تھا۔ تو نہ اس سے انکار تھا نہ احتراز۔ آخر لالہ بھائی بھی تو ہیں جو شب و روز اپنی چوٹیوں سے لٹک کر امتحانوں کی تیاری کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر بھی ہم انسانیت کے دعویدار ہوتے ہیں۔ مجھ پر تو یہ عذاب بھی نہ آتا تھا۔ لہٰذا کئی مہینے اس طرح گذار دیئے کہ گلی ڈنڈا، کنکوا بازی اور ریس کورٹ میں ید طولےٰ حاصل کر لیا۔

جب رول نمبر آنے کے دن آئے۔ تو ہم نے گلی ڈنڈے کا اڈا ڈاکخانے کے قریب ہی بنا دیا۔ جونہی ڈاک آتی۔ ہم اپنے اطمینان کے لیئے پوچھ لیتے کہ کیوں میاں چٹھی رساں، ہمارا رول نمبر تو نہیں آیا؟ اور جواب ہمیشہ تسلی بخش ملتا۔ آخر جب امتحان کے دن بالکل قریب آ گئے۔ اور امتحان کی نسبت گھر اور برادری کی تاکیدیں ہم پر اولوں کی طرح پڑنے لگیں تو ہمیں اپنے فرض کا اس قدر خفیف سا احساس ہوا جس طرح گہری نیند سونے والے کو مرغ کی اذان سنائی دے۔ رفتہ رفتہ امتحان اتنا قریب معلوم ہونے لگا جیسے ایک اونچی چٹان کے پاس کھڑا ہونے سے چٹان سر پہ آتی معلوم ہوتی ہے لیکن رول نمبر معشوق کے مکتوب کی طرح غائب تھا۔ آخر میں یونیورسٹی کے اس شترغمزہ پر کچھ چراغ پا ہونے لگا۔ کیونکہ رول نمبر کے آنے تک کتابوں سے عدم تعاون کا اقرار کر رکھا تھا اور اب تعاون جناب رجسٹرار اور ان کی یونیورسٹی کے غمزوں کی نذر ہو رہا تھا۔ گویا ہم مجبوراً امتحان کی تیاری سے دستکش ہو گئے تھے۔

ہماری یونیورسٹی کے چند امتحان حقیقی ہیں اور چند سوتیلے ایف۔ اے۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے وغیرہ پہلی قسم کے ہیں۔ اور منشی فاضل۔ گیانی۔ آنرز ان پشتو وغیرہ دوسری قسم کے یہ سوتیلے امتحان ہر سال خزاں کی طرح آتے ہیں۔ اور گذر جاتے ہیں لیکن سوائے امیدواروں کے ان کا کوئی پرساں حال نہیں۔ آخر اس سے بڑھ کر سوتیلا پن بھی کیا ہو کہ ولادت کی گھڑی سر پر ہے۔ مولود کے لواحقین ملک کے گوشہ گوشہ میں گوش برآواز ہیں لیکن ان تک اطلاع پہنچانا بھی ہتک سمجھا جاتا ہے۔

بہرکیف امتحان سے عین چوبیس گھنٹے پیشتر رول نمبر ملا۔ جن میں سے تئیس گھنٹے تو لاہور پہنچنے میں صرف ہونے تھے، لہٰذا ہمارے اختیار میں صرف ایک گھنٹہ تھا۔ اگر اسے مطالعہ میں صرف کر دیتے تو گھنٹے غریب نے تو اعتراض کیا کرنا تھا لیکن آخر ہماری ذاتی شرافت کا تو یہ تقاضا نہ تھا پس گھنٹے کو یونہی جانے دیا۔ اور مطالعہ کی کمی کو گیارھویں والے پیر کی نیاز مان کر پورا کر دیا۔

الغرض اگلی صبح قلم، ربڑ اور "سیاہی چوس" سے مسلح ہو کر یونیورسٹی ہال کے سامنے جا ڈیرے ڈالے ہال کی دیوار پر امتحان کی نشستوں کا نقشہ آویزاں تھا۔ ہر کوئی اپنا اپنا رول نمبر دیکھ کر پیشگوئیاں کر رہا تھا۔ کوئی کہتا مجھے نگراں کے عین سامنے بیٹھنا پڑے گا۔ نقل کی امید بھی گئی۔ کوئی صاحب بتاتے۔ ہمیں تو نگراں کے پس پشت ہی میں گھنٹے گذارنے ہوں گے۔ اچھا نقل تو پیٹ بھر کر اڑائیں گے۔ میں نے دیکھا۔ تو میرا رول نمبر نقشہ کے عین مرکز میں درج تھا۔ میں اپنے دماغ سے فیصلہ نہ کر سکتا تھا۔ کہ اس نقشہ کے اعتبار سے میرا بنچ (BENCH) کمرے کے کس موقع پر ہوگا۔

جس طرح نقشہ لٹک رہا تھا۔ مجھے یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا بنچ چھت اور فرش کے عین درمیان ہوگا۔ میں یونیورسٹی کے اس امتیازی سلوک کے متعلق فیصلہ کر رہا تھا۔ کہ مجھے خوش ہونا چاہیئے۔ کہ اتنے میں داخل ہونے کی گھنٹی بجی۔ تمام امیدوار غولِ بیابانی کی طرح دروازوں پر پل پڑے۔ اور ہال میں داخل ہوتے ہی میزوں پر کہنیاں ٹیک کر سٹولوں پر اس طرح سوار ہو گئے۔ گویا ایک دو تین پر میاں میر[1] جا دم لیں گے۔ میں خود ایک کونے میں "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کا ترجمہ بنا کھڑا تھا۔ اور میری نگاہ کمرے کے وسط میں بجلی کے قمقمے اور پنکھے کا جائزہ لے رہی تھی کہ آیا ایسی مصنوعات کسی طرح بنچ کا کام بھی دے سکتی ہیں۔ اسی فکر میں تھا کہ پیچھے سے نکتے کی بہ نسبت کسی قدر مہذب شکل کا ہاتھ میرے کندھے پر آ تھما۔ ہاتھ کا مالک امتحان کا نگراں تھا۔ اور شاید اسی لیئے ذرا مہیب سا معلوم ہوتا تھا۔

کہنے لگا۔ "بیٹھتے کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "جگہ نہیں ملتی"

کہنے لگا "آسمان پر چلی گئی"

میرا اپنا خیال اپنی جگہ کے متعلق کچھ اسی سمت میں تھا۔ لہٰذا نگراں کے تمسخر کو سنجیدگی سمجھا اور کہہ دیا "جی ہاں"۔

بولا "میں! یہ کیا کہا؟ دکھاؤ رول نمبر تو؟"

---

[1] لاہور سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مقبرہ مرجع خاص و عام ہے۔

میں نے سر ہلایا۔ تو ہنس کر کہنے لگا "امتحان دینے کے لئے بھی عجیب عجیب سامنے آتے ہیں! دیہاتی معلوم ہوتے ہو میاں جاؤ وہ بیچ سنبھال لو۔"

میں نے وہ بیچ تو سنبھال لیا لیکن اس بات کے متعلق دماغ سے کچھ تسلی بخش جواب بن نہ آتا تھا کہ دیہاتی کہہ کر اس نے میری عزت افزائی کی یا ہتک۔ میں غور کر رہا تھا [illegible] مجھے خود بھی کہہ گیا تھا۔ کہا جائے [illegible] ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میرے کانوں سے ایک فلک شگاف آواز ٹکرائی [illegible] یونیورسٹی[1] کی توپ نے خاموش بول دیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ "خاموش" جناب نگراں کی زبان سے نکلا تھا جس کے بعد تقریر فرما رہے تھے۔ تقریر کا ماحصل یہ ہے:۔

> یہ جگہ [illegible] آپ خاموشی سے اکڑ کر بیٹھ جائیں [illegible] کہ مجھے کسی تحقیق کی ضرورت نہ ہو۔ تمہاری حرکات سے جس نقل نویسی کا شبہ پیدا ہوگا اور اظہار سے [illegible] ہمارا سلوک بھی اچھا نہیں ہوگا بلکہ [illegible] کی حالت میں تو ہم متواتر تین سال بہ سلوک کرتے رہتے ہیں۔ خاموشی کے لئے تم ان مرحوم بزرگوں کا خیال کرتے رہو جو عرصے سے زیر خاک چپ چاپ لیٹے ہوئے ہیں۔
>
> تم یاد رکھو ہمارے لئے یکساں میز [illegible] کا ثبوت ہے لیکن کہا کہ تین گھنٹے تک تمہیں اپنی جگہوں سے الگ ہونے کی اجازت نہیں [illegible] ہال میں تمہاری کوئی اندرونی یا بیرونی طاقت رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد تین گھنٹوں کے اندر اندر تمہیں باہر جانے کی اجازت ہے اور تمہیں باہر جانا تمہاری ہی ٹانگوں کا فرض ہے۔ اگر تین گھنٹوں کے بعد تم نے ہال سے باہر نکلنے میں تاخیر کی تو ہماری لاتیں تمہارے شامل حال ہوں گی۔

اس تقریر کے بعد مجھے ہال میں بیٹھنا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بیرونی دنیا سے سلسلہ آمد و رفت بالکل منقطع ہو گیا تھا۔ رابنسن کروسو[2] ایک نہایت ہی قریبی رشتہ دار معلوم ہوتا تھا۔ ہال کی وسعت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ دیواروں کو جس نقطہ پر دیکھتا پیچھے ہٹتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ چھت کی طرف نگاہ کرتا تو وہ بھی اس طرح اوپر ابھر جاتی جیسے اونٹ کے پیٹ میں بیٹھنے سے اس کی کوہان دکھائی دے۔ ہال میں ایک وسیع دریا معلوم ہوتا تھا۔ جہاں ایک آدم زاد ہزاروں جنگلی جانوروں کے نرغے میں آ گیا تھا۔ نگران و نائب نگرانوں کی شکلوں میں ایسا تغیر پیدا ہو رہا تھا کہ دشمن سے معلوم ہونے لگے تھے۔ ایسے ہی جسم میں ایک بہت ہی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی تھی وہ اعضا بھی جو قدرت نے ساکن [illegible] بنا رکھے تھے بجز میری رضامندی کے وجد پر اتر آئے تھے۔

بالآخر پرچے تقسیم کرنے والا میرے پاس سے گذرا اور ایک سوالات کا ورق منہ کے بل بیچ پر لٹا گیا۔ اب اس ورق کو مجھے ان انگلیوں سے سیدھا کرنا تھا۔ جو شدت و [illegible] اور جن کی نسبت مجھے ان [illegible] پر زیادہ اختیار تھا جو میرے ہمسائے ہاتھوں پر تھیں لیکن ہمسائے سے مدد خواہی نہ صرف قانون شکنی تھی بلکہ [illegible] عقوبت دوزخ برابر بھی مگر قربان جاؤں اپنی قوت ارادی کے کہ اس نازک وقت میں جسم کے دور افتادہ حصوں سے نکل کر انگوٹھے اور انگشت شہادت میں آ کر جمع ہو گئی۔ اور کاغذ کو آن کی آن میں پشت کے بل لٹا دیا۔

سب سے پہلے تین دفعہ "یا مسبب الاسباب" کا ورد کیا۔ اور آنکھیں بند کر کے ہال کے چاروں طرف پھونک دیا پاس سے نگراں گذر رہا تھا اس پر خاص پھونک لگائی حتیٰ کہ پھیپھڑے خالی کر دیے۔

اب سوالات کی نسبت یہ عرض ہے کہ گو امتحان دینے والے تمام ہندوستانی تھے لیکن سوالات فارسی میں لکھے تھے بیرونی ناصحوں کی ہدایت تھی کہ جواب لکھنے سے قبل سوالات پڑھ لینا چنانچہ میں نے سوالات کو یکے بعد دیگرے پڑھنا شروع کیا۔ تلفظ کی غلطیوں کا تو امکان نہ تھا۔ کیونکہ دل ہی دل میں پڑھ رہا تھا جب تمت بالخیر کے اس پار نکل گیا تو معلوم ہوا کہ جلدی میں سہل و دشوار کی تمیز کرنا بھول گیا ہوں ویسے کبھی جی چاہتا کہ انہیں آسان کہہ دوں کبھی خیال آتا کہ دشوار لکھوں لیکن جس نکتہ پر آخر اپنے آپ سے متفق ہو گیا۔ وہ یہ تھا کہ سوالات مشکل ہیں کیونکہ اب جس لفظ پر نگاہ پڑتی تھی لغات کی یاد دلاتا تھا بلکہ اب اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ابھی سوالات کا اردو ترجمہ تقسیم ہونا باقی ہے چنانچہ ترجمہ کے انتظار میں تھوڑی دیر قلم چبایا گیا لیکن جب گرد و پیش کے تمام ذی روحوں کو بے حد مستغنی پایا۔ تو ایک پاس سے گذرتے ہوئے نائب نگراں کو عرض کیا

---

(۱) یونیورسٹی ہال کے قریب شاہی زمانے کی ایک توپ جو ایک دو راہہ پر رکھی ہوئی ہے۔ (۲) ایک انگریزی ناول کا کردار جسے کئی برس تک ایک جزیرہ میں تنہا رہنا پڑا۔

"جناب وہ ترجمہ تو دیا ہوتا"

نائب نگراں "ترجمہ! ترجمہ کیسا"

میں:- "انہی سوالات کا اردو ترجمہ، اور کیا؟"

نائب نگراں "گویا تم مجھ سے سوالات کے جواب پوچھتے ہو!"

میں:- "مذاق نہ کیجئے۔ دیجئے ترجمہ"

نائب نگراں "بے وقوف نہ بنو۔ ورنہ نگراں کے پاس لے جاؤں گا"

نائب نگراں کی اس ترش کلامی کے بعد میں نے اس شخص سے ترجمہ مانگنا باعث ہتک قرار دیا اور عہد کر لیا کہ بے ترجمہ ہی سوال حل کروں گا لیکن جب سوال پڑھے تو معلوم ہوا کہ ایسے عہد کرنے سے سوالات کی رمز تو کچھ کم نہیں ہوئی۔ بہرحال فیصلہ کر دیا کہ "چلو لکھنا شروع کریں ممکن ہے لکھتے لکھتے تمام مشکلیں حل ہو جائیں" آخر کسی نے کہا ہے نا کہ ع

"وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا"

اور حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہوئے ان کی مدح شریف کا معروف مطلع گنگنا الاپ لیا۔

"مشکل نام کشا ہے تیرا حل کر مشکل میری"

(نوٹ: لفظ "نام" کا مشکل اور کشا کے درمیان واقع ہونا صنعت دخل در معقولات ہے۔)

الغرض ابتدا کے لئے عجز و خلوص کے ساتھ بسم اللہ تو خوب لکھی اور سوالات کو اس غور سے پڑھنا شروع کیا۔ گویا [illegible] کے سوالات تھے۔ لیکن دیکھئے اس پرچہ کی کافر قلمی کہ [illegible] انگریزی عہد میں ایسا دانشمندانہ پرچہ انگریزوں کے انصاف و قانون پر بدنما دھبا تھا۔ ایک دفعہ تو خیال آیا کہ ممتحن نے پرچہ بنانے میں قانون شکنی کی ہے۔ تو ہم جواب لکھنے میں کیوں نہ [illegible] سوال کے جواب میں چائے والی کی شکل کھینچ دیں کسی کے جواب میں [illegible] جاناں میں ہم نے ساقی ... والی غزل لکھ دیں اور کہیں [illegible] لے کر [illegible] یکایک دہرا دیں لیکن جو رشتہ داروں کی تاکیدیں یاد آنے لگیں خصوصاً وہ جس کی رو سے مولوی صاحب کا خون میرے ذمے تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے یہ سوالات سرے سے ہی بے معنی ہوں اور ممتحن نے محض مذاق کی خاطر دے دئے ہوں دیکھئے نا آخر سوچنے کی بات ہے۔ اس میں کوئی چالاکی نہیں: نہ فارسی کا پرچہ ہے۔ نہ ماضی مطلق بنانے کا طریقہ پوچھتا ہے نہ مصدر کی علامت، نہ کریا بحث۔ آخر یہ مذاق نہیں تو پھر مذاق کس جانور کا نام ہے چنانچہ یہ تحقیق ہمارے ذہن کو اس قدر موافق آئی کہ ہم نے ممتحن کے اس خفیہ مذاق کو طشت از بام ہی کرنا مناسب سمجھا کیونکہ اس پرچہ کا اس سے صحیح تر جواب کوئی نہ تھا۔ لہذا لکھا۔

جناب ممتحن صاحب

اگر جاں کی امان پاؤں تو وہ بات عرض کروں۔ جس کے ذریعے آپ نے ہم لوگوں کو الو بنانے کی کوشش کی ہے میرا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ آپ سے الو بنانے میں کوئی ذرہ بھر غلطی ہوئی ہے صرف یہ بات ہے کہ

"تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں"

ہاں تو سادہ الفاظ میں میرا یہ مطلب ہے کہ آپ نے پرچہ میں جو کچھ لکھا ہے۔ بالکل فضول ہے فضول سے میرا مطلب وہ فضول نہیں بلکہ مذاق تمسخر ٹھٹھہ اور اس قسم کی چیزیں

اب سمجھ گئے۔ جناب گیا ہوں نا۔

ہا ہا ہا انشا دیکھو کیسی کہی؟

اتنا لکھ چکا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ آخری سطر میں [illegible] لکھی [illegible] ہے۔ اس لئے اسے قلم زد کر دیا اور اس کی جگہ لکھ دیا خدا کی قسم جو کچھ لکھا ہے خود سوچ کر لکھا ہے کسی کی نقل نہیں کی۔

ابھی میں نے [illegible] کی ایک بات کو [illegible] دی تھی مزید [illegible] [illegible] متعلق بھی کوئی [illegible] [illegible] تھا کہ کم بخت [illegible] چنانچہ اسی خیال سے کہ باہر جاتا ہوں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا [illegible] [illegible] میں کچھ کسر باقی تھی [illegible] چند منٹ [illegible] تھا [illegible] پیچھے سے آیا اور [illegible] گردن سے [illegible] کرنے لگا جس کا [illegible] دیکھا تو جناب نگراں تھے فرمانے لگے "کہاں کی تیاریاں ہیں"

میں نے کہا:- "باہر جاتا ہوں۔ پرچہ ختم ہو گیا"

کہنے لگے:- "ختم ہو گیا! وہ کیسے؟ حل کیا ہے یا جیسا گئے ہو ابھی تو پانچ منٹ بھی نہیں گذرے"

میں نے کہا "جناب میں نے تمام سوالات کے خلاصے کے
جوابات کا خلاصہ لکھ دیا ہے اس طرح وقت بچ جاتا
ہے زیادہ تر عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل ہو یہ خلاصہ
تو تمہیں بھی دکھایا ہوتا"

اس کے بعد آداب گفتگو کے مطابق مجھے حق حاصل تھا کہ جواب دیتا۔ عجائب خانہ میں رکھے جانے کے متعلق اعتراض کرتا۔ اور پرچہ دینے سے پس و پیش کرتا لیکن نگراں جس نے آداب گفتگو پر کوئی مسلم تصنیف مثلاً گلستاں۔ بوستاں وغیرہ کبھی دیکھی تک نہ تھی گنواروں کی طرح نزدیک تر آگیا۔ اور مجھ سے پرچہ چھین لیا میرا احتجاج اس طرح دب گیا جیسے چھینک آتے آتے ملتوی ہو جاتی ہے۔ نگراں پرچہ پڑھ چکا تو کہنے لگا۔

میاں صاحبزادے۔ گھر سے لڑ کر آئے معلوم
ہوتے ہو۔ کیوں نا؟

اب حقیقت یہ ہے کہ میں گھر سے بہت صلح کی صورت میں رخصت ہوا تھا چلنے سے چند یوم پیشتر مجھے دس روپے بطور زاد سفر عنایت ہوئے تھے۔ جو میری ضروریات کے لیے بالکل کافی تھے۔ لیکن میں دم رخصت مجھے والدہ نے ایک کاغذ کا پرزہ دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا۔

"اشد ضروری

لاہور سے آتے وقت مندرجہ ذیل دس اشیاء عزیزم بالضرور
ہمراہ لانا تاکید مزید ہے۔

۱۔ سیویوں کی مشین۔ چھلنی نہ بہت باریک نہ بہت موٹی
۲۔ صغریٰ کے لئے پارہ الف لام میم۔ جلی قلم۔ عمدہ کاغذ۔
۳۔ صغریٰ، حمیدہ کے لئے جرابوں کی جوڑیاں۔ زنانہ۔
دھوکے سے بچنا۔
۴۔ ننھے خالد کے لئے بھلکنے ٹین والے۔ اصل کا پوری
جرمن ہو۔ مگر دیکھ لینا گارنٹی والا ہو تو بہتر ہے
۵۔ نانی جان کے لئے ایک جائے نماز۔ نرم و ملائم۔ اور ایک
تسبیح خاک کعبہ والی۔
۶۔ دادا جان کے لئے ایک عینک پتھر کی۔ ۶۵ سال کی
عمر کے مطابق ہو
۷۔ میلاد کے لئے مندرجہ ذیل نعتیں و قصیدے۔ کریما۔
معلّٰی مراج شریف۔ روز محشر کہ جاں گداز بود۔ اولین
پرسش نماز بود۔ یکمیں ہوں۔ وضو کر کے ہاتھ لگانا ہوگی
دروازے کے اندر ملیں گے۔
۸۔ قصور کی میتھی۔ بڑی پڑیا۔ خوشبودار۔ سونگھ لینا۔
۹۔ روح کیوڑا ایک شیشی کلاں۔ جالندھر
۱۰۔ میرے لئے اور اپنے ابا کے لئے جو تحفہ مناسب
سمجھو لے آنا لاہور میں فقط چڑیا کا دودھ نہیں ملتا
باقی کسی چیز کی کمی نہیں۔

راقمہ تمہاری والدہ"

میں والدہ کی اس دست درازی سے زہر کا گھونٹ ہی تو پی گیا تھا۔ لیکن اب حیران تھا کہ نگراں کو ہمارے خانگی حالات کس نے بتا دیئے۔

جھوٹ بولنا تو عبث تھا۔ لہذا عرض کیا۔

"حضور کچھ لڑ کر ہی آیا ہوں"

معلوم ہوتا تھا میری راست گوئی سے نگراں میری جوانی پہ رحم کھا گیا تھا۔ کہنے لگا

"صاحبزادے لڑائی کا جواب لڑائی سے فیل ہو کر
اپنی عمر ضائع کرو گے۔ گھر والوں کا کیا جائے گا لو قصہ مختصر
دو اور انسانوں کی طرح پرچہ لکھو۔ خلاصے لکھنا انسانوں
کا کام نہیں ویسے بھی مرنا ہی ہے تو آدھے گھنٹے کے بعد
اجازت ملے گی"

گو میرے جوابات کے "خلاصہ شکل" ہونے میں خانگی ناراضگی کو قطعاً دخل نہ تھا یہ محض میری اپنی سوال فہمی کا نتیجہ تھا لیکن نگراں کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ سوالات کے مذاقیہ ہونے کے متعلق میرا قیاس اتنا غلط تھا کہ مجھے فیل کرانے کے لیے کافی تھا۔ علاوہ ازیں نگراں کے احسان کا بوجھ تو میں نے اس قدر محسوس کیا کہ اس کے دباؤ سے کئی فی البدیہہ دعائیں مگر اس کے حق میں میرے منہ سے نکل گئیں۔ دل چاہتا تھا کہ ایسے فرشتہ سیرت آدمی کو خدا وائسرائے بنا دے بلکہ یہ ہوتا تو میں اسے بنا دینا چاہتا تھا۔ لیکن موقع نہ مل سکا۔

اب میں نے سوالوں سے جان لڑانے کا تہیہ کر لیا۔ پرچے کو نہایت کھردرے ہاتھوں سے اوپر تلے کیا۔ اور گھور کر پہلے سوال پر دیکھا۔ لیکن خیال آیا کہ پہلا سوال تو ممتحن رعب جمانے کی غرض سے ڈھونڈ کر مشکل دیتے ہیں۔ چلو دوسرے سے دو دو ہاتھ کئے جائیں۔ اس سوال کی تین دفعہ

تلاوت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تیس الفاظ پر مشتمل ہے جن میں سے پچیس کا مجھے تلفظ معلوم نہ تھا اور انتیس کے معانی سے بے خبر تھا۔ تیسرے کے متعلق نہ تو اس وقت کوئی صحیح رائے قائم کر سکا نہ ہی اب کہہ سکتا ہوں بہرحال بہت فضول سوال تھا۔ چوتھے میں ممتحن کا تو کچھ قصور نہ تھا البتہ کتابت کی غلطیاں بے شمار تھیں مثلاً ایک جگہ لکھا تھا "تاریخ وصاف" حالانکہ صحیح لفظ تاریخ ہند ہے۔ جاہل سے جاہل شخص بھی جانتا ہے کہ دریافت شدہ دنیا میں وصاف کسی جگہ کا نام نہیں اسی طرح عمرو عیار کو نعوذ باللہ عمر خیام لکھ دیا تھا۔ کم بخت کاتب کو اتنا معلوم نہ تھا کہ خیام تو خیمہ بنانے والوں کو کہتے ہیں۔ بھلا فارسی کے پرچے میں خیمہ سازوں کا کیا کام اور پھر دنیا کی اس مشہور ہستی کا نام بگاڑنا کتنا گناہ تھا۔ باقی تین سوالوں سے بھی کسی نہ کسی مقام پر اختلاف تھا۔ لہٰذا ایسے ناموافق سوالات سے حل ہو جانے کی توقع رکھنا عقل و خودداری کے منافی تھا۔

ادھر حضرت نگراں کو مجھ سے دلچسپی جو پیدا ہوئی تو ایک بار فی سانس کے حساب سے میرے پاس سے گذرنے لگے (آیا لکھنا ہے۔ یا خلاصے پر ہی قناعت کئے بیٹھا ہے) لکھا تو جو کچھ میں نے تھا۔ آپ سے چھپا ہوا نہیں۔ البتہ نگراں کو ٹالنے کی غرض سے مجھے ایک اور گر یاد آ گیا۔ جونہی آنحضرت میرے پاس سے گذرتے میں سوالات کا پرچہ جوابات کے کاغذ پر رکھ دیتا۔ اور سوالوں کے نمبروں پر اس طرح نشان لگانا شروع کرتا:۔

۳ ۲ ۱

اب اس ذرا سی ٹیڑھی لکیر کا یہ اثر ہے کہ جس سوال کے نمبر پر کھینچ دی جائے۔ اسے "حل شدہ" سمجھا جاتا ہے۔

اس جادو کی لکیر سے میں نے پرچہ تو آن کی آن میں حل کر مارا لیکن اب باہر کی دنیا رہ رہ کر یاد آتی تھی جی چاہتا کہ بھاگ کر باہر جاؤں اور ہر جانے والے کو بتاؤں کہ مجھ پہ یہ مصیبت گذری ہے اور اب میں آزاد ہوں لیکن میعاد قید کے ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ ادھر نگراں کا مجھ سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ میرے بنچ کا طواف کرنا شروع کر دیا تھا میرا قلم صفحۂ قرطاس پر بیکار رہتا تو حضرت نگراں خوش رہتے لیکن جونہی مائل بہ سکون ہوتا۔ آنحضرت پند و نصائح کی بوچھاڑ کرنا شروع کر دیتے:۔

"میاں بیکار نہ بیٹھو۔ سوچ سمجھ کر سوال حل کرو۔ فیل ہو گئے تو اپنی عمر ضائع کرو گے گھر والوں کا کیا جائے گا!"

میں دل ہی دل میں رو کر کہتا:۔ ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غم گسار ہوتا!!!"

شعر تو کئی دفعہ پڑھ دیا لیکن اس شعر خوانی کا فائدہ کچھ نہ تھا۔ پندرہ منٹ اسناد ذوق کی شمع کی طرح مس کر یا رو کر گذرنے تھے۔ اور قلم کو بھی یو نہی رکھنا تھا۔ ورنہ نگراں کی نصیحتوں میں طغیانی آنے کا خطرہ تھا لہٰذا فیصلہ کیا کہ چلو ممتحن کے نام ایک خط بطور اپیل ہی لکھ دیں۔ ممکن ہے۔ رحم دل انسان ہو ترس کھائے اور پاس کر دے ویسے بھی جذبات موثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ خط شروع کیا۔

"جناب ممتحن صاحب!

اتنا لکھنے کے بعد "السلام علیکم" لکھنے ہی کو تھا کہ خیال آیا۔ ممکن ہے ممتحن ہندو ہو۔ یا سکھ ہو۔ تو اب بڑی مصیبت تھی کہ "السلام علیکم" لکھا جائے یا "نمستے" یا "واہگرو جی کی فتح"۔ سوچ رہا تھا کہ ایک ملک میں ایک سے زیادہ مذہب کس قدر تکلیف دہ چیز ہے کہ اتنے میں میرے ذہن میں گڈ مارننگ نمودار ہوئی۔ جو سلام تو انگریزوں کا ہے لیکن ننگ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد ہندوستانیوں کو بھی بلاتمیز مذہب و رنگ اس سے مساوی انس ہے چنانچہ میں نے گڈ مارننگ لکھنے کا فیصلہ کر دیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اس ماسٹر جی کی قابلیت و دور اندیشی پر حیران ہوتا رہا جو چوتھی جماعت میں ہر دوسرے دن انگریزی رات کی برکتوں پر جواب مضمون لکھوایا کرتا تھا اور اس وقت ہم ہنس کر کہہ دیتے تھے۔ کہ ماسٹر جی ٹوڈی ہیں! تو خیر خط شروع کیا۔

جناب ممتحن صاحب!

گڈ مارننگ یہاں خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ باقی عرض یہ ہے کہ اس دفعہ آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ یوں تو آپ کو کبھی ایسی تکلیف نہ دیتا لیکن کیا کروں امر مجبوری ہے ناں تو کوئی اتنی بڑی تکلیف بھی نہیں صرف مجھے اس پرچہ میں بذرہ نوازش صرف... کر دیں۔ ... آپ وہ بات سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میں ذرا اس لئے وہ خاص لفظ لکھنے سے پرہیز کرتا ہوں۔ کہ کہیں یونیورسٹی کو پتہ نہ چل جائے۔ اور میری اپنی تحریر بطور ثبوت پیش کر دے۔ آخر آپ جانتے ہیں۔ قانون سے چھٹکارا تو نہیں ہو سکتا۔ پچھلے سال اسی طرح میرے دوست ظفر نے پرچہ میں خط لکھا تو اس

میں کچھ اسی کی قسم کے الفاظ لکھتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدانخواستہ فیل ہوگیا۔ حالانکہ کمبخت آسانی سے میری طرح نقلے ڈال سکتا تھا۔ آخر آپ لوگ کوئی جاہل تو نہیں صرف گندا رنگ سے ہی اندازہ لگا لیتے ہوں گے کہ بھئی۔ اسے پاس ہونے کی ضرورت ہے۔ اسے پاس کردیں۔ آپ کو مجبور کرنا شرافت نہیں۔

اب میں نہیں چاہتا کہ اس سے زیادہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کروں۔ آپ کو ابھی بہت سے پرچے دیکھنے ہوں گے۔ ویسے میں آپ کے حسن سلوک کا اس قدر ممنون ہوں کہ بیان نہیں کرسکتا۔ منہ پر تعریف کرنا ناجائز ہے لیکن آپ سے مہربان بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں کیا کہوں۔ ع

پیام بن نہیں سکتی ہیں راز کی باتیں

افسوس۔ آپ مجھے اس خط کا جواب نہ دے سکیں گے۔ کیونکہ پرچوں میں نام پتہ لکھنے کی سخت ممانعت ہے۔ اچھا خدا حافظ

ہاں تو ایک ضروری بات رہ گئی ہے۔ ہمارے گاؤں میں پوٹھری جوتا غضب کا نفیس بنتا ہے اگر ارشاد ہو۔ تو مفت بھیج دوں لیکن براہ نوازش اسے رشوت نہ سمجھیں۔

باقی اس بات کے متعلق دوبارہ تاکید کرنے کی ضرورت تو نہیں لیکن خیر یہ بھی دیتا ہوں میں جانتا ہوں آپ کو میری باتوں پر غصہ تو آئیگا نہیں۔ بلکہ اب تو آپ تھوڑے تھوڑے دوست ہوگئے ہوں گے دوستوں سے شرمانا فضول ہے۔ تو آپ سچ مچ پاس کردیں گے نا!

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال مے آید!

اچھا خدا حافظ — خاکسار رول نمبر ۴۴۳،

خط کے ختم ہوتے ہی آدھا گھنٹہ بھی گذر گیا۔ میں پرچہ وارڈن کے حوالے کرکے لپک کر ہال سے باہر آگیا۔ میں دل میں کہتا۔ یہ گھر والے کس قدر کم فہم ہیں۔ جو مجھے آج تک سادہ لوح و بے وقوف سالڑکا سمجھتے رہے ہیں۔ حالانکہ میں اتنا چالاک ہوں۔ کہ جوتے کے بہانے سے ممتحن جیسے آدمی کو چیڑی چکنی باتوں میں پھنسا لیتا ہوں۔ اور پاس ہونے کی دیر ہے۔ پھر جوتا بھی نہ دوں گا۔

مجھ گھر پہنچ کر میں نے اپنی چالاکی کو صیغہ راز میں ہی رکھنا مناسب سمجھا اور فیصلہ کیا کہ جب نتیجہ نکلے گا تو انہیں بتاؤں گا۔ کہ دیکھو یہ اسی ہمیں کوٹ کھیلنے والے بچے کا کام ہے جس پر تم پکٹنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور جب وہ حیران ہوں گے تو اپنی خط والی چالاکی کا ذکر کرکے انہیں اور حیران کردوں گا۔ پھر انشاء اللہ گاؤں کے لوگ میرے سایہ سے بھی بھاگیں گے۔ اور مولوی صاحب کے لئے تو بلا تکلف انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ دوں گا۔

حضرات آپ حیران ہوں گے۔ کہ جب ایک ماہ بعد نتیجہ نکلا۔ تو مجھے نہ صرف فیل کردیا گیا۔ بلکہ مجھ سے وہ سہ سالہ بدسلوکی بھی کی گئی۔ اور سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ مولوی صاحب کو زندہ رہنے کے لئے تین سال کی ایزادی مل گئی۔ اور میرے خلاف پکٹنگ کا اعلان ہوگیا۔ دیکھیں یونیورسٹی کی ذرا سی غلطی نے میرا پروگرام کس قدر تہ و بالا کیا۔ ایسی منافق یونیورسٹی کے معاملات کی تحقیقات ہونی چاہئے +

کامران ایم۔ اے

کیفِ بہار

بہار!
اپنی شوخیوں۔ مسرتوں کے ساتھ آگئی
جہان زندگی پر ایک موجِ رنگ بن کے چھاگئی۔ ہر ایک مردہ شے میں پھر سے حیات کی تڑپ آگئی ہر ایک زندہ شے میں حسن بے مثال رقص کراٹھا
وہ چلی:۔ خوشنما نشاط بیز پھول اڑنے لگے۔
وہ۔ پھیلا جیسی شوخ تتلیوں سے اک جہاں مہک اٹھا۔ کہو
تو ان میں کون تتلیاں ہیں۔
اور پھول کون ہیں!
بہار!
ہاں بہار کی نشاط خیز روح کی قسم!
مجھے تو کچھ خبر نہیں۔

خالد (لندن)

تجلّیات

(۱)

آرزو دل میں نظر میں ہے تماشا گستاخ
محفلِ یار میں بھی آج ہیں کیا کیا گستاخ

پھر انہوں نے نگہِ ناز سے دیکھا دل کو
پھر بڑھا اُن کی طرف دستِ تمنّا گستاخ

دامنِ یار پہ سر بار اٹھا جاتا ہے
دستِ وحشت بھی ہوا جاتا ہے کتنا گستاخ

خلوتِ ناز میں شاید کہ اسے بار نہیں
غیر ہے آج سرِ راہ گذر کیا گستاخ

غمزۂ یار کی شوخی یہ کہے دیتی ہے
جس قدر آج تجھے ہونا ہو ہو جا گستاخ

(۲)

ابر و ہوا و شاہد و مستی ہے زندگی
بزمِ سرود و بادہ پرستی ہے زندگی

آلامِ روزگار نے بے حال کر دیا
اب مرگِ ناگہاں کو ترستی ہے زندگی

ہے فصلِ برشگال میں اتنا نمو کا جوش
گویا کہ بادلوں سے برستی ہے زندگی

اے ناشناسِ رمزِ حیات و ممات سُن
گر جان دے کے بھی ملے سستی ہے زندگی

وہ جنتِ نگاہ ہے پیشِ نظر مدام
اکبر مری تو حُسن پرستی ہے زندگی

جلال الدین اکبر

ہماری غزلوں پر مقامی اثرات

ہماری شاعری پر جہاں اور بڑے اور چھوٹے بہت سے اعتراضات ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس میں مقامی اثرات کی کمی ہے۔ یا یُوں کہئے کہ جو شاعری ہندوستان کی فضا میں پروان چڑھی وہ شروع سے آخر تک فارسی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اعتراض ہماری شاعری کے کافی بڑے حصّے پر چھا جاتا ہے لیکن اعتراض کرنے والوں کو اعتراض کرنے سے پہلے یہ بھی سوچ لینے کی ضرورت ہے کہ اردو شاعری کن اثرات کے ماتحت ہندوستان میں شروع ہوئی؟ یہاں کی سیاسی فضائیں کس قسم کی تھیں؟ جن لوگوں نے اُردو شاعری کی ابتدا کی اُن کی زبان کونسی تھی؟ ان سب باتوں کا جواب بہت آسان ہے۔ اور ان کا صحیح جواب معلوم کر لینے کے بعد اعتراض کی اہمیت بہت ہلکی ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری میں ہمارے شاعروں نے نہ فارسی کی روایتوں کو کسی خاص محبت کی بنا پر شامل کیا اور نہ ہندی روایتوں کو کسی نفرت کی وجہ سے اپنی شاعری میں جگہ نہیں دی۔ چونکہ سیاسی فضاؤں نے اُن کے سامنے شروع شروع میں فارسی شاعری کے نمونے پیش کئے اس لئے اُنہوں نے اُنہیں کو اپنا بنانا شروع کر دیا۔ بعد میں آنے والے اُسی لکیر کے فقیر رہے اور ہماری شاعری فارسی کے قالب میں ڈھل گئی۔

لیکن یہ مان لینے کے بعد بھی اِس بات سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے شاعروں نے اپنی مقامی چیزوں کی محبت اور عظمت کو دلوں میں قائم رکھا اور اپنی شاعری کو برابر اُن ملکی خزانوں سے مزین کرتے رہے چونکہ ہماری آنکھیں فارسی کی روایتوں اور اُن فرسودہ خیالات کو دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں اِس لئے جب ہمارا کوئی شاعر اپنے شعر میں اِس مُلکی سرمایہ کی مدد لیتا ہے تو یہ شعر بہت غنیمت معلوم ہوتے ہیں۔ جو آنکھیں اب بادۂ پارس کے نشے میں چور رہتے رہتے تھک گئی ہیں اُنہیں ہندوستان کی ہری بوٹیوں میں عجب کیف آتا ہے۔ اور ایسے شعروں کو دل کا سرور سمجھا جاتا ہے۔

مثنوی، قصیدے اور مرثیے میں ہندوستان کی خالص فضاؤں کا جو اثر ہے اُسے نظرانداز کر دینے کے بعد اگر ہم صرف اپنی غزلوں کو اِس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہماری وطن پرستی کا جذبہ ہر لذت سے سیراب ہوگا

ہندی کا اثر

۱۔ اگر ہم اپنی غزلوں کو سرسری نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُن پر صرف ہندی لفظوں ہی کا اتنا کافی اثر ہے۔ کہ اگر اِن لفظوں کی مکمل فہرست بنائی جائے تو سیکڑوں سے زیادہ ایسے لفظ نکلیں گے جو خالص ہندی کے ہیں اور وہ ہماری زبان میں داخل نہیں ہوئے۔ قلی قطب شاہ وجہی۔ ولی۔ آبرو۔ قائم۔ یقین میر اور آتش کی غزلوں میں آدھار۔ اچرج اکاس۔ امرت بچن۔ اصیشدی۔ بان۔ براگی۔ برہ۔ بچن۔ بچن ہاری۔ پیتم چرن۔ چندر۔ درس۔ درشن۔ رادت۔ رین۔ ساجن۔ سجن۔ سریجن۔ سکھیاں۔ سلونے۔ سمرن۔ سنیاسی۔ سُندر۔ سنسار۔ سیس۔ شکر بچن۔ سہاگن۔ لابن۔ لگن۔ موہن۔ من ہرن۔ من۔ نیر۔ نینہ۔ نین جیسے لفظ اکثر استعمال ہوتے ہیں خصوصاً ایسے لفظ جو ہندی کی عاشقانہ شاعری میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ انہیں ہمارے شاعروں نے کثرت سے اپنی غزلوں میں داخل کیا ہے۔ مثال کے لئے کچھ شعر پیش خدمت ہیں ؎

جُدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہئے
کہ اُس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جگ بیتا (آبرو)

آج تو ناجی سجن سے کر لے اپنا عرض حال
مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہونا ہو سو ہو (ناجی)

ع سُنتا نہیں ہے بات کسی کی تو لے سجن (یکرنگ)

ہمیشہ مجھ سے نئی جان چاہتا ہے سجن
یہ کون ہٹ ہے تو اتنا بھی خُردسال نہیں (یقین)

جہاں جاتا ہوں وہاں آتا ہے سائے کے نمن پیچھے
ترے ہلنے لے ظالم لیا دُنبال عاشق کا (ولی)

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا تو دیکھنا منت ہے سرو جن کا (ولی)
ہوا معلوم تجھ مکھ سوں لالن کہ رنگین ہے بہار آشنائی "
اب تلک ولی پیا نے دکھایا نہیں درس "
جیوں شمع انتظار ہیں ساری رین گئی "

ان شعروں میں سجن، سرجن، موہن، لالن، پیا، درس رین، پیا، ایسے لفظ ہیں جو خاص طور پر ہندی کی عشقیہ شاعری میں بہت استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے شاعروں نے بھی ہندی سے یہ اثر قبول کیا۔

کسی زبان کا اثر قبول کرنا تو کوئی ایسی خاص بات نہیں آدمی دن رات جو لفظ سُنے گا۔ اُنہیں استعمال بھی ضرور کرے گا لیکن اصل چیز خیالات ہیں۔ اگر کسی انسان پر دوسرے انسان کا اتنا اثر پڑے کہ وہ لفظوں کے ساتھ ساتھ اُس کے خیالات کی بھی تقلید کرنے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ اثر بہت نمایاں ہے۔ ہمارے بعض غزل گو شاعروں نے اپنی غزلوں میں ایسے جذبات نظم کئے ہیں جن میں وہی دلکشی ہے جو ہندی کے لئے مخصوص ہے اور جس سے فارسی یا کسی دوسرے مُلک کی شاعری خالی ہے۔ عورت کی فطرت لطافت اور محبت کے عناصر سے مل کر بنتی ہے۔ اس لئے اُس کی ہر بات میں وہ اثر وہ جادو ہے جو دل کو مسحور کرتا ہے۔ شاعری دلی جذبات کی سچی مصوری ہے۔ مرد جب سچے جذبات شاعری کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں تو سُننے والے دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ تو جب عورت اپنے دل کا درد، اپنی میٹھی زبان سے فطرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نازک لفظوں میں شاعری کے بُت پر چڑھانے لائے گی تو کون اُسے دیکھنے اور سُننے کی تاب لا سکے گا۔ ہندی شاعری کے اثر کا ایک یہی بہت بڑا راز ہے ہمارے بعض شاعر اس دُنیا میں جا کر وہاں سے بھی فطری حُسن لائے اور اپنی غزلوں کو اُس سے سجایا۔

دکن کے شاعروں میں قلی قطب شاہ اور وجہی کے یہاں اکثر شعر ملیں گے۔

عورت کی فطرت میں رشک حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح نہیں گوارا کر سکتی کہ اُس کا محبوب کسی دوسرے کا محبوب بن کر رہے اس خیال کو ہندی میں طرح طرح سے نظم کیا گیا ہے۔ صرف دو دوہے سُنئے۔

آجا پیارے نین میں پلک ڈھانپ توئے لوں
نا میں دیکھوں اور کو نا تو کو دیکھن دوں
پیا۔ چونچ تمہاری کاٹ کے ماپے چھڑکوں لوں
میں پیو کی، پیا مورے۔ تو پیو کہے سو کوں

اسی خیال کو ہمارے شاعروں نے بالکل اسی انداز میں کئی جگہ ادا کیا ہے ؎

کہا کر رین روتی سے چھپاتے
میں بوجی ہوں نشانیاں سب رین کے
پیا کس سے گمائی رات ساری
تمن انکھیاں ہیں میں پائی خماری
کہو رات کن ساتھ کیتی ہیں باتاں
کہ چُونا ہے تم میں ٹھٹے رنگ خماری

اس خیال کو ایک جگہ تو جس لطف کے ساتھ نظم کیا ہے بیان نہیں ہو سکتا خود پیا کے فراق میں آنکھوں میں نیند نہیں پیا آئے تو اُن کی یہ حالت ہے کہ سوئے جاتے ہیں۔ یہ سمجھ جاتی ہے کہ کہیں اور ہیں کالا ہے۔ دل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہوتے ہیں۔ آخر مجبور ہو کر کہتی ہے ؎

او نیندی ہے مُج نیں تج یار سیتی
کہو تم نین میں ہے کاں کی خماری

اس کے علاوہ ہندی شاعری میں جس جذبہ کو شاعروں نے کثرت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ وہ ہجر کے صدمات ہیں۔ ایک ہجر نصیب عورت اپنے محبوب کی یاد میں اپنے وقت کو کس طرح گذارتی ہے۔ اُس کے نازک دل پر ان صدموں کا کیسا اثر پڑتا ہے اس کا احساس خود درد میں مبتلا ہونے سے زیادہ درد انگیز ہے۔ ہمارے شاعروں نے فطرت کی اس مخلوق کی زبان میں اُس کے دل کے نقش جس طرح ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ وہ بے حد سحر انگیز ہیں ؎

کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں
تجھ تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل اے پیا (وجہی)
ہر دم تو یاد آتا مجھے۔ اب عیش نہیں بھاتا مجھے
برہا سو ستاتا مجھے۔ مج ناج تل تل اے پیا (")

پی کے بیراگ کی اُداسی سوں
دِل بھی بیراگی و اُداسی ہے (ولی)

معشوق کی خصوصیات بیان کرتے وقت بھی کبھی کبھی ہمارے شاعروں کی نظریں اُنہیں محاسن پر پڑیں جو صرف ہندوستان کی سادی اور پرکیف فضا کے لئے مخصوص ہیں ؎

سلونے سانورے پتیم۔ تری موتی کی جھلکاں نے
کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ (ولی)

سانورا مکھڑا۔ رسیلے نین۔ البیلی ہے چال
ایسے پیارے پر فغاں کیونکر نہ دیوانہ ہوں (فغاں)

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف
اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا (ولی)

تجھ نکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بُت کی پجن ہاری اس بُت کو پجاتی جا (ولی)

ہندی کی عشقیہ شاعری کا وہ حصہ جو عورتوں کے نہیں مردوں کے جذبات کا ترجمان ہے بیحد فطری اور جذبات انگیز خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ یوں تو اس میں طرح طرح کے خیالات ہیں لیکن جہاں کسی حسین دوشیزہ کا سراپا بیان کیا ہے وہاں شوخی اور شاعرانہ نزاکتوں کی حد کر دی ہے۔ ان دوہوں میں خصوصاً ایسے دوہے بیحد پرکیف اور لطیف ہیں جن میں "مرم" کا ذکر مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے جی چاہتا تھا کہ کچھ دوہے لکھوں لیکن اول تو اس خیال سے کہ وہ بلا شرح کئے آسانی سے سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ اور شرح اُن کی لطافتوں پر پانی پھیر دے گی دوسرے اِس لئے کہ اُردو والے ابھی اس شوخ اور بے باک حسن کی جھلک دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ صرف اردو شاعروں کی غزلوں میں سے دو تین ایسے شعر لکھتا ہوں جو ہندی شاعری کے اسی لطیف عنصر شاعری کا بے حد کیف انگیں عکس کہے جا سکتے ہیں ؎

اودی کرتی۔ لال چمکن اور اس پہ سنہری گوٹ لگی
ابر سے نکلا چاند کا ٹکڑا۔ برقؔ کے دل کو چوٹ لگی (برقؔ)

کپڑے کا پرانگیا میں لکار "مادھو کا" بولی!
ہے کشن یہ کالے گا مرے انگ میں کپڑا (انشا)

انشا کی شوخیوں نے اس شاعرانہ لطافت میں اپنی ترنگوں کے جلوے بھی شامل کر دیئے ؎

مت چھیڑو مجھے دیکھو ابھی کہنے لگو گے
چولی میری ٹکڑے ہوئی دامن بھی گیا پھٹ

انشاؔ نے یہ اثر ہندی ہی سے لیا لیکن افسوس ہے کہ اُس کا استعمال غیر شاعرانہ طریقہ پر کیا۔

تشبیہ و استعارہ

شاعر کی دُنیا میں عشق و محبت کے بعد اگر کوئی دوسری چیز حسین سمجھی جاتی ہے۔ تو وہ شعریت ہے۔ یہ شعریت مختلف طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ اُن میں سے ایک عام طریقہ یہی ہے کہ شاعر معمولی سے معمولی خیال کو شاعری کی فضا میں لانے کے لئے اُسے اچھے سے اچھے تشبیہ اور استعارے کے دامن سے وابستہ کر دے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے اس وقت بیحد پرکیف معلوم ہوتے ہیں جب ہماری آنکھیں اُن کی حقیقت سے اس سے پہلے بارہا لطف اُٹھا چکی ہوں اور ہماری غیر شاعرانہ فطرت نے ان محسوسات کو لفظوں میں نہ جلوہ گر ہونے دیا ہو لیکن جب شاعر اسی معمولی چیز کو ایک شاعرانہ انداز میں پیش کر دیتا ہے تو ہم اُسے سُنتے ہیں اور وجد میں آتے ہیں ہمارے شاعروں نے بیحد اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے اپنی ملکی فضاؤں میں سے چُنے اور اُنہیں پُرلطف انداز میں نظم کیا انہیں سُن کر لطف لینا ایک وجدانی چیز ہے ؎

تصور نے مرے اِک دھوپ سی سوتوں کو دکھلائی
ہُوا ساون بھی اُن کو جیٹھ اور بیساکھ کا جوڑا (انشا)

اپنا دل شگفتہ تالاب کا کنول تھا
افسوس تو نے ظالم ایسے کنول کو توڑا (انشا)

ہے نور بصر مردُمک دیدہ میں پنہاں جیسے کہ کنہیا
سو اشک کے قطروں سے پڑا کھیلے ہے جمنا تٹ اور آنکھیں ہیں پنگھٹ (انشا)

ہجوم رکھتے ہیں جاں بازیوں ترے آگے
جواریوں کا دوالی میں جیسے جمگھٹ ہو (ناسخ)

خونِ جگر سے مژگاں یوں سُرخ ہو رہے ہیں
جنگل میں جیسے یارو پھولا کھڑا ہے ڈھاکا (نثار)

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ نین وہ ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے (سودا)

راجہ اندر ہے پری خانۂ مے کا پانی
نغمہ نے کا سری کشن کہیا بادل (محسن)

محسن۔ انشا۔ ناسخ۔ نثار اور سودا کے اِن شعروں میں

جو تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض یہاں کے موسموں سے بعض مناظر فطرت سے اور بعض یہاں کے تیواروں سے لی گئی ہیں چونکہ ہم ان چیزوں کو بارہا دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے ذکر کے ساتھ ہمارے دل میں وہی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں جو بارہا ان چیزوں کے دیکھنے کے بعد ہو چکی ہیں۔ ہم حقیقت کے اس فطری مرقع کو شاعر کی کھینچی ہوئی شاعرانہ تصویر سے ملاتے ہیں اور جوں جوں ہم اُس میں لطیف مماثلتیں پاتے جاتے ہیں ہمارا وجدان سرور محسوس کرتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ فطری اور پرسحر مرقعے وہ ہیں جو ولی نے جابجا اپنی غزلوں میں انہیں تشبیہوں اور استعاروں کی دنیا میں آکر کھینچے ہیں ؎

نین دیول میں پتلی ہے ویا کعبہ میں ہے اسود
ہرن کا ہے یو نافہ یا کنول بھیتر بھنور وستا
رِدے کاجل سوں تجھ انکھیاں کی یوں مج
کہ برہمی کون پکڑ نکلا ہے راجپوت
تری زلفاں کے حلقے میں ہے یوں نقش رخ روشن
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی کے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خیال
ہندوئے ہردوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی
پاس تل اُس کے جیوں سناسی ہے

مقامی اثر کی اس سے زیادہ پر تاثیر کیفیتیں خود ہندی شاعری میں بھی اس سے زیادہ کیف آگیں نہیں ہیں۔

موسم

ہندوستان اور یہاں کی سحر تاثیر کشش میں اضافہ کرنے والی اور جو چیز بھی ہو لیکن ان سب میں زیادہ اہم وجہ یہاں کے موسموں کو دیا جاتا ہے خصوصاً برسات اور اُس کے لوازمات دُنیا کے کسی دوسرے ملک میں ان خصوصیتوں کے ساتھ موجود نہیں ہیں جیسے یہاں مُردہ دلوں کے دلوں میں اُمنگیں اسی موسم میں پیدا ہوتی ہیں۔ فرزانوں کو دیوانگی کا سودا اس زمانے میں ہوتا ہے۔ وصل کی لذتیں اسی موسم میں سب سے زیادہ جاں بخش ہوتی ہیں اور ہجر کے صدمے اسی جنون فزا زمانہ میں تیر و نشتر کی طرح زخمی کرتے ہیں یہی موسم ہے جس میں بچّوں کو سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور یہی زمانہ ہے جب جوان اپنے دل کی اُمنگوں میں ایک جوش محسوس کرتا ہے۔ فطرت کے نکھار کے ساتھ۔ انسانی حُسن میں اسی زمانہ میں توبہ شکن ہو جاتا ہے یہی موسم ہے جب ساغر و مینا کی جھنکار دل کو تڑپا دیتی ہے اور ساون رُتوں میں زہد نما زاہدوں کو ساقی کے قدموں پر نثار ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ غرض کیا ہے جو یہ برسات اپنے ساتھ نہیں لاتی میرا تو یہ خیال ہے کہ کھوئی ہوئی نعمتوں کا احساس۔ اور نئی لذتوں کے حاصل کرنے کی آرزو صرف اسی موسم میں پیدا ہوتی ہے ہندی شاعری میں تو خیر کوئی حد ہی نہیں۔ ہمارے اردو شاعروں نے بھی فطرت کی اس نیرنگی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے قصیدہ۔ مثنوی اور مستقل نظموں کو چھوڑ کر بھی ہماری غزل ہی میں برسات اور اُس کی دوسری نیرنگیوں کو طرح طرح یاد کیا گیا ہے ؎

جی چاہتا ہے اے دل اک رات ایسی آوے
مطلع ہو صاف ستھرا۔ بادل بھی پھٹ رہے ہوں (انشا)

ساون میں بھی ملنے کا وہ وعدہ نہیں کرتے
باتوں میں ٹہلاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے (رشک)

جھومتی آتی ہے مستانہ گھٹا برسات کی
ساتھ کیفیت کے چلتی ہے ہوا برسات کی (آتش)

ہے دلاتی یاد مے نوشی فضا برسات کی
دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی جمنا۔ کبھی گنگا بادل (محسن)

خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل (〃)

جھوم جھوم آتی ہے گھنگھور گھٹا ساون کی
ٹھنڈی ٹھنڈی چلی آتی ہے ہوا ساون کی (رند)

لہلہانے لگے جنگل ہوئے پھر کھیت ہرے
روپ دکھلانے لگی نشو و نما ساون کی (〃)

برسات کی بہت سی دلچسپیوں میں جھولا بھی ایک ہے۔ اسے بھی مختلف شاعروں نے اپنے شعروں کا موضوع بنایا ہے ؎

ہے بندھا مینہ کے تار کا جھولا
کیوں نہ لے جھونٹے یار کا جھولا (انشا)

گانے سے مطرب آکے ہے مشتاق
میگھ کا اور ملار کا جھولا (انشا)

چل نہ امرئیوں میں جھولیں لیں درختوں کی ہوا
چھا گئی کالی گھٹا ہے تیرہ بختوں کی ہوا (انشاء)

برسات کے بعد دوسرا پُرکیف موسم بسنت کا ہے۔ اُس کے لطف بھی صرف ہندوستان میں رہنے والے جانتے ہیں انشا کی دو غزلیں ایسی ہیں جن میں اس نے بسنت کو ردیف قرار دیا ہے اور مختلف طریقوں سے بسنت کی کیفیتوں کو شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے صرف دو تین شعر سنئے سے

تو نے لگائی آئے یہ کیا آن اے بسنت
جس سے کہ دل کی آگ اٹھی جاگ اے بسنت

انشا سے شیخ پوچھتا ہے کیا صلاح ہے
ترغیب بادہ دے ہے مجھے اے جواں بسنت

گیندا ہے کھلا باغ میں میدان میں سرسوں
صحرا وہ بسنتی ہے یہ گلزار بسنتی (امانت)

ہندوستان کے تیوہاروں میں ہولی اور دیوالی دو ایسے ہیں جن میں ہندوستان والے حد سے زیادہ خوشیاں مناتے ہیں۔ دیوالی کی سب سے بڑی رونق جسے ہر دیکھنے والا محسوس کرتا ہے چراغاں ہے۔ لیکن ہولی ایسے موسم میں ہوتی ہے جب انسان کی فطرت امنگوں کی طرف رُخ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ بہار کی آمد ایک نئے لطف کا پیغام لاتی ہے۔ اور اُس کی خوشی میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کا سب سے زیادہ مزیدار حصہ رنگ کھیلنا ہے۔ ہمارے شاعروں نے اپنی غزلوں کو اس رنگ میں بھی رنگا ہے سے

بتاتے ہیں ہم تم کو کیا شیخ جیو
ذرا آنے دیجے تو ہولی کی رات (انشاء)

خاکِ شہید ناز سے بھی ہولی کھیلئے
رنگ اس میں ہے گلال کا بو ہے عبیر کی (آتش)

انہیں موسموں کے سلسلے میں دو نظر فریب اور سامعہ نواز چیزوں کا ذکر ضروری ہے۔ وہ یہاں کے چند مخصوص پھول اور جانوروں کے نغمے ہیں۔ ہندی شاعروں نے کچھ پھولوں اور جاندار مخلوقات کو عشقیہ شاعری کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ اور ان کا ذکر ہر شاعری میں ایک عجیب ہنگامہ خیز اثر پیدا کرتا ہے۔ ان چیزوں میں کوئل۔ پپیہا۔ مور۔ بھونرا کنول وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں سے

نیلوفر آنکھ ہے سرے دریائے حُسن کی
شب رنگ مردمک نہیں بھونرا کنول میں ہے (آتش)

دل میں سما رہا ہے یوں داغ عشق اپنے
جس طرح کوئی بھونرا ہووے کنول میں بیٹھا (انشاء)

تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے (ولی)

کس کا ماتم ہے یقیں جو اس طرح روتا ہے ابر
کوکتی ہیں کوئلیں اور شور یوں کرتے ہیں مور (یقین)

عالم کے دل لبھاتے ہیں خال رُخ حبیب
سمجھے ہیں اپنے حصہ میں بھونرے کنول تمام (آتش)

راتن ہی کچاریں داو دُوجوں پپیہا پیا پیا تجھ بن (داؤد)

اس کے علاوہ ایک آدھ اور ایسے کیڑوں کا بھی ذکر ہے جو صرف ہندوستان کی آب و ہوا میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بیر بہوٹی جگنو اور جھینگر وغیرہ۔ یا اس کے علاوہ شاعروں نے یہاں کے دوسرے ایسے مناظر فطرت کا بھی غزلوں میں ذکر کیا ہے جو ہندی کی عشقیہ شاعری میں نہیں ہیں لیکن یہاں کی موسمی خصوصیات کے لحاظ سے بے حد قابل قدر ہیں سے

جل یقیں بہتر نہیں ہے اس سے جل مرنے کی طرح
کیا ہی پھولا ہے پلاس اور لگ رہی ہے بن میں آگ

یا ناسخ کا بہت مشہور شعر ہے سے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

عکس لب جاں بخش سے جوں بیر بہوٹی
پھرتا ہے پڑا اک قدح بھنگ میں کیڑا

جھینگر کی سن آواز مراقب ہو کہ ہے یہ
مشغول عبادت عجب آہنگ میں کیڑا

بعض شاعروں نے مقامی فضا سے یہاں تک اثر قبول کیا کہ فارس کی روایتوں کو ترک کر کے اپنی قومی خصوصیات کو اُن کی جگہ داخل کر لیا مثال کے طور پر کوئل کو لے لیجئے۔ دو ایک شاعروں نے اسے غزل میں وہی جگہ دی ہے جو بلبل کو سے

کیفیت گلشن ہے مرے نشہ کا عالم

کوئل کی صدا نعرۂ مستانہ ہے میرا
حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں
چپ رہے باغ میں کوئل اگر آگاہ رہے
محبت ہے مجھے کوئل کے درد انگیز نالوں سے
چمن میں جا کے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

ان چیزوں کے علاوہ ہماری غزلوں میں ایک خاص چیز جس سے مقامی اثر کا پتا چلتا ہے۔ ان مقامات یا دریاؤں وغیرہ کا ذکر ہے جو ہندوستان میں کچھ انفرادی خصوصیت کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں۔ ایسے مقامات میں کاشی، پریاگ۔ ہردوار، متھرا اور دریاؤں میں گنگا اور جمنا کو مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ایک خاص درجہ حاصل ہے اور اس لئے شاعروں نے اکثر اُنہیں غزلوں میں نظم کیا ہے اور جن جن مختلف طریقوں سے یہ مقامی عنصر ہماری غزلوں میں شامل ہُوا وہ لطف سے خالی نہیں ؎

متھرا میں جوں کنھیا وہ بت جو ہاتھ آوے
تو میں اُسے دکھاؤں عبدالغنی کی مسجد (انشا)
سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل (محسن)
دِل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی (چکبست)
زلف تیری ہے موج جمنا کی (ولی)
اے صنم تجھ جبیں اپر یہ خال ہندوئے ہردوار باسی ہے (ولی)
ادھر گنگا۔ اُدھر جمنا بیچ تربینی
عجب طرح کا ہے تیرتھ پراگ پانی پر (انشا)

ایک اور چیز جس نے اُردو کی غزلوں پر بہت زیادہ اثر کیا ہے۔ ہندوستان کی مذہبی روایات ہیں۔ رامائن۔ مہابھارت اور گیتا میں جن جن لوگوں کا ذکر مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ ان میں اکثر کو انکی خصوصیتوں کے ساتھ اردو کی غزلوں اور اُن کے مضامین میں منتقل کرلیا گیا ہے مثلاً رامائن سے رام لچھمن سیتا اور ہنومان۔ مہابھارت سے کرشن۔ رادھا اور ارجن پرانوں سے مہادیو۔ پاربتی وغیرہ کے علاوہ ہمارے شاعروں نے بہت سے ایسے راجاؤں وغیرہ کا ذکر کیا ہے جنہیں کسی نہ کسی حد تک ہندوستان کی مذہبی روایتوں سے تعلق ضرور ہے۔ رام کی فرمانبرداری لچھمن کی برادرانہ محبت ہنومان کی خدمت گذاری۔ کرشن اور رادھا کی محبت کے نغمے۔ کرشن کی بانسری کی تانیں۔ ان کے سانولے رنگ میں حُسن اور کشش کے جلوے ارجن کی بہادرانہ عزیمتیں۔ مہادیو اور پاربتی کا علوئے مرتبہ یہ سب چیزیں ہماری غزلوں میں موجود ہیں۔ مثال کے لئے صرف چند شعر پیش کردینے کافی ہیں ؎

مہادیو اُترے جو کیلاس سے اپنی جٹا کھولے
تو شاید بن سکے اس جوگ کے پراگ کا جوڑا (انشا)
شیو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں
کیا ہی بہار آج ہے رادھا کے کنٹھ پر (انشا)
لپٹ کرشن جی سے رادھکا یونہی لگی کہنے
ملا ہے چاند سے اے لو اندھیرے پاک کا جوڑا (انشا)
ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار
کنھیا بنا وہ جو سنو لا گیا! (بحر)
کفر کو توڑ دل سوں دل میں رکھ کر نیّت خالص
ہُوا ہے رام بن حسرت سوں جا لچھمن سوں رام اسکا (ولی)
گرچہ لچھمن نسا ہے رام ولے
اے سجن تو کسی کا رام نہیں (ولی)
تجھے بن رات دن پھرتا ہوں بن بن کشن کے مانند
اپس کے مکھ اُپر رکھ کر نگہ کی بانسلی انکھیاں (ولی)
ترکش سینۂ عالم کا چھال مارا
مژگاں نے تیری پیارے ارجن کا بان مارا (سودا)

ان کے علاوہ دوسری تلمیحات بھی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے زیادہ ایسی ہیں جن سے اردوداں طبقہ واقف نہیں لیکن شاعروں نے ملکی روایات سے اتنا اثر لیا کہ بلا کسی خیال کے اُنہیں نظم کر دیا چونکہ ہم ان سے بالکل ناواقف ہیں اس لئے ان کا لُطف بھی نہیں لے سکتے لیکن اس لئے غنیمت سمجھتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی چیزیں ہیں ؎

کنور جی بھی ٹھاکر کے ایسے ہی ہیں
ہنومان جیسے مہیشر کے رُت
جہاں گئے تھے راجہ بھرتری جی کنواں تھا بیکو وہاں کسی نے
زمین کھودی تو ایک جوگی دھسے ہوئے سر پہ باندھ نکلا

ان ملکی خصوصیات کا ہمارے شاعروں پر کبھی کبھی اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ انھوں نے فارسی کی تخیئلوں کو ہندی روایات کی مدد سے نظم

کیلے ہے ہولی ۔ دوالی بسنت یا اسی قسم کی اور بہت سی چیزیں جو اُن کی نظروں میں تھیں انہیں اُس تخیل کا لباس پہنایا جو وہ فارسی کے دیوانوں سے لائے ۔ یہ اثر ابتدائی دوروں کے شاعروں پر زیادہ نمایاں ہے۔ قلی قطب شاہ ۔ وجہی ۔ ابن نشاطی کی غزلوں میں اکثر ایسے شعر ملیں گے جن میں تخییل فارسی ہے لیکن اُن کا اندازِ بیان یا لفظ تشبیہہ و استعارے بالکل ہندی اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر اُن ابتدائی دوروں کو چھوڑ بھی دیجئے تو خود دہلی کی شاعری میں یہ اثر شدید نمایاں ہے۔

تو اٹھ چلا تو زرد ہوئے سب کے رنگ رو
کل آگئی بہار میں یہ ناگہاں بسنت
شب محفل ہولی میں وا ، دہ ہُوا زاہد ، رندوں سی لپٹ کر
داڑھی کو دیا اُس کی لگا نہ قطوطا ادر بجنے لگی گت

خیالات کا یہ انداز فارسی ہے لیکن انشا نے بسنت اور ہولی کے رنگ میں ڈبو کر اُسے ملکی اثر کا مرہونِ منت بنا لیا۔

پھرتا ہے جوگی بنا تیرے لئے آفتاب
یہ خط شعاعی نہیں ۔ سر پہ کھلی ہے جٹا (ظفر)
کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے مد ہ تیرے میرا آسن جل گیا (امیر)

دونوں شعروں میں خیال کا انداز بالکل فارسی ہے اور خیال فارسی میں ہزاروں جگہ نظم ہوئے ہیں لیکن جوگی کی مُلکی تخییل نے اُنہیں اپنا بنا لیا ۔ خصوصاً امیر کا شعر بالکل مقامی رنگ میں ڈوب گیا۔

خاکِ شہیدِ ناز سے بھی ہولی کھیلئے
رنگ اس میں ہے گلال کا بو ہے عبیر کی (آتش)
ہیں جلوۂ تن سے درو دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے میرا یار بسنتی (امانت)

ان دونوں شعروں کا رنگ بھی وہی ہے جو اوپر کے شعروں کا۔

اس قسم کی اور پچاسوں مثالیں ہمارے شاعروں کے یہاں مل سکتی ہیں۔ مثال کے لئے دو تین شعر دلّی کے سُنئے۔

اے زہرہ جبیں کش ترے مُکھ کی کلی دیکھ
گاتا ہے ۔ ہر اک صبح کوں اُٹھ رام کلی کوں
سلونے سانورے پیتم ترے موتی کی جھلکان نے

کیا عقدِ ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

پہلا مصرعہ خالص ہندی اثر میں ڈوبا ہُوا ہے اور دوسرا بالکل فارسی میں۔

جس طرح شاعری پر اور بہت سی چیزوں کا گہرا اثر پڑتا ہے ملک کے خاص رسم و رواج ۔ وہاں کے لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں اور ڈھنگوں سے بھی شاعری متاثر ہوتی ہے ۔ شاعر جو کچھ کہتے یا لکھتے ہیں ۔ وہ سوسائٹی کی حالت دیکھ کر کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ تصویر ایک عالمگیر حلقہ پر صادق آجاتی ہے اور کبھی اس تصویر سے اُسی حلقہ کے لوگوں کے حالات و اطوار کی ترجمانی ہوتی ہے جہاں بیٹھ کر یا جہاں کے حالات سے متاثر ہو کر وہ شعر کہے گئے ہیں۔ اس لئے اگر اشعار میں ایسی باتیں نظم ہو گئی ہوں جو کسی خاص مقام یا طبقہ کے حالات کی ترجمان ہوں تو اُسے بھی مقامی اثر ہی کہنا چاہئے ہماری غزلوں میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو ہندوستان کی کسی نہ کسی سوسائٹی کی باتوں کے اثر کا نتیجہ ہیں مثلاً ستی کا رواج ہندوستان کے سوا کہیں نہیں تھا ۔ اسلئے صرف ایک ہندوستانی شاعر ہی اس خیال کو اس آزادی سے نظم کر سکتا ہے کہ ؂

ستی اِک ہو گئی بیراگن آکر گھاٹ پر تب سے
دوا سا چھا رہا ہے اور سب بیراگ پانی پر

پُرانے زمانے میں رسم تھی کہ جب فوج کا سپہ سالار مر جاتا تھا تو فوج کے دوسرے سپاہی اُس کے جنازے کو آگے لے کر اس کا بدلا لینے جاتے تھے ۔ سودا نے اپنے اس شعر کا مضمون اسی رسم سے لیا ؂

اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوج اشک
لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے

ہندوستان میں اب تک یہ رسم ہے کہ جب کوئی خوشی ہوتی ہے تو گھی کے چراغ جلتے ہیں ۔ رات کو عورتیں جاگتی ہیں ۔ گاتی بجاتی ہیں اور پکوان پکتے ہیں ۔ ان رسموں کا اثر آتش ۔ داغ اور امیر کے مصرعوں پر پڑا ؂

گھی کے چراغ طور کے اوپر جلاؤں میں (آتش)
چراغ گھی کے جلاؤں وہ آج شام نہیں (داغ)
رتجگے ہوتے ہیں گر غیر کے گھر ہونے دو (امیر)

ان رسموں کی صدہا مثالیں اردو کی غزلوں میں مل جائیں گی۔ خاص طور پر غزل کا وہ حصّہ جسے ریختی کہا جاتا ہے اس قسم کے خیالات سے بھرا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر چند شعروں کو دیکھئے۔ رنگین کا شعر ہے ؎

زرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مسلمانوں میں عام طور پر رواج ہے کہ شہروں میں ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانے کے لئے عورتیں ڈولیوں پر جاتی ہیں۔ اور ان جگہوں کا کرایہ مقرر ہے۔ اُسی رسم کا اثر اس شعر پر نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ اور شعر ملاحظہ ہوں جن میں شادی بیاہ کی رسمیں اور گھروں کی دن رات کی باتوں کی صحیح مصوری کی گئی ہے ؎

جاتے دیکھیں جب مرے گھر سے بری کی شکیاں
ہو کے منہ ٹھٹا سا کھپرے کا منگیتر ہو گیا

چالیس دن کی پینڈیاں بیٹھے بنائی تھیں
دیکھا تو دو ہی روز میں اک تل نہیں رہا

چاند دیکھے کرنے والی ہوں میں کونڈا کھیر کا
سال بھر سے فرض ہے مجھ پر یہ بی بی پیر کا

صفا کہتی ہوں منہ میں خاک بی بی کس کے بیچھے ہیں
نہیں ہوتا ہے اچھا پھیرنا ہر وقت جھاڑو کا

شاعری پر سیاسی انقلابات کے بھی بہت اثر پڑتے ہیں۔ یہ سیاسی انقلابات سوسائٹی کی حالت کو ہمیشہ کیا سے کیا کرتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے لیکن مثال کے لئے ہم اگر ہندوستان اور اس کے انقلابات کو لیں تو مختصر طور پر ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری غزل نے اس حیثیت سے کیا کیا مقامی اثرات قبول کئے۔ اردو غزل گوئی کے بالکل ابتدائی دور کو لیجئے اُس کی غزلوں میں جہاں اور بہت سی خصوصیتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ دکن کے شاعروں نے بہت سے مرثیے ایسے کہے جو غزل کی شکلوں میں ہیں۔ بحری کے غزل کے دیوانوں میں چار مرثیے ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا۔ ذوقی۔ سلطر۔ روحی کے مرثیے بھی غزل کی شکل میں ہیں۔ عزلت اور ولی کی غزلیں بھی کسی حد تک اس سے متاثر ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ ولی کی ایک پوری غزل مسلسل مرثیہ ہے ظاہرا اس کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ چونکہ قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہ شیعہ تھے۔ اور ان کے زمانے میں محرم کا خاص احترام اور اہتمام ہوتا تھا مجلسیں ہوتی تھیں علَم نقسیم کئے جاتے تھے۔ لنگر لُٹتے تھے اور اس کے علاوہ ادبی حیثیت سے بھی بادشاہ مرثیہ کی طرف متوجہ تھے اس لئے شاعروں نے بھی اس اثر سے اردو غزل میں ایک نیا موضوع داخل کیا۔

لکھنؤ کی شاعری پر نظر ڈالیے۔ اور اس کا مقابلہ دہلی کی غزل گوئی سے کیجئے تو زمین اور آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ شاعری میں عاشقانہ جذبات ہیں لیکن اُن میں عُریانی آگئی ہے معشوق کا ذکر ہے لیکن اُس میں حیا کی جگہ شوخی نے لے لی ہے۔ یہاں تک کہ یہ شوخی عریانیوں کی حد تک پہنچ جاتی ہے معشوق کے حُسن کا معیار صرف ظاہری سنگھار کو سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اُسے عیش و نشاط کی محفلوں کی زینت سمجھتے ہیں۔ نہ اُس میں وہ پہلی سی شان حُسن کا وقار و جلال ہے نہ روحانی کشش۔ نہ ناز کے مسحور کن نظارے نہ محبوبیت کے والہانہ جلوے۔ اب کیا ہے؟ ناگن کی طرح لہراتی ہوئی چوٹی سُرمے اور دُنبالہ سے سجی ہوئی آنکھیں اور تیکھی چتون ہونٹوں پر پان کا لاکھا اور دانتوں پر مِسّی کی دھڑی۔ سینہ پر ابھار اور چال میں الھڑپن گھنگرو کی جھنکار میں عشاق کے دلوں کو تسخیر کرنے کا جادو۔ ہر ایک کی نظریں اُن کی طرف اُنہوں نے جدھر دیکھا دس پانچ اپنے دلوں کو پکڑ کر رہ گئے۔ ان کی چتونوں میں شوخی پیدا ہوئی اور یہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ دوپٹے کا آنچل سر سے گر پڑا تو کچھ پروا نہیں۔ غرض یہ ہے کہ اس غزل گوئی کا دل ستان معشوق اس کی وجہ؟ اس تغیر کا راز؟ صرف سیاسی فضا کی تبدیلی اور اُس کا اثر سوسائٹی پر۔ لکھنؤ کے حاکم نے شاہی اختیار کر لی۔ نظام مملکت کی دلچسپیوں کے بجائے عیش و عشرت نے حل ہونا شروع کر دیا ہر طرف رنگ رلیاں ہونے لگیں شاعروں نے بھی وہی اثر لیا اور اُس کا اثر اس دور کی غزلوں پر ہے مثالوں کی ضرورت نہیں۔ کون ایسا ہے جو اس لذت سے نا آشنا ہو۔

اب آگے چلئے خود اپنے دور میں آئیے۔ اس کی سیاسی فضا کیا ہے؟ مشرق کی ہر چیز پر مغرب کا اثر سادگیوں میں رنگینی۔ سچائی میں فریب حقیقت میں بناوٹ۔ مذہب کی جگہ سائنس۔ اخلاق کی جگہ فیشن۔ مختصر طور پر یہ ہماری سوسائٹی کا خاکا ہے۔ اُس کا اثر بھی شاعری پر پڑنا بے حد ضروری تھا۔ اور پڑا۔ اکبر کی شاعری اُس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اُن کی غزلوں کو شروع سے آخر تک پڑھ جانے کے بعد موجودہ سوسائٹی کی ایک مکمل تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

لیکن اِس سلسلے میں بے حد دلچسپ چیز جو اکبر کی غزلوں میں مقامی اثر کی مظہر ہے وہ وہ نام ہیں جہاں انہوں نے خاص خاص موقعوں پر کسی انفرادی سوسائٹی کے نمایندہ کے طور پر کسی ایک آدمی کا نام لکھ دیا ہے۔ ان میں اکثر ہندوؤں کے نام ہیں۔ جو صرف ہندوستان میں ہی ہوتے ہیں لیکن دوسرے خاص نام مسلمانوں کے ہیں مسلمانوں کے نام ہر ملک میں مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے نام بھی اسی طرح مختلف ہیں لیکن اس اختلاف میں بھی ہمارے ملک والوں نے خاص خاص تبدیلیاں کر لی ہیں۔ دو ایک شعر سُن کر اس کا اندازہ کیجئے ؎

یہ وہاں لب گنگا کبھی گل نہیں سکتی
کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی
کامیابی کا سدیشی پر ہر اک در بستہ ہے
چرنیچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے
ممبر علی مراد ہیں یا سکھ [illegible] ہیں
لیکن معاینہ کو وہی نابداں ہیں
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

اسی سیاسی انقلاب کا اثر ہے کہ ہماری موجودہ دور کی شاعری حزن و یاس سے سرور و انبساط کی دُنیا میں قدم رکھ رہی ہے۔ اقبال اصغر، جگر، حکیست۔ سرور کی شاعری اِس حیثیت سے بھی مقامی اثرات کی نمایندگی کر سکتی ہے۔

غزلوں پر جو مقامی اثرات ہوئے انہیں مختلف طریقوں سے مختصر طور پر پیش کر دیا گیا لیکن اس کے باوجود بھی چند باتیں باقی رہ گئیں جنہیں کہے بغیر یہ مضمون نا مکمل رہ جائے گا۔ ان میں پہلی چیز تو اُس صنفِ نازک سے متعلق ہے جسے ہندوستان کی سوسائٹی میں ایک ایسا درجہ دیا گیا ہے جو اس کے لئے قطعی ناموزوں ہے۔ اُسے سوسائٹی نے بہت ذلیل سمجھ رکھا ہے۔ اور اس کا اثر ہماری شاعری پر بھی پڑا۔ غزل گوئی کے ایک دور میں عورت کو اپنا محبوب بنایا گیا لیکن اس کے ساتھ ایسا کوئی حُسن وابستہ نہیں کیا گیا۔ جو اُسے فطرت نے روز ازل سے دے رکھا ہے۔ اس کے باوجود ہماری غزلوں میں کہیں کہیں ایسی چیزیں موجود ہیں جو صرف ہندوستان کی عورت کے لئے مخصوص ہو سکتی ہیں۔ چند شعروں میں اس کا اندازہ ہو جائیگا ؎

مجھ گھٹ میں اے نگھر گھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا
دیکھیں سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹکا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں سن سوں!
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سُناتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بُت کی پجن ہاری اس بت کو بچاتی جا
تجھ گھر کی طرف سُندر آتا ہے ولی دائم!
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

یہاں تک تو غنیمت ہے لیکن آگے چل کر دیکھئے کہ اس معصوم مخلوق کی کیا گت بنائی جاتی ہے ؎

اِس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل بھی نہ توڑے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لے
کسی کے مخرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
جو گوبج انجی بالے کی جھنجلا کے بولے
لگے پیار کو آگ ابھی کان جاتا!

لیکن ہمیں ان شعروں کے مذاق اور بدمذاقی سے غرض نہیں۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ عورت کی فطرت کو اکثر موقعوں پر جن جن خصوصیات کے ساتھ ہماری غزلوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اُن میں سے بعض مقامی اثر کی وجہ سے ہیں۔

عورت کے علاوہ ایک دوسری مخلوق جسے ہندوستان میں ایک خاص درجہ حاصل ہے جوگیوں اور بیراگیوں کی ہے۔ اُن کی مختلف خصوصیات ہندی شاعری میں دلکش انداز میں نظم کی گئی ہیں۔ اُردو کے شاعروں نے بھی اُس کا کافی اثر لیا ہے اور اپنے شعروں کو رنگین اور پُرکیف بنانے میں ہندی کی اس روش سے بے حد مدد لی ہے

لیا گر عقل نے منہ میں دل بیتاب کا گٹکا
تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

برائی جو کہاتے ہیں اُسے گھربار کرنا کیا
ہوئی جوگن جو گئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا
پی کے بیراگ کی اُداسی سوں ہیں دل بھی بیراگی واُداسی ہے

اس کے علاوہ بعض شاعروں نے جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے جس میں مقامی اثرات کی جھلک بے حد نمایاں ہے۔ ایسے شعر ولی کے دور کے سوا اور کہیں نہیں ملتے۔ اس لئے ولی کے دو ایک شعر لکھنے کافی ہیں ؎

جو پیو سے پرت کا پانی اُسے کیا کام پانی سوں
جو بھوجن دُکھ کا کرتے ہیں اُسے آدھار کرنا کیا
نہیں گئی دھرم دھاری جو کہے یتیم کون سمجھا کر
کہ دکھیا کون سمجھی سوں اتنا بیزار کرنا کیا

غزل پر جن مقامی اثرات کا ذکر کیا گیا اُس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اُس کے کسی پہلو پر ہندوستان کی مخصوص خصوصیات کا اثر ہی نہیں مجھے یقین ہے زیادہ کاوش اور تلاش کے بعد کچھ باتیں اور بھی مل سکتی ہیں۔ یا جو باتیں بیان کی گئی ہیں اُنہیں بھی مختلف طریقوں سے اور زیادہ مکمل بنایا جاسکتا ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ اتنی چیزوں کے جان لینے کے بعد ذوقِ تجسس اور راہیں نکال سکتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک بات کا اعتراف ضروری ہے اور وہ یہ کہ میری نظر میں دو ایک ہندی بحریں ایسی بھی تھیں جو فارسی شاعری میں نہیں اور اُردو شاعروں نے مقامی اثر قبول کر کے اپنے یہاں شامل کر لی ہیں۔ لیکن میں نے اُن کے ذکر کو کسی قدر غیر دلچسپ پایا۔ اگر کسی کے لئے یہ چیز بھی دلچسپ ہو تو میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ ایسی غزلیں دکن کے ایک آدھ شاعر عارف الدین عاجز اور انشا کے یہاں موجود ہیں۔

سید وقار عظیم

عورت کی تخلیق

چاند کی گولائی
سانپ کے خوبصورت مگر خطرناک حلقوں کے ناہموار پیچ و خم۔
گھاس کی پتی کی دلآویز خمیدگی اور بید کی ٹہنی کی نزاکت
پھولوں کی مخملی نرمی۔
پروں کی سبکی
ہرن کی نگاہ کی ملائمت و حلیمی۔
سورج کی کرن کی چلبلاہٹ اور شوخی۔
بادلوں کے آنسو۔
صرصر کا تلوّن
خرگوش کی کم دلی۔
مور کی خود نمائی
ہیرے کی خشونت اور رنگینی۔
چیتے کی سفاکی اور بے رحمی
برف کی سرد مہری۔
طوطے کا شور خود ستائی
مرغی کی کم ظرفانہ کڑکڑاہٹ۔
بے شر فاختہ کی کوکو۔
حسن کے دیوتا نے ان سب چیزوں کو لے کر ملایا۔ اور اُن سے عورت کا خمیر تیار کیا۔

(ترجمہ از انگریزی)

عبدالرحمٰن



نیرنگِ عشق

محبوبِ ازل چہرہ نما میرے لیئے ہے — ہر ذرہ میں اک حسن نیا میرے لئے ہے

جو لب تک نہ آئے وہ صدا میرے لئے ہے — جو عرش پہ پہنچے وہ دعا میرے لئے ہے

تُو حسنِ دل آرا ہے، میں آئینہ ہوں تیرا — ق — نقصاں ہے ترا ہی جو بنا میرے لئے ہے

تو حُسن ہے اور جلوہ گری کام ہے تیرا — میں عشق ہوں نظارہ روا میرے لئے ہے

یہ جلوہ گہِ ناز ہے، یا خُلدِ نظر ہے — دنیا یہ فقط تیری ہے یا میرے لئے ہے

تُو چاندِ اُفقِ حُسن کا، میں بحرِ محبت — تو میرا ہے، اور تیری ضیا میرے لئے ہے

تو حُسن کا دریا ہے، تُو ہے عشق مرا خضر — تُو آبِ بقا، آبِ بقا میرے لیئے ہے

شاعر ہوں میں، تو میرے لئے معنیِ رنگیں — تاثیر تری، حُسن ترا میرے لئے ہے

ہر شے جسے نسبت نہیں تجھ سے وہ انہیں دے — جو چیز بھی ہے اس کے سوا میرے لئے ہے

ساقی مرا اک سرو ہے، اک سروِ لبِ جُو — ق — مَے چشمۂ صافی ہے، صفا میرے لئے ہے

آ جانِ مغاں! تازہ کریں سنّتِ جمؔ کو — جس شکل میں بھی آگ ہوا میرے لئے ہے

تیرے لئے یہ فخر کہ تُو ہے مرا ساقی — اور بادۂ رنگیں کا نشا میرے لئے ہے

کیوں منعِ غمِ عشق مجھے کرتا ہے ناصح — یہ زہر سہی، زہر دوا میرے لئے ہے

میں خاک پہ بیٹھا ہوں، تو ہے عرش نشیں دوست — اے تنگ نظر! ارض و سما میرے لئے ہے

بے خود مجھے کرتی ہے کلیمؔ اس کی تجلّی
میں خوش ہوں کہ یہ خاص ادا میرے لئے ہے

عطاء اللہ کلیم

صرف آغاز

ہم چاروں پر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ سب اس ہولناک واقعے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ہر ایک اپنی تسکین کے لیے اس کو سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کچھ ایسا گورکھ دھندا تھا کہ اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ ہم ایک طالب علم کے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ روشنی کھڑکیوں سے باہر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور تاریکی کمرے کے اندھیرے کونوں سے نکل کر اپنا تسلط جما رہی تھی۔ فضا میں ایک تھکاوٹ ایک اضمحلال سمٹا جا رہا تھا۔

طالب علم بے خبری کے عالم میں چائے کی پیالی اپنے منہ کے قریب لے گیا اور پھر بھول گیا کہ اسے ایک گھونٹ لینا ہے۔ شاعر کوئی ایسی چیز تلاش کر رہا تھا جس پر وہ اپنی نظریں گاڑ سکے۔ میں ہر ایک کے چہرے کو باری باری دیکھ کر یہ جانچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

شاعر نے کہا۔ "واقعی یہ سمجھنا بہت مشکل ہے مرغوب کی زندگی کو سامنے رکھ کر کون مان سکتا ہے کہ وہ ایسا کام کر گزرے گا۔ ایک خاموش حلیم الطبع، ملنسار آدمی جسے ہر ایک عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ یکایک ایک ہولناک ڈرامے کا کردار بن جائے۔ ..."

چوتھے ساتھی نے کھلتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں بھئی ہم تو حیران رہ گئے۔ جب ہم نے اس واقعے کی خبر سنی۔ ... میرا مطلب ہے جیسا تم نے کہا مرغوب کی زندگی کو دیکھ کر۔ ... لیکن کسی کی شکل سے کسی کے نیک و بد ہونے کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ .... یہ مٹھائی بہت خوب ہے۔" چوتھے ساتھی نے ایک ہلکا سا بے آہنگ قہقہہ لگایا اور مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ اس ادا اس لمحے میں اس کا قہقہہ بھیانک معلوم ہوتا تھا۔

شاعر نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا۔ نیک و بد؟ کیا اس کا پست دماغ صرف نیک و بد کے عام معیار پر ہر ایک کو جانچتا ہے۔ اس سانحے کا نیک و بد سے کیا تعلق ہے۔ شاعر نے اپنے لمبے اور کسی قدر پریشان بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں اور سگرٹ کا ایک کش لگایا۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور روشنی مغرب کی طرف سمٹ رہی تھی۔ طالب علم اپنے خیالات میں غرق معلوم ہوتا تھا۔ اس کا اداس چہرہ بہت خوش وضع تھا ہم سب پھر چپ ہو گئے ہیں سے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے طالب علم سے کہا "تم تو مرغوب کے پڑوسی ہو میں نے سنا ہے اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی، ...."

طالب علم نے اپنی گہری خوش آیند آواز میں کہنا شروع کیا۔ "شاید میں اس واقعے کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔ شاید کچھ بھی نہیں یقین سے کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ زندگی میں ہمیں چھوٹی سے چھوٹی چیز کے متعلق بھی پورا پتہ نہیں چلتا۔ صرف ایک افسانہ نویس ہی یہ دعوے کر سکتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو سمجھتا ہے ان کے متعلق سب کچھ جانتا ہے اور پھر یہ کوئی افسانہ نہیں۔ محض زندگی کا ایک ٹکڑا ہے۔ شاید ایک افسانے کا آغاز ہے۔ لیکن صرف آغاز۔ میں تو چند احساسات تم تک پہنچانا چاہتا ہوں لیکن الفاظ کیا کر سکتے ہیں۔ اگر میں شاعر ہوتا تو تو شاید۔ ....."

شاعر نے اپنی نظریں کسی موہوم نقطے پر گاڑ کر کہا۔ "یہ بھی ایک دھوکا ہے۔ اگر تم شاعر ہوتے تو جانتے کہ شاعر بھی آخر انسان ہوتا ہے ایک مجبور اور بے چارہ انسان۔ ممکن ہے اور لوگوں کی بہ نسبت وہ الفاظ میں زیادہ جان ڈال سکتا ہو۔ لیکن جذبات اور احساسات کو پوری طرح الفاظ میں کون ادا کر سکتا ہے۔"

طالب علم نے جواب دیا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہو ہر انسان کی اپنی الگ کائنات ہوتی ہے۔ ... لیکن میں بہک رہا ہوں۔ اصل واقعہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس سے میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا ہے۔

"تم جانتے ہو میں مرغوب کے ساتھ والے مکان میں رہتا ہوں۔ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ میں نے اسے دو ایک مرتبہ دیکھا اور

جیسے اکثر نوجوان کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کی طرف مائل ہو جائے میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی لیکن کسی شد و مد سے نہیں۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوتا تو یہ خواہش اپنی قدرتی موت مر جاتی۔

ایک دن شام کو میں اپنے میز کے سامنے بیٹھ کر پڑھ رہا تھا۔ دروازے کی طرف میری پیٹھ تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں وہ کھڑی تھی۔ مرعوب کی بیوی۔ میں اٹھ بیٹھا لیکن پریشانی میں کوئی بات کہہ نہ سکا۔ وہ بھی بالکل چپ چاپ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بستر پر بیٹھ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ہم نے کیا باتیں کیں۔ ہاں اس کا پراسرار چہرہ اور اس کا غمگین تبسم اب تک آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اس کی اداس آواز اب تک کانوں میں گونجتی ہے

"جس پراسرار طریقہ سے وہ آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی مجھے ایک ناقابل بیان بے چینی نے گھیر لیا۔ یہی بے چینی اور کشمکش کی حالت ہے جو میں بیان نہیں کر سکتا یا زیادہ درست یہ ہے کہ تمہیں محسوس نہیں کرا سکتا وہ اکثر آیا کرتی تھی ہمیشہ خاموش رہتی۔ کبھی کبھار بات کر لیتی۔ میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمین میرے پاؤں کے نیچے سے سرکتی جا رہی ہے۔ دم گھٹنے سے جو اثر جسم پر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی یاد کا دماغ پر ہوتا تھا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں میں اب بھی نہیں جانتا کہ مجھے کس چیز کی خواہش ہے اس کو مجھ سے بہت محبت تھی اس کا مجھے یقین ہے لیکن جب وہ میرے پاس بھی بیٹھی ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت دور ہے کروڑوں میل دور۔

"یہ بے چینی یہ ناقابل بیان بے چینی مجھے پریشان رکھتی تھی۔ ایک بہت حسین عورت کی سچی محبت کے نشے میں سرشار ہونے سے روکتی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا میں محسوس کرتا تھا کہ میں اپنے آپ کو گنوا رہا ہوں۔ میری روح میرے قبضے سے نکل جا رہی تھی۔ . . .

"یہ سنانے سے کیا فائدہ۔ شاید تم مجھ پر ہنستے ہو گے۔ تم سمجھتے ہو میں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو ——— اکثر آدمی جب بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں تو وہ بھی دراصل الفاظ کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہوں ہر انسان آپ بیتی سنانا چاہتا ہے۔ تنہائی کے قید خانے کو توڑ کر نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن اس کی دیواریں مضبوط ہیں اور زنجیریں کڑی

میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری زندگی ایک خواب بن کر رہ گئی ہوش و حواس ایک عجیب مدہوشی میں گھلتے چلے گئے۔ زندگی کے رہوار کی باگیں میرے ہاتھوں سے نکلنے لگیں۔ وہ کچھ نامعلوم اور موہوم خواہشات بیدار کرتی تھی جن کو پورا کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ نہ شاید اس کے ہی بس کی بات تھی۔

"ایک شام وہ مجھ سے ملنے آئی۔ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کہیں بہت دور ہے۔ اپنا جسم اور اپنی روح دے چکنے کے بعد بھی مجھ سے کروڑوں میل دور ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اپنی یا اس کی زندگی کو ختم کر کے اس ذہنی کرب سے نجات حاصل کروں۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہی بیتابی وہی پریشان کن ناقابل بیان بے چینی مجھ پر طاری ہو گئی میں نے پڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پھر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا لیکن بے سود بستر پر لیٹا تو اپنے جسم اور بالوں اور کپڑوں کی مہک وہ چھوڑ گئی تھی مجھ تک پہنچی اور میرے دماغ میں پرلطف مگر بھیانک یادوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تکیے پر سر رکھے چھت کو تک رہی ہے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہے۔ میں صرف ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ لیکن وہ کسی اور دنیا میں ہے۔ . . !"

طالب علم یکایک رک گیا اور اداس نگاہوں سے ہم تینوں کو دیکھنے لگا۔ "تم سمجھتے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں! میں جانتا ہوں میری باتیں بے ربط ہیں لیکن بے معنی نہیں یہ کوئی افسانہ نہیں۔ یہ تو صرف ایک واقعہ ہے یا ایک آغاز صرف آغاز۔ لیکن بہکنے سے کیا حاصل......

میں کمرے سے باہر نکلا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اندھیری رات میں پھیکے رنگ کا آسمان تاروں سے لدا ہوا تھا۔ تارے شمار رہے تھے گویا زندگی کے آخری سانس لے رہے ہیں۔ بے ترتیب بے شمار تارے میری طبیعت پر بوجھ ڈالتے تھے۔ سڑک پر بجلی کے لیمپوں کی قطار تھی جو بہت دور تک چلی گئی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ انتہا تک چلی جاتی ہے۔ سڑک سنسان تھی اور اندھیری۔ صرف روشنی کے دھبے نظر آتے تھے لیکن رات کی عالمگیر تاریکی ان پر ہنستی معلوم ہوتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اسی سڑک پر چلتا جاؤں۔ اس دنیا کو اس بے چینی کو پیچھے چھوڑ جاؤں۔ جب تھک کر چور ہو جاؤں تو اسی سڑک کے کنارے لیٹ جاؤں اور تاریکی اپنا پر امن اور وسیع دامن پھیلا کر مجھے چھپا لے۔

"مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کہاں کہاں پھرتا رہا۔ لیکن اتنا خیال ہے صبح ہونے سے پہلے میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میرا جسم دکھ رہا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں اسی طرح آ کر لیٹ گیا اور میری آنکھ

لگ گئی۔

"صبح اٹھ کر پہلی بات یہ سنی کہ مرغوب نے اپنی بیوی کو مار ڈالا ہے۔ شہر بھر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ سب حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ مرغوب اور اس کی بیوی کے تعلقات میں کسی طرح کی کشیدگی نہ پائی جاتی تھی۔ میرے خیال میں اس حادثے کی ایک ممکن وجہ یہ ہے کہ وہ جذبات کو ابھارتی تھی موہوم خواہشات بیدار کرتی تھی جن کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے وہ چاہتی تھی اس کا مجھے یقین ہے لیکن میرا یہ حال تھا کہ اگر یہ معاملہ طول پکڑ جاتا تو نہ جانے میں کیا کر بیٹھتا اور مرغوب بیچارے کی یہ حالت تھی کہ وہ اس کو محبت بھی نہ کرتی تھی لیکن اس کی بیوی تھی ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی اور اس میں وہ سب خواہشات وہ ناقابل بیان جذبات ابھارتی رہتی تھی جو پورے نہ ہوتے تھے۔ اس حالت میں اگر مرغوب نے اسے مار ڈالا تو کیا عجب ہے۔ اس نے خود جا کر پولیس کو اطلاع دی کہ میں نے اپنی بیوی کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا ہے۔ لیکن یہ اس نے نہیں بتایا کہ کیوں شاید وہ خود بھی نہیں جانتا۔

ممکن ہے میں سب کچھ جانتا ہوں . . . ممکن ہے کچھ بھی نہیں اور ممکن ہے کہ مرغوب کے پاس کوئی اور خاص وجہ ہو جسے وہ اپنے سینے کے اندر دفن ہو جائے گا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس واقعے کی یاد میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ ایک خبیث روح کی طرح یہ میرا پیچھا کرے گی اور خوبصورت مگر بھیانک لباس اختیار کر کے میرے امن کو تاراج کر دے گی لیکن میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ میں اس ذہنی کرب سے جو اس کی زندگی میں مجھے تھا نجات حاصل کرنے پر کسی قدر خوش ہوں اب میرا دکھ اور قسم کا ہے اس کا برداشت کرنا اتنا مشکل نہیں

میں اکثر سوچتا ہوں کہ مرغوب کیا کچھ جانتا ہے . . . کون کہہ سکتا ہے . . . . ."

ہم چاروں پر پھر ایک لمحے کیلئے خاموشی چھا گئی

آغا عبدالحمید

رباعی

پھر قلب کو تعلیم تپیدن ہے آج
پھر ذہن بہ انداز چکیدن ہے آج
اے آہ و فغاں تمہیں کہاں لے جاؤں
پھر یار بہ طرز نشنیدن ہے آج

رباعی

آئینہ اگر ترے مقابل ہو جائے
یکتائی کا دعوے ہی باطل ہو جائے
ممنون نہ ہو تیری تجلی کا اگر
ممکن نہیں حسن ترا کامل ہو جائے

سعید احمد اعجاز

جوانی

طلسموں کا دریا ہے، خوابوں کے دھارے
دھندلکوں میں لپٹے ہوئے ہیں نظارے
مری ناؤ کس سرزمیں کو رواں ہے

فضاؤں میں نکہت سی پھیلی ہوئی ہے
پُر اسرار ظلمت سی چھائی ہوئی ہے
یہ کس گیت کا ماہ پیکر رواں ہے

ہر اک چیز نغموں کی لے سے بنی ہے
ہر اک چیز نیندوں کی مے سے بنی ہے
ہر اک چیز یہ حُسن پرتو فشاں ہے

ستاروں کی آواز ہے یا جوانی
لطافت بھرا ساز ہے یا جوانی
جوانی ہے یا نغمۂ کہکشاں ہے

ستارے ہیں، دریا ہے، اور چاندنی ہے
مری ناؤ خود اک حسیں راگنی ہے
مری طرح فطرت کی ہر شے جواں ہے

کسی دھن میں کھویا ہوا جا رہا ہوں
سفینے میں سویا ہوا جا رہا ہوں
نہیں کچھ خبر میری منزل کہاں ہے

عدم

دماغی پریشانیاں اور اُن کا علاج

ہر ایک زمانہ میں ہر ایک خطۂ ارض کے لوگ پریشانیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس انسانی تنہائیت کے اسباب معلوم کر کے انسانی روح کے لئے امن اور سکون بہم پہنچانے کی سعی کرتے ہیں۔ انجمن اقوام اور تحدید اسلحہ کی کانفرنس جیسے اداروں کے پیش نظر بھی یہی مقصد ہے۔ اپنے طور پر یہ ادارے بھی نہایت مفید ہیں۔ لیکن ماہر نفسیات کے خیال میں یہ ادارے صحیح طور پر کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ جنگ و نزاع کے اسباب فطری طور پر انسان کے قلب کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں جس سے ان اداروں کو کوئی تعلق نہیں۔

حال ہی میں ایک ماہر نفسیات نے دریافت کیا ہے۔ کہ ہر ایک انسان میں مہذب ذہن کے پہلو بہ پہلو PRIMITIVE MIND ذہن قدیم بھی قائم رہتا ہے۔ جو اصلی طور پر وحشی اور گنوار ہوتا ہے۔ اور ہماری بے خبری کے عالم میں انسان اور انسان میں بلکہ خود انسان کے اپنے قلب میں نزاع پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہ ایسا ذہن ہے۔ جس کا ہمیں علم یا شعور نہیں۔ اس لئے اسے ذہن لاشعوری کہتے ہیں۔ یہی وہ ذہن ہے۔ جس میں ہماری بیشتر دماغی پریشانیوں کے اسباب موجود ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے یوگیوں کو اس ذہن لاشعوری کا علم تھا اور وہ اسے گپت من ([illegible]) پکارتے تھے۔ لیکن علمی طور اس کا مطالعہ موجودہ صدی میں وی آنا کے ماہر نفسیات ڈاکٹر فرائڈ نے ہی کیا ہے۔ جس کے سر اس کی دریافت کا سہرا تو نہیں۔ لیکن وہ پہلا انسان ہے جس نے اس کی تحقیق کر کے ایسے قوانین وضع کئے ہیں۔ اور وہ طریقہ معلوم کیا ہے۔ جن کی اعانت سے ہماری اس ذہن تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اس طریقہ کو طریقۂ تحلیل نفسی کہتے ہیں۔

ہر ایک آدمی کو اپنی ذات یعنی "میں" یا انا کا شعور ہوتا ہے۔ اس انا کی مختلف خواہشات ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ تم ایک نامور کھلاڑی بننا چاہتے ہو۔ تم رولز رائس پر سواری کرنا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو۔ کہ تمہاری بیوی بہت خوبصورت ہو۔ تم چاہتے ہو۔ کہ بنک میں تمہارے حساب کے آگے ہندسوں کی طویل رقم لکھی ہوئی ہو۔ تم چاہتے ہو۔ کہ دنیا کے گرد سفر کرو تم۔ چاہتے ہو کہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریر کرو۔ اور تمہارا نام جلی حروف میں اخبارات میں درج ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے بہت خوبصورت ہوں۔ یا بالکل نہ ہوں یہ تمہاری چند ایک خواہشات ہیں۔ تم انہیں اپنی خواہشات کہتے ہو۔ میں انہیں اپنی خواہشات کہتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ انا کی خواہشات ہیں۔

اب اگر کوئی آدمی تم سے یہ استفسار کرے۔ کہ تمہیں بے شمار دولت کیوں چاہیے؟ تمہیں شہرت کیوں چاہئے؟ تم دنیا کیوں دیکھنا چاہتے ہو؟ تو تمہیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا جواب تمہارے پاس کوئی نہیں۔ ان خواہشات کے وجوہ ذہن لاشعوری میں پنہاں ہیں۔ جس کا تمہیں علم نہیں۔ زیادہ سے زیادہ تم یہ کہہ سکتے ہو۔ آخر کار میں انسان ہوں جس سے تمہاری مراد یہ ہو گی۔ کہ یہ خواہشات فطرتِ انسانی کا حصہ ہیں۔ ماہر نفسیات تمہیں بتائے گا کہ جب تم پیدا ہوتے ہو۔ تو اسی وقت سے تمہارے دماغ میں عمل اور تحصیل کے رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ یہ رجحانات تمہاری نشو و ارتقا کے مختلف منازل پر اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ ان فطری رجحانات کو جبلت کہا جاتا ہے۔ مثلاً خوراک کی تلاش، تعجب، جنسی خواہشات، لڑائی اور اجتماعی جبلت، خوئے تسلیم اور اپنے حقوق کا تحفظ چند ایک بنیادی خواہشات ہیں۔ جو انسانی فطرت سے اپنی تسکین کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہ رجحانات یا جبلتیں ذہن لاشعوری میں پنہاں رہتی ہیں

اور ہماری کسی شعوری کوشش کے بغیر بھی ننگیں اور خواہشیں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً عمر کے ایک خاص حصے میں جنسی جبلت پختہ ہو جاتی ہے اور لاشعوری طور پر اس سے متعلق خواہشیں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ خواہشیں قدرتی ہوتی ہیں۔ ان میں تعلیم کو کوئی دخل نہیں۔

ہر ایک سماج نے ان جبلتوں کے لئے تسکین بہم پہنچانے کے طریقے وضع کئے ہیں۔ ہر ایک فرد کے لئے اس کا سماج اس کی ان جبلتوں کی تسکین کے لئے ذرائع مہیا کرتا ہے یا کم از کم مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے اعرانی اور اجتماعی جبلت کے لئے انجمنیں کلب اور اسی طرح کے دیگر ادارے قائم کئے جاتے ہیں۔ بہترآزمائی کی جبلت کے لئے کرکٹ بازی، ہاکی، فٹ بال کشتی اور کبڈی جیسی کھیلیں ایجاد کی گئی ہیں۔ جنسی جبلت کی تسکین کے لئے شادی کی رسم کی ترویج کی گئی ہے اسی طرح پر ذاتی اقتدار اور ملکی جبلت کی تسکین کے کئی طریقے ہیں

لیکن سماج ہر ایک طرح کی جبلتوں مثلاً جنسی خواہشات اور ذاتی دماوی کی تکمیل کی کامل تسکین کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ ان جبلتوں کی تسکین کی حد بندی کرنے کے لئے سماجی آئین و قوانین بنائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی میں جنسی خواہش بہت زیادہ ہے۔ وہ اگر تنہا چھوڑ دیا جائے۔ تو شاید ایک سو ایک شادیاں کرلے لیکن سماجی آئین اس کو اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح ہر دولت کا حریص چاہیگا کہ وہ تمام دنیا کی دولت غصب کرلے۔ اور اپنے آپ کو دنیا کا آقا بنا کر تمام لوگوں کو اپنا بندہ بننے پر مجبور کرے لیکن سماجی قانون نے اس ذاتی کبر و پندار کی تسکین کے لئے حد بندی کر دی ہے۔

فرائڈ نے یہ عظیم الشان حقیقت آشکار کی ہے کہ تمام دماغی پریشانیوں کا ایک ہی سبب ہے۔ یعنی خواہش کا پورا نہ ہونا۔ انا کی خواہشات تسکین کا تقاضا کرتی ہیں۔ ان کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اور ان کی تسکین نہیں ہوتی۔

پابندیاں ابتدائی سالوں سے ہی اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور ہماری ذات مثالی کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ جس کی تعمیر دو سال کی عمر سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اور جوں جوں ہم عمر میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس ذات مثالی کا بھی ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ اس ذات مثالی کو ضمیر کہا جاتا ہے۔ فرائڈ اسے فوق انا کے نام سے پکارتا ہے۔

زندگی کے عرصہ پیکار میں انا یا میں مافوق انا کی اخلاقی ذات اور بیرونی دنیا میں ایک مستقل جنگ جاری رہتی ہے۔ غریب انا اپنی جبلی خواہشات کے مطالبات، بیرونی دنیا کے مطالبات اور اخلاقی ذات کے مطالبات میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح ہمارے ذہن میں پریشان کن نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔ جو زندگی کی جملہ پریشانیوں کا باعث بنتی ہے۔

فرض کرو کہ ایک آدمی کو اپنے ہمسایہ کی بیوی دلکش معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے۔ اس کی اس خواہش کی مخالفت کی جاتی ہے۔ پہلے تو اس سماج کی طرف سے جس کا وہ ایک رکن ہے۔ کیونکہ سماج کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے اس کا فوق انا اس کی اس خواہش کی مخالفت کرتا ہے۔ اس طرح اس کے ذہن میں ایک نزاع پیدا ہو جائے گی۔ جو ہر ایک طرح کی دماغی پریشانیوں کا باعث ہوگی۔ جو خواہشات لاشعوری طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور جن کی مخالفت کرکے انہیں پورا نہیں ہونے دیا جاتا۔ وہی دماغی پریشانیاں پیدا ہونے کا باعث بنتی ہیں۔ ہماری بہت سی پریشانیاں اپنے آپ کو دوسروں سے برتر بنانے کی خواہش سے متعلق ہیں۔ مختلف انسانوں کا تھوڑا سا مطالعہ کرنے سے پتہ چل جائے گا۔ کہ وہ کس طرح ہر وقت اپنے آپ کو اپنے ہمسایہ سے برتر بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ کس طرح ہر ایک آدمی اپنا نام اپنی تصویر کے ساتھ ملک کے مقتدر جرائد میں چھپا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ ماہر نفسیات کو بڑے بڑے آدمی بھی قومی، ملکی اور سماجی اجتماعات میں اس لئے بیتاب نظر آتے ہیں۔ کہ اخبارات کے نمائندے انہیں دیکھ لیں یہ بڑے آدمی اپنی عظیم الشان تقریر کے اعلان کی غرض سے بڑے بڑے اشتہارات دیواروں پر لگواتے ہیں۔ لیکن عین موقع پر ان کی طرف سے یہ معذرت پیش کی جاتی ہے۔ کہ ان کی طبیعت ناساز ہے۔ یہ کیوں۔ اس لئے کہ تقریر یہ صرف ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ طبیعت کی ناسازی سے وہ اپنا مزید اشتہار دے سکتے ہیں۔ ہر ایک آدمی کم و بیش طور پر اپنے آپ کو دوسرے آدمیوں سے بہتر بنانے کی خواہش کرتا ہے۔ جب یہ خواہش پوری نہیں ہوتی۔ دماغی پریشانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ادنے سے لے کر اعلےٰ انسان تک دماغ کی یہی کیفیت ہے۔

یہ خواہشات ہماری جبلّتوں سے متعلق ہیں۔ یعنی جذبۂ جنسی، حرصِ زر اور پدری خواہشات وغیرہ سے ان کا تعلق ہے۔ یہ خواہشات بنی نوعِ انسان میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ یہاں تک کہ اوتار و اقطاب کی بھی اپنی خواہشات ہوتی ہیں۔ اور اپنی ہی پریشانیاں ماہرِ نفسیات کو ابھی تک اس آدمی کی تلاش ہے۔ جس کی تمام خواہشات پوری ہو چکی ہوں۔ اور وہ ہر لحاظ سے مطمئن ہو۔

اب ہمیں جملہ پریشانیوں کا باعث معلوم ہو گیا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان کے تدارک کا کوئی ذریعہ ہے؟ بنی نوعِ انسان ازل سے اس سوال کا جواب مہیا کرنے میں کوشاں ہے۔ ہندوستان کے یوگیوں اور صوفیا کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا۔ اور وہ یہی کہ دنیاوی پریشانیوں سے کس طرح نجات پائی جائے۔ لیکن ان کے طریقے اتنے مشکل اور ناقابلِ عمل ہوتے تھے۔ کہ عام آدمی ان پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے تھے۔

عام آدمیوں نے پریشانیوں سے نجات پانے کا یہی طریقہ سمجھا ہے۔ کہ انہیں فراموش کر دیا جائے۔ یہ لوگ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے منشیات، خوش خیالی لہو و لعب اور اسی طرح کے دیگر غیر معمولی ذریعوں کی وساطت سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہیں۔

منشیات سے عارضی نشہ ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کے رنج و محن فراموش ہو جاتے ہیں خوش خیالی اور فرضی قلعوں کی تعمیر انا کے وہ طریقے ہیں جن سے وہ دنیا کے مصائب کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح اپنی اُن خواہشات کی تکمیل کر لیتا ہے۔ جن کی تسکین عام حالات میں نہیں ہو سکتی۔ یہ عمل مندرجہ ذیل طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔

جب انا کی خواہشات کی مخالفت کی جاتی ہے۔ تو دماغ میں ایک قسم کی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ الجھن غیر محدود وقت تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اس کا تجربہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً Y ایک قصبہ کا با اثر آدمی ہے۔ اُس کی توقع تھی۔ کہ اس کے قصبے میں جو عظیم الشان اجتماع ہونے والا ہے۔ وہاں اُسے بھی مدعو کیا جائے گا لیکن اُسے کوئی دعوت موصول نہیں ہوتی۔ اور اجتماع ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ سے اُسے کچھ الجھن سی ہوتی ہے۔ اب اس صورتِ حالات میں وہ تین طرح پر اپنی الجھن سے نجات پا سکتا ہے۔ یا تو یہ کہ وہ دعوت دینے والوں کے پاس سیدھا چلا جائے۔ اور دلائل و براہین سے ان سے اپنے احترام کا مطالبہ کرے۔ لیکن یہ طریقہ اُسے سماج کے آداب کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ اس کے پاس یہ ہے۔ کہ وہ خاموشی سے وہ وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ جس کی بنا پر اُسے دعوت سے محروم رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ لوگ اُسے اُتنا اہم آدمی نہ سمجھتے ہوں۔ جتنا وہ خود اپنے آپ کو خیال کرتا ہے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے سے اس کا غم و غصّہ دُور ہو جائے گا۔ ایک اور تیسرا طریقہ بھی ہے۔ کہ وہ کچھ عرصہ تک اس واقعہ پر کڑھتا رہے۔ اور پھر اسے لاشعوری طور پر فراموش کر دے۔ اس لاشعوری فراموشی کو فرائڈ Repression کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ فراموشی کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ یہ لاشعوری کیفیت ہوتی ہے۔ اور ہمیں معلوم نہیں۔ کہ یہ کس طرح واقع ہوتی ہے۔ فرائڈ نے ہمیں ایک اور صداقتِ عظیم کا درس دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ فطرتِ انسانی ناگوار تاثرات کو فراموش کر دیتی ہے۔ اس طرح ہم قرض واپس کرنا بھول جاتے ہیں۔ لیکن وصول کرنا نہیں بھولتے۔

ناگوار تاثرات ذہنِ شعوری سے اس لئے مفقود ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ بہت زیادہ عرصہ تک انہیں گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ تاثرات جاندار اشیاء کی طرح نشوونما پاتے ہیں۔ اگر کسی ساکن پانی کی جھیل میں ایک روڑا پھینکا جائے۔ تو وہ پانی میں ایک چھوٹا سا حلقۂ تموج پیدا کر کے گم ہو جاتا ہے۔ اس حلقہ کے گرد ایک بڑا حلقہ بنتا ہے۔ اور پھر اُس کے گرد ایک اور۔ حتیٰ کہ یہ بہت بڑے حلقے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایک ناگوار تاثر اپنے ارد گرد ناگوار تاثرات کے بڑے بڑے حلقے پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح ذہنِ لاشعوری میں بہت سے ناگوار جذبات کا مجموعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فرائڈ اس مجموعہ کو ? Complen کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ ? Complenes پر جوش طور پر زندہ رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں ان کا علم نہیں ہوتا۔ یہ ذہنِ شعوری میں نہیں آتے۔ کیونکہ اسے ان کی موجودگی گوارا نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ بالواسطہ دوسرے طریقوں سے اپنا اثر ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہ طریقے مندرجہ ذیل ہیں:—

(۱) یہ ہمارے خوابوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ہمارے ذہنِ لاشعوری کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہر ایک خواب ایک ایسی خواہش کی تکمیل ہوتی ہے۔ جو بیداری میں تشنۂ تکمیل رہ گئی تھی۔ نوآموز آدمی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ خواب کے علامات

مختلف ہیں۔ اور وہاں خیالات کا اظہار مختلف طور پر ہوتا ہے۔

(۲) یہ Complenes خواب بیداری اور اوہام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

(۳) ذہنی خرابیاں اور ہسٹیریا جیسے امراض انہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(۴) غیر معمولی دماغی حالتیں اور عادات کے ذمہ وار بھی یہی ہیں۔

یہ Complenes بعض دفعہ زندگی کے پہلے سال میں ہی بن جاتے ہیں۔ فرض کرو۔ کہ تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تم اس بچے کی ہر طرح سے نگہداشت کرتے ہو۔ اور اس کی ہر ایک خواہش کو پورا کرتے ہو۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اور قدرتی طور پر پہلے بچے کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ بس اسی انقلاب سے اُس کے دماغ میں Complenes پیدا ہو جاتے ہیں۔ بے رحم باپ۔ خوفناک ماں۔ سوتیلی ماں۔ اور اسی طرح کی دیگر چیزیں Complenes کی تخلیق کی ذمہ دار ہیں۔ یہی Complenes باغی نوجوان۔ گستاخ عورتیں۔ سارق لڑکے۔ اور مالیخولیا کے مریض پیدا کرتے ہیں۔ بچوں کے بہت سے نقائص کے اسباب کا پتہ ان Complenes سے چلتا ہے۔ جو ان کے بچپن کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارا روزمرہ کا رویہ۔ ہماری نفرت اور ہماری حقارت کا انحصار انہی Complenes پر ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ ہم کسی آدمی کو خواہ مخواہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔

اس کی وجہ کچھ نا شعوری ذہن ہی جانتا ہے۔ Complenes کے جذبات کا رجحان بالعموم اس چیز کی طرف ہو جاتا ہے۔ جس کو انسان Complenes کے پیدا ہونے کے بعد پہلی دفعہ دیکھتا ہے۔ بہت سے آدمی معمولی معمولی باتوں کے متعلق پریشان ہوتے ہیں۔ اور بہت پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہوتی ہے۔ کہ ان کے Comlenes جذبات مختلف الجھنوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں اپنی پریشانی کا باعث معلوم نہیں ہو سکتا۔ بعض استاد جماعت سے باہر کسی استاد سے ناراض ہو کر جماعت میں آتا ہے۔ تو خواہ مخواہ طلبہ سے ناراض ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ طلباء کے معمولی معمولی قصور اسے بڑے گناہ نظر آنے لگتے ہیں۔ کیونکہ اس کے Complenes کے جذبات کو کسی چیز سے متعلق ہونے کا آسانی سے موقع مل جاتا ہے۔ اس عمل کا عام مظاہرہ کئی دفعہ ہماری گلیوں میں ہوتا ہے۔ دو بچے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ ایک بچہ دوسرے کو پیٹتا ہے۔ پٹنے والا اپنی ماں سے جا کر شکایت کرتا ہے۔ اور دونوں بچوں کی مائیں ایک دوسری کو بُرا بھلا کہتی ہیں۔ اگر پیٹنے والے بچے کی ماں کو اس جنگ میں شکست ہو۔ تو وہ اپنے ہی بچے کو پیٹنے لگتی ہے۔ یہ جذبات کا نہایت منحوس انتقال ہے۔

ایک دن میں نے مندرجہ ذیل خبر ایک اخبار میں پڑھی:—

"مس ——— کی شادی بڑی دھوم دھام سے ——— کے ساتھ ہوئی ہے۔"

ان الفاظ نے مجھ پر بجلی گرا دی۔ دفعتہً میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہی لڑکی پہلے میرے ایک دوست سے منسوب ہو چکی تھی۔ لیکن خبر کی اشاعت سے ایک مہینہ قبل یہ نسبت منسوخ ہو گئی تھی۔ اب لڑکی کی شادی کسی اور جگہ ہوئی۔ جب مجھے پہلی دفعہ اس کی اطلاع ملی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ افسوس سا ہوا تھا لیکن خبر کے مطالعہ نے اس افسوس کو غم کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد جب میرے حواس درست ہوئے۔ تو میں نے اپنے ذہن کا مطالعہ کیا (یہ میری عادت ہے۔) ایسا کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ اسی صبح کو میرے ایک حاکم نے میری تحقیر کی تھی۔ اور میں دل میں بہت خفیف ہوا تھا۔ لیکن آداب مجلس مجھے اجازت نہ دیتے تھے۔ کہ میں اپنے غصہ کا اظہار کروں۔ اس لئے میں صرف ہنس دیا۔ کچھ دیر کے بعد میں یہ واقعہ بھول گیا لیکن خبر کے مطالعہ نے میرے دبے ہوئے جذبات کو ایک اور واقعہ کی طرف منتقل کر کے ظاہر ہونے پر مجبور کیا۔ اور میں رو دیا۔

ہم جرم یا ناقابلیت کے جذبات کو دبا دیتے ہیں۔ لیکن یہ جذبات ذہن لاشعوری میں Complenes کی صورت میں قائم رہتے ہیں۔ اور موقع ملنے پر اپنی شکل تبدیل کر کے دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ جو شرابی اپنی بیوی کے اخلاق پر حملہ کرتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر اپنے جرم کو چھپاتا رہتا ہے۔ یہی حال نامرد آدمی کا ہے۔ جو اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ بہت سے آدمی تمہیں ایسے ملیں گے جو ہر وقت مذہبی اذکار سے تنہا رہ کر

کھا جائیں گے۔ شعوری طور پر یہ لوگ بہت مخلص ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ذہن کا مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس ساری نمائش کی پشت پر کوئی جرم نفلجوان کے اس روّیہ کا ذمہ دار ہے۔ شعوری طور پر ان کے جذبات نہائت پاکیزہ ہوتے ہیں۔ لیکن ذہن لاشعوری کی زبان میں وہ اس طرزِ عمل سے کسی ایسی گذشتہ فروگذاشت کا ازالہ کر رہے ہوتے ہیں۔ جس کے خیال کو وہ ایک عرصہ سے دبائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے متعلق وہ بہت پریشان رہتے ہیں۔ ماہرِ نفسیات کا یہ قول یاد رکھئے۔ کہ جب کوئی آدمی ہر وقت کسی خاص مسئلہ پر زور دیتا رہے تو اس سے یہ مراد ہوگی۔ کہ اس کے دماغ میں کوئی ? Complen پیدا ہوگیا ہے۔

یہی ? Complnes ان گنت پریشانیوں کے باعث ہوتے ہیں۔ اور یہ پریشانیاں اس لحاظ سے بہت جابر ہوتی ہیں۔ کہ ہمارا ان پر کوئی بس نہیں چلتا۔ ان پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ کہ ان کو ذہن شعوری میں منتقل کیا جائے۔ اور پھر ان کو رفع کرنے کی تدبیر کی جائے۔ فرائڈ نے دنیا کو وہ طریقہ بتایا ہے۔ جس سے محض پریشانیاں ذہن شعوری میں منتقل کی جاسکتی ہیں۔

یہاں تحلیل نفسی کا طریقہ مجمل طور پر بیان کیا جائے گا۔ اتنی قلیل سی جگہ میں تفصیلات بیان نہیں کی جاسکتیں۔ اگر تم کسی تحلیل نفسی کرنے والے سے ملو۔ تو تمہیں وہ نہائت خوشگوار انسان نظر آئے گا۔ وہ تمہارے ساتھ مروّت سے پیش آئے گا۔ اور اس کی جملہ حرکات سے ہمدردی اور خلوص کا اظہار ہوگا۔ اور تمہیں ایک آرام دہ نشست پر بٹھا کر تم سے تمہارے ماضی کے وہ واقعات دہرانے کو کہے گا جو تم دہرا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے بچپن کے زمانہ تک لے جائے گا۔ تمہارے بیان کردہ واقعات سے وہ چند ایک اشخاص، واقعات، حادثات اور الفاظ کو چن لے گا۔ اور ان کو آزاد تلازم میں استعمال کرے گا آزاد تلازم تحلیل نفسی کا مرکزی جزو ہے۔ اور یہ اس طرح عمل میں لایا جاتا ہے کہ مریض کو نہائت آرام سے بٹھا دیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کی دماغی کیفیت کو اونگھ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور اسے کہا جاتا ہے۔ کہ جو کچھ اس کے دماغ میں آئے۔ وہ بولتا چلا جائے۔ تحلیل نفسی کرنے والا خاموشی سے اپنے لئے کچھ نوٹ درج کرتا رہتا ہے۔ بعض دفعہ تحلیل نفسی کرنے والا کوئی لفظ بول دیتا ہے۔ اور مریض اس لفظ کو سن کر جو کچھ اس کے دماغ میں آتا ہے۔ فوراً بول دیتا ہے۔ اس لفظ کو مہیّج لفظ کہتے ہیں۔

بعض دفعہ دیں مریضوں سے آسان طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کو ہر لحاظ سے پرسکون کر کے انہیں ایک کاغذ اور پنسل دے دی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ ان کے جی میں جو کچھ آئے۔ وہ اس پر لکھ دیں۔ اس طریقہ میں بھی بعض دفعہ مہیّج الفاظ بولے جاتے ہیں مریض کو کہا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی تنقیدی قوت کا بالکل استعمال نہ کرے۔ اور نہائت آزادی سے جو کچھ اس کے جی میں آئے۔ وہ کہ دے یا لکھ دے اس طرح ذہن لاشعوری کے خیالات ابھر آتے ہیں۔ اور ہماری گرفت میں آجاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں خوابوں کا بھی مخصوص اور اہم استعمال کیا جاتا ہے۔ خواب ذہن لاشعوری کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آزاد تلازم کے لئے خوابوں کو بھی مہیّج کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ تحلیل نفس کرنے والا مریض کے سامنے نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک پردہ کے پیچھے بیٹھتا ہے۔ وہ کوئی تنقید نہیں کرتا۔ صرف مریض کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ کہ وہ بولتا رہے۔ تحلیل نفسی کرنے والے کو علم ہوتا ہے۔ کہ ذہن لاشعوری سے کسی قسم کی اطلاع حاصل کرنا آسان کام نہیں۔ مریض ہر ایک طرح کی رکاوٹ پیش کرتا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے۔ کہ یہ رکاوٹیں لاشعوری ہوتی ہیں۔ شعوری طور پر مریض تحلیل نفسی کرنے والے کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ذہن لاشعوری اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ مریض یہ کہتا ہوا سنا جاتا ہے "صاحب میں یاد کرنے کی تو بہت کوشش کرتا ہوں لیکن کچھ یاد نہیں آتا"۔ رفتہ رفتہ رکاوٹ رفع ہو جاتی ہے۔ اور مریض بہت سے واقعات دہرانے لگتا ہے۔

دورانِ تحلیل میں مریض کو تحلیل کرنے والے سے ایک انس سا ہو جاتا ہے۔ یہ انس محبت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو۔ تحلیل کرنے والا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور لاشعوری رکاوٹ ختم نہیں ہوتی۔ مجمل طور پر تحلیل نفسی کا طریقہ یہی ہے۔ اب کچھ پریشانیوں کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

بہت سی پریشانیاں ? Complenes کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ تحلیل کرنے والا ان ? Complenes کو پنہاں سے پیدا کر لیتا ہے۔ اور انہیں مریض کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ اس طرح سے پریشانیاں صحیح شکل میں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ دوسرا

عمل اب ان پریشانیوں کو رفع کرنا ہوتا ہے۔ تحلیل کرنے والا ہم پر ہمارے نقائص، گناہ اور جرم واضح کرتا ہے جنہیں ہم ایک عرصہ سے چھپائے ہوتے ہیں۔ ہم ان کو اس لئے چھپائے ہوتے ہیں کہ ان کا خیال ہمارے لئے نہایت ناگوار ہوتا ہے۔ ہم ان کا اقبال کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن اب ان کا اقبال ہی ہمیں پریشانیوں سے نجات دلاسکتا ہے۔

چونکہ پریشانیاں ہماری تشنۂ تکمیل خواہشات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے بسا اوقات یہ علاج بھی تجویز کیا جاتا ہے۔ کہ اگر ممکن ہو۔ تو ہمارے ماحول میں ایسی تبدیلیاں کردی جائیں جن سے ہماری خواہشات پوری ہو جائیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو صحت اور فلسفہ کی دوا سے کام لیا جاتا ہے یعنی مریض کو یہ سمجھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ اس دنیا میں ہر ایک خواہش کی تسکین ممکن نہیں۔ اور تمام عمل کو ایک مختصر سے جملہ میں بیان کیا جاتا ہے۔

"اپنے آپ کو سمجھو۔ اپنی حالت پر قانع رہو۔"

تحلیل نفسی صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد فلسفۂ حیات کا درس دیا جائے۔ کیونکہ زندگی کے سانحات پریشانیوں کے باعث نہیں ہوتے۔ صرف ان سانحات کی طرف اپنا رویہ ہوتا ہے جو پریشانیوں کی تخلیق کا ذمہ دار ہے۔ یہ رویہ فلسفہ کی مدد سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ تعلیم دی جانی چاہیے۔ کہ ہم زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے لئے تیار رہیں۔ کیونکہ ان کو تسلیم کر لینے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہر ایک جائز اور ناجائز خواہش کا پورا ہونا ضروری نہیں۔ سماج کی بہتری کے لئے صرف جائز خواہشات پوری ہو سکتی ہیں۔ تحلیل نفسی کے بعد اپنے جرم کا اقبال اور اپنے نقائص کا اقرار کر کے اپنی ناجائز خواہشات سے دستبردار ہونے سے ہم اپنی تمام پریشانیاں رفع کر سکتے ہیں۔ تحلیل نفسی صرف اتنی مدد کرتی ہے۔ کہ وہ ہمیں صحیح شاہراہ پر لے آتی ہے۔ فرائڈ کا یہ احسان عظیم بنی نوع انسان کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ کہ اس نے دنیا کو سکون اور آرام کی زندگی بسر کرنے کا راستہ بتا دیا۔ کیونکہ اس کو سمجھنے کے بعد کوئی پریشانی نہیں رہتی۔

(آر۔ آر۔ کمریا)

نسیم رضوانی

معراجِ سخن

آہ کی فریاد کی شکوا کیا — کیوں خفا ہیں آپ ہم نے کیا کیا؟

کیا کہوں تاثیرِ ضبطِ سوزِ غم — دل کی بستی سے دھواں اٹھا کیا

قصۂ دردِ جگر کیوں کر کہے — کہنے والا عمر بھر سوچا کیا

بات جب ہے دردِ دل پیدا کرے — دل اگر پیدا کیا تو کیا کیا

اچھے آئے تم عیادت کے لئے — چارۂ دردِ جگر اچھا کیا

ایک وہ ہیں چین سے سویا کئے — ایک ہم ہیں رات بھر تڑپا کیا

آپ گر مصروفِ آرائش نہ تھے — آئینہ پہروں کسے دیکھا کیا

پردے والا لاکھ پردے میں رہا — دیکھنے والا مگر دیکھا کیا

رازِ دل معراجؔ کیوں ہوتا عیاں

اشتیاقِ دید نے رسوا کیا

معراج

دھولپوری

غزل

حسن و الفت کی تھیں راہیں اور دلِ خود کام تھا
جوشِ وحشت میں خیالِ دوست سے آرام تھا

بیکسی تھی، قبر تھی، میں تھا، دلِ ناکام تھا
آج وہ ظاہر ہوا جو عشق کا انجام تھا

آنے والی اس جہاں میں ایک ہی وہ رات تھی
ہم سرِ بستر تڑپتے تھے تمہیں آرام تھا

چلنے والے رک کے دنیا کا تغیر دیکھ لے
وہ لحد پر آج ہے جو کل زباں پر نام تھا

اللہ اللہ دن سے تھی اتنی ترقی فراق
دل کا ہر اٹھتا ہوا شعلہ چراغِ شام تھا

فکرِ بیمارِ غم ان کو کب ہوئی پیدا کہ جب
قلب کو جنبش نہ تھی اور نبض کو آرام تھا

یاد ہیں "تاباں" ہمیں بھی عشق کی مصروفیاں
دل کو کب فکرِ سحر تھی کب خیالِ شام تھا

"تاباںؔ" (بریلوی)

اپریشن

امنگوں اور تمناؤں کی آندھی طوفان نکل جانے کے بعد جب شباب کی سرسوتی میں آسمان کو چھو لینے والی موجیں تھم تھم کر مٹنے لگیں اور صاف و شفاف ہو گئے آکاش کے نیچے پریم کی مدھم چال سے زندگی کا سفر طے کرنے لگی تو ڈاکٹر پرمانند کو ایک نئی بات معلوم ہوئی

"ہاں شاعر ٹھیک تھے ——— اب اس میں کچھ شک نہیں ورنہ اس آدھی رات کے سمے میں جب سب لوگ دنیا کے جھمیلوں سے اکتا کر نیند کی گود میں آرام کر رہے ہیں وہاں اس چھت کی منڈیر پر دودھ سے دُھلی سنگ مرمر کی مورتی کی طرح دنیا اور دنیا والوں سے بے خبر بیٹھی ہوئی یہ آسمان میں کیا دیکھ رہی ہے ——— ؟ اب تک سنا کرتے تھے کہ شاعر پاگل ہوتے ہیں۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

لتا نے مڑ کر دیکھا تو پرمانند وہیں سے منہ لپیٹے ہوئے تکیہ پر منہ رکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اس نے پوچھا ——— "کیوں کیسے ہنس رہے ہو؟ ابھی تک نیند نہیں آئی کیا؟"

پرمانند نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا ——— "یہاں آؤ ———!"

لتا آکر پلنگ پر بیٹھ گئی انھوں نے کملی کی طرح ماریک ساڑی کے نیچے بڑی موٹی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "میں تو سمجھتا تھا کہ ڈاکٹری ہی کے امتحان پاس کرنے میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ شاعر بننے کے لئے بھی رات رات بھر جاگ کر گھور تپسیائیں کرنی پڑتی ہیں۔"

لتا نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا ——— "چلو رہنے دو۔ نہ جانے کیا نیا وہم تمہیں سوار ہو گیا ہے۔"

کچھ دن اور اسی طرح گزر گئے۔ ڈاکٹر پرمانند کی پریکٹس اب زور شور کے ساتھ چل نکلی تھی۔ دو ڈھائی برس پہلے وہ ولایت سے ایم۔ ڈی کی ڈگری لے کر واپس آئے تھے اس وقت اگر وہ چاہتے تو کسی اچھی سرکاری پوسٹ کو پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ اور ہمیشہ کے لئے بے فکر ہو جاتے۔ لیکن وہ دیدہ دانستہ اس راستے سے الگ رہے۔ ان کا ایک لائف مشن تھا انھوں نے جب دیکھا کہ اس کی تکمیل کے لئے کوشش کرنے کا وقت آ گیا ہے تو وہ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اس میں منہمک ہو گئے۔ اس کے لئے آئندہ انہیں کن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑیگا؟ اس کا انھوں نے کبھی خیال تک نہیں کیا۔

یہ مشن تھا سرجری کو رواج دینا۔ دنیا کے کونے کونے میں گھر گھر میں سرجری کی بنیاد قائم کر کے دم لینا وہ سرجری کے اسپیشلسٹ تھے۔ ان تھوڑے دنوں کی پریکٹس میں انھوں نے ایسے ایسے کامیاب اپریشن کئے تھے کہ انہیں دیکھ کر اچھے اچھے تجربہ کار ڈاکٹر دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے تھے معمولی لوگ تو انہیں دیوتا سمجھنے لگے تھے ان کی ڈسپنسری کے سامنے صبح سے شام تک غریب دکھیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور وہ باری باری سب کی سنتے اور ان کا علاج کرتے تھے۔

ڈاکٹر پرمانند کا قول تھا کہ ——— "خود اعتمادی اور قربانی کے زور سے ایک ادنیٰ آدمی بھی دنیا میں دوام حاصل کر سکتا ہے ———!"

یہی دو قوتیں تھیں جن کے بھروسے پر انھوں نے اپنے سنہرے خوابوں کی دنیا سا رکھی تھی سرجری کا نہیں نشہ سا چھایا رہتا تھا، جوں جوں اس کی طاقتوں کی جستجو میں آگے بڑھتے جاتے تھے۔ قدرت کے اسرار کی طرح وہ اور بھی پیچیدہ ہوتی چلی جاتی تھیں ان کی نگاہ میں ساری دنیا کے سکھ آنند اور ان کی جملہ خرابیوں کا علاج انہیں قوتوں میں مضمر تھا انہیں پہلے دریافت کر کے صرف رواج دینے کی ضرورت تھی۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، ویسے ہی ویسے ان کا یہ رنگ اور بھی گہرا ہوتا گیا۔ پرمانند چاہتے تھے کہ ان کا یہ پاک پیغام بچے بچے کے کان تک پہنچ جائے۔ اس لئے وہ جس سے ملتے زیادہ باتیں اسی کے متعلق کرتے۔

جو لوگ اپنی زندگی کو کسی خاص مقصد کے لیے وقف کر دیتے ہیں ان میں یہ ایک کمزوری ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر پرمانند بھی اس سے بری نہ تھے۔ اگر انہیں کوئی نہ ملتا تو وہ لتا ہی کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور سرجری کے

متعلق اپنے نئے اور پرانے تجربات نیز علم الابدان کے دقیق مسائل بیان کیا کرتے۔ لتا ایک بے سمجھ بچی کی طرح پرمانند کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر ان کی باتیں سنا کرتی لیکن بہت کوشش کرنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ سرجیکل ڈبکس میں رکھے ہوئے طرح طرح کے ان ٹیڑھے میڑھے چاقوؤں کا نفسیات کے ساتھ کیا تعلق ہے! وہ اس موضوع سے دلچسپی لینے کی بہت کوشش کرتی تھی۔ لیکن ان کی کھٹور صورت تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کے نازک تخیلات پژمردہ ہو جاتے تھے۔

کوٹھی کے پاس ہی پرمانند کا اپنا ایک پرائیویٹ اسپتال تھا جس میں ہر درجہ کے لوگ داخل ہو کر اپنا علاج کراتے تھے غریبوں کے لئے اس میں بڑے بڑے لمبے وارڈ تھے۔ اور امیروں کے لئے ان کے اوپر آزاد کمرے۔ سارا اہتمام انگریزی ہسپتالوں کی اسٹائل پر کیا گیا تھا۔ ویسا ہی انتظام وہی نرس۔ ویسے ہی ہاؤس سرجن۔ کمپاؤنڈر۔ نوکر۔ چاکر۔ غرض سب کچھ ویسا ہی۔

شام کے وقت لتا اس طرف نکل جاتی۔ جہاں غریب بیمار اپنے دکھوں کی لمبی راتیں ہال کی اونچی چھت پر آنکھ لگائے کاٹا کرتے تھے اور ان سے ان کے دکھ سکھ کی باتیں پوچھا کرتی۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ کبھی کبھی بارہ بارہ اور دو دو بجے تک آدھی رات میں سناٹے میں بجلی کی صرف ایک بتی کی دھندلی روشنی میں خیالی دنیا کی ہستی کی طرح کرسی پر تنہا بیٹھی ہوئی کسی مریض کے افسردہ چہرے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتی۔ اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اس کی بیان کردہ زندگی کی کہانی کو سنا کرتی تھی۔ اسی درمیان میں کبھی کبھی ہال کے دوسرے حصے سے کسی دکھیا کی درد بھری آواز اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی وہ کرسی سے اٹھ کر دبے پاؤں اس کی چارپائی کے پاس جاتی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھتی

"تمکو کیا تکلیف ہے؟"

لتا کی نرم آواز سن کر مریض اپنی نیم وا آنکھیں کھول دیتا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی آسمانی دیوی اپنا دستِ شفا پھیر کر اس کی تکلیفوں کا خاتمہ کرنے آئی ہو۔ اس کی سفید آنکھوں سے مسرت اور احسانمندی کا بوجھ لے کر آنسوؤں کے دو قطرے لڑھک جاتے۔ لتا بھی نہال ہو جاتی اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اسے دنیا کی سب سے بڑی دولت مل گئی ہو۔

لتا کو وہ سب چیزیں حاصل تھیں جن سے دنیا والے دوسروں کے سکھ کا اندازہ لگایا کرتے ہیں موٹریں تھیں۔ نوکر چاکر تھے۔ باغ باغیچے تھے۔ کئی کوٹھیاں تھیں۔ اور ان سب چیزوں کے نباہنے کے لئے ایک خاصی آمدنی تھی لیکن جو سکھ۔ جو اطمینان اسے ان غریبوں اور بیکسوں کی تکلیف دور کرنے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنے میں ملتا تھا۔ وہ اُسے نہ تو موٹروں میں بیٹھ کر ہوا خوری میں ملتا تھا اور نہ بجلی کی روشنی سے جگمگاتے ہوئے اوپیرا ہاؤس میں بیٹھنے سے۔

اسپتال کے غریب اور دکھیا مریضوں کے پاس بیٹھ کر ان کی درد بھری کہانی سنتے سنتے درد و غم ملے ہوئے جذبات کے ساتھ اس کا دل اسی رنگ میں رنگ گیا تھا۔ دنیا کی ساری چیزوں میں وہ صرف اسی رنگ کو دیکھنے کے لئے بے قرار رہتی تھی۔ سمندر کے ساحل کے غروبِ آفتاب گھنے جنگلوں کے طلوعِ آفتاب۔ پہاڑوں کی آغوش میں کھیلتے ہوئے آبشار اور خاموش بہنے والی ندیاں۔ اسے ایک لمحے کے لئے اپنی طرف کھینچتی تھیں لیکن تھوڑی دیر تک قدرت کے ان مناظر کو دیکھتے دیکھتے وہ سوچ اور اداسی کے گہرے سمندر میں غوطے کھانے لگتی۔ اس وقت اس کی حالت ٹھیک اس انسان کی سی ہو جاتی جو شراب کے دو چار گھونٹ پی کر تھوڑی دیر تک ہنستا رہتا ہے اور پھر بے ہوش ہو کر سو جاتا ہے۔

× × × × ×

ایک روز لتا اسی طرح تخیلات کی دنیا میں بہہ رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ساون کا مہینہ۔ کالے بادلوں کے دل کے دل آسمان پر اڑتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ سامنے بہت دور افق میں سورج ٹوٹے ہوئے جہاز کی طرح بادلوں میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوا مستانی ادا سے چل رہی تھی زمین اور آسمان اندھیرے کی ایک ہلکی سی چادر میں چھپے ہوئے۔ بہت دنوں کی جدائی کے بعد آنکھوں میں خوشی اور مسرت کے آنسو بھر کر آپس میں ملنے کی تیاری کر رہے تھے لتا اپنی کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین کے باہر خلا میں جو کچھ ہے سب حسین ہے سب آزاد اور آنند ہے۔ یہاں دکھ تکلیف اور پاپ بے خوف ہو کر شکار کھیلتے ہیں۔ لوگ یہاں صرف مرنے کے لئے جیتے ہیں۔ بچھڑنے کے لئے ملتے ہیں اور بوڑھے ہونے کے لئے جوان ہوتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ لامحدود آسمان۔ یہ پرجوش سمندر

اور چہچہاتی ہوا اتنی دل کش کیوں معلوم ہوتی؟ اور دل انہیں میں کھو جانے کے لئے کیوں تڑپتا۔۔۔۔۔۔! اور دلفریب صبح نہ ہوتی تو اس دنیا میں آہ و فغاں اور چیخ و پکار کے سوا اور کیا ہوتا۔۔۔۔! اس زمین سے جو چیز جتنی ہی دور ہے اتنی ہی منوہر۔ اتنی ہی دلفریب اور اتنی ہی پاک ہے۔ یہ چڑیاں جب پنجرے میں بند کر لی جاتی ہیں تو ان میں سے جیسے روح نکل جاتی ہے۔ لیکن یہی چڑیاں جب آسمان میں اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں تو ہمیں ان پر رشک ہونے لگتا ہے یہ ندیاں پہاڑیوں کی گود میں مچلتی ہوئی کیسی خوش نظر آتی ہیں لیکن زمین پر اترتے ہی ان کی ساری خوشی۔ سارے ولولے خاک میں مل جاتے ہیں۔ یہ ہرے بھرے درخت برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیاں زمین سے جتنی ہی اونچی اٹھتی ہیں، اتنی ہی دلفریب اتنی ہی منوہر معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہ گرجتے برستے۔ بجلی سے آنکھ مچولیاں کھیلتے ہوئے بادل جب زمین پر چھا جاتے ہیں تو ہماری سوئی ہوئی خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اور ہم دکھ درد کے کفن کو منہ سے ذرا سرکا کر، دنیا کی فریب سے ایک بجلی گانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

رات بھولی پیاسنگ سینواں میں

تتا قلم لے کر بیٹھ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس مرتبہ وہ اپنی نظم میں اپنے دل کے سارے درد کو سمیٹ کر یک بارگی ہی رکھ دے۔ تاکہ اس کے لئے اسے بار بار نہ رونا پڑے۔ اس نے ایک بار دھوئیں کی طرح منڈلاتے ہوئے بادلوں کی طرف ٹھیک اسی طرح دیکھا جیسے مصور اپنی تصویر میں رنگ بھرنے سے پہلے اپنے برش میں رنگ لگاتا ہے وہ کچھ لکھنا ہی چاہتی تھی کہ یکایک سامنے کا دروازہ کھلا۔ اور ڈاکٹر صاحب سامنے آ کر کھڑے ہو گئے

"کیا کر رہی ہو!

"کچھ نہیں"

پرمانند کے ہاتھ میں چمکتا ہوا ایک نشتر تھا اور چہرے پر فتحمندی کا جوش۔ نشتر کی طرف ایک محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے تتا سے کہا "میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس نشتر سے میں نے کیسے کیسے خوفناک اپریشن کئے ہیں کیسے کیسے لوگوں کی جانیں بچائی ہیں کبھی کبھی تو مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ شہرت یہ ناموری اور یہ دھن جو تم دیکھ رہی ہو سب اسی کی بدولت ہے۔ تم کہتی ہو گی کہ اس نشتر میں ایسی کیا کرامت ہے۔ یہ تو اپنی اپنی قابلیت اور ہاتھ کی صفائی کی بات ہے تمہارا یہ سوچنا ایک حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن جس چیز نے اتنے دنوں تک میرا اس طرح ساتھ دیا ہے کیا اس کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی! یوں تو میرے پاس ایک سے ایک قیمتی نشتر ہیں لیکن مجھے ان پر اتنا بھروسہ نہیں ہے جتنا اس چھوٹی سی چیز پر ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کسی روز یہ کھو جائے تو۔۔۔۔۔۔؟"

ڈاکٹر نے نشتر کو اپنے منہ کے پاس لے جا کر چوم لیا۔ اور پھر اسے موڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا تتا ان سب باتوں کا کچھ جواب دیے بغیر ہی کچھ دیر تک پرمانند کی طرف بے معنی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنا قلم اور نظم لکھنے کی کاپی کو اٹھا کر پاس کے طاق پر رکھ دیا۔

جب پرمانند کمرے سے باہر جانے لگے تو اس نے پوچھا۔۔۔۔۔۔" کوئی اپریشن کیا تھا کیا؟"

"اور تم نے سنا کیا! خوفناک اپریشن تھا۔ دس انچ لمبا۔۔۔۔۔! بائیں طرف کی ران کا ریوسیس تھا۔ اگر تم نے دیکھا ہوتا تو غش کھا گئی ہوتیں اف کتنا خون کتنا مواد نکلا۔۔۔۔۔۔۔"

"کیا کہیں ٹہلنے نہ چلوگے؟"

"چلو کینس گارڈن۔ وکٹوریا پارک۔ جوبلی کلب۔ جہاں جی چاہے چلو لیکن بادل آ رہے ہیں کہیں بارش نہ ہونے لگے۔

✱ ✱ ✱ ✱ ✱

رات بھر تتا کچھ افسردہ سی رہی۔ دوسرے روز سویرا ہوتے ہی وہ اپنا دل بہلانے کے لئے اسپتال کی طرف نکل گئی وہاں وہ روز کی طرح ایک ایک کمرے کے مریضوں کو دیکھتی بھالتی ایک ایسی چارپائی کے پاس جا پہنچی جس پر ایک نوجوان آنکھیں بند کئے کروٹ کے بل پڑا تھا۔ اس کی بائیں ران میں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور ان میں سے خون بہہ بہہ کر نیچے کی چادر کو بھگو رہا تھا۔ نرس نے بتایا کہ کل شام کو اس کا اپریشن ہوا تھا۔ ابھی ابھی ڈریسنگ ہوئی ہے۔ اسی لیے تھک کر سو گیا ہے اسے جگانا ٹھیک نہیں۔

تتا کو خیال آگیا کہ یہ وہی مریض ہے۔ جس کے اپریشن کا ذکر پرمانند نے کل کیا تھا۔ وہ آہستہ سے کرسی سرکا کر چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا نوجوان کا دبلا پتلا جسم ناقابل برداشت تکلیف کی وجہ سے اور بھی لاغر ہو گیا ہے حسین چہرہ خون کی کمی کے باعث بالکل زرد پڑ گیا ہے

اور سر کے بال نہ جانے کتنے دنوں سے سنوارے نہ جانے کی وجہ سے روکھے ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے پر بھی اس کے چہرے پر ایک قسم کی غیر معمولی چمک ہے۔ بلند پیشانی ایک خاص شخصیت کا پتہ دے رہی ہے۔ اور بڑی بڑی آنکھوں کی ساکن پلکوں کے پیچھے ایک حسین زندگی جاگ رہی ہے۔

لتا کو خیالات کی رو میں بہتے دیر نہ لگی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ یہ کون ہے کہاں سے آیا ہے؟ اس کی سرگزشت کیا ہے؟ کس بری طرح بیمار ہے۔ لیکن ایسے میں بھی کوئی اس کا پرسان حال نہیں کوئی دوست، کوئی عزیز نہیں۔ اف یہ دنیا کیسی عجیب و غریب جگہ ہے؟

لتا اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی کہ مریض نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور پھر اسی طرح بند کرلیں۔ یہ کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک حسین عورت یہ نرس۔ یہ قلیوں اور بہروں کی چہل پہل۔ سب اسے خواب سا معلوم ہوا۔ وہ سو گیا۔

* * * * * *

لتا اب شام کو روزانہ نوجوان مریض کے پاس بیٹھتی۔ اور اسپتال کے دوسرے مریضوں سے فرصت پانے کے بعد جو وقت ملتا اس میں ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا دل بہلایا کرتی۔ نوجوان اب کچھ اچھا ہو چلا تھا اور اب اپنی ران کو اپنی خواہش کے مطابق حرکت دے سکتا تھا۔ لتا کے آنے پر وہ اٹھ کر ایک تکیہ کے سہارے بیٹھ جاتا۔

نوجوان کو یہ معلوم کرتے دیر نہ لگی کہ لتا کون ہے؟ اور وہ اس طرح کیوں روزانہ شام کو آکر مریض کی خبر لیا کرتی ہے۔ لتا کو بھی یہ معلوم ہو گیا کہ نوجوان ایک پاک طینت انسان ہے۔ اس نے شادی نہیں کی۔ والدین بچپن ہی میں چل بسے۔ اس نے کالج کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے لیکن سیاحت کی طرف زیادہ میلان طبع ہے۔ اس لئے اکثر سفر ہی میں رہتا ہے۔ اس وقت وہ کشمیر سے واپس ہو رہا تھا کہ یکایک اس کی ران میں درد شروع ہو گیا۔ اور مجبوراً اسے یہاں اتر جانا پڑا۔

لتا نے پوچھا ———— "آیندہ کے لئے آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

نوجوان نے کہا ———— "اگر ایک ہفتہ کے بعد مجھے یہاں سے فرصت مل گئی۔ اور میں چلنے پھرنے کے لائق ہو گیا تو یہاں سے سیدھے اودے پور جاؤں گا۔ برسات میں راجپوتانے کی بہار دیکھنے کے لائق ہوتی ہے

اور خاص کر اودے پور تو اپنے قدرتی مناظر کیلئے مشہور ہے اسے لوگ ہندوستان کا وینس کہتے ہیں"۔

لتا نے کہا ———— "ہاں تاریخی نظر سے بھی وہ ایک اہم جگہ ہے"

"آپ نے درست فرمایا لیکن میں تاریخ کا اتنا عقیدت مند نہیں ہوں میں تو قدرت کے حسن کا ایک ناچیز پجاری ہوں۔ پہاڑی بستیاں ندی کنارے کے گاؤں سنسان تاریک گھاٹیاں اور جنگلی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے اندھیرے کنج۔ نیز ایسے ہی اور حسین مناظر اپنی خاموش دعوتوں کے ذریعے مجھے اپنے پاس بلایا کرتے ہیں۔ قدرت کی دلکش موسیقی کو سننے کے لئے شاعروں نے اس میں جو زندگی دیکھی ہے اسے سمجھنے کے لیے انسان کو ایسی ہی جگہوں میں جانا پڑتا ہے۔ اپنے پیٹ میں صدیوں کو ہضم کر کے جمائی لینے والے تاریخی کھنڈروں اور شان و عظمت کے بوجھ سے دبے ہوئے شہروں کے قابل دید مناظر میں اس کے تخیل کا عکس تک نہیں پہنچتا"۔

لتا کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے دلی جذبات کی تصویر کھینچ رہا ہو ———— وہ بولی ———— "آپ کا میلان طبع تو بالکل شاعروں کا سا ہے........"

نوجوان کسی قدر مسکرا کر بولا ...... "آپ نے ٹھیک ہی سمجھا ہے۔ میرا یہ پاگلوں سا مارے مارے پھرنے کا خبط اسی طبیعت کا عطیہ ہے۔ تخیل میرے لئے ایک کوئل ہے۔ جہاں کہیں مجھے اس کی کوک سنائی دیتی ہے۔ وہیں میں اپنی شاعری کا دامن بچھا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور جب تک میری طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ وہاں سے دوسری جگہ نہیں جاتا۔

"اوہو! تو آپ شاعر ہیں ————؟" لتا نے چونک کر پوچھا۔

"شاعر تو ہوں۔ ہاں نظمیں لکھتا ہوں۔ شاعر ہونا تو بڑی بات ہے"

شاعر نے نہایت سادگی سے جواب دیا

تعجب اور حیرت سے لتا کا دل اچھل پڑا۔ جیسے سمندر نے چودھویں کا چاند دیکھ لیا ہو۔ وہ اصرار کر کے بولی ———— "اگر تکلیف نہ ہو تو ایک نظم سنائیے"۔

"شاعر نے ایک شعر سنایا کیسی شیریں آواز تھی۔ کیسے اچھوتے خیالات تھے۔ لتا کا دل کیف و سرور سے مخمور ہو اٹھا وہ بے ساختہ بول اٹھی ———— "واہ وا کیا شعر کہہ دیا آپ نے۔ ہاں دو چار اور سنائیے!"

شاعر چن چن کر اپنے اشعار سناتا جاتا تھا اور لتا کا پیاسا دل

کمال شوق کیساتھ کیف و سرور کی شراب سے اپنی تشنگی بجھا رہا تھا۔

شام چلی گئی رات آئی۔ اسپتال ایک بار پھر نرسوں اور قلیوں کی چیخ و پکار سے گونج اٹھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد ہال کے سارے مریض ایک ایک کر کے اپنے دکھوں کی چادروں میں سمٹ کر سو گئے۔ لیکن لتا کی آنکھوں میں نیند کہاں —— ! جب وہ کرسی سے اٹھ کر اپنی بلڈنگ کو جانے لگی تو اس نے ہال کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ٹھیک بارہ بجے تھے۔

کئی روز تک یہی شغل جاری رہا۔ ایک ہفتہ نہ جانے کب ختم ہو گیا شاعر کو خبر بھی نہ ہوئی اور —— لتا کی تو زندگی ہی بدل گئی۔ اس میں اب ایک نئی صبح کا طلوع ہوا۔ اس کے چاروں طرف اب تک سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے جنہیں چھو کر سکھ آنند کی روشن دنیا واپس چلی جاتی تھی۔ اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ غیر ہمدردانہ حالت اور ملکی فضا کے ہاتھ میں اپنے آپ کو سونپ کر اس نے اپنے لئے ایک ایسی دنیا کی تخلیق کر لی تھی۔ جہاں اس کے نفرت انگیز اصول سیاہ تخیل پیدا کرتے تھے

اس تخیل کی شراب کو پی کر جب تک وہ اپنا کلیجہ خاک نہ کر لیتی اسے چین نہ آتا تھا۔ شاعر کی دنیا اس کے برخلاف کیسی حسین کیسی دلفریب اور کیسی ہنگامہ خیز تھی۔ اس میں لتا کی گرم آہوں کی جگہ سکون کی ٹھنڈی جھلک تھی آنسوؤں کے سیلاب کی جگہ تبسم کی ہلکی لہر تھی اور نرک دنیا کی خاموشی کی جگہ دنیا کی محبت کا اندھر اُگ چھڑا ہوا تھا وہاں جہنم تھا۔ یہ بہشت ہے۔ وہ خزاں تھی یہ بہار ہے۔ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ تھے۔ اور ایک دوسرے کے کتنے نزدیک —— لیکن بدنصیب لتا کے لئے کتنے دور...... ؟

لتا کی سفارش سے نوجوان کو ہال کے اوپر اب ایک آزاد کمرہ مل گیا تھا۔ اور نوکر چاکر نیز کھانے پینے کی خاص سہولتیں مہیا کر دی گئی تھیں۔ لتا اب یہیں بیٹھ کر نوجوان شاعر کی نظمیں سنا کرتی۔ اور اس کے بہت اصرار کرنے پر کبھی کبھی دو چار نظمیں اپنی بھی سنا دیا کرتی تھی۔

شاعر دیکھتا۔ جس حسن کے لیے وہ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا جس تخیل کو اپنانے کے لئے وہ جگہ جگہ ڈیرے ڈالتا رہتا تھا۔ اسے لتا کا نسوائی دل پیدائش کے وقت سے اپنے ساتھ لایا ہے ——! لتا نے تخیلات کو اپنے رنگ میں اتنا ضرور ڈبو لیا ہے کہ ان میں ایک کالی چمک آگئی ہے۔ لیکن ان میں وہ تصنع نہیں ہے۔ جو کبھی کبھی اس کی نظموں میں پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ شاعر کی نظم پہاڑی آبشاروں کو روک کر تیار کیا ہوا سنگ مرمر کا حسین تالاب تھا۔ تو لتا کی نظمیں جنگل میں بہتی ہوئی دلکش ندی ——!

اس شاعرانہ صحبت اور نظموں کے سننے سنانے سے نوجوان کی صحت میں کمال سرعت سے تبدیلی ہونے لگی۔ اس کا زخم تقریباً بھر چکا تھا جسم میں طاقت بھی آگئی تھی۔ اور چہرے کی رونق بھی آہستہ آہستہ واپس آ رہی تھی۔ جیسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برساتی دھوپ سایہ کو آگے آگے بھگاتی ہوئی پھیل جاتی ہے۔

ایک روز نوجوان نے کہا —— "سنا ہے جو قیدی لمبی سزا کاٹ کر چھوٹتے ہیں، وہ جیل خانے سے نکلتے وقت رو یا کرتے ہیں۔ مجھے جب کبھی اس دن کا خیال آتا ہے جب میں اسپتال چھوڑ کر باہر جاؤں گا تو تمہاری منوہر مورتی اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے سے میرا راستہ روک لے گی۔ میں سوچتا ہوں۔ اگر تم نہ ہوتیں تو میری کیا حالت ہوتی۔ لتا! تمہاری اس محبت اور مہربانی کا معاوضہ کیا میں اس زندگی میں کبھی ادا کر سکوں گا!"

لتا نے کہا —— "جسے تم مہربانی سمجھتے ہو اسے میں اپنی بہت بڑی غلطی سمجھتی ہوں۔ تم آج یہاں ہو تو میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ کل چلے جاؤ گے تو کس سے باتیں کروں گی! کس کے پاس اس محبت سے بیٹھوں گی؟ تمہاری یہ دن دونی سدھرتی ہوئی حالت مجھے کسی زبردست حادثہ کی طرح آنے والی مصیبت کا پتہ دے رہی ہے مجھے وہ دن رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ جب میں نے پہلے پہل تمہاری بھیگی ہوئی آنکھیں۔ مرجھایا ہوا چہرہ اور کسی اجڑے ہوئے مندر کے کلس کی طرح خاموش مگر بلند پیشانی دیکھی تھی!"

شاعر —— "اگر تم نے اپنے نازک بازوؤں پر یہ بار نہ لیا ہوتا تو ممکن ہے میں ہمیشہ کے لئے چارپائی کی رونق کا باعث بنا رہتا۔ سچ پوچھو تو میرے حقیر جسم کو تم نے زندگی عطا کی ہے۔ یہ تمہارا ہے۔ اگر اس اسپتال میں زندگی بھر اسی طرح پڑے رہنے سے تمہارے دل کو ذرہ بھر بھی سکھ ملے تو اس جسم کا اس سے اچھا اور کوئی استعمال نہیں ہو سکتا۔ ایشور نے تمہیں سندر روپ دیا ہے۔ ویسا ہی منوہر تمہارا دل بھی بنایا ہے۔ اور اس میں پریم بھرے جذبات بھی دئیے ہیں۔ قدرت کے حسین اور دلکش مناظر پر برسوں تک منڈلا کر بھی جس شہد کے چھتے کو میں نہ بھر سکا اسے تمہاری مد بھری آنکھوں نے ایک ہی لمحے میں رس سے بھر دیا —— شاعر کی لطیف تخیل کا دلکش حسن۔ اور حسن کی بے پناہ کشش تم میں آکر ختم ہو جاتی ہے —— تم کائنات کی لازوال دولت —— قدرت

کا مجموعی حسن، اور زندگی کا مجسم شوق جو تمہارے قدموں کا سہارا پا کر ایسا کون بدنصیب ہوگا جو ادھر جھکنا چاہے گا۔ لیکن ...... "

لتا ـــــــ "لیکن کیا ـــــ؟"

شاعر ـــــ "یہی کہ انسان مصائب و حوادث کا پتلا ہے، اور ان حالات کے پیدا کرنے میں سماج کے سخت اور بے رحم قانونوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ جو بات دیکھنے اور سننے میں بھلی معلوم ہوتی ہے، وہی حقیقت کے چکر میں گھوم کر انتہائی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے تمہارے خواب و خیال جگت کے کومل جیو ہیں اس لوبھی سنسار کے کٹھور ست کو سامنے لاتے ہی اس کے رنگ جھلس جائیں گے۔ پھر ایسے سپنوں کو پال کر ہردے کو دکھی بنانے سے کیا فایدہ ـــــ؟"

لتا ـــــ "تمہیں اس میں کچھ فایدہ نظر نہ آئے۔ یہ دوسری بات ہے لیکن میں تو انہیں کے سہارے جیتی ہوں۔ اب تک میں سنسار میں اکیلی تھی جنگل میں بھولی ہوئی کوئل کی طرح میں اپنی سب بولیاں بھول کر صرف ایک دردناک چیخ سے اپنے دل کے پرسکون آسمان کو صدائے بازگشت سے گونجانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ یہ سارا سنسار میرے لئے ایک کارخانے کی طرح تھا جہاں انسان لوہے کے کل پرزوں کی طرح الگ الگ اپنے دائروں میں گھوما کرتے ہیں وہ دن رات آپس میں ملتے ہیں۔ کھاتے ہیں۔ پیتے ہیں۔ اٹھتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں اور زندگی بھر ساتھ رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے ... ! ان کے دلوں کو پہچان نہیں سکتے۔ جیسے مشین کے پرزے آپس میں رگڑ کھاتے ہوئے بھی آگ نہیں پیدا نہیں کر سکتے۔ میرا یہ مال و دولت اور فردوسی حسن اب تک ایک قبر بنا ہوا رہا تھا، جہاں میری فراہم شدہ آرزوئیں ایک مدت سے مایوسی کے اندھیرے میں سوئی ہوئی پڑی تھیں۔ تم انہیں جگانے کے لئے نہ جانے کہاں سے آ گئے اور اب جب وہ کسی چنچل دیوتا کی طرح مجھ سے کہہ رہی ہیں "بر مانگو نہیں تو بھسم کرتا ہوں ..... !" تو تم کہتے ہو "یہ سب خواب ہے! اسے پالنے سے کیا فایدہ؟"

لتا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے شاعر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "سچ بتاؤ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم تم دونوں ایک پنچھی کے جوڑے کی طرح اس زمین پر ساتھ ساتھ گھومیں انہیں سایہ دار کنجوں میں۔ انہیں ندی نالوں میں۔ انہیں گھاٹیوں میں جن میں تم اب تک سیر کرتے رہے ہو تم اپنی آواز میں بہار کی ساری مستی بھر کر ایک گیت گاؤ۔ اور میں شام کے وقت انہیں کنجوں میں تمہاری گود میں سر رکھ کر اسے سنوں۔ جب تک یہ سنسار اور ہم تم دونوں مل کر شامل نہ ہو جائیں۔ اور میں آنند سے بے سدھ ہو کر تمہارے ...... !"

شرم نے لتا کی زبان پکڑ لی لیکن اس کے ہاتھ نہ رک سکے پریم سے دیوانی ہو کر اس نے شاعر کا ہاتھ اوپر کو اٹھایا اور پاگلوں کی طرح چوم لیا ...... !

نوجوان شاعر کے دل میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ یکایک کمرے کا دروازہ کھلا، اور ڈاکٹر پرانند اندر داخل ہوئے۔

لتا کے جسم میں سے جیسے جان نکل گئی۔ شاعر کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دھرا ہی رہ گیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ دیکھ کر بولے..... "کیوں اس کی حالت کیسی ہے؟ ٹمپریچر معلوم ہوتا ہے کیا؟"

لتا کو سانس لینے کی جگہ نہ ملی سنبھل کر دبی آواز سے بولی

"ہاں ان کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا دیکھئے تو!"

ڈاکٹر نے نبض دیکھی نبض میں نوجوان کا کمزور دل زور سے دھڑک رہا تھا اور واقعی کچھ گرم تھا۔ انھوں نے برآمدے میں سے گذرتی ہوئی ایک نرس کو اشارے سے بلایا اور اس سے نوجوان کا ٹمپریچر لینے کی خاص ہدایت کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

* * *

دوسرے دن نرس سے لتا کو معلوم ہوا کہ نوجوان کو ہر وقت ٹمپریچر رہتا ہے، اور اس کا پھر دوبارہ کھولا جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ کسی جگہ مواد رہ گیا ہے۔

شاعر نے پھانسی کی سزا کی طرح یہ خبر سنی۔ خدا کی قدرت میں وہ کیا دخل دے سکتا تھا! اس نے بغیر کچھ کہے سنے نہایت اطمینان اور سکون سے خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔

دو روز تک ڈاکٹر صاحب نے بخار کا اتار چڑھاؤ اور دیکھا، اور پھر اپریشن کر دیا۔ اس مرتبہ اپریشن کے بعد مریض کی حالت زیادہ نازک ہو گئی تھی۔ صورت پر ایک خاص طرح کی اداسی آ گئی تھی۔ اور آواز ایک دم سست پڑ گئی تھی لتا یہ حالت دیکھ کر رو پڑی۔

اس نے نوجوان کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیئے۔ ہسپتال میں دواؤں کی ندی بہا دی۔ لیکن مریض کی حالت روز بروز گرتی چلی گئی۔

ایک روز شام کو جب سورج کی کرنیں اسپتال کی کھڑکی سے ایک شیشے میں سے ہو کر اندھیرے سے لڑنے کی آخری کوشش کر رہی تھیں شام اپنی مایوس آنکھیں لتا کے اداس چہرے پر گاڑ کر اس دنیا سے چل بسا۔

لتا نے اپنی پریم کی ارتھی کو اپنی آنکھوں کے سامنے جاتی ہوئی دیکھا اور جی بھر کر رو بھی نہ سکی۔ اس کے دل کا غم بند چمنی کے دھوئیں کی طرح اندر ہی گھٹ کر رہ گیا۔

* * *

دنیا بھی عجیب محفل ہے۔ جن کے لئے ہم سوچتے ہیں کہ ہم ان کے بغیر مر جائیں گے۔ ہمارا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ وہ اس دنیا سے اٹھ جاتے ہیں۔ اور ہم جیتے رہتے ہیں ——— ہم پہلے کی طرح کھاتے پیتے ہیں راگ رنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ اور کچھ دنوں کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

لتا بھی سب پچھلی باتیں بھول گئی ——— کچھ بھول گئی۔ کچھ اس نے کوشش کر کے بھلا دیا۔ اب اس کے دو لڑکے تھے کئی لڑکیاں تھیں لڑکے کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور لڑکیوں کی شادی ہو گئی تھی یہ واقعہ مذکورہ کے بیس برس بعد کی بات ہے۔

ڈاکٹر پرمانند اب خاندان سمیت لنڈن میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں انھوں نے کافی دولت اور ناموری حاصل کی لیکن ہندوستان جیسا ملک ان کی بڑھی ہوئی تمناؤں اور بلند حوصلوں کے لئے بہت ہی تنگ تھا۔ اس لئے موقع پاتے ہی وہ ولایت چلے گئے۔ اور وہیں جا کر بس گئے وہاں رہ کر انھوں نے کیا کیا ؟ اپنی اہم تحقیقات کی بدولت وہاں کے ڈاکٹروں کے طبقہ میں کیسی ہل چل مچا دی ؟ ان باتوں کا تذکرہ ہمارے افسانے کے موضوع سے الگ ہے۔ ہم یہاں اخیر میں ایک ایسا واقعہ بیان کریں گے جو ڈاکٹر پرمانند کی سیرت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتا ہے جس سے اب تک ان کی رفیقۂ حیات لتا بھی بالکل بے خبر تھی ———!

* * *

کنگس اسٹریٹ کے ایک عالی شان ہوٹل میں ڈاکٹر پرمانند لتا کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ عمر کی زیادتی کی وجہ سے ان کے سر کے کثر بال سفید ہو چلے تھے۔ اور گردن کا کساؤ کچھ ڈھیلا ہو کر ایک بدنما شکن پیدا کر رہا تھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے کچھ دور تک سیاہی پھیلی ہوئی تھی اور بھرے ہوئے پپوٹوں پر گہری آڑی شکنیں سن رسیدگی کے جمے ہوئے خیالات اور پرانے تجربات کا پتہ دے رہی تھیں

لتا ٹیبل کے دوسرے سرے پر بیٹھی تھی۔ لنڈن میں برسوں رہ کر بھی اس کے دل میں اپنی تہذیب کی محبت اس طرح موجود تھی اس کے بدن پر ایک ریشمی ساڑھی تھی۔ اور پیشانی کی ایک لٹ بالوں کا ساتھ چھوڑ کر بھوؤں کے پاس لٹک رہی تھی۔ جوانی کے خیالات کا پرشور سیلاب وقت کے پتھریلے راستے پر بہت دنوں تک بہہ کر سست ہو گیا تھا۔ اور دل ذاتی دکھ سکھ سے بے نیاز ہو کر اولاد کو سکھی دیکھنے میں زیادہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ وہ اب نظمیں نہیں لکھتی تھی۔ لیکن تخیل کا پودا ویسا ہی ہرا بھرا تھا۔

پرمانند چمچے سے چائے میں چینی ڈالتے جاتے تھے اور لتا سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ سامنے ٹیبل پر تازہ اخبار پڑا تھا چائے کی پیالی سے ہٹ کر ان کی نگاہ اخبار کی ایک سرخی پر پڑ گئی تو وہ ہنس پڑے۔ لتا نے دیکھا ٹائیٹل پر موٹے موٹے ٹائپ میں چھپا ہوا تھا

LOVE AFFAIR IN HOSPITAL

PATIENT COMMITS SUICIDE

SENSATIONAL DISCLOSURES OF NURSE

یعنی: " اسپتال میں عشق بازی ———!

مریض نے خودکشی کر لی۔ نرس نے راز فاش کر دیا ———!"

ڈاکٹر پرمانند بولے ——— " لوگ کیسے کڑے ہیں کہ اسپتال میں بھی محبت کرنے سے باز نہیں آتے ! "

لتا نے ذرا متانت سے جواب دیا ——— " پریم دیش اور کال کو نہیں دیکھتا۔ اس کی پہنچ ہر جگہ اور ہر وقت ہے یہی اس کی خصوصیت ہے۔"

پرمانند نے بہت دنوں کے بعد آج اپنی بات میں تمسخر کا رنگ دیتے ہوئے کہا ——— " لتا ! تم نے بھی کسی سے پریم کیا ہے یا نہیں "

لتا اور بھی سنجیدہ ہو گئی بیس برس پہلے کے مناظر زندہ ہو کر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے ——— ! جیسے انہیں غم نے نکل کر اس نے جواب دیا ——— " جو پریم نہیں کرتا۔ وہ آدمی نہیں ہے ———! "

پرمانند کو اس جملے میں تلخی کا اثر محسوس ہوا تو کہنے لگے ——— " میں نے مذاق سے کہا تھا۔ تم ناراض ہو گئیں ! "

لتا نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا ——— "ناراض ہونے کی بات نہیں ہے۔ تم مذاق کر رہے ہو لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں ——— !"

ڈاکٹر ——— "کیا کہہ رہی ہو!"

لتا ——— "یہی کہ میں نے محبت کی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جرم کا اقبال کر لینے سے سزا نہیں بھگتنی پڑتی۔ یہی سوچ کر اتنے دنوں تک یہ بات چھپا کر بھی آج میں اسے ظاہر کرنے بیٹھی ہوں میں نے محبت کی تھی!"

پرمانند ——— "کس سے ——— ؟"

لتا ——— "ایک نوجوان سے یہ اپنے اسپتال کا واقعہ ہے ——— تم تو بھول گئے ہو گے۔ یاد ہے ایک دبلا پتلا لڑکا ——— ؟ جو ہال کے اوپر کے کمرے میں کچھ دنوں تک رکھا گیا تھا۔ اس کے پیر کا تم نے دوبار اپریشن کیا تھا!"

ڈاکٹر ——— "وہی نا جو شاعر تھا ——— ؟"

لتا ——— "ہاں! ہاں! وہی تمہیں کیسے معلوم ——— ؟"

پرمانند نے لتا کے چہرے پر سے اپنی آنکھیں سمیٹ کر چائے کی پیالی میں ڈبو دیں۔ اور بولے ——— "میں نے ہی تو دوبارہ اپریشن کر کے اسے مار ڈالا تھا ——— "

لوگ کہتے ہیں جج جس قلم سے پھانسی کی سزا دیتے ہیں اسے وہیں توڑ ڈالتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر پرمانند میں جرأت ہوتی تو ان لفظوں کو کہنے کے بعد اپنی زبان کاٹ ڈالتے ——— ؟

(ترجمہ) آسی رام نگری

آہنگِ نو

(دھرم سالہ کی ایک رنگین شام)

(۱)

کوہسار!
وہ شفق کا لالہ زار!
شام نے پہنی قبائے زرنگار
جس کے جلووں کا ہے خود نظارگی جوشِ بہار
رخصت اے سرمایۂ صبر و قرار!
ہر طرف ہیں نغمہ بار
آبشار!

(۲)

نام و ننگ ؟
اب کسے پروائے ننگ !
جاگ اٹھی دل میں محبت کی امنگ
اک طرف آہنگِ نغمہ اک طرف ہے موجِ رنگ
آج چشم و گوش ہیں مصروفِ جنگ
بج رہا ہے جلترنگ!
جلترنگ!

حفیظ ہوشیارپوری

رباعی

وہ حورِ سحر کا روئے روشن چمکا
کافور ہوا سیاہ بادل غم کا
نغموں کے ہیں آبشار جاری ہر سو
کیا روح فزا ہے لطف زیر و بم کا

احسان

غزل

بستیاں ڈھونڈتی ہیں اب انہیں ویرانوں میں
بڑھ گئیں وحشتیں حد سے ترے دیوانوں میں

ایک رنگینیٔ ظاہر ہے گلستاں میں اگر
ایک شادابیٔ پنہاں ہے بیابانوں میں

وسعتیں بھی ہیں نہاں تنگیٔ دل میں غافل
جی بہل جاتے ہیں اکثر انہیں میدانوں میں

بزمِ مے بے خود و بے تاب نہ کیوں ہو، ساقی
موجِ بادہ ہے کہ درد اٹھتا ہے پیمانوں میں

جان و ایمانِ جنوں سلسلہ جنبانِ جنوں
کچھ کششہائے نہاں جذب ہیں ویرانوں میں

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے
گرمیاں ہیں ابھی کچھ سوختہ سامانوں میں

یہ جو ہر غنچۂ گل میں ہے اک اندازِ جنوں
کچھ بیابان نظر آتے ہیں گریبانوں میں

دلِ بے تاب کی زد پر نہ یہ آئے ہوں کہیں
ایک رعشہ سا ہے قاتل ترے پیکانوں میں

دیکھ جب عالمِ ہُو کو تو نیا عالم ہے
بستیاں بھی نظر آنے لگیں ویرانوں میں

دلِ صد چاک بھی دیکھا ہے کبھی جامہ درو
دامنوں میں ہے یہ عالم نہ گریبانوں میں

اب وہ رنگِ چمن و خندۂ گل بھی نہ رہے
اب وہ آثارِ جنوں بھی نہیں دیوانوں میں

اب وہ ساقی کی بھی آنکھیں نہ رہیں رندوں سے
اب وہ ساغر بھی چھلکتے نہیں میخانوں میں

اب وہ اک سوزِ نہانی بھی دلوں میں نہ رہا
اب وہ جلوے بھی نہیں عشق کے کاشانوں میں

اب وہ اک سازِ غم آگیں بھی نہیں شمعِ خموش
اب وہ اک سوزِ دروں بھی نہیں پروانوں میں

اب ترا کام ہے بس اہلِ وفا کا پانا
اب ترا نام ہے بس عشق کے غم خانوں میں

اب نہ وہ رات کہ امیدیں بھی کچھ تھیں تجھ سے
اب نہ وہ بات غمِ ہجر کے افسانوں میں

تا بکے وعدۂ محبوب کی تفصیل فراقؔ
شبِ فرقت کہیں کٹتی ہے ان افسانوں میں

فراقؔ گورکھپوری

نواب بدرِ عالم بیگم صاحبہ بدرؔ

جانِ عالم واجد علی شاہ نے جان اور شوق کے شعر و سخن سے بھی بڑی دلچسپی لی چنانچہ جانِ عالم کی کئی ایک مثنویاں دیوان وغیرہ موجود ہیں نہ صرف اختر پیا خود شعر کہتے تھے بلکہ اپنے دربار میں بھی اچھے اچھے شعرا جمع کئے تھے یہی نہیں کہ وہ مردانے میں شعر و سخن کی داد دیتے تھے اور خود حصہ لیتے تھے بلکہ محلات میں بھی انھوں نے ایک ادبی روح پھونک دی تھی چنانچہ محلات کی اکثر بیگمات اور ممتوعات شعر کہتی تھیں نواب بادشاہ محل صاحبہ جو جانِ عالم کی بیاہتا بیوی تھیں بڑے اچھے شعر کہتی تھیں (جن کی شاعری سے متعلق ہمارا ایک مضمون ادبی دنیا بابتہ جولائی ۱۹۳۰ء میں طبع ہو چکا ہے) ان کے علاوہ اور کئی بیگمات کے کلام کے نمونے ہمارے پاس موجود ہیں مگر فی الحال نواب بدرِ عالم بیگم صاحبہ بدرؔ کی نظم اور نثر کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

نواب بدرِ عالم بیگم صاحبہ جانِ عالم کی محبوب ممتوعہ تھیں جب جانِ عالم کلکتہ بھجوا دیئے گئے تو کسی وجہ سے یہ ساتھ نہ جا سکیں مگر جانِ عالم کو آنکھوں سے دور ہونے کے باوجود دل سے دور نہیں کیا خود لکھنؤ میں رہیں مگر کلکتہ کے محبوس بادشاہ جانِ عالم کے تصور میں مگن رہیں چنانچہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا ۱۲۷۳ھ سے ۱۲۷۶ھ تک مسلسل خط و کتابت کرتی رہیں جانِ عالم چونکہ جوہری تھے اس لئے انھوں نے ان جواہر پاروں کو جو خط کی شکل میں بدرِ عالم کے پاس سے آیا کرتے تھے محفوظ رکھا اور تمام خطوط کو ایک جگہہ کتابی صورت میں جمع کر کے ان پر ایک دیباچہ سپرد قلم کیا۔

اتفاق سے جانِ عالم کا مرتبہ نسخہ سید محمد علی نعمانی ملیح آبادی مرحوم کے ہاتھ لگا اور انھوں نے ۱۳۲۲ھ میں ان خطوط کو "رقعات بدرؔ" کے نام سے چھپوا دیا مگر افسوس ہے کہ اس مطبوعہ رسالہ کی اشاعت اور شہرت بالکل نہیں ہوئی اور عام لوگوں تک نہ پہنچ سکا انتہا یہ کہ باوجود حیدرآباد میں رہنے کے میں خود اس سے ناواقف تھا حالانکہ یہ مجموعہ قاسم پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوا ہے اگر عزیزی سید شاہ عبد القادر صاحب سلمہ اپنی مہربانی سے ایک نسخہ جو تیل میں بھیگا ہوا اور حاشیوں کو تقریباً نذر دیمک کر چکا تھا عنایت نہ کرتے تو شاید اب تک ناواقف ہی رہتا۔

جانِ عالم نے دیباچہ حمد و نعت کے بعد اس طرح شروع کیا ہے:۔

"اما بعد راقم الحروف ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ حوالہ صفحہ بیان کرتا ہے کہ جب سپہر بوقلموں نے نیا رنگ دکھلایا اور سفر کلکتہ کا اتفاق ہوا بعض محلات سلطانی کہ جلباب دوری اور پردہ مہجوری میں رہیں اکثر خطوط نو دردآمیز بھجواتی تھیں اور اشتیاق اور محبت کی یادو لاتی تھیں بہ پاس مراسم الفت کے مطمحِ نظر ہوا کہ وہ فرامین حسن تالیف پائیں تاکہ رائیگاں نہ جائیں لہذا ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ میں خطوط نواب بدرِ عالم صاحبہ کو زیور ترتیب عطا کیا اور تحریرات ہر سال کو باب اور ہر ماہ کو فصل قرار دیا اور تاریخ بدر نام رکھا۔"

یہ رسالہ تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں ۱۲۷۳ھ دوسرے باب میں ۱۲۷۵ھ اور تیسرے باب میں ۱۲۷۶ھ کے خطوط ہیں کل چوبیس خطوط ہیں جن میں سے پانچ خطوط منظوم ہیں۔ چنانچہ پہلے خط کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

مودّت نامۂ اوّل

"مہر تمثال۔ یوسف جمال۔ داؤد الحان سلیمان زماں جانِ عالم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ ستم رسیدۂ مہاجرت۔ آفت رسیدۂ مفارقت بدرِ عالم۔ بعد عالم ارادت و نیاز

وجہان تمنائے دولتِ مواصلت مسرت آغاز کے ملتمس یہ ہے کہ نامۂ لطاف نظام، اختیار انضمام مملوئے شکوہ و شکایت و متضمن ارشاد و ہدایت نسبت اس بیمار زار، اسیر شکنجۂ مجرد اضطرار، ورود مسعود سے عزت افزا و مسرت پیرا ہوا۔ اس عنایت پر جاں فشانی، حیات جاودانی اور محو شیفتہ نوازی ہونا سرمایۂ انبساط روحانی ہے جس خدائے عزوجل نے مجھ کو شیدائے جمال جہان آرا کیا اُسی کو گواہ کرتی ہوں کہ رات دن تمہارے درد فراق سے سوائے گریہ و سوز مشغلہ نہیں رکھتی ہوں۔ اور سب ساتھی اور سنگت والیوں سے کنارے بسر کرتی ہوں اور خداوند حقیقی سے کہ چارہ گر بیچارگان ہے بہزار زبان دعا مانگتی ہوں کہ جان عالم کو با حشمت و اقبال و سلطنت و اجلال زینت افزائے تخت و تاج دیکھوں۔"

اس خط کا بقیہ حصہ نواب باقر محل صاحبہ نواب چھتر محل صاحبہ اور نواب اکلیل محل صاحبہ کی شکایت سے بھرا ہوا ہے شاید ان تینوں محلات نے بدر پر کچھ تہمت اٹھائی تھی اور جان عالم کو بدر کی طرف سے بدظن کرا دیا تھا۔ جس کی صفائی اس خط میں کی گئی ہے یہ خط محرم ۱۲۷۳ھ کا مکتوب ہے جمادی الآخر ۱۲۷۵ھ میں ایک منظوم خط اور غزل کے بعد یہ چند سطریں لکھی ہیں عبارت صاف زبان سلیس اسلوب حد درجہ پاکیزہ اور انداز بالکل مکالمے کے ہیں۔

"جانِ عالم ہمارے اختر پیارے! بدر عالم تمہارے عجب صدمہ میں گرفتار ہے ور نہ دوری سے بے قرار ہے۔ حال مختصر اگرچہ سلسلۂ نظم میں موزوں کیا ہے لیکن کچھ نہیں لکھا گیا ہے دل کی کیفیت بیان میں نہیں آتی ہے جو حقیقت گزرتی ہے نظم و نثر میں کسی طرح نہیں سماتی ہے مسیحا سے دوری ہے مریض محبت کی جہاں سے رخصت ضروری ہے زندگی کا سہارا اب فقط خط تمہارا ہے للہ ہاتھ جوڑتی ہوں منتیں کرتی ہوں جانِ عالم ادھر دیکھو ہماری طرف منہ پھیرو سنتے ہو خط جلدی جلدی لکھا کرو، اچھے جانِ عالم! ہماری طرف کو غافل نہ ہو نہیں تو ہم سچ کہتے ہیں مر جائیں گے جہان سے گذر جائیں گے کوئی مصیبت اٹھ نہیں رہی ہے جو ہم پہ نہیں پڑی ہے اب ہم پر رحم کا مقام ہے درد و دوری سے

ہمارا کام تمام ہے زیادہ سوائے آرزوئے وصل خطوط کے کیا لکھیں حال زار اپنا کہاں تک کہیں فقط!"

۱۱ ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ کو ایک خط لکھتی ہیں:۔

اختر پیارے میں صدقے تمہارے ہمیشہ شاد رہو دائماً آباد رہو خدا تم کو قید سے نجات دے مجھ کو آبِ حیات دے وہ دن آئے کہ تم یہاں آؤ پیاری پیاری صورت مجھ کو دکھاؤ تم کو پاؤں مرتی ہوں جی جاؤں جب سے یہ غزل آئی میرے دل مضطر کو کل آئی سبحان اللہ کیا فصاحت ہے ماشاء اللہ کیا بلاغت ہے نظیری تمہاری بے نظیری کا معترف ہے، ظہوری کے اظہار حال سے یہی ظاہر ہے جامی تمہارے جام بادۂ شاعری سے مدہوش ہے نظامی تمہارے کلام معجز نظام کا حلقہ بگوش ہے انوری تمہاری روشن بیانی کا قائل ہے فرید الدین عطار نسخۂ صحت کا تم سے سائل ہے عرفی شرعاً اور عرفاً تمہارا مدح خواں ہے۔ خاقانی تم کو خاقان اقلیم سخن جان کر قربان ہے۔ اہلی اگر دعوٰے کرے تو سراپا اس کی نااہلی ہے صائب اگر قائل نہیں تو رائے صاحب نہیں بلکہ بڑا جہلی ہے حسان بن ثابت پر ثابت اور عیاں ہے ملالی فرط غیرت سے سرگریباں ہے۔ مرزا انہیں واقف خوب واقف ہے سلمان ساوجی سلیمان اوج سخن جان کر تمہارا وصاف ہے شمس الدین فقیر تمہارے باب ابیات کا گدا ہے کلیم کو کیا کلام ہے بلکہ تمہارے کلام کا طالب مدام ہے فردوسی اور سعدی ہر ایک تمہارے گلستان سخن کا بلبل ہے بیدل بے دل، حزیں حزیں کوئی تمہارا ثانی نہیں ہے ہر شب ماہ کامل بایں کمال نظم ثریا کو دکھاتا ہے ہر صبح پیر فلک بایں کہنہ سالی مطلع آفتاب کو بامید اصلاح لاتا ہے ہر بیت ایک مثنوی ہر شعر ایک دیوان ہے بلکہ مثنوی صد قے دیوان قربان ہے یہ بحر رمل مسدس مقصور سشش جہت میں لاجواب ہے ہر مضمون اس بحر میں گوہر نایاب ہے سر مطلع تکرار لفظ بدر عالم نے قند مکرر کا مزہ دیا فصاحت کا دریا بہا دیا!"

۹ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو ایک خط لکھتی ہیں:۔

" اختر جانی زاد اللہ محبتہٗ بعون اللہ سبحانہٗ

تعالیٰ۔

بیوم خامس شہر ذی الحج ۱۲۷۵ھ مژدۂ صحت مزاج عیسیٰ لا علاج نامہ اعلیٰ صحیفۂ والا آیا اعجاز مسیحائی دکھلایا .... ایک جوڑا جہانگیری مرصع الماس فرحت اساس کی آمد کا مژدہ پایا بن دیکھے بے چینی دل نے مزا اٹھایا الحق سوا تمہارے کون ہے۔ جو اس از خود فراموش کو یاد کرے اور ایسے ایسے تحائف بھیج کر پھر اس اجڑی ہوئی بستی کو آباد کرے واللہ ایک جہانگیری پر کیا ہے میں نے کل زیورات واسباب قدیمی کو صبر کیا باعیوں اور ظالموں کی کٹی لگایا تمہاری سلامتی کی دعا لیل ونہار ہے یہی اب زیور اور یہی سنگھار ہے خدا تم جہانگیر ثانی کو آباد رکھے خرم وشاد رکھے ہر چند کہ اس مہجور کے پاس اب کچھ نہیں ہے مگر تم سلامت رہو تو سب کچھ ہے اور تم نے جو لکھا ہے کہ صندلی کلائیوں میں بہراوٹ ان کی مبارک ہو شاخ گلاب میں سجاوٹ کی جھک ہو سنو جان عالم: بغیر تمہارے ان صندلی کلائیوں میں جہانگیریوں کا نقشہ یہ ہے کہ گویا شاخ نخل صندل میں ماریچاں لپٹا ہے ان دونوں خلش خار الم نے شاخ گلاب کو پژمردہ کیا ہے طائر دل کو مانند عندلیب نالاں کے افسردہ کیا ہے آج کل روپیہ کا بڑا توڑا تھا نہ بہت تھا نہ تھوڑا تھا تم نے ہزار روپیہ بھجوائے سنا تو ہے کہ آئے مگر میں نے ابھی نہیں پائے جس وقت پاؤں گی رسید بھجواؤں گی خداوند تعالیٰ اب تم کو جلد لائے اور جلوۂ جمال جہاں آرا ہم کو دکھلائے واللہ اب تاب مفارقت نہیں ہے ضبط کی طاقت نہیں ہے زیادہ اشتیاق فقط۔"

یہ نمونہ ہے ایک پردہ نشین خاتون کی نثر کا جو مرزا غالب کی وفات سے دس سال پہلے لکھی گئی ہے جو دہندی اور اردوئے معلےٰ میں انہیں سنین کے رقعے مرزا غالب کے بھی نظر آتے ہیں۔ آپ ان رقعوں کو بدر کے ان رقعوں سے ملائیے اور پھر دیکھئے کہ مرزا نوشہ کی طرز اچھی ہے یا بدر عالم کی اگر بدر کے رقعات مرزا غالب کے رقعات سے بڑھے ہوئے نہیں تو گھٹے ہوئے بھی نہیں ہیں یہ رقعات اس زمانے کے ہیں جب کہ عورتوں کو تعلیم سرے سے دلائی ہی نہیں جاتی تھی آج تعلیم عام ہو اور بڑے شہروں میں تقریباً پچاس فی صدی خواتین لکھی پڑھی نظر آتی ہیں اور رسائل واخبارات میں مردوں کے دوش بدوش لکھتی ہیں مگر کسی خاتون کی نثر اس پائے کی نظر نہیں آتی۔ کیا ان خطوط کو دیکھ کر ہماری انشا پرداز بہنیں نصیحت حاصل نہیں کریں گی!

اوپر ہم نے بدر عالم صاحبہ کی نثر کے نمونے پیش کئے ہیں اب ان کی نظم کے نمونے دئے جاتے ہیں نثر کی طرح نظم پر بھی بدر عالم صاحبہ کو کافی عبور تھا اور نظم میں بھی وہی شان ہے جو نثر میں نظر آتی ہے چنانچہ ایک منظوم رقعہ جو جمادی الآخر ۱۲۷۵ھ کا مکتوب ہے نقل کیا جاتا ہے۔

دوائے درد منداں جان عالم! — مسیحائے مریضاں جان عالم!
قیامت تک رکھے تم کو سلامت — خدائے پاک با اقبال وشوکت
پس ذوق وصال وشوق دیدار — میں اپنا حال یوں کرتی ہوں اظہار
جدا تم سے ہوئی ہوں جس گھڑی کو — یہ تنگ آئی ہوں اپنی زندگی سے
چھڑایا ہے فلک نے تم کو جب سے — گھلی جاتی ہوں میں رنج وتعب میں
ستاتا ہے مجھے درد جدائی — بلا یہ کیسی میرے سر پہ آئی
کہوں کیا اپنے دل کی بیقراری — ہوئی ہوں جان سے اپنی میں عاری
تمہاری ہر گھڑی ہے یادگاری — ہر اک دم آنکھوں سے آنسو ہیں جاری
کھلے رہتے ہیں میرے دیدۂ تر — نہیں آتی ہے مجھ کو نیند دم بھر
تڑپتی ہوں سحر سے لے کے تا شام — نہیں ملتا کسی دم مجھ کو آرام
مرا دل خانۂ تن میں ہے بے تاب — خدا آگاہ ہے مانند سیماب
تیری فرقت میں فرش رنج وغم پر — پڑی رہتی ہوں ہر دم تلملاتی
ہوئی ہے مجھ کو صحبت رنج وغم سے — بہا کرتے ہیں آنسو چشم نم سے
ہوئی ہوں یاں تلک میں زار ولاغر — ہوا ہے جسم شکل تار بستر
ہوا ہے بار دوش اپنا مجھے سر — ہوئی ہے اب تو اپنی جان دوبھر
یہاں تک جوش سودے کی ہے کثرت — کہ اپنے سایہ سے آتی ہے وحشت
ہوا ہے گھر مجھے زنداں سے بدتر — دہان مار ہے گھر کا مجھے در
زیادہ دم بدم ہوتا ہے سودا — نہیں مجھ کو خبر کچھ اپنی اصلا
بلائے ہجر میں جب سے پھنسی ہوں — میں انگاروں کے اوپر لوٹتی ہوں
پڑی ہوں نیم جاں فرقت میں تیری — ہوئی ہوں ناتواں فرقت میں تیری
تڑپتا ہے مرے پہلو میں یہ دل — ہر اک ساعت برنگ مرغ بسمل
تپ فرقت ستاتی ہے بہت اب — نہیں ملتی مجھے راحت کسی ڈھب
الجھتا ہے مرا دم خود بخود اب — ملائے گا مجھے تم سے خدا کب
دعا ہے ہر گھڑی میری خدا سے — تمہاری شکل پھر مجھ کو دکھا دے

ہوئی ہے تم سے جس آن سے جدائی مدد سے جان ہوئی ساری خدائی
نہیں لگتا کسی جا پر مرا جی تڑپتی پھرتی ہوں مانندِ وحشی
خدا آگاہ ہے یہ بدرِ عالم تمہاری یاد میں رہتی ہے ہر دم
ہوئی شدت جنوں کی جبکہ مجھ کو پڑھا تب اس غزل کو میں نے درد

غزل

خدا لائے یہاں سلطانِ عالم! تمہیں با عزو شاں سلطانِ عالم!
تمہاری یاد کرتے ہیں شب و روز حسینانِ جہاں سلطانِ عالم!
کرے سرسبز باغِ آرزو کو بہارِ جاوداں سلطانِ عالم!
ہر اک گلرو یہی کہتے ہیں ہر دم گلِ باغِ جہاں سلطانِ عالم!
پڑی ہوں بسترِ غم پر یہاں میں گئے جب سے وہاں سلطانِ عالم!
تمہاری بزمِ عشرت یاد کر کے ہوں روتی شمع ساں سلطانِ عالم!
غم و اندوہ و رنج و درد و صدمہ مرے ہیں مہرباں سلطانِ عالم!
تمہارے ہجر میں میں زار و لاغر پڑی ہوں نیم جاں سلطانِ عالم!
یہ کیسی سر پہ میرے آگئی ہے بلا اک ناگہاں سلطانِ عالم!
ہیں جلتے آتشِ فرقت سے ہر دم ہمارے استخواں سلطانِ عالم!
کہوں کس سے میں حالِ دل کو اپنے نہیں کوئی یہاں سلطانِ عالم!
نہ روؤں کس طرح میں شب و روز ہیں آنکھوں سے نہاں سلطانِ عالم!
حباب آسا ہوں بس بحرِ جہاں میں کوئی دم میہماں سلطانِ عالم!
کیا غربال تیرِ ہجر نے دل مرے ابرو کماں سلطانِ عالم!
مریضِ ہجر کی اب کوئی دم میں نکلتی ہے یہ جاں سلطانِ عالم!
اب اپنی بدرِ عالم کو یہاں سے بلا لیجے وہاں سلطانِ عالم!

رجب ۱۲۸۵ ہجری کے لکھے ہوئے رقعہ میں ایک غزل ہے

شکل دکھلاؤ بس اب بہرِ خدا اختر! ہوں بہت رنجِ جدائی سے مکدر اختر!
رات دن تیرے تصور میں بسر کرتی ہوں اس دلِ زار کو سمجھاؤں میں کیونکر اختر!
پھٹ گیا آبِ خورش مثلِ سحاب ہوں گا کیا کہوں تجھ سو کہ جیتی ہوں میں کیونکر اختر!
تجھ سلیمانِ جہاں سے جو محبت ہے مجھے طائرِ دل کو بناتی ہوں کبوتر اختر!
سینہ بے ہو کر چمن دہر میں بارنج و الم یاد کرتے ہیں تجھے سرو صنوبر اختر!
سانپ سے سینہ پہ مرے لہراتے ہیں یاد آتی ہیں جو زلفیں تیری پیکر اختر!
ناتوانی نے کیا جسم کو ایسا لاغر ضعف ہوتے ہیں ہر گام پہ چکر اختر!
بدرِ عالم یہ دعا کرتی ہے ہر صبح و مسا نورِ دیدار سے کر دل کو منور اختر!

ایک اور غزل ایک رقعہ میں لکھی جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

شکل اپنی دکھاؤ جانِ عالم! بس اب نہ ستاؤ جانِ عالم!
مجھ زار و حزیں کے جان و دل پر صدمہ ہے اب آؤ جانِ عالم!
دل پھنکتا ہے آتشِ الم سے تم آکے بجھاؤ جانِ عالم!
راحت جو مری تمہیں ہو منظور مجھ کو بھی بلاؤ جانِ عالم!
فرقت کے الم سے رو رہی ہوں اب تم نہ رلاؤ جانِ عالم!
تم میری محبت و ولا کو دل سے نہ بھلاؤ جانِ عالم!
غم کھاتی ہوں خونِ دل ہوں پیتی یہ شغل چھڑاؤ جانِ عالم!
ہر دم ہے یہ ذکرِ بدرِ عالم
للہ اب آؤ جانِ عالم!

ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ میں ایک منظوم خط لکھا گیا ہے تمہید میں دعائیہ اشعار لکھ کر یوں ابتدا کی ہے

پس از شوقِ وصالِ جانِ عالم بیاں کرتی ہوں اپنا حالِ پرغم
تپِ فرقت سے یہ بیتاب ہے دل مثالِ پارۂ سیماب ہے دل

اسی طرح کے چند اشعار لکھ کر لکھتی ہیں۔

خداوندا کبھی پھر وصل ہوگا مبدل وصل کیا یہ فصل ہوگا
کبھی دل محوِ زیب و زین ہوگا کبھی اس جان کو پھر چین ہوگا
کبھی آئیں گے یاں سلطانِ عالم میں پھر دیکھوں گی شکلِ جانِ عالم
کبھی یہ دور دل کا داغ ہوگا میسر پھر وہ قیصر باغ ہوگا
کبھی پھر عیش کا ساماں ہوگا کبھی پورا میرا ارماں ہوگا
کبھی نکلے گی میرے دل کی حسرت خوشی کی پھر کبھی دیکھوں گی صورت
ستاتا ہے بہت دردِ جدائی دوہائی ہے خداوندا دوہائی

ایسے ہی فراقیہ شعر لکھ کر اس طرح رقعہ ختم کرتی ہیں۔

اسی فقرے کے اوپر خاتمہ ہے کہ خاکی بدرِ عالم راقمہ ہے

اور ایک منظوم رقعہ بڑی دھوم دھام سے لکھتی ہیں۔

معدنِ الفت مسیحائے زماں جانِ عالم جانِ عالم جانِ عالم!
تا صد و سی سال تم قائم رہو شیرِ حق حامی رہیں اور مہرباں!
داستانِ شوق کیا کیجئے رقم مختصر بھی ہو نہیں سکتی بیاں!
ہے تپِ فرقت سے بھڑکی دل میں آگ آہ کا سینہ سے اٹھتا ہے دھواں!

اسی طرح اپنے ہجر کے صدمات لکھ کر اپنے قسمت اور تنگدستی کا

بھی تذکرہ بڑے مزے سے کیا ہے۔

کس قدر دشوار ہے آزارِ ہجر   قرض کا بھی سر پہ ہے بارِ گراں

تین ہزار اور ایک سو کی قرضدار   ہو گئی ہوں اپنی ڈگری لے جانِ جاں

اطلاع کر دیا افشائے حال   ورنہ تھا یہ راز سینہ میں نہاں

آخر میں اس دعا پر رقعہ ختم ہوتا ہے۔

یا الٰہی وصلِ اختر ہو نصیب   ہو پذیر اب دعائے عاشقاں

جو کہیں یوسف کو زنداں سے نجات   آرزومندوں کا دل ہو شادماں

بدرِ عالم سے نہ ہونا بے خبر   اے میرے اختر میرے بختِ جواں

اور ایک خط بڑے مزے سے نظم ہوا ہے

اے سرورِ من ایا باغِ مراد   آب بخشِ نہالِ باغِ مراد

افسرِ افسرانِ کشورِ حسن   خسروِ خسروانِ کشورِ حسن

نگہت افزائے گیسوئے قدرت   جوہرِ تیغِ ابروئے قدرت

نیرِ آرزو منور باد   ظلِ الطاف سایہ گستر باد

بعدِ اظہارِ شوقِ بوس و کنار   شرح کرتی ہوں حالتِ دلِ زار

لاکھ میں آپ کو سنبھالتی ہوں   ہر طرح دردِ ہجر پالتی ہوں

خود بخود دم نکلا نکلتا ہے   دل کو جیسے کوئی مسلتا ہے

سوزِ غم سے ہوا ہے دل تفتہ   رفتہ رفتہ ہوا ز خود رفتہ

گاہ اٹھتی ہوں گاہ گرتی ہوں   چاہ میں باولی سی پھرتی ہوں

ہائے تقدیر کا پڑا یہ بجوگ   جان کو لگ گیا کہاں کا روگ

لالۂ باغ میں تو چار ہیں داغ   ایک دل میں میرے ہزار ہیں داغ

دن گزر کر جو شام ہوتی ہے   ایک منزل تمام ہوتی ہے

کشورِ دل خراب ہے پیارے   رنج اب بے حساب ہے پیارے

مدتوں سے مدام رونا ہے   صبح رونا ہے شام رونا ہے

اب یہ چوتھا برس ہوا ہے شروع   نیرِ وصل نے کیا نہ طلوع

ایک دو میں سے حال ہو جائے   وصل ہو یا وصال ہو جائے

تم سے یہ التجا ہے جانِ جہاں   کوئی صورت تو زیست کی ہو عیاں

واقعی کم ملال ہوتا ہے   خط بھی نصف الوصال ہوتا ہے

جانِ عالم پئے رحیم و رؤف   آمد و شد نہ خط کی ہو موقوف

ہجر سے جان درد ناک ہے اب   زندگی پر سبیل ڈاک ہے اب

دردِ دل جس قدر لکھوں کم ہے   راقمہ خط کی بدر عالم ہے

مہر محرم ۱۲۷۱ھ کو ایک منظوم رقعہ لکھا گیا ہے جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

ہمارے قدر دان سلطان عالم!   سلیمانِ زماں سلطانِ عالم!

سپہرِ مہر و الفت کے ستارے   تم ہی ہو اخترِ طالع ہمارے

میرے مالک میرے سلطانِ غازی   میرے وارث خداوندِ مجازی

اس کے بعد جانِ عالم کا خط وصول ہونے اور اس خط کے ذریعہ سے جانِ عالم کی رہائی کی خبر ملنے اور جہانگیری اور روپوں کی وصولی کا تذکرہ کیا ہے

بدرِ عالم صاحبہ کے کلام میں نہ صرف روانی سلاست اور تند ہے بلکہ روز مرّہ درست محاورہ چست اور زبان حد درجہ صاف ہے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے لئے مذکر ضمیر استعمال نہیں کرتی ہیں بعض شعر نہایت عمدہ بلکہ لاجواب ہیں ان منظوم خطوط میں نثر کے ساتھ ساتھ دو دو چار چار شعر بھی لکھ دئے ہیں۔ جن میں سے چند نقل کئے جاتے ہیں۔

تمہارے خط کو جب دیکھا تنِ مردہ میں جاں آئی   ہوا ثابت کہ ہے تحریر میں اس کے مسیحائی

تو نے ہمیں بے گناہ مارا   بیساختہ دل یہی پکارا

سینہ میں جگر نہیں سنبھلتا   ہاتھوں سے ہے کوئی دل کو ملتا

ہر دم ہے جگر کا داغ روشن   قندیل میں ہے چراغ روشن

سوزاں ہوں مگر دھواں نہیں ہے   گویا منہ میں زباں نہیں ہے

ایسا جینا کسے ہے منظور   مرتی ہوں تمہاری جان سے دور

جان تک اس کی محبت میں گنواں بیٹھے ہیں
ہاتھ جینے سے سر دست اٹھا بیٹھے ہیں

اس مجموعہ کے خاتمہ پر حبیب الدین احمد ردولی نے عربی میں مختصر خاتمہ لکھ کر ۱۶ ر جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ ہجری لکھا ہے اس طرح یہ مجموعہ پونیا سائز کے ۵۵ صفحات پر ختم ہوا ہے اور ۹ سطرہ اسطری ہے۔

انشاء اللہ آیندہ جانِ عالم کی اور محلات کی شاعری کے نمونے پیش کئے جائیں گے۔ فقط۔

سید تمکین کاظمی

کلوپیٹرا کی ایک رات

کلوپیٹرا چند سہیلیوں کے ساتھ دریائے نیل کے کنارے اپنے قصر میں چپ سادھے بیٹھی ہے۔ انٹنی مصر میں موجود نہیں، اس لئے زندگی اس کے لئے دو بھر ہو رہی ہے۔ اس وقت اُسے یونان، اپنا وطن یاد آ رہا ہے اور وہ مصر اور اُس کی ہر چیز سے متنفر سی ہو رہی ہے۔ کچھ سوچ کر وہ اپنے دل کی بات اپنی سب سے بڑی سہیلی سے یوں کہتی ہے:

شارمیان! اگر میری زندگی میں کوئی دلچسپی ہوتی، محبت، آہ والہانہ محبت! تو پھر مجھے مصر کا یہ ویرانہ بھی اپنے یونان کی طرح پیارا معلوم ہوتا جس کے عاج کے بت، براق معبد، مصفا چشمے اور پُر فضا گلزار ہر وقت میری نگاہوں میں رہتے ہیں کاش میری زندگی میں کوئی دلچسپی پیدا ہو کوئی جنوں خیز واقعہ پیش آئے۔ مگر کون ایک ملکہ سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے!

کلوپیٹرا انہی خیالات میں غرق ہے کہ ہوا کو چیرتا، سائیں سائیں کرتا ہوا ایک تیر کھڑکی کے راستے سے اندر آتا ہے اور زناٹے کے ساتھ دیوار کے چوبی حصے میں پیوست ہو کر تھرتھرانے لگتا ہے۔ تیر کے ساتھ ایک رقعہ بندھا ہے جس پر یہ الفاظ لکھے ہیں: "مجھے تم سے محبت ہے"۔ یہ وہی چیز ہے جس کے لئے اس وقت کلوپیٹرا کا دل بے قرار ہے۔

تیرانداز جس نے ملکہ کی محبت کے جنون میں جان کی بازی لگائی ہے ایک نوجوان شکاری میامون ہے جس کا مردانہ حسن کسی دیوتا کے تانبے سے ڈھلے ہوئے مجسمے کی یاد دلاتا ہے تیر چلانے کے بعد وہ غائب ہو جاتا ہے لیکن محض اس لئے کہ شاہی حمام میں پانی پہنچانے کی راج بہا میں غوطہ لگا کر باغ میں جا نکلے اور کسی درخت کے پتوں میں چھپ جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کلوپیٹرا جس کے بالوں میں ایک پن دیوی کی طرح کائی کے ریشے اور کنول کے پھول گندھے ہیں تیرنے کے تالاب سے برآمد ہونے لگتی ہے تو دفعتہً اس کی نگاہیں دو آتشیں آنکھوں سے دو چار ہوتی ہیں۔ جو درختوں کے پتوں کے درمیان اس پر ٹکٹکی جمائے ہوئے ہیں۔ کلوپیٹرا کی ہلکی سی چیخ سن کر اس کے غلام جھپٹتے ہوئے آتے ہیں۔ اور اس بے باک نامحرم کو گرفتار کر کے طرفۃ العین میں ملکہ کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں کلوپیٹرا کے اس سوال کے جواب میں کہ کیوں نہ فوراً قتل کر دیئے جاؤ وہ یہی چند الفاظ گنگناتا ہے۔ "مجھے تم سے محبت ہے"۔

کلوپیٹرا ہکا بکا سی رہ جاتی ہے۔ تیر کے ساتھ رقعہ باندھ کر بھیجنے والا نوجوان یہی ہے۔ وہ دفعتہً اپنے دل میں ایک فیصلہ کرتی ہے۔ نوجوان شکاری رات بھر میرے پاس رہے گا۔ لیکن صبح اسے موت کے گھاٹ اترنا ہو گا۔

نوجوان جو خوشی سے پھولا نہیں سماتا، محل میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں حسب معمول ایک عظیم الشان ضیافت کا سامان ہو رہا ہے۔

رات گزر جاتی ہے اور پو پھٹنے کے ساتھ ہی ایک خوفناک گھڑی شکاری کے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ ایک غلام اُسے سینگ کا ایک پیالہ پیش کرتا ہے جس میں ابلتا اور پھنکارتا ہوا ایک زہر ہلاہل بھرا ہے۔

کلوپیٹرا کا رنگ اس وقت زرد ہے۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ شکاری کے بازو پر رکھا ہے جس کی جرأت دیکھ کر ملکہ کا جذبہ رحم برانگیختہ ہو رہا ہے اور وہ یہ کہا ہی چاہتی ہے کہ ابھی زندہ رہ اور مجھ سے محبت کر کہ ایوان سے باہر نرسنگے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ مارک انٹنی کی واپسی کا نقیب ہے۔ کلوپیٹرا اپنی انگلیاں نوجوان کے بازو سے اٹھا لیتی ہے وہ پیالہ لبوں سے لگا کر غٹا غٹ چڑھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی لاش یوں زمین پر گر جاتی ہے گویا اس پر بجلی آ پڑی ہے۔

انٹنی نمودار ہوتے ہی کہتا ہے "میری پیاری ملکہ! معلوم ہوتا ہے میں وقت گزرنے کے بعد آیا ہوں۔ ضیافت ختم ہو چکی ہے مگر فرش پر یہ لاش کیسی ہے؟"

کلوپیٹرا مسکرا کر جواب دیتی ہے "کچھ نہیں آقا! میں ایک نئے زہر کی تلاش کر رہی تھی آپ تشریف رکھئے اور ذرا ان یونانی بہروپیوں سے اپنا دل بہلائیے!"

(تلخیص و ترجمہ)

حامد علی خاں

خوابِ رنگین

(مکتوب جو ایک خودکشی کرنے والے کی نعش کے ساتھ ملا)

محترمہ!

آپ کا خیال ہے۔ کہ میں اس موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں چرب زبانی سے کام لے رہا ہوں۔ یا بالکل جھوٹ بول رہا ہوں۔ آپ یقین نہیں کر سکتیں۔ کہ دنیا میں ایک ایسا شخص بھی ہے۔ جو تمام عرصۂ حیات میں کبھی مبتلائے محبت نہیں ہوا۔ تاہم میں ایک انسان ہونے کی حیثیت سے آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

اس کی وجہ ہے ——— درحقیقت میں خود بھی نہیں جانتا۔ میں نے کبھی اپنے دل کو اپنی عقل و دانش کے مقابلہ میں تیز رفتاری کا موقع نہیں دیا اور نہ کبھی ایک عورت کی محبت میں اس جنون کی حد تک گرویدہ ہوا کہ اپنی خودی کو اس کے حلقۂ دام میں محصور کر لوں۔ آپ کی صنف کے کسی فرد کو اتنی قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ کہ اس نے کبھی مجھ کو رلایا ہو یا مبتلائے رنج و آلام کیا ہو میں نہ ان راتوں سے آشنا رہا۔ جن کی بیداریوں میں اختر شماری کی جاتی ہے۔ اور نہ اس نمودِ سحر سے واقف ہوں۔ جس کی خوشگوار فضا میں محرومِ لذّتِ کام و دہن رہنا پڑتا ہے۔ امید و بیم میرے لئے الفاظ بے معنی ہیں۔

کیونکہ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔

اکثر میں خود متعجب ہوتا ہوں کہ آخر میرے ساتھ ایسا اتفاق کیوں نہیں ہوا۔ اس کا تسلی بخش جواب صرف ایک ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ میں عورت کی ذہنیت سمجھنے میں اتنا اچھا نقّاد ہو گیا ہوں۔ کہ کسی کی شخصیت سے اثر پذیر ہو کر مرعوب نہیں ہو سکتا۔ محترمہ! میری اس صاف گوئی پر اظہارِ برہمی نہ کریں۔ . . . . . . آپ جانتی ہیں۔ کہ ہر متنفس کی ایک مادی شخصیت ہوتی ہے۔ اور دوسری رُوحانی۔ . . . . اور لازمی طور پر آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی سے صادق اور پرخلوص محبت کرنے کے لئے محبوب کی ذات میں ان دونوں شخصیتوں کا باہمی اجتماع اور ہم آہنگ ہونا شد ضروری ہے۔ لیکن فی زمانہ یہ حسنِ امتزاج شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات آپ دیکھیں گی۔ کہ ایک عورت ظاہری اعتبار سے پیکرِ حسن و جمال اور مجسمۂ شباب و رعنائی ہے۔ لیکن بلحاظِ فطرت و ذہنیت ایک قابلِ نفرین دخترِ اہرمن۔ اور کبھی یہ بھی مشاہدہ میں آئے گا۔ کہ ایک عورت اخلاقِ برگزیدہ و اوصافِ حمیدہ کی تقدس مآب دیوی کہلائے جانے کے لائق ہے۔ لیکن جسمانی موزونیت کے لحاظ سے اس کی کوئی خوبی کسی کو اپنی طرف مائل کر لینے کے لئے مقناطیسی کشش نہیں رکھتی۔

محبت کرنے کے لئے مرد کو اندھا ہو جانا ضروری ہے۔ اسے چاہئے کہ صرف جذبۂ الوہیت کے ساتھ اندھا دھند محبت کے جال میں جا گرے۔ اور محبوبہ کے نقائص و عیوب کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لے۔ وہ اس کے ساتھ دَورانِ گفتگو میں سنجیدہ موضوع کو زیرِ بحث نہ لائے۔ وہ اس کے نازک لبوں پر صرف مہرِ الفت ثبت کرے۔ اور اسے اپنا بنا لے۔ محبوبہ کی ہرزہ کاریاں اور خیالاتِ باطلہ اس کی نظر میں ایسے معلوم ہوں۔ گویا یہی شانِ حُسن اور اقتضائے جمال ہیں۔ خیر! میں اس کورچشمی کا طالب نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ انسان سے لے کر کائنات کے ذرّوں تک ہر شے کو حقائق کی روشنی میں دیکھوں۔ نہ کہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حسین و جمیل لڑکیاں ہی خلافِ توقع بے مہر و وفا ثابت ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے سادہ لوح ہستیاں کبھی مایوس نہیں کرتیں۔ کیونکہ ان سے کسی چیز کی توقع ہی نہیں کی جاتی۔

تاہم عرصۂ دراز ہوا۔ مجھے یقین واثق ہو گیا تھا کہ میں گرفتارِ محبت ہوں۔ صرف ایک ساعت کے لئے۔ محض ایک خوشگوار رات میں۔ لیکن سب

سے زیادہ فضا اور ماحول میری گرفتاری میں ممد و معاون تھا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ واقعات کی تفصیل سُن کر آپ بھی اس ضمن میں میری ہی ہم خیال ہو جائیں گی۔ اچھا سنیئے۔

ایک روز شام کے وقت ایک حسین دوشیزہ سے میری ملاقات ہوئی۔ عالی حوصلگی اور جدت طرازی اس کی فطرت میں داخل تھی۔ لہٰذا اس نے تجویز پیش کی کہ ہم دونوں تمام شب دریا کی پرسکون سطح پر ایک سفینہ کے آغوش میں بسر کریں۔ اگر مجھ سے پوچھا جاتا۔ تو میں گھر کی چار دیواری میں شب بیداری کو ترجیح دیتا۔ مجھے یہ زیادہ مرغوب ہے۔ تاہم محض دل بستگی کے طور پر میں نے سفینہ میں بیٹھنے کی دعوت قبول کر لی۔

جون کا مہینہ۔ تعویذی شکن سہانی رات۔ خوشگوار چھٹکی ہوئی چاندنی۔ بادِ صرصر کے لطیف جھونکے۔ ہم تقریباً دس بجے روانہ ہوئے۔ میں کسی قدر کبیدہ خاطر تھا۔ لیکن میری شریک سفر جوش مسرت میں جھوم رہی تھی میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پتوار اٹھائیے۔ اور روانگی عمل میں آ گئی۔

دل فریب نظارہ تھا۔ دریا میں کہیں خشکی کے ٹیلے ابھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان پر درختوں کی ہریاول اور ان میں قمری و عنادل کے روح پرور چہچہے۔ پانی کی روانی آہستہ آہستہ ہم کو بہاتی رہی۔ ساحل کے قریب دلدل میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ہوا مدھم سروں کا راگ گاتی معلوم ہوتی تھی . . . سہانی رات کی لطیف اور خوشگوار رعنائیوں کا اثر طاری ہوتا گیا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ صرف ایسے وقت میں زندہ رہنا حقیقی زندگی کے مترادف ہے۔ اور وہ بھی ایک نوخیز۔ پرشباب حسین و جمیل دوشیزہ کے پہلو میں۔

نقرئی چاندنی کی مستی و سرشاری اور اپنی ہم جلیس کے انتہائی قرب کے احساس سے میری رگوں میں تلاطم جذبات اور جوشش ترنگ کی سیمابی کیفیت پیدا ہو گئی۔

"ہم کو اسی طرح بہتے رہنا چاہیئے۔" اس نے کہا۔ "آؤ۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور پتوار ہاتھ سے رکھ دو۔"

میں نے ارشاد کی تعمیل کی۔ اس وقت میں اس کے ہر حکم کو دائرہ عمل میں لانے کے لئے تیار تھا۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ اشعار سناؤ۔"

میں نے حیل و حجت کرنی چاہی۔ لیکن اس کے اصرار نے مجبور کر دیا۔ ظاہر ہے۔ کہ وہ ہر اس شے کو حاصل کرنے پر تلی ہوئی تھی جس کے ذریعہ ہیجانِ جذبات ممکن ہو۔۔۔ سہانی رات۔۔۔ نقرئی چاندنی۔ پرسکون سطحِ آب۔ فضائے شعر و سخن۔ اور ایک جوان مرد اس کے پہلو میں محض ستانے کی غرض سے میں نے غلط سروں میں گانا شروع کر دیا۔ اور اشعار بھی فارسی کے منتخب کئے۔ جن کو سمجھنا اس کے لئے کسی قدر دشوار تھا۔ لیکن مجھے سخت تعجب ہوا۔ جب میری بیہودگی پر ملامت کرنے کی بجائے وہ فہیمانہ طور پر اپنے سر کو جنبش دیتی رہی۔ گویا خوب سمجھ کر داد دے رہی ہے۔ اور ساتھ ہی دبی زبان سے کہا۔

"یہ الفاظ صداقت سے کس قدر لبریز ہیں۔"

میں ورطۂ استعجاب میں غرق تھا۔ حقیقتاً اتنی سمجھدار عورتیں کہاں ہیں۔ ہمارا چھوٹا سفینہ پانی پر چھائے ہوئے ساحلی درختوں کے سایہ میں گزر رہا تھا۔ میں نے اپنی ہم جلیس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنے لبوں کو اس کی پیشانی تک پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن فوری غصہ کے ساتھ اس نے جواب دیا۔

"بس مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تم ہر ایک چیز میں بے لطفی پیدا کر رہے ہو۔"

میں نے کوشش کی کہ کسی طرح اس کو مناؤں۔ لیکن اُس نے علیحدہ ہو جانے کے لئے بہت جد و جہد کی۔ اور درخت کی ایک شاخ کو اس قدر گھبراہٹ کے ساتھ پکڑا کہ مجھے گمان ہوا۔ کہ بس اب سفینہ الٹ جائے گا۔ اور ہم دونو پانی میں جا گریں گے۔ اس نے کہا۔

"اگر تم پانی میں گر پڑے تو یہ سزا تمہارے لئے مناسب ہوگی۔ مرد کس قدر اجڈ ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے ہیں۔ کہ شکستِ خواب کر کے دوسری ہستی کو بیدار کر دیا جائے۔۔۔ اور ہاں تم تو ابھی ابھی مجھ کو کچھ اشعار سنا رہے تھے۔"

اس نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میں خاموش تھا۔

پھر اس نے کہا۔ "ہمیں کچھ اور دُور چلنا چاہیئے۔"

میں نے خیال کرنا شروع کیا کہ واقعات غیر موزوں سے ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ فکر بھی دامن گیر ہوئی۔ کہ تمام رات اسی طرح ضائع ہو گی۔ میری ہم جلیس نے مجھ سے کہا۔

"میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"

"بہتر۔" میں نے جواب دیا۔ "بشرطیکہ میں اسے پورا کر سکوں۔"

"اچھا وعدہ کرو کہ تم بالکل خاموش اور نیک بنے رہو گے۔ اگر میں

تم کو اجازت دوں ...."

"کیا؟"

"اگر میں تم کو اجازت دوں کہ میرے قریب پہلو میں لیٹ جاؤ —
سفینہ کے زیریں حصہ میں — اور میری طرح صرف آسمان پر چمکنے والے
ستاروں کا مشاہدہ کرتے رہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ صورتِ حال مضحکہ خیز ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن
پھر بھی جواب دیا۔

"بہت بہتر۔ جو آپ کی مرضی ہو۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے" اس نے وضاحت سے کہا۔ "تم کو ہرگز
اجازت نہیں ہوگی — مجھے چھونے کی — مجھے پیار کرنے کی .. یا .. یا
... یا مجھے چھیڑنے کی — مجھے ستانے کی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"اور اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی۔ تو میں سفینہ کو اُلٹ دوں گی۔"

کس قدر واہیات بات تھی۔ ہم قریب قریب لیٹے رہے۔ سفینہ
کی خفیف جنبشوں کا ترنم اور وہ نغمۂ حیات جو ساحل کی طرف سے مدہم سروں
میں سنائی دے رہا تھا۔ ہمارے لئے لوری بن کر رہ گیا۔ اور عین اس لمحہ —
اپنی تمام زندگی میں پہلی مرتبہ — کسی سے محبت کرنے کی آرزو میرے دل میں
پیدا ہوگئی۔ میں نے چاہا کہ اپنے وجودِ مطلق کے اسرار و رموز کو کسی پر منکشف
کر دوں۔ اور بطورِ خراج اسے پیش کر دوں — اپنے تخئیل کا پرتو — اپنے
جسم کی موزونیت — اپنے قلب کی پُرخلوص تپش — اپنی حیات کی سرمستیاں —
اور ہر وہ چیز جو مجھ سے متعلق ہو۔

اچانک میری ہم جلیس نے خواب کی سی دنیا میں ایک ایسی آواز
میں جو بہت دور سے آ رہی ہو۔ مدہم سروں میں کہا۔

"ہم کہاں ہیں؟ کدھر جا رہے ہیں .... معلوم ہوتا ہے۔ ہم کرۂ
ارض کی کشش ثقل سے نکل چکے ہیں۔ سرحدِ ادراک سے بھی پرے ہیں۔ کتنا
پُرلطف سماں ہے۔ آہ! کاش! تم مجھ سے تھوڑی ہی سی محبت کرتے۔"

میرے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ اور میں کوئی
جواب نہ دے سکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ میں نے
خیال کیا کہ ایسا ہوگیا ہے۔ پھر بھی میرے اندر کوئی رقیق جذبہ بیدار نہیں ہوا
میں نے صرف محسوس کیا کہ میں کامل سکون کی دنیا میں ہوں — اس مقام پر —
اس حسینہ کے پہلو میں — اور بس یہ احساس ہی میرے لئے کافی تھا۔

اسی طرح ہم بہت دیر تک لیٹے رہے — بہت دیر تک —
جنبش کئے بغیر — ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ میں ہاتھ لے لیا — دلنوازانہ
طریقہ پر — خاموشی کے ساتھ — کوئی نامعلوم قوت ہم پر چھا دی تھی —
غیر محسوس طریقہ پر۔ ہمارے درمیان ایک رشتہ قائم ہوگیا — پُراسرار —
الوہیانہ — تعجب انگیز — آخر وہ کیا تھا — شاید اسی کا نام محبت ہو۔

سکوتِ شب کا طلسم صبحِ کاذب کی نمود سے ٹوٹ گیا۔ تقریباً
تین بجے کا عمل ہوگا۔ سفینہ کسی شئے سے ٹکرایا — وہ ایک چھوٹا سا جزیرہ
تھا۔ میں بحرِ تحیر میں غرق ہوگیا۔ آسمان کی تمام سطح سُرخ گلابی اور
عبیر آلود ہونے لگی۔ بادل کے شگافوں میں سے نورِ سحر پھوٹنے لگا۔ دریا کا
پانی خونابہ بن گیا۔ اور اس کے دونو ساحل آتش گرفتہ معلوم ہونے لگے۔

میں اپنی ہم جلیس کی طرف جُھک گیا۔ تاکہ اس دلفریب منظرِ
نور و ضیا سے لطف اندوزی حاصل کرنے میں اسے بھی شریک کروں لیکن
مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ بلکہ میں خود اس کے پرتو جمال کی آئینہ سامانی میں
محو ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ وہ بھی شفق کی طرح گل تمثال تھی — اس
کے رخسار — اس کے لب — اس کا تبسم — اس کا لباس — وہ
پھولوں کی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ اور میں اس وقت میں اسے صبح کی دیوی سمجھنے لگا۔

وہ نزاکت کے ساتھ اٹھی اور اپنے لب مجھے پیش کر دیئے میں اس کی طرف
بڑھا۔ پیش قدمی اور انبساط کے کیف ارتعاش میں ڈوبا ہوا۔ گویا میں ایک آستانۂ
قدوسی کا بوسہ لینے والا تھا۔ ایک ایسے خواب کا بوسہ لینے والا جو پیکرِ نسائی میں تبدیل
ہوگیا ہو ..... اس نے مجھ سے کہا ....

"آہ! میرے محبوب! تمہارے ریشمی بالوں میں ایک کیڑا الجھ رہا ہے۔"

شاید اس کے تبسم کی یہی وجہ تھی۔ میں نے اپنے سر پر ایک ضرب
سی محسوس کی۔ اور ایسا معلوم ہوا۔ گویا نمودِ سحر سے قبل ہی فضا کی تمام
رعنائیاں دُور ہوگئی ہیں۔ اور طلسمِ خواب کے ٹوٹتے ہی میں اس دنیائے
آب و گل میں آگیا ہوں۔ اور بس۔

یہ محض ابلہی اور طفل تسلی ہے۔ جو چاہو سمجھو۔ لیکن یہی وہ معمولی
سی بات ہے۔ جو انسان کو دل برداشتہ کر دیتی ہے۔ اور سب سے زیادہ
دلربا ہستی سے متنفر۔

بہرحال اس دن سے آج تک میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔

طاہرہ دیوی شیرازی (موپساں)

ساون میں

ساون بیتا جائے سجنی! پریتم گھر نہیں آئے
کیسے کاٹوں رات برہ کی ناگن بن بن کھائے

ٹھنڈی ٹھنڈی پُروا سن کے بادل گھر گھر چھائے
ننھی ننھی بوندیں ٹپکیں اور بجلی لہرائے
یاد انھوں کی میرے دل کو رہ رہ کر تڑپائے
ساون بیتا جائے سجنی! پریتم گھر نہیں آئے

مور پپیہا۔ جھینگر۔ سارس مل کر شور مچاویں
ناچیں۔ کودیں۔ کریں کلولیں پھولے نہیں سماویں
راگ رنگ اور کھیل کود کی بات نہ من کو بھائے
ساون بیتا جائے سجنی! پریتم گھر نہیں آئے

کنج کنج میں پڑے ہیں جھولے مل مل سکھیاں جھولیں
پینگ بڑھائیں تان اڑائیں رہس رہس کر پھولیں
ہنسی خوشی کی بات پریمی من کو اور جلائے
ساون بیتا جائے سجنی! پریتم گھر نہیں آئے

اندرجیت شرما

رُوم کا آخری جانباز

تاریخ روما کا ایک عبرت ناک ورق

رُوم کی ابتدائی ترقی کے زمانے میں عوام کی جانب سے جانباز سرداروں کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ ان سرداروں کو ہمیشہ رائے عامہ کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے قبضے میں نہایت وسیع اختیارات ہوتے تھے۔ مثلاً قوانین کو جاری کرنا۔ صلح و جنگ کا اعلان کرنا۔ اور ملکی نظم و نسق کو قابو میں رکھنا انہیں کے اختیار میں تھا۔ اور ان وجوہ سے ان کی حیثیت بعض اوقات خود مختار بادشاہوں سے بھی بڑھی چڑھی ہوتی تھی۔

صدیوں کے انقلابات میں "لیڈر" یا سردار کی شخصیت کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ روم کے مطلق العنان و متکبر شہنشاہوں کے خاتمے کے بعد جب روم کی سطوت اور جبروت رخصت ہوئی۔ تو ملک میں ہر طرف طوائف الملکی اور لامرکزیت کا دَور دَورہ ہو گیا۔ ملک میں ہر وقت خانہ جنگیاں برپا رہتیں جس سے بیرونی دشمنوں کے خطرات بہت بڑھ گئے تھے۔ اسی لئے ملک کا امن اور اس کی آسودہ حالی شر و فساد سے بدل گئے۔

چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ جن پر جابر رؤسا اور امرا قابض ہو گئے۔ جن کے درمیان ہمیشہ لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک کی حالت بدتر ہوتی چلی گئی ان ہی مطلق العنان رؤسا میں "آرسنی" اور "کالونا" نامی دو سربرآوردہ خاندان بھی تھے۔ جن کی لڑائیاں ضرب المثل ہو گئی تھیں۔ آپس میں یہ ہمیشہ خونریز معرکوں میں مبتلا رہتے اور یہ سردار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر روم کے دو زبردست محلوں میں جن کے گرد مضبوط فصیلیں اور خندقیں تھیں۔ یہ لوگ ہمیشہ محصور رہتے۔ اور جب کبھی موقع ملتا ایک خاندان کے لوگ دوسرے خاندان کے جتنے آدمی مل سکتے انہیں ختم کر دیتے۔ تجارت کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ دن میں دکان کھولنا گویا لٹ جانے کے مترادف تھا۔ عورتوں اور بچوں کی جانیں اچانک حملوں اور بدمعاشوں کی پکڑ دھکڑ سے معرضِ خطر میں تھیں۔

حالات اس قدر مایوس کُن تھے۔ کہ کسی زبردست مصلح کے بغیر روم کا سنبھلنا ناممکن تھا۔ حتیٰ کہ پوپ کی عظمت ٹھکرا دی گئی تھی اور اس نے اپنی جان کے خوف سے شہر "ایوگنان" میں پناہ لی تھی۔ اسی پر آشوب زمانے میں ایک نوجوان نے ملک کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ جس کے دل میں خلوص۔ ایثار۔ راستی اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔ اُس نے دل میں اپنی بھائیوں کی بیکسی اور افلاس کو دور کرنے اور انہیں گذشتہ دَور کی ترقی اور آسودہ حالی پر لے جانے کی ٹھانی۔ اس کے اس خیال کو اسکے ننھے بھائی کے ناگہانی قتل سے مزید تقویت پہنچی۔ اس کا چھوٹا بھائی ایک دن اپنے گھر کے قریب ایک گلی میں کھیل رہا تھا۔ کہ آرسنی خاندان کے کچھ سپاہی اس طرف سے گزرے۔ اتفاقاً دوسری جانب سے کالونا کا رئیس تھوڑی سی فوج کے ساتھ وہیں آ پہنچا۔ اور جس گلی میں بچہ کھیل رہا تھا۔ وہیں ان کی مُٹ بھیڑ ہوئی۔ زبردست جنگ ہوئی۔ جس میں وہ بچہ بھی مارا گیا۔ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ بھی نہ کی۔

لوگوں کے اس نئے سردار کا نام "رتینزی" تھا۔ اس نے عوام کو دعوتِ اتحاد و عمل دی۔ اور اپنی جادو بیانی۔ نغز گفتاری۔ راست گوئی اور حق پرستی سے روز بروز اپنے رفقاء میں معتدبہ اضافہ کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ روم کے سارے باشندے اس کے ایک اشارے پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور موقع کے منتظر رہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح دونوں جنگجو رئیسوں کو شکست دے کر اپنی سلب شدہ آزادی دوبارہ حاصل کریں۔ نوجوان سردار کی محبت ان کے قلوب میں جاگزیں ہو گئی۔ اور اس کی ہر بات کے لئے وہ جان تک دینے کو تیار رہتے۔ اس نے اپنے لئے کسی اور لقب کی بجائے گذشتہ عہد کے جانبازوں کی یادگار میں "جانباز" کا نام تجویز کیا۔ اور اس

کو عملاً ثابت کرنے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہنے لگا۔

چھوٹے بھائی کی وفات کے بعد خاندان بھر میں صرف اس کی بہن "آیرین" ہی اس کی تنہا رفیق رہ گئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اس کے گیسو سیاہ و دراز تھے۔ اور اس کا حسن ملائک فریب۔ وہ رینزی کے گھر کا گوہر شب چراغ تھی۔ "رینزی" حقیقتاً شاعر تھا۔ اس کے لئے سکوت۔ مطالعہ۔ مناظر قدرت اور بہار یہ سب بیخود کرنے والی چیزیں تھیں۔ لیکن ملک کی موجودہ فضا نے اس کی شاعرانہ طبیعت پر غلبہ حاصل کر لیا اور کچھ عرصے کے لئے وہ اپنی فطرت کے بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم اس تبدیل فطرت کے باوجود اس میں ہر شخص پر اعتماد کرنے کی عادت موجود تھی۔ جو شاعروں کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ اور جو سیاست دان کے لئے ہلک ترین چیز ہے۔

ایک دن "آیرین" کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ راستے میں اتفاقاً آرسنی خاندان کے ایک شخص کی نظر اس پر پڑی اور "آیرین" کے عشق کا تیر اس کے جگر کے پار ہو گیا۔ "آیرین" کے انکار کا خیال کر کے وہ بجائے سیدھے طور پر اظہار محبت کرنے کے اس کو اُڑا لے جانے کی سوچنے لگا۔ یہ حرکت کتنی ہی بہیمانہ سہی لیکن "رینزی" کے پر آشوب زمانے میں ایسے بیسیوں واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔

موقع پاکر انہوں نے ایک بھیانک رات میں "رینزی" کے مکان کا رُخ کیا۔ ان کی یہ چال نہائت کامیاب رہی۔ کیونکہ "رینزی" عموماً رات میں لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا کرتا تھا۔ اور "آیرین" مکان میں اکیلی رہتی۔ سیڑھیوں کے ذریعے آناً فاناً وہ گھر میں پہنچ گئے۔ اور بیکس لڑکی کو پکڑ لیا وہ ہر چند مدد کے لئے چیخی چلائی لیکن کسی نے توجہ نہ کی۔ قریب تھا کہ وہ اس کو لے کر فرار ہو جاتے لیکن ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ خاندان کالونا کا ایک نوجوان چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا۔ آپس کی کشمکش اور گڑبڑ سے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اسی اثنا میں کالونا کا وہی نوجوان موقع پاکر بیہوش "آیرین" کو اس ہنگامے سے نکال کر علیحدہ ایک جانب لے گیا۔

لڑائی کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ "رینزی" آپہنچا۔ اور اس نے فوراً لڑائی کو موقوف کر دینے کا حکم دیا۔ لوگ کائی کی طرح چھٹ گئے۔ اس نے اپنی قابل احترام تقریر سے دونوں دشمنوں کو بے حد شرمندہ کیا۔ قانون اور اخلاق کو مدِ نظر رکھ کر انہیں فوراً وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ دونوں دشمن قہر آلود نگاہیں ڈالتے ہوئے بیچارگی کے عالم میں عوام کے اس نئے سردار کے آگے سر جھکا کر رخصت ہو گئے لیکن انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ شہر کے حصار کے باہر کھلے میدان میں کل صبح مقابلہ کریں گے۔

ادھر دشمن روانہ ہوئے اور ادھر لوگوں نے "رینزی" کو مجبور کیا کہ حاصل شدہ موقع کو کھونے کی بجائے لڑ بھڑ کر دشمنوں سے شہر کو پاک کرنا چاہیئے۔ عوام نے باہمی مشورے سے یہ بات طے کر لی کہ کل جس وقت دونوں رئیس شہر کے باہر اپنی افواج کو لئے ہوئے مصروف پیکار ہوں۔ اسی وقت شہر کے سارے دروازوں کو بند کر دیا جائے۔ اور جب تک وہ لوگ قوانین کی اطاعت کا حلف نہ اٹھائیں۔ اس وقت تک اُن کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔ عوام کی رائے سے وہ ہر وقت متفق تھا۔ اُس نے فوراً حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ اپنے عزیز ترین اور قدیم شہر کی عزت اور آزادی کو برقرار رکھنا ہو تو بس یہی ایک موقع ہے۔ کہ کل اپنی ساری قوت صرف کر دیں۔ اور ہر ایک یہی سمجھے کہ بقائے زندگی کی کشمکش میں وہ اپنی ساری قوت صرف کر رہا ہے۔

سب لوگوں نے اس کی تائید کی۔ مجمع چھٹ گیا۔ اور "رینزی" کو اب موقع ملا کہ اس جھگڑے کا اصلی سبب معلوم کرے۔ رہائی پانے والا سوائے اپنی بہن کے اور کوئی نہ تھا۔ اب اس کے حواس بجا تھے۔ اور وہ ایک دیوار کے سہارے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ "رینزی" اُس کو دیکھتے ہی چلا اٹھا:۔

"آیرین! اڈرین!!"

"بھائی جان خدا کا فضل ہے"۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ "ہمارے شکریہ اور تعریف کا مستحق صرف یہی نوجوان ہے۔ اگر آج اس نے بہادری اور جوانمردی کا ثبوت نہ دیا ہوتا۔ تو واقعات کی صورت ہی کچھ اور ہوتی۔ ہم پر اس کا یہ احسانِ عظیم ہے"۔

"اڈرین اس کے لئے ہم بے انتہا ممنون ہیں۔ اور تمہارا جتنا شکریہ ادا کیا جائے۔ کم ہے"۔ رینزی نے کہا۔

کالونا کا ایک طرفدار اڈرین اگرچہ بچپن سے رینزی کا دوست تھا لیکن واقعات نے مجبوراً انہیں علیحدہ کر رکھا تھا۔ اڈرین نے کہا کہ میں نے کوئی کارنامہ تھوڑا ہی کیا ہے۔ جس کی داد دی جائے۔ بلکہ دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے میں نے واقعات کو سمجھا ہی نہ تھا۔

اب "رینزی" کو یہ خوف لگ گیا کہ کہیں اڈرین ان کی اسکیم کو دشمنوں سے بیان نہ کر دے۔ جس سے ممکن تھا کہ لڑائی موقوف کر کے

دونوں اپنے اپنے گھر بیٹھ رہیں۔ لہذا اس نے اپنی قدیم رفاقت کے بھروسے پر کہا۔ کہ آج کی کوئی بات اپنے اہل خاندان سے نہ کہنا!

ابتداءً تو اڈرین نے پریشانی ظاہر کی لیکن "رینزی" نے نہایت دانشمندانہ پیرائے میں کہنا شروع کیا کہ اس میں اس کی کوئی ذاتی بھلائی یا منفعت مقصود نہیں بلکہ اس میں ملک اور شہر کی بہبودی مضمر ہے۔ اور کہا کہ صرف یہی ایک وجہ تمہارے خاموش رہنے کے لئے کافی ہے۔

"اور جب تم نے اتنا بڑا احسان ہم پر کیا ہے۔ تو کیا تم سے اس معمولی چیز کی امید نہیں رکھ سکتے۔" آیرین نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں"۔ اڈرین نے جوش سے کہا۔ "اور یہ صرف میرے ملک اور تمہاری خاطر!"

"آیرین مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی شوخی چمکنے لگی۔ نوجوان کے دِل پر اس برق پاش تبسم نے تیر نیمکش کا کام کیا۔ اور اس نے دل میں ایک نئی خواہش اور جذبۂ نو کو نشوونما پاتے ہوئے محسوس کیا۔ جو اس سے پہلے کبھی پیدا نہ ہوا تھا۔ اور صرف اس کی خاطر وہ اپنی جان۔ مال اور ناموس قربان کرنے کو تیار ہو گیا۔

صبح ہوئی اور سارا شہر جاگ اٹھا دونوں رئیس اپنی افواج کے ساتھ شہر کے باہر جا نکلے۔ "رینزی" اور اس کے ساتھی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اور مسلح سپاہی لوگوں کو جمع کر رہے تھے۔ سارے لوگ "رینزی" کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے۔ حتّٰی کہ اس میں دکاندار۔ بنئے۔ بقال اور بزاز بھی شامل تھے . . . . سورج قدرے بلند ہوا اور نقارے پر چوٹ پڑی۔ یہ "رینزی" کی آمد کی اطلاع تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہزارہا آدمی سڑکوں اور گلی کوچوں سے نکل کر جمع ہو گئے۔ شہر کے چوک کے قریب اس نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج ہی کے روز ان کی ہمت اور جوانمردی شہر کی عظمت کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس کے بعد دروازوں کو بند کر کے اس نے ہر جگہ معتدبہ آدمیوں کی ایک جماعت کو پہرہ پر مقرر کیا اور خود جنگجو رئیسوں کی آمد کا منتظر رہا۔

حقیقتاً یہ نہائت سہل فتح تھی۔ کیونکہ جب دونوں رئیس لڑ بھڑ کر تھکے ماندے واپس ہوئے تو انہوں نے دروازوں کو مضبوطی سے بند کیا ہوا پایا۔ جن پر سخت نگرانی کی جا رہی تھی۔ بالآخر شہر میں داخل ہونے سے مایوس ہو کر انہوں نے صلح کی شرائط مان لیں۔ لہذا "رینزی" کو جانباز ماننے اور قوانین کی اطاعت کا حلف اٹھانے کے بعد انہیں شہر میں داخل ہونے اور اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت ملی۔ "رینزی" کے مقابلے میں اپنی ذلت کو دونوں ظالم سردار برداشت نہ کر سکے۔ لیکن اس قدر کثیر تعداد کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے خفیہ طور پر سازش کرنی شروع کی۔

اس واقعہ کے بعد جب "رینزی" نے پہلی مرتبہ دارالعوام میں ایک مجلس منعقد کی۔ تو عوام کی طرح دونوں سرکش امیروں کو بھی اس میں شریک ہونا پڑا۔ اس میں بہت سے مشاہیر دوسری سلطنتوں کے سفیر اور بیشتر ممتاز اہل شہر بھی شریک تھے۔ خبر رسانوں کے ذریعے ہر طرف اطلاعات روانہ کی گئیں۔ احکامات جاری کئے گئے۔ ملک میں ہر طرف سے صلح و امن کے پیغامات آنے لگے۔ دوسرے ممالک سے بھی اطلاعیں آئیں۔ اکثر ممالک نے "رینزی" کو ملک کا نیا جانباز تسلیم کیا۔ لوگ اس کی حکومت اور عمر کی درازی کے لئے دعائیں مانگنے لگے۔

سوائے ان باغی امیروں کے ہر ایک کو "رینزی" کی حکومت سے خوشی ہو رہی تھی۔ امیروں نے اس بڑھتے ہوئے خطرے کو پہلی مرتبہ محسوس کیا۔ اور سازش کرنا شروع کی کہ کسی نہ کسی طرح "رینزی" کا خاتمہ کر دیا جائے۔ دونوں نے مطلب براری کے لئے اپنی رقابت کو عارضی رفاقت سے بدل لیا۔ اڈرین جو اس موقع پر حاضر تھا۔ اس نے لعنت ملامت کرنی شروع کی کہ وہ اپنے عہد سے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ خود اڈرین کے والد نے جو کالونا کا ایک سپہ سالار تھا۔ اس کا تمسخر اڑایا اور اور اڈرین کے اس استدلال کو سنا ہی نہیں کہ ملکی مفاد ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے۔ دونوں سردار اپنے لباسوں میں دو خنجر چھپا کر "رینزی" کی تلاش میں نکل پڑے۔

"رینزی" لوگوں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ جبکہ "اڈرین" نے دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچ کر چپکے سے اُسے آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ ادھر اس نے "رینزی" کی جان کی حفاظت کرنے کو کہا۔ اور ادھر سازشی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ وہ کسی اہم چیز کے متعلق کچھ استفسار کرنا چاہتے ہیں۔ سازشیوں کا اضطراب اور اُن کی بوکھلاہٹ اُن کے چہروں سے ان کے قابلِ نفرین مقصد کو ظاہر کر رہی تھی۔ اگرچہ ایک لمحہ دونوں کو اپنے اپنے خیال پر عمل پیرا ہونے کے لئے کافی تھا۔ لیکن ادھر تو سازشی امیروں نے اپنے اپنے خنجر اس کے جسم میں گھونپنے کے لئے نکالے اور ادھر چالاک "رینزی" نے اس سے پہلے اپنی آہنی زرہ بکتر

بہن لی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خنجر اسی میں اٹک کر رہ گئے۔

"پکڑو! بدمعاش!! قاتل! کمینے! انہیں گرفتار کر لو! قتل کر دو!!"

کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں۔ دیکھتے دیکھتے سارے لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے اور گرفتار کر کے اُن کی مشکیں کس دیں۔ اور اسی وقت انہیں دو تاریک زندانوں میں قید کر دیا گیا۔ لوگوں نے غصے اور جوش میں "رینزی" کو کہا جو اب اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا، کہ انہیں فوراً قتل کر دینا چاہیے۔ "رینزی" بھی مشتعل تھا۔ وہ اس لئے ان کی جان نہیں لینا چاہتا تھا۔ کہ وہ خود اس کی جان کے درپے تھے۔ بلکہ آزادی دلانے والی نئی جماعت کا اس طرح خاتمہ کر کے وہ پھر اپنی جابرانہ حکومت اور اپنے ذاتی مفاد کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اُن کے لئے وہ قتل کا حکم جاری کرنے ہی والا تھا کہ ایک جانب سے "اڈرین" اور "آیرین" داخل ہوئے۔

"اڈرین" کو علم تھا کہ دونوں ظالم رئیسوں کے ساتھ ساتھ اس کے بوڑھے باپ اور دیگر افراد خاندان کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اس لئے "آیرین" سے واقعات کا اظہار کر کے بہ منت اس کے بھائی سے ان قیدیوں سے درگزر کرنے کو کہا۔ "آیرین" نے بے انتہا عاجزی سے کہا کہ عدل کے مقابلے میں درگزر کرنا یقیناً اپنی عالی ہمتی کو ظاہر کرنے اور دشمنوں کی تنگ ظرفی کو درست کرنے کا بہترین آلہ ہے۔

کوتہ اندیش بھائی نے فوراً بہن کا کہا مان لیا۔ اپنے دستخط شدہ کاغذ کو پھاڑ کر اپنی سحر بیانی کے بھروسے پر مجمع سے خطاب کر کے رحم و معافی کا خواستگار ہوا۔ لوگوں نے اس کی بات کو منظور تو کر لیا لیکن اس کی ناتجربہ کاری سے وہ کھٹک گئے۔ امیروں میں سے ہر ایک اپنی زندگی کے آخری لمحے گن رہا تھا۔ موت کی سزا یقینی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی "رینزی" کی بجائے حاکم ہوتا تو سب سے پہلے وہ یہی کام کرتا۔ اس کی بجائے دوستوں کی طرح اس نے اُن سے یوں خطاب کیا:۔

"دوستو تمہاری ناشائستگی کی وجہ سے تمہیں پابند سلاسل دیکھ کر مجھے بے حد رنج ہو رہا ہے۔ جہاں تک میری زندگی کا تعلق ہے۔ میں اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ اپنے ملک کی بہبودی کے لئے میں ہمیشہ سربکف رہتا ہوں۔ لیکن آپ نے مجھ پر جو قاتلانہ حملہ کیا۔ اس کی بڑی وجہ مجھے ہلاک کرنے کی بجائے میرے ملک کو نقصان پہنچانے کی تھی۔ آپ نے قانون شکنی کے علاوہ اپنے وعدہ کا پاس نہ رکھا۔ اگر میں صرف عدل ہی پر قائم رہوں تو آپ کی موت کے لئے ایک لمحے سے زیادہ عرصہ لگے گا۔ لیکن مقدس انجیل کی تعلیم نے ہمیں رحمدلی کا سبق سکھایا ہے۔ اسی لئے میں نے آپ کی جاں بخشی کے لئے عوام سے درخواست کی ہے۔ جس کو انہوں نے اپنی فراخدلی سے قبول کر لیا ہے۔ اب آپ لوگوں کی جان بخشی اسی میں مضمر ہے۔ کہ آپ لوگ از سرِ نو ایفائے عہد اور عوام کی طرح میری سیادت کا حلف اٹھائیں....."

اس غیر متوقع طرزِ عمل سے دونوں رئیس مبہوت ہو گئے۔ انہوں نے بظاہر تمام شرائط کو مان لیا۔ اور عہد کیا کہ وہ اس کی حکومت کو تسلیم کریں گے لیکن دل میں وہ کوتہ اندیش "رینزی" کی کارروائیوں پر ہنس رہے تھے۔ لہذا رہائی کے بعد سب سے پہلے وہ انتقام کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

مشہور ہے۔ کہ بھلائی کا بدلہ برائی ہے۔ دوسرے ہی روز لوگوں کا اندیشہ پورا ہوا کہ انتقام کی تلاش میں راتوں رات دونوں سرکش امیر روم سے بھاگ گئے ہیں۔ اور فوجیں جمع کر رہے ہیں۔ کہ روم پر حملہ کر دیں اب تو عوام رینزی کی کم فہمی پر علانیہ ملامت کرنے لگے۔ تاہم انہوں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور یہ بھی مدافعانہ کارروائی میں مصروف رہے۔ "رینزی" کا چہرہ اب بھی متبسم تھا۔ اور اس کی موجودگی لوگوں کے دلوں میں غیر معمولی جوش پیدا کرنے کے لئے بہت کافی تھی اور اس کی بات پر وہ جان تک دینے کے لئے تیار تھے۔

واقعات کے گوناگوں الٹ پھیر نے سب سے زیادہ "اڈرین" کو مبتلائے مصیبت کر دیا۔ ایک طرف اپنے خاندان اور بوڑھے باپ کا خیال تھا۔ تو دوسری طرف ملکی فلاح اور حقوقِ عوام کی طرفداری کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ "آیرین" کی محبت نے اس ماحول میں بھی اسے بالکل دیوانہ بنا دیا تھا۔ اور جوں جوں لڑائی کی مدت قریب ہوتی گئی۔ اُس کی بے چینی بڑھتی چلی گئی۔

بالآخر رئیسوں کی متحدہ افواج شاہانہ غرور کے ساتھ شہر کے بند دروازوں کے قریب آ کر رک گئیں۔ رئیسوں نے فوراً دروازے کھولنے کا حکم دیا۔ "رینزی" نے بھی اپنی افواج کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دینے کا تہیہ کر کے شہر کے دروازوں کا رُخ کیا۔ مقابلے کا حکم دینے سے پہلے

"اڈرین" فوج کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ کر "رینزی" سے ٹھیرنے کی استدعا کرنے لگا۔ گھوڑے کی باگ روک کر "رینزی" نے سوال کیا:-

تمہاری اس دخل اندازی کی کیا وجہ ہے؟

رئیسوں کی سرکشی کو ایک مرتبہ اور معاف کردو۔۔۔ ممکن ہے میرے کہنے سے اپنی غلطی پر نادم ہو کر تمہاری سیادت کو بغیر لڑائی بھڑائی کے تسلیم کرلیں؟" اڈرین نے کہا۔ "اب اس کا وقت نہیں ہے" "رینزی" نے کہا "ایسے بدعہدوں کو سرکوبی کی سخت ضرورت ہے۔ دروازے کھول دو اور تلواریں سونت لو"۔ . . . پھاٹک کھلے اور شکار پر جھپٹنے والے عقاب کی طرح دونوں فوجیں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں۔ قدیم روم کی جنگ آشنا دیواروں نے اس سے بڑے گھمسان معرکے کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ عوام کے جوش وخروش کی کوئی انتہا نہ تھی ایک طرف باغی رئیسوں کے دلوں میں نفرت اور حقارت کے جذبات موجزن تھے۔ تو دوسری طرف لوگوں کو آزادی کی خواہش اور حصولِ حقوق نے بے جگری سے لڑنے پر مجبور کیا تھا اس ہولناک معرکے میں ہر طرف "رینزی" کی ہمت بڑھانے والی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور اپنے سیاہ گھوڑے پر خطرناک سے خطرناک مقامات میں وہ دندناتا ہوا گھس رہا تھا۔

اس فیصلہ کن جنگ میں میدان "رینزی" کے ہاتھ رہا۔ دونوں امیر بھاگ گئے۔ مقتولین میں "اڈرین" کے باپ کی لاش بھی موجود تھی۔ فتح مند سپاہی ترانے گاتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ اپنے پرجوش سردار کی عظمت کا سکہ اور زیادہ مضبوطی سے ان کے قلوب پر ثبت ہوگیا۔ روم کی تاریخ میں گویا ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا۔

رئیس شکست سے مایوس ہونے کی بجائے دونی ہمت سے اور سبیل کی تلاش میں نکل پڑے۔ انہوں نے شہنشاہ جرمنی سے مدد طلب کی جس کی حکومت میں ایک عرصے تک روم بھی شامل تھا۔ "رینزی" پر غاصب کا الزام لگا کر اس کے خلاف انہوں نے شہنشاہ کے کان بھرنے شروع کئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "ایوگنان" جا کر پوپ سے ملاقات کی۔ پوپ جس نے انہیں کی ہنگامہ آرائیوں اور سازشوں سے روم کو ترک کیا تھا۔ اب ان کی چالوں میں آگیا۔ انہوں نے پوپ کے سامنے "رینزی" کو بے دین، مرتد اور باغی ٹھیرایا۔ جس کو سن کر پوپ نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ شہنشاہ جرمنی نے بھی اپنے سفیروں کو واپس بلانے کے احکامات جاری کردیئے۔

جونہی یہ خبریں روم پہنچیں۔ ایک نیا انقلاب رونما ہوا۔ بہت سے لوگ اپنے چہیتے سردار ہی کے خلاف ہوگئے۔ اس فساد میں ایک اور مہلک تحریک کا آغاز ہوا جس کا بانی "جیکو" نامی ایک لہار تھا۔ بدنظمی کے زمانے میں "جیکو" اور اس کے ساتھیوں کو خیال پیدا ہوا کہ ہاتھ پاؤں ہلانے سے کچھ نہ کچھ حاصل ہوگا۔ لہذا "رینزی" کے خلاف اس نے زہر اگلنا شروع کیا۔

ان سب کا سردار سوائے "اڈرین" کے اور کوئی نہ تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس نے اعلان کردیا تھا کہ اس کے بدلے میں "رینزی" کو قتل کردوں گا بہت سے لوگ اس کے ہم خیال ہوگئے۔ اور "رینزی" کا کلمہ پڑھنے والے آن کی آن میں اس کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔۔۔ "یہی تو دنیا کا دستور ہے"۔

چند ایسے بھی تھے جنہوں نے ان باتوں کو تمسخر سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اسی اثنا میں کلیسا کے گھنٹے بجنے لگے۔ فتح کی مسرت میں شکریہ ادا کرنے کے لئے ایک جلسہ ترتیب دیا گیا تھا۔ پوپ کا نائب اپنے دوسرے راہبوں کے ہمراہ کلیسا کی جانب جانے لگا۔ اس سے لوگوں کے خیالات پھر "رینزی" کی طرف مائل ہونے لگے۔ ان کے خیال میں جب پوپ بھی اس فتح کی خوشی میں "رینزی" کا شریک تھا۔ تو انہیں اس کی مخالفت کرنے کی بظاہر کوئی وجہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ اتنے میں "رینزی" اپنی بہن کو ساتھ لئے کلیسا جانے کے ارادے سے نکلا۔ ہجوم میں "رینزی" کے خلاف آوازے کسنے والے بھی بالکل خاموش ہو رہے۔ خود "اڈرین" جس نے اس کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کی پُررعب شکل اور قابلِ احترام شخصیت کے آگے ماند پڑ گیا۔

"آیرین" کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ ایک طرف اس کے دل میں پیارے بھائی کی سلامتی کی دعائیں موجود تھیں تو دوسری طرف "اڈرین" کی حالت پر رحم آرہا تھا۔ اگر اڈرین آیرین کے دلی جذبات سے واقف ہو جاتا تو اس کے دل میں بھی ایک ایسا جذبہ پیدا ہو جاتا جو اُسے بیک وقت غمگین اور خوش دونوں بنا سکتا

جونہی "رینزی" اور "آیرین" کلیسا کے دروازے پر پہنچے۔ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ پوپ کا نائب کلیسا کے اندر سے دروازے پر آیا اور ان کو اندر جانے سے روک دیا۔ اور ان کی راہ میں حائل ہوگیا۔ بلند آواز میں اس نے "رینزی" کو بد دعائیں دینی شروع کیں۔ اور عوام سے مخاطب ہو کر کہا کہ جو کوئی اس منکرِ دین کا کسی طریقے پر ساتھ دے گا۔ اس کی

بھی مذہباً یہی گت بنے گی کلیسا کی یہ سخت ترین سزا تھی۔ جو صرف مرتدوں
باغیوں اور قزاقوں کو دی جاتی تھی۔
"زینزی" پر اس غیر متوقع طرزِ عمل سے ایک بجلی سی گری۔ اپنی
بیش بہا خدمات کے عوض ایسی سزا یقیناً صبر شکن تھی۔ وہ فرطِ حیرت
سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لوگ جس طرح پلیگ زدہ سے بھاگتے ہیں۔
اس کے اطراف سے ہٹ گئے۔ اتنے میں "آڈرین" نے بڑھ کر "آیرین" سے
کہا:—
"چلو تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں —— کلیسا کی یہ سزا تو تمہارے
لئے نہیں ہے"۔
"آیرین" نے اپنے بھائی سے چمٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں! ہرگز نہیں!!
—— جہاں میرا بھائی جائے اور جو مصیبت اس پر پڑے اس میں میں
اس کی شریک رہوں گی"۔
"لیکن تم اُسے بچا نہیں سکتیں ——— آؤ اب بھی
وقت ہے"۔
"نہیں!" اس نے کہا اور بھائی کے ہمراہ آہستہ آہستہ گلی کی
راہ سے گھر واپس ہو گئی۔ لوگ حیرت سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔
اس ہمت شکن ضرب سے "زینزی" مایوس نہیں ہوا۔ اس نے خیال کیا
کہ اب بھی صحیح واقعات کو روشنی میں لایا جائے تو لوگ اس کا ساتھ
دیں گے۔ غصّے کی بجائے رحم کے جذبات اس کے دل میں بھر گئے۔ اس
نے ایک نئی ترکیب سوچی۔
"دارالعوام کے بیرونی حصّے پر ٹھیر کر تقریر کی جائے تو؟" اُس نے
بہن سے کہا۔
"نہیں بھائی ہرگز نہیں۔ ہمیں اپنی جان کی حفاظت کے لئے فوراً
یہاں سے فرار ہو جانا چاہیئے ——— جب روم کے لوگوں میں
صداقت اور حق پرستی کا جذبہ موجود ہی نہیں۔ تو تمہاری بڑی سے
بڑی خدمات کے عوض تمہاری وہ لوگ کیا قدر کرنے والے ہیں"۔
"اور میں اس طرح مجرم بنوں؟" اس نے جواب دیا۔ "یہ ہرگز نہیں
ہو سکتا۔ اس کے علاوہ میں جاؤں کہاں؟ روم سے محبت بلکہ اس کی
ہر چیز سے مجھے عشق ہے۔ میری زندگی روم کے ساتھ ہے —— اگر روم
کے مصائب میرا خون پی کر دُور ہو سکتے ہیں۔ تو میں بخوشی اس کے
لئے تیار ہوں —— آہ! میری حقیر زندگی اس کی بھلائی میں صرف
ہو۔ تو اس سے بڑھ کر اور کونسی مسرت ہوگی؟"
"آیرین" اس کو سمجھانے کی بجائے بالکل خاموش ہو گئی۔ وہ دونوں
گھر سے نکل کر دارالعوام کی جانب چلنے لگے۔ یہاں سیڑھیوں پر پہرہ داروں
نے اس کو باقاعدہ سلام کیا۔ چوبداروں اور نقیبوں کو حکم دے کر وہ دارالعوام
کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں اس نے اہلِ روم کی سلامتی اور بہبودی
کے لئے سچے دل سے دعائیں مانگیں۔
پوپ کی بد دعا اور "زینزی" کی بدنامی کے واقعات سارے شہر
میں بارود پر چنگاری کا کام کر رہے تھے۔ "جیکو" اور دوسرے سازشیوں نے
موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور واقعات کو نمک مرچ لگا کر لوگوں کے سامنے
بیان کیا۔ اور کہا۔ کہ اس کے گذشتہ بُرے اعمال اور بدکاریوں کے نتائج
کا یہ خمیازہ ہے —— لہٰذا اس کو فوراً قتل کر دینا چاہیئے۔
برخلاف اس کے "آڈرین" نے اپنی پوری قوت "زینزی" کو بیگناہ
ثابت کرنے میں صرف کی لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ الٹے لوگوں نے اس
کے الفاظ سے اسی کو نشانۂ ملامت بنایا۔ "جیکو" اور اس کے ساتھیوں کا اثر
بڑھتا چلا گیا۔ اس بات کا سب کو علم ہو چکا تھا کہ "زینزی" دارالعوام میں
پناہ گزیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے ادھر ہی کا رُخ کیا۔ "زینزی کو نکالو"۔ کے
ساتھ ساتھ "دارالعوام کو جلا دو"! کی صدائیں بھی بلند ہونے لگیں۔
"زینزی" کے بچنے کی کوئی صورت نہ پا کر آڈرین گلیوں کے راستے سے
فوراً دارالعوام پہنچا۔ بھائی کی حفاظت کے لئے دروازے پر "آیرین" موجود تھی۔
اس نے اس سے دریافت کیا کہ "زینزی کہاں ہے؟ اب ہم کو فوراً فرار
ہونا چاہیئے"۔
"وہ وہاں ہے!" آیرین نے بتلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ کبھی فرار
نہ ہوگا۔ اور میں اس کے ساتھ ہوں"۔
"آہ! آیرین! آیرین!! مجھے تم سے کتنی محبت ہے —— جب
سے کہ میں نے اس گلی میں پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا۔ آج تک میری محبت
روز افزوں ہے۔ میرے ساتھ آؤ —— ہم دونوں تمہارے بھائی کو چلنے پر
مجبور کریں گے —— اگر وہ نہ بھی مانے تو تم ناحق اپنی جان کیوں گنواتی
ہو؟"
وہ اس کا جواب سنے بغیر کمرے میں گھس گیا جہاں "زینزی"
عبادت میں مشغول تھا۔
"چلو" آڈرین نے کہا۔ "لوگ اس عمارت کو جلانے کے لئے آ

سے ہیں۔ اگر تم اور تمہاری بہن ایک خفیہ راستے کے ذریعے جس کا صرف مجھے ہی علم ہے۔ میرے ساتھ نہ چلو گے تو تمہاری ہلاکت یقینی ہے۔ کیا تم سنتے ہو؟ ——— دیکھو گلیوں سے آوازیں آ رہی ہیں!"

"لیکن وہ لوگ میرا کیا بگاڑ لیں گے جو میں ان سے خوف کھاؤں" رینیزی نے کہا۔ "لیکن آئرین میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے اس دوست کے ساتھ چلی جاؤ"

"آئرین" جو کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ سن کر متحیر ہو گئی ——— آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی گئیں۔ لیکن "رینیزی" مسکرا رہا تھا۔

"میں نے اس سے پہلے بھی ہمراہ چلنے کو کہا ہے۔" اڈرین نے کہا۔ "خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ میں اس وقت بھی اس کی حفاظت کے لئے دنیا کی کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھوں گا۔ میں عاجزانہ التجا کرتا ہوں۔ کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔"

"بہن کیا تم اس شخص سے محبت کرتی ہو؟" رینیزی نے مربیانہ انداز سے پوچھا۔

"ہاں" آئرین نے آہستہ سے کہا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ مضبوطی سے اپنے بھائی سے چمٹ گئی۔

"تب اس کے ہمراہ چلی جاؤ"۔ اس نے آئرین کا ہاتھ اڈرین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھی محبت کی ہے ——— اور میرا محبوب شہر روم رہا ہے۔ جس طرح تم اب ایک دوسرے سے وابستہ رہو گے۔ اسی طرح میں بھی اپنے بدنصیب شہر کا ساتھ دیتا ہوں ——— خدا حافظ!"

لوگ عمارت کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اڈرین نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر رینیزی سے ہاتھ ملایا۔ اور بے ہوش آئرین کے جسم کو اٹھا کر خفیہ تاریک زینے سے اتر کر چلا گیا۔

لیکن نڈر "رینیزی" جس نے آخر دم تک جانبازی سے منہ نہ موڑا۔ سیڑھیوں سے اوپر کی منزل پر چڑھ آیا کہ لوگوں کو مخاطب کرے "جیکو" اور اس کے ساتھیوں نے اس کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اپنی قادرالکلامی اور سحر بیانی سے وہ سب لوگوں کو ایک لمحے میں اپنی طرف مائل کر سکتا ہے۔ پہلے تو انہوں نے پتھر برسانے شروع کئے۔ لیکن "رینیزی" اپنی جگہ سے نہ ہلا ——— اس کے بعد عمارت کو آگ لگا دی گئی۔ دھوئیں کے غبار نے ساری عمارت کو نظروں سے چھپا دیا۔ لیکن جب ہر طرف آگ کا قبضہ ہو گیا۔ اور شعلے بلند ہونے لگے۔ تو لوگوں نے دیکھا کہ رینیزی وہیں کھڑے کھڑے لوگوں کو مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بالآخر ساری عمارت جل کر خاکستر ہو گئی۔ اور راکھ کا ایک ڈھیر باقی رہ گیا۔

یہ تھا روم کے آخری جانباز کا انجام ؎

تا سحر تو نے نہ چھوڑا اس کو اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

سید ابوالفضل عثمانیہ

رباعیات

ہر شے میں کچھ انقلاب پوشیدہ ہیں
ہر خار میں کچھ گلاب پوشیدہ ہیں
ہشیار ہو اور زمیں پہ چلنے والے
ان ذروں میں آفتاب پوشیدہ ہیں

احساسِ مآل سے ہراساں ہو جائے
آغاز میں انجام سے لرزاں ہو جائے
رحمت ہے اسی کا خاص حصہ منظر
جو کچھ نہ کرے اور پشیماں ہو جائے

منظر صدیقی اکبرآبادی

خلوتِ گاہِ حسن

دیدنی ہے ہمنشیں خلوت میں اُن کا اضطرار
چھو رہی ہوں جیسے اُن کو میری نظریں بار بار

بیٹھے بیٹھے بیخودی میں مسکرا پڑتے ہیں وہ
جھوم کر فرطِ خوشی سے کھلکھلا پڑتے ہیں وہ

پھر کسی احساسِ پنہاں کے اثر سے یک بیک
جھلملا اُٹھتی ہے اُن کے رُخ پہ سرخی کی جھلک

دیکھتا ہو جیسے ان کو کوئی چھپ کر پاس سے
دل میں کچھ محجوب ہو جاتے ہیں اس احساس سے

ناز کی اک لہر شامل جس میں ہو رنگِ حجاب
چاند سے ماتھے پہ ہو جاتی ہے ہنس کر بے نقاب

دفعتہً کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں وہ
چونک کر سنجیدگی کی رو میں کھو جاتے ہیں وہ

دیر تک رہتا نہیں لیکن تکلف برقرار
خود بخود ہوتی ہے پھر دل کی حقیقت آشکار

دلربا چہرے پہ لوٹ آتا ہے پھولوں کا نکھار
ہنسنے لگتا ہے ہر اک عضوِ حسیں بے اختیار

رقص کرتے ہیں مچل کر ناز سے زلفوں کے بال
گدگداتا ہے انہیں میری محبت کا خیال!

اُن کے یہ سب رنگ چھپ کر دیکھتا رہتا ہوں میں
مجھ سے کچھ کہتا ہے دل اور دل سے کچھ کہتا ہوں میں

عدم

سوت کی انٹی

چوماسہ ختم ہوا۔ گاؤں کی لڑکیوں نے تیجن بڑھانے کی رسم ادا کی۔ جس سال جس لڑکی نے سب سے زیادہ سوت کاتا اُسے آیندہ تیجن کی رانی بنایا گیا جب پکوان تقسیم ہو چکا تو لڑکیوں نے اپنی اپنی کتنیاں اور چرخیاں اٹھائیں جس بوہ کے گھر میں تیجن تھا اسے ایک آخری سلام کیا۔ اور ڈبڈبائی آنکھوں سے یکے بعد دیگرے باہر نکل گئیں لڑکیاں جھانبے کی چڑیاں ہیں۔ خدا جانے آیندہ اساڑھ تک کس کس کا ڈھکانا ہو جائے۔ اور اس تیجن کی بچھڑی سہیلیوں میں سے آیندہ سال کون کون مل کر بیٹھ سکیں۔ اس خیال سے سب کی سب آبدیدہ تھیں۔

جن لڑکیوں کی روئی ختم نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے تاوان کے طور پر رسم کا خرچ ادا کیا۔ کوئی گڑ لائی کوئی تیل اور کوئی آٹا۔ باقی روئی سردی بھر گھر پر کاتنے کے لیئے اٹھائے گئیں۔ رشیدہ انہی پھسڈی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ بیری لڑکیاں تو فارغ تھیں لیکن رشیدہ اور اس کے ساتھ کی دوسری لڑکیاں دوپہر کے وقت تھوڑا بہت سوت کاتتی تھیں۔

رشیدہ نے اپنا نیا پروگرام مرتب کیا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر وہ دودھ بلوتی۔ اس کے بعد صبح کا دودھ دوہ کر بھینس کو باہر کالتی اور گوبر اٹھا کر تھوا تھے میں چلی جاتی وہاں سے فارغ ہو کر آتی تو جھاڑ و بہارد کرتی۔ پالی لاتی اتنے میں روٹی کا وقت ہو جاتا۔ رشیدہ بھاوج کے پہلو تھے کو ذرا باہر بہلاتی وہ روٹی ڈال لیتی۔ پکا ریندھ کر بھاوج اُدھر فارغ ہوئی رشیدہ نے روٹی کھائی۔ باہر کھیتوں میں بھجوائی۔ اور چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔ دن ڈھلے کچھ سینا پرونا یا پڑھنا لے بیٹھتی اور پھر بھتیجے کو کھلانے باہر سہیلیوں میں چلی جاتی، وہاں دن بھر کے کام پر تبصرہ ہوتا۔ اور چراغ جلے اپنے اپنے گھر!

گھر کے باقی کام رشیدہ کی ماں اور بھاوج نے بانٹ رکھے تھے جب تک رشیدہ دودھ کے کام سے فارغ ہوتی یہ چکی پیس کر اٹھا لیتیں۔ بھاوج ابھی نئی تھی باہر کا کام کاج وہ نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے رشیدہ اس کی آرام طلبی پر اُس سے ذرا کھچی کھچی رہتی لیکن بھائی کی محبت کے مارے چپ تھی۔ اُدھر بھاوج جی میں سمجھتی تھی کہ چلو نند کوئی دن کی ہے۔ یہ دو باتیں کہہ بھی جائے تو پروا نہیں۔ آخر گھر میں سب کچھ میرا ہے۔

بڑھیا کا یہ حال کہ کبھی بہو کو سمجھا رہی ہے کبھی بیٹی کو رو رو کر نصیحت کر رہی ہے۔ گھر غریب تھا لیکن گھر والے شریف تھے۔ رشیدہ تھی تو کمیری لیکن مزاج میں بچپن تھا۔ اس لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتی جس سے بھاوج کا دل بھی دکھتا اور ماں بھی چیختی چلاتی۔ زیادہ کسی نے کہا سنا۔ تو شام کو بھائی کے کان بھر دیئے اور بھاوج کی مرمت کرا دی۔ پھر جو دن بھر بھاوج کو چڑاتی تھی۔ بس خدا کی پناہ! اس طرح یہ چھوٹا سا کنبہ اپنی کچی پکی مصروف زندگی گزار رہا تھا۔

(۲)

معمول کے مطابق رشیدہ کات رہی تھی۔ اور اس کی ماں اٹیرنی لیئے سوت اٹیر رہی تھی۔ اب تک رشیدہ نے گھر پر جو سوت کاتا تھا۔ اس کی چار انٹیاں اتر چکی تھیں۔ پانچویں انٹی اٹیرنی پر تھی۔ دس انٹیاں اور بس پھر باقی بچا ہوا کام ختم! ماں بیٹی باتیں کرتی جاتی تھیں۔

"بس اماں ایک تہائی کام ختم ہوا۔ دو تہائی اور"

"تیرا تو دیدہ ہی نہیں لگتا تجھ سے آدھی آدھی لڑکیوں نے تیجن میں ہی سارا کام ختم کر لیا"

"اور باقی کام کون کرے۔ بھابی کو تو تم نے ایسا سر پر چڑھا رکھا ہے"

"چپ رہ! بھاوجوں کو یوں کہا کرتے ہیں۔ خدا خدا کر کے اب تو اس کے میکے کا غم غلط ہوا ہے۔ جب پرائے گھر جائے گی تو تجھے معلوم ہوگا"

"اچھا یہ لو نیچلا۔ بس یہ انٹی اس میں پوری ہو جائے گی۔ میں چرخہ اٹھاتی ہوں۔ پٹواری کی بیوی نکل آئی ہے آج ہم سب اسے دیکھنے جائیں گی۔ بیاہی آئی بیچاری دو تین دن رہی، دیکھنا ہی نہ ملا۔ کہتے ہیں اماں وہ کشیدہ بہت اچھا جانتی ہے"

"ہاں کیوں نہیں۔ تعریف میں نے بھی سنی ہے بڑی سگھڑ لڑکی ہے اور پھر ہو کیوں نہ پڑھے لکھے گھر کی ہو ہے۔ بیٹی فرصت نکال کر تھوڑا سا سینا پرونا تو بھی سیکھ لے۔ کام آئے گا۔"

چرخہ اٹھا کر رشیدہ نے کونے سے لگایا ہی تھا کہ سہیلیوں کی آواز باہر سے آ رہی تھی۔ دو ڈگر ان میں جا ملی اور چلیں سب کی سب چہل کرتی ہوئی

پٹواری کے مکان کی طرف! رشیدہ کی ماں ابھی وہیں بیٹھی اٹیرن رہی تھی۔ کڑاڑے سے دودھ جلنے کی چراندآئی! بیسرنی ہاتھ سے رکھ کر ہاڑے کی طرف جو دوڑی تو دیکھا کہ کلسے میں سے دودھ اُبل اُبل کر گر رہا ہے۔ جلدی سے چینی اٹھا کر پانی کا چھینٹا دیا۔ اور بولی۔

رشیدہ کے کسی کام میں بھی تو جھدرک نہیں۔ آتے ہی اُپلے لگادئے خدا جانے اس بچی کو کس دن سدھ بدھ آئے گی۔ جوان ہونے آئی۔ مگر رہی پھوہڑ۔ سارا دودھ نکل گیا۔ اور بہو تم نے بھی نہ دیکھا! یہ کہہ کر اُس نے آس پاس کی راکھ سلگتے اپلوں پر ڈال دی کہ آنچ کم ہو جائے۔ اور ادھی چینی دے کر جو لوٹی تو پوتے نے ایک چیخ ماری۔

"اے ہے! بچے کیا ہوا۔ صدقے واری" کہہ کر پوتے کو گود میں اٹھایا اور ہمسائے کے ہاں چلی گئی۔ جاتے جاتے بہو کو تاکید کر گئی کہ دودھ کا خیال رکھنا میں ننھے کو بہلاتی ہوں۔ تم ہنڈے سے گیہوں جھٹک لو۔ اور دھوپ دکھادو۔ اب تک اناج سے چھاس کا اثر نہیں گیا۔ پیستے میں چکی چکٹ جاتی ہے

بہو نے گیہوں نکالے۔ اور چھاج لے کر بیٹھ گئی۔ اناج میں سے دو تین چوہے نکل کر ادھر ادھر بھاگے اور تھوڑی دیر صحن میں اچھل کود کر جہاں جس کا سر سمایا گھس گیا۔ بہو نے گیہوں صاف کیے چارپائی پر کپڑا بچھا کر دھوپ میں ڈال دئے۔ ساس آئی تو بچہ اس کی گود سے لیا۔ ادھر رشیدہ آگئی

(۳)

رشیدہ۔ لو بی اماں دیکھو۔ ہمیشہ مجھے کہا کرتی ہو۔ کہ بھاوج سے لڑتی ہو۔

ماں۔ کیا ہوا؟

رشیدہ۔ اچھی خاصی چار انٹیاں کُتنی میں چھوڑ کر گئی تھی۔ ایک غایب ہے،

ماں۔ انٹیاں تھیں تو چار ہی۔ لیکن اس میں بھاوج کی کیا خطا؟

رشیدہ کی بھاوج۔ میں نے تو دیکھا بھی نہیں کہ انٹیاں تھیں کہاں اور کے تھیں۔

رشیدہ۔ تم بھلا کیوں دیکھو گی رانی بی جو بیٹھی رہتی ہو۔ جیسے گھر سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اب یہ بتاؤ یہ نقصان کہاں سے پورا ہوگا۔ بڑی آئیں امیر کہیں کی!

ماں۔ بیٹیا! یوں کہا کرتے ہیں۔ وہ خیر سے بچے والی ہے۔ کیا کیا کام دیکھے! یہ تو میری خطا ہوئی کہ ننھے کو لے کر چلی گئی۔ اور انٹیاں اٹھا کر نہ رکھیں۔

رشیدہ۔ پھر بھابی کس مرض کی دوا ہیں۔ اور یہاں سے انٹی لے کون گیا۔ ایک آدھ پونی کی بات ہو تو خیر اتنا سوت! اور میری اتنی محنت!

بھاوج۔ بہن! کیا کہوں اب تم ماننے لگی ہو!

رشیدہ۔ (منہ بنا کر) "اب تم ماننے لگی ہو"

ماں۔ چل چپ رہ بیٹیا! بھائی باپ سنیں گے۔ تو خفا ہوں گے۔ نقصان تو بہت بڑا ہے۔ لیکن اب لڑنے جھگڑنے سے تھوڑی پورا ہوتا ہے۔

ایک ہمسائی!۔ لو بیٹی سنو۔ بھلا اس بچی کا دل تھوڑا نہ ہوگا بچاری کتنی محنت سے کاتتی ہے۔ اور پھر پوری انٹی غائب!

دوسری۔ نندیں تو ہمیشہ بھاوجوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہیں۔ میری بھاوج نے وہ وہ ظلم توڑے ہیں کہ جیسے ہی بھلی ہو

تیسری۔ ساس تعریفیں کرتی کرتی نہیں تھکتی اور بہو کے لچھن دیکھو سارے جو نہیں دیکھی وہی بھلی!

چوتھی۔ ساس بچاری کیا کرے۔ تعریف نہ کرے تو اپنی ٹانگ آپ کھولے اور لاجوں مرے! زمانہ ہی کم بخت ایسا آرہا ہے۔

پانچویں۔ نند بھی کونسی بھلی مانس ہے اگر بھڑکی تو اس کی زبان ہے!

پہلی۔ بچہ ہی تو ہے۔ بھربول چال کا بدلہ یہ کیا کہ انٹی غائب کرلی۔ اور صورت دیکھو تو ہر وقت بھیگی بلی سی بنی رہتی ہیں رشیدہ کے باپ بھائی کو پتہ لگے تو بھلا وہ اس نقصان پر چپ رہیں گے!

(۴)

شام ہوئی۔ گھر کے سب آدمی جمع ہوئے۔ رشیدہ نے ٹھنک ٹھنک کر بھائی سے شکایت کی اور رو رو کر بُرا حال کرلیا رشیدہ کے باپ نے اس کی ماں کو اس غفلت پر بُرا بھلا کہا۔ بھائی بھاوج کے سر ہوگیا۔ وہ منتیں کرتی ہاتھ جوڑتی لیکن کون سنتا ماں نے رشیدہ کو ایک دوہتڑ مارا۔ غرض انٹی کیا گئی کہ ایک دوسرے کی جان کا لاگو ہوگیا۔

روٹی پکی پڑی رہی رشیدہ نے نہ کھائی۔ بھائی بھاوج نے نہ کھائی۔ رشیدہ کی ماں رات گئے بیٹے کے پاس دودھ لے کر گئی۔ اس نے

۱؎ مٹی کا دودھ کڑھانے کا کٹھلے کی شکل کا آلہ۔ اوپر سے کھلا ہوتا ہے۔ ہنیدے میں اُپلے رکھ آگ دے دیتے ہیں ان کے اوپر دودھ کی ہانڈی رکھ کر صبح سے دن ڈھلے تک کڑھاتے ہیں! اس کی اصل "ہارہ" معلوم ہوتی ہے۔ اس کو بولی میں تردی کہتے ہیں۔

وہ بھی نہ پیا۔ رشیدہ کی بھاوج کا یہ حال کہ دل ہی دل میں کڑھ رہی ہے اور کسی پر بس نہیں چلتا۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد بچے پر غصہ نکالتی ہے۔ بیچارے کا مار مار کر بُرا حال کر دیا۔

باپ بیٹا نہیں بولتے۔ ماں بیٹی نہیں بولتیں۔ نند بھاوج میں تو شروع سے ہی کشم کشا تھی۔ گھر پر ایک سکوت سا طاری تھا۔ لیکن دلوں میں آگ سلگ رہی تھی یہ رات سب نے انگاروں پر کاٹی۔ اور صبح کو چپ چاپ جیسے کسی نے منہ سی دئیے ہوں سب اپنے اپنے کام پر لگ گئے۔

رشیدہ کا بھائی غصے میں جو اٹھا۔ تو بیل کھولتے کھولتے ان کی کمر پر دو تین لاٹھیاں جمادیں اندر والے گھرسے بیل جو جھک کو بھاگے تو ایک بیل چکی کے اوپر جا چڑھا۔ چکی کا ہتا بھی اکھڑ گیا اور "بھڑ" بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔

رشیدہ دودھ بلونے اٹھی تو غصے میں رئی چاٹی پر دے ماری اس کا گلا الگ ہو گیا۔ اور لسی ادھ بلوئی رہ گئی۔ کمی کچھ یوں ہی ہاتھ واتھ مار کر ذرا مکھن نکالا۔

غرض دن چڑھے تک کبھی کچھ کبھی کچھ نقصان ہوتا رہا۔ منہ سے کوئی کچھ نہیں بولتا تھا۔ لیکن ایک دوسرے پر دل ہی دل میں غصہ کھا رہا تھا اور ہر ایک اپنی جگہ اپنے آپ کو معصوم و مظلوم اور دوسرے کو ظالم اور گناہ گار سمجھتا تھا۔ آخر بڑھیا نے اپنی دانائی سے سب کے بگڑے ہوئے منہ سیدھے کئے

روٹی باہر بھیج کر بڑھیا نے کہا۔ کہ لڑکیو آج نئی "بھڑ" بنیگی۔ چکی اسی طرح رہی تو صبح کے لئے آٹے کا تو ٹھیک ہے لیکن بیلوں کا دانہ کل سے ختم ہے۔ لو مٹی بھگو کر ذرا ابنا تو ڈالو "بھڑ"۔ آج اور کل کی دھوپ کھا کر ٹھیک ہو جائے گی کل شام کو جوڑ دیں گے!

(۵)

اگلے دن "بھڑ" تیار تھی۔ جڑنا باقی تھی۔ بہو باہر صحن میں اس کا گھیرا گیلے ہاتھوں سے ہموار کر رہی تھی۔ اندر ماں بیٹیاں پرانی بھڑ کھیڑ رہی تھیں۔ نچلا پاٹ جو اٹھائی ہیں تو دیکھتی کیا ہیں کہ دیوار کے ساتھ چوہے کا بل ہے اور اس کے منہ کے پاس باہر پاٹ کے نیچے گرد و غبار میں بھری انٹی پڑی ہے۔ رشیدہ نے پاٹ دیوار سے لگا جھٹ انٹی اٹھالی اور بولی۔ آہا۔ انی۔ اماں۔ انٹی!!

ماں نے کہا۔ انٹی! دیکھو اس انٹی نے کیا کھوئی کھوئی۔ اور ملی کہاں سے! رشیدہ میں نہ کہتی تھی بھاوج کو الزام نہ دے۔ جا اس سے کہہ دے۔ کہ انٹی مل گئی اور جا کر معافی مانگ! یا اللہ شکر تیرا۔

رشیدہ خوشی خوشی دوڑی باہر گئی۔ بھاوج "بھڑ" کے پاس دیکھ رہی تھی رشیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ بھابی میری انٹی مل گئی، چکی کے نیچے پڑی تھی کم بخت کوئی چوہا لے بھاگا۔ اب تو بھابی تم ناراض نہیں، لو، ذرا ہنسو! نہیں گڑ کھلاؤں گی! یہ کہہ کر رشیدہ نے بھاوج کی طرف دیکھا۔

بھاوج کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو رخساروں پر ڈھلک گئے۔

وقار انبالوی

جامِ صہبائی

ایک آرزو

جب سحر کی طلعتوں سے پردۂ شب چاک ہو
جب سیاہی سے بلند و پستِ عالم پاک ہو

جب طلوعِ صبحِ رنگیں ہمکنارِ نور ہو
جب فضا کی ہر خلا تنویر سے معمور ہو

جب حرم اور بتکدے میں جاگتی ہوں نیکیاں
جب ہو ذرّوں کی زباں بھی فطرتاً تسبیح خواں

ہر کلی بے چین ہو جب پھول بننے کے لئے
قطرۂ شبنم ہو مضطر جب مچلنے کے لئے

جب ہوں مشرق سے ہویدا کچھ طلائی بجلیاں
جب چمک جانے پر آمادہ ہو خورشیدِ جہاں

کاش ایسے وقت میں تم آؤ بن کر جانِ دل
ہو تبسم سے تمہارے منجلی ایوانِ دل

کشمکش سے دو جہاں کی تنگ جب ہو جاؤں میں
اور جب راہِ محبت میں کہیں کھو جاؤں میں

جب نہ رہبر ہو کوئی میرا نہ کوئی رہنما
جب ہو میری روح میں پیدا غمِ بے انتہا

جب جنونِ عشق کر دے پرزے پرزے پیرہن
اور جب ہر ذرۂ صحرا ہو مجھ پر خندہ زن

جب ہلاکِ غربت و بے چارگی ہونے لگوں
جب میں اپنا حالِ ابتر دیکھ کر رونے لگوں

ضعفِ دل سے سانس تک لینا بھی جب دشوار ہو
جب طبیعت ہی مری خود زیست سے بیزار ہو

کاش اُس ساعت میں تم لاؤ پیامِ زندگی
صبح میں تبدیل ہو پھر میری شامِ زندگی

جب فزوں ہو جائیں دردِ عشق کی بے چینیاں
جب دلِ صد چاک ہو جائے مرا آتش بجاں

جب نفس کی آمد و شد ہو شکارِ بیکسی
جب میری ہستی ہو رہینِ اختیارِ بیکسی

جب مرا جینا نگاہِ دو جہاں میں ننگ ہو
جب فراز و پستِ عالم میرے دل پر تنگ ہو

جب غمِ ایام سے ہو جائے مشکل زندگی
جب نظر آنے لگے خود مجھ کو باطل زندگی

جب نہ کوئی دردمندِ دل نہ چارہ ساز ہو
جب میری روحِ پریشاں مائلِ پرواز ہو

کاش ایسے وقت میں ممکن تمہاری دید ہو
از سرِ نو زندگی کی مجھ کو پھر امید ہو

نذیر احمد ظفر

فنِ صحافت کا معیار

(آیندہ دس سال میں)

فنِ صحافت نے جو مقبولیت مغربی ممالک میں حاصل کی ہے۔ اور جو مدارج اس نے وہاں طے کئے ہیں۔ غالباً اس کا عشرِ عشیر بھی ہندوستانی صحافت کو نصیب نہیں ہوا۔ شاید اس کی وجہ انگریزی حکومت اور زبان انگریزی کی مقبولیت ہے۔ یا خود اُردو کی اوائل عمری لیکن علوم اصطلاحیہ میں مشرق کی قدرتی پستی بھی اس کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جو معلومات عرصہ گزرا، ہم نے مغربی ممالک میں پڑھی تھیں۔ آج کل ہندوستان میں رائج ہو رہی ہیں۔ تاہم مغرب اور مشرق میں ایک بات مشترک ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جس طرح لوگ اُن ممالک میں فنِ صحافت پر زوال آجانے کی شکایت کر رہے ہیں۔ اسی طرح باخبر حلقے ہمارے اخبارات اور رسائل کے معیار میں کمی محسوس کر رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ وہ لوگ اس کمی کو رفع کرنے کی تدابیر بھی سوچ رہے ہیں۔ اور ہم ابھی اس طرف متوجہ بھی نہیں ہوئے۔ یہ سچ ہے۔ کہ اخبارات اور رسائل کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بات عموماً تسلیم کی جائے گی۔ کہ انکا معیار زیادہ بلند نہیں رہا۔ اس لئے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ گذشتہ زمانے نے تو فنِ صحافت میں انحطاط کا زمانہ دیکھا۔ لیکن آئندہ وقت میں اس کا معیار کیا ہوگا۔ کیا اس تنزل کا احساس جلدی ہی ہو جائے گا۔ اور مختلف تجاویز عمل میں لائی جائیں گی۔ یا ابھی اُردو صحافت میں اور خرابیاں پیدا ہوں گی؟ غالباً ناظرین مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اُردو صحافت کے پیشِ نظر ایک شاندار مستقبل ہے۔ اور یقیناً آئندہ دس سال میں ان تمام عیوب کا ازالہ ہو جائے گا۔

انگریزی اخبارات میں اس موضوع پر ہر روز متعدد مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لوگ اخباروں کے موجودہ نظم ونسق کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اور اُن کا مطالبہ ہے۔ کہ جلدی ہی صحافت کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ احساس اب اس حد تک پہنچ چکا ہے۔ کہ لوگ یہ قیاس آرائیاں بھی کر رہے ہیں۔ کہ آج سے دس سال بعد انگلستان میں روزانہ اخباروں کا معیار کیا ہوگا۔ اور ان کا اجراء کس دستور العمل کے ماتحت ہوا کرے گا۔ اسی قسم کا ایک مقالہ اخبار سپیکٹیٹر (SPECTATOR) میں مسٹر سینٹ جان اروِن کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر اس کے چند اقتباسات اس جگہ نقل کئے جائیں :-

"مسٹر آر۔ ڈی۔ بلوم فیلڈ نے اپنی دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب "میرے وقت کا پریس" میں اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ کہ آج کل اخبار کے نامہ نگار کی ذاتی خصوصیات بیس سال یا اس سے پہلے کے نامہ نگار کی خصوصیات سے ادنےٰ درجہ کی ہیں۔ وہ اس کی کئی وجوہ بتاتے ہیں۔ جن میں سے سب سے بڑی یہ ہے۔ کہ آج کل لوگ اپنی سرگرمیوں کے دائرے کو محدود کرتے جا رہے ہیں۔ مثلاً ایک اخبار کے نامہ نگار کو موٹر کے متعلق ہر قسم کی واقفیت ہونی چاہئے۔ خواہ اس کے علاوہ اسے کسی اور چیز کا علم ہو یا نہ ہو۔ تقریباً تیس چالیس سال پہلے کا نامہ نگار جو ہر نوع کے مضمون پر ایک اعلےٰ پایہ کا مقالہ لکھ سکتا تھا۔ آج کل معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ نامہ نگاروں کے اس ذہنی زوال پر یہ اثر پڑا ہے۔ کہ قابل۔ اولوالعزم۔ اور تعلیم یافتہ نوجوان اُس پیشہ کی طرف بہت کم توجہ دے رہے ہیں۔ جو ان کی قابلیت اور لیاقت کے اظہار کا بہت کم موقع دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ معیارِ صحافت میں بھی زوال

؟ تا جا رہا ہے۔ مسٹر بلوم فیلڈ کا بیان شاید ایک بوڑھے آدمی کی قنوطیت کا نتیجہ خیال کیا جائے۔ لیکن آپ کے دوست مسٹر بلوم فیلڈ پر یہ الزام عاید نہ کریں گے کیونکہ اُن کی دیانتداری اور وسیع النظری مسلّم ہے۔ اور ان کی خوش مذاقی کے سب معترف ہیں۔ آج کا کثیر الاشاعت اخبار کل کے کثیر الاشاعت اخبار سے گرا ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۱۳ء کے "ڈیلی میل" اور "ڈیلی ایکسپریس" سے سنہ ۱۹۳۴ء کے "ڈیلی میل" اور "ڈیلی ایکسپریس" کا مقابلہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ ان کے علمی اور ادبی مواد میں ایک حیرت انگیز کمی واقع ہوگئی ہے۔ یہ کمی لوگوں کی ذہانت میں عام کمی کی وجہ سے ہے۔ جو سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد ظہور میں آئی۔ اور جس کو آجکل ہر شخص ہر جگہ محسوس کر رہا ہے۔ نہ کہ لارڈ نارتھ کلف اور لارڈ راتھرمیر کی شخصیتوں میں فرق ہونے کی وجہ سے۔ اگر اول الذکر آج زندہ ہوتا تو وہ موجودہ "ڈیلی میل" سے ہر طرح مطمئن ہوتا۔ کیونکہ یہ بھی عوام کی ذہنیت کا پوری پوری طرح آئینہ دار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ لارڈ نارتھ کلف کا اخبار اُن کے بھائی کے اخبار کے برعکس دماغی لحاظ سے اعلے پایہ کے لوگوں میں پڑھا جاتا تھا۔

جنگِ عظیم کے دوران میں جب میں فرانس سے چھٹی پر تھا۔ اور انگلستان آیا ہوا تھا۔ تو میں مسٹر بلوم فیلڈ سے ملا اور اس سے شکایت کی کہ اس کے ایڈیٹوریل اب ناقص ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے میری شکایت کا جواب دیا۔ پہلے ایک کالم کے دو مضمون شائع ہوا کرتے تھے۔ اب اسی ہی جگہ آٹھ مضمون شائع ہوا کرتے ہیں۔ لوگ تین سو سے زیادہ الفاظ کے مضمون پر غور نہیں کرسکتے۔ ہماری ملاقات کے بعد ہی میں نے دیکھا کہ ایڈیٹوریل طویل ہونے شروع ہوئے۔ اور آٹھ کی بجائے صرف چھ چھپنے لگے۔ اور آخر کار اُن کی تعداد فقط چار رہ گئی۔ آج کل ہر کثیر الاشاعت اخبار کا ادارہ موٹی موٹی سرخیوں۔ حوالوں۔ نقلوں اور تصاویر وغیرہ سے پُر ہوتا ہے۔ اور اس قدر مہیب دکھائی دیتا ہے۔ کہ سوائے چڑچڑے مزاج کے لوگوں کے اُسے کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اشاعت میں کمی کی وجہ شاید یہ ہے کہ اخبار کے ایڈیٹروں کو حالات پیش آتے رہے ہیں لوگ اس سے تنگ آچکے ہیں۔ ایک ہی ہفتہ میں دو ایڈیٹروں کا اپنے منصب سے عہدہ برآ ہو جانا ثابت کرتا ہے۔ کہ ہمارے پریس میں ایک زبردست انقلاب آنے والا ہے۔ مسٹر بلوم فیلڈ کہتے ہیں۔ کہ عوام متانتِ خیال میں بالغ ہو چکے ہیں۔ جبکہ اخبارات ابھی بچپن کا دور ہی ختم کر رہے ہیں۔

"آئندہ دس سال میں صحافت کا معیار کیا ہوگا؟" مسٹر بلوم فیلڈ نے پیشین گوئی کی ہے۔ کہ "آئندہ دس سال میں اخبار کی ایک زیادہ اہم اشاعت ہوا کرے گی۔ اور اس کا علمی اور ادبی معیار بلند ہوا کرے گا"۔ اور واقعی مسٹر بلوم فیلڈ کا قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اخبار موجودہ حالت سے زیادہ اچھا اور اس سے زیادہ بے وقعت اور کیا ہوسکتا ہے۔ بیہودہ خبروں کی اشاعت بہت حد تک کم ہو جائے گی۔ اور اگر ایسا مواد اخبار کو بہم پہنچایا گیا۔ تو اسے اتنی اہمیت نہ دی جائے گی۔ اخبار کی تیاری میں زیادہ وقت صرف ہوگا۔ اور اُسے محض چھاپ دینے کی کوشش نہ کی جائے گی۔ آج کل اخبار کا بہت سا حصہ موٹی موٹی سرخیوں میں ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ اکثر ایسی سرخیاں بے معنی اور گمراہ کن ہوتی ہیں۔ لیکن آئندہ دس سال میں ایسا نہ ہوگا۔ کسی سنجیدہ بحث میں دلائل کے درمیان مزاحیہ فقرے استعمال کرنے کی فضول کوشش کم ہو جائے گی۔ اخبار کے ادارہ میں تصاویر، حوالے، نقلیں اور موٹی موٹی سرخیاں بالکل ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے ایک گستاخ لڑکا ایک سنجیدہ گفتگو میں بیہودہ مداخلت کر رہا ہو۔ لفظ "سنجیدہ" اپنے صحیح معنی حاصل کر لے گا۔ اور آج کل کے رواج کے مطابق اس کا مطلب پھسپھسی اور بے معنی خبریں نہ ہوا کریں گی۔ خبریں سوچ بچار کے بعد لکھی اور ڈھونڈ کر انتخاب کی جائیں گی۔ نیز آج کل کی دیوالہ نکالنے والی تجاویز جن سے خریداروں میں مفت تحائف تقسیم کئے جاتے ہیں۔ بند ہو جائیں گی۔ اور وہی روپیہ جو مستقل خریداروں میں سگرٹ کیس۔ کپڑوں کے پریس۔ اور ایچ۔ جی۔ ویلز کے ناول تقسیم کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ اخبار کو زیادہ دلچسپ بنانے میں خرچ ہوگا۔ مستند مضامین کو چٹکلوں پر ترجیح دی جائے گی۔ ایڈیٹر کی ہمیشہ یہی کوشش ہوگی کہ وہ خریداروں کو اتنی ہی قیمت میں زیادہ سے زیادہ مواد بہم پہنچائے۔ "آبزرور" اور "سنڈے ٹائمز" کی کثیر اشاعت اس بات کی شاہد ہے۔ کہ لوگ قابل مطالعہ مستند چیزوں کے اب بھی خواہاں ہیں۔ تمام قومی اخباروں کا بیشتر حصہ صرف دس منٹ میں ختم کیا جاسکتا ہے۔

"لیکن سب سے بڑی تبدیلی جو واقع ہوگی وہ یہ ہے۔ کہ اخبارات مختلف فریقوں کی حمایت کرنے اور آپس میں لڑنے جھگڑنے کی بجائے ملکی مفاد کو ترجیح دیا کریں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ وہ اپنے دستور العمل کو بھی بدل دیں گے۔ بلکہ اپنے مخالفین کو بالکل نظرانداز

کردینا اور ان کے وجود سے ہی انکار کرنا ان کا کام نہ ہوگا۔ میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔ جب جان بوجھ کر غلط خبریں چھاپنے اور سیاسی لیڈروں کے بیانات کو غلط پیرائے میں چھاپنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ چلا چلا کر غلط خبریں سنانے والا اخبار فروش بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ اور اس کی سزا قید ہوگی۔ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ محض ذاتی عناد کی وجہ سے اپنے سیاسی مخالفین کے اعلانات غلط پیرائے میں چھاپنے والا کیوں نہ سخت سے سخت سزا کا مستوجب ہو۔ لاسلکی اخبار والوں کے لئے سخت مشکلات حائل کر رہی ہے۔ کیونکہ مسٹر بالڈون کی تقریر کے متعلق مجھے دعوکا دینا آسان نہیں جبکہ میں خود اس تقریر کو بذریعہ لاسلکی سن چکا ہوں۔ لاسلکی لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر کر رہی ہے۔ یہ ایک ایسا اثر ہے۔ جسے مسٹر بلوم فیلڈ مستحسن نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور جس کے وہ منتظر ہیں۔ لیکن اس سے اخبارات کے بیشتر ایڈیٹر ڈرتے ہیں۔ اور سخت نفرت کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ کہ لاسلکی کو وسعت دینے سے اخبارات کی ہر دلعزیزی کو نقصان پہنچے گا بلکہ ان کی بہتری کے لئے اور ان کے معیار کو بلند کرنے کے لئے میرے خیال میں اس سے زیادہ مفید اور کوئی چیز نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں کو تفریح کے لئے زیادہ وقت مل جانے کا اثر اخبارات پر بھی ضرور پڑے گا۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ زندگی کے میکانکی پہلو اس قدر ترقی کر گئے ہیں۔ کہ آئندہ ہمارے کام اس سے چوتھائی وقت میں ہوجایا کریں گے۔ ایک ملک یا قوم جس کو اتنی فرصت ہے۔ کہ وہ اس چیز پر جس کا وہ مطالعہ کرتی ہے۔ غور کر سکے۔ تو ضروری ہے۔ کہ وہ اس بات کا مطالبہ کرے کہ اس کو پڑھنے کے لئے بہتر چیزیں دی جائیں۔ ہفتہ وار تنقیدیں زیادہ اور طویل ہوجائیں گی۔ جن کی قیمت کم ہوا کرے گی۔ اور تعداد اشاعت بھی ادارہ کے خواب وخیال سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ مجھے حیرت نہ ہوگی۔ اگر دس سال کے بعد "سپکٹیٹر" کی قیمت دو آنے اور اس کی ہفتہ وار اشاعت ایک لاکھ تک پہنچ جائے۔ ہزارہا مزدور پیشہ لوگ اس کو اس کی قیمت کی زیادتی کی وجہ سے نہیں خریدتے۔ ہاں اگر اس کی قیمت کم ہوجائے تو بہت سے اس کو خریدنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ مزدور پیشہ لوگ اخبار کو اس واسطے بھی نہیں خریدتے کہ باقی اخباروں کی طرح اس میں بھی ایسی کتابوں کے ریویو شائع ہوتے ہیں۔ جو صرف ایک مخصوص علمی طبقے کی دلچسپی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ چالیس صفحے کا ایک تنقیدی رسالہ جس کی قیمت دو آنے ہے۔ اور جس میں اعلےٰ درجہ کے کارٹون گاہے بگاہے تصاویر اور دیگر مضامین اُن مصنفین کے شائع ہوتے ہیں۔ جن کو اپنی آرا پر اعتماد ہے۔ اور جو ان آرا پر مذاق کئے جانے سے نہیں گھبراتے۔ ضرور کامیاب ہوگا۔ تم میں سے ہر شخص ایک پرچہ کا خواہاں ہے۔ جو ہمیں صبح شائع ہونے والے روزناموں کی خبروں کی پڑتال کرنے میں مدد دے۔ اور یہی ایک ہفتہ وار اخبار کا منشا اور مقصد ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کم اشاعت اور مقابلۃً زیادہ قیمت اسے اپنے مقصد میں ناکامیاب رکھتی ہے۔ بے کار آدمیوں کو لائبریریوں میں "سپکٹیٹر" پڑھتا دیکھ کر ہر شخص کو میرے دعوے کی سچائی معلوم ہوجائے گی۔ اور اس پر یہ ظاہر ہوجائے گا۔ کہ میری پیشین گوئی بالکل درست ہے۔ مجھے کامل یقین ہے۔ کہ ۱۹۳۵ء کا اخبار ۱۹۳۴ء کے اخبار سے بدرجہا بہتر ہوگا۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ۱۹۱۳ء کے اخبار سے بھی بہتر ہوگا یا نہیں"

مقبول الٰہی

رباعی

جذبات کو بے پناہ کیوں کرتا ہے ہستی اپنی تباہ کیوں کرتا ہے
کیا جانے گناہ تو، جو ناواقف ہے واقف ہے تو پھر گناہ کیوں کرتا ہے

منظر صدیقی اکبرآبادی

اتفاقات

آہ، اس ساعتِ دزدیدہ و نایاب میں بھی،
جسم ہے خواب سے لذت کشِ خمیازہ ترا!
تیرے مژگاں کے تلے نیند کی شبنم کا نزول
جس سے مٹ جانے کو ہے غازہ ترا!
زندگی تیرے لیئے رس بھرے خوابوں کا ہجوم
زندگی میرے لیئے کاوشِ بیداری ہے!
اتفاقات کو دیکھ،
اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ!
ناامیدی سی تری روح پہ کیوں طاری ہے؟
چھوڑ دے وہم کے جال،
بھول جا اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال
آتنا بے صرفہ نہیں تیرا جمال!
اس زمستاں کی جنوں خیز حسیں رات کو دیکھ
آہ، اس ساعتِ دزدیدہ و نایاب میں بھی،
تشنگی روح کی آسودہ نہ ہو!
جسم ہے تیرا جوانی میں کہ نیسانِ بہار
رنگ و نکہت کا فشار!
پھول ہیں، گھاس ہے، اشجار ہیں، دیواریں ہیں،
اور کچھ سائے کہ ہیں مختصر و تیرہ و تار،
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں!
ایسے موہوم خیالات سے آلودہ نہ ہو!
دیکھ پتوں میں لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ،
سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے
اولیں بادہ گساری میں نئی تند شراب،
دفعتاً جس سے لرز اٹھتے ہیں جذبات کے تار!
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں!
کہکشاں میری تمناؤں کا ہے راہ گذار
کاش اس راہ پہ مل کر کبھی پرواز کریں!
آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک،
آ اسی خاک کو ہم جلوہ گہِ راز کریں!
روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں،
آ اسی لذتِ جاوید کو آغاز کریں!
صبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آئے،
اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش گلاب،
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں،
اور خدا ہے، تو پشیماں ہو جائے!

ن۔م۔راشد



دربار خسرو

فریبِ دَولت

قروسس، شاہِ لیڈیا
خسرو، شاہِ فارس
الیسپ، سولن } فلسفی
القمانہ، قروسس کا سپہ سالار

[قروسس، شاہ لیڈیا کا دربار، بادشاہ کی تاج پوشی کی دسویں سالگرہ کا جشن]

قروسس، حضرات! آپ کو اس لئے دعوت دی گئی ہے۔ کہ آپ ہماری تخت نشینی کی دسویں سالگرہ میں شریک ہو کر ہماری مسرت میں اضافہ کریں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ دیوتاؤں نے ہماری رعایا پروری اور عدل گستری سے خوش ہو کر کس طرح ہم پر اپنے احسانات کی بارش کی ہے۔ اور خزانوں کے منہ ہمارے لئے کھول دیئے ہیں۔ دس سال یوں تو آنکھ جھپکنے میں گزر جاتے ہیں۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں دیوتاؤں نے ہم سے کیا کیا عظیم الشان کام لئے ہیں۔ جب سلطنت کی ذمہ داریوں کا بار ہم پر پڑا تو اس وقت ملک خستہ حال تھا۔ فوج میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ تجارت سرد تھی۔ رعایا کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ علما اور اہلِ ہنر مارے مارے پھرتے تھے۔ زندگی لوگوں کے لئے ایک وبال تھی۔ مگر اب ہم نے ایک ایسا لشکر جرار فراہم کر لیا ہے۔ کہ کوئی بادشاہ ادھر آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ ملک میں امن و امان ہے۔ کوئی شریر دم نہیں مار سکتا۔ تجارت ترقی پر ہے۔ مصر سے چاندی کے جہاز آتے ہیں۔ تو شام سے مشک اور عنبر کی پیٹیں آ آ کر ہمارے ملک کو مہکاتی ہیں۔ بابل سے سنگِ مرمر آتا ہے۔ تو فلسطین سے معاہدہ زمین جگہ جگہ ہمارے لئے خزانے اگل رہی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ اس بات میں سرِ مُو بھی مبالغہ ہے؟

حاضرین۔ بے شک بادشاہ کا فرمانا بجا ہے۔ درست ہے۔ حقیقت ہے! اس میں مبالغے کا شائبہ تک نہیں۔

قروسس۔ ہمیں اپنے دانا مشیروں اور اپنی وفادار فوج پر فخر ہے۔ ہم ان میں سے ہر ایک کی خدمات کی قدر کرتے ہیں۔ اور ہر ایک کو اس کی حیثیت کے مطابق انعام و اکرام سے بہرہ اندوز کریں گے۔ بالخصوص القمانہ کی بہادری کی ہم بہت تعریف کرتے ہیں۔ جس نے لٹیروں کی گوشمالی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور ان کے لئے جان کی کبھی پروا نہیں کی۔ القمانہ کو شاہی خزانے میں داخل ہونے دیا جائے۔ اور اُسے اجازت ہے۔ کہ جتنا سونا سمیٹ سکے۔ اپنے ساتھ لے جائے۔

[القمانہ خزانے میں داخل ہو کر اپنی جیبیں۔ اپنے کپڑے۔ اپنے بوٹ اور اپنا منہ سونے سے بھر لیتا ہے۔ اور سر پر بھی سونے کے ذرات بکھیر لیتا ہے۔ یہ بھیس بنا کر وہ قروسس کے سامنے حاضر ہوتا ہے]

قروسس۔ آخاہ! یہ سونے کا پرندہ کہاں سے آ گیا! لیکن ابھی کچھ کسر رہ گئی ہے۔ اس سنہری عقاب کی چونچ تو کوّے جیسی ہے۔ اس کے چہرے پر بھی سونے کا چُورا بکھیر دو تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔

[اس کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے]

قروسس۔ ہم آدھی دنیا سے خراج لیتے ہیں۔ لیکن علم وہ طاقت ہے کہ ہمیں بھی اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ ہماری تمام سلطنت کا خراج ایک طرف اور الیسپ سا عالم ایک طرف۔

الیسپ۔ شہنشاہ کی عین ذرّہ نوازی ہے۔

قروسس۔ الیسپ۔ ہم تمہیں اپنے تاج کا رخشندہ ترین گوہر سمجھتے ہیں۔

الیسپ۔ حضور ناچیز کی قدر افزائی کرتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ شہنشاہ

عالم پناہ ایک غلام کو ایسے ناموں سے یاد فرماتے ہیں۔

قروسس۔ علم بہترین متاع ہے۔ اور عالم کا دماغ بہترین کانِ جواہر ہے۔

الیسپ۔ بادشاہ کی ذات کیمیا ہے۔ اور بادشاہ کی نظر ذرّے کو لعل اور قطرے کو گوہر بنا سکتی ہے۔ لعل اگر بادشاہ کی نگاہوں سے دُور ہے تو ایک بے حقیقت پتھر ہے۔ اور عالم اگر بادشاہ کی عنایات سے محروم ہے۔ تو ایک بے فیض چشمہ ہے۔ بادشاہ کا وجود دنیا میں ایسا ہے۔ جیسے آنکھ میں نور، جیسے جسم میں جان، جیسے انگشتری میں نگینہ۔ جیسے انسان میں عقل، جیسے مندر میں دیوتا۔

قروسس۔ آفرین، صد آفرین، الیسپ، تیری جتنی شہرت سنی تھی تجھے اس سے بڑھ کر پایا۔ (اپنی قبا اتار کر الیسپ کو پہناتا ہے۔ اور اُسے تخت کے ساتھ ہی جگہ دیتا ہے۔)

الیسپ۔ بادشاہ کا اقبال رہتی دنیا تک قائم رہے۔

قروسس۔ کیا سولن فلسفی بھی یہاں موجود ہے۔ (سولن حاضر ہوتا ہے) سولن، تم نے موت و حیات کے کئی عقدے سلجھائے ہیں، تمہاری تمام عمر زندگی کے نکتوں کی گرہ کشائی کے لئے وقف ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ خیال کیا ہے۔ کہ دنیا میں سب سے خوش قسمت شخص کون ہے؟

سولن۔ یہ تو آسان بات ہے۔ میں نے ٹیلس جیسا خوش قسمت شخص کوئی نہیں دیکھا۔

قروسس۔ ٹیلس؟ ٹیلس کون؟ ہم نے تو کبھی اس شخص کا نام تک نہیں سنا۔

سولن۔ حضور نے اس کا نام سنا ہو یا نہ سنا ہو، اس سے اُس کی خوش قسمتی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

قروسس۔ ایک گمنام شخص دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان کیونکر ہو سکتا ہے۔

سولن۔ شہرت خوش قسمتی کی کوئی دلیل نہیں، میں ٹیلس کو اس لئے دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تصوّر کرتا ہوں کہ اُس نے حلال کی روزی کما کر زندگی بسر کی۔ اور اپنی زندگی وطن کے ناموس پر نثار کر دی۔

قروسس۔ ٹیلس کو چھوڑو، کسی اور شخص کی بات کرو۔

سولن۔ میں نے دو اور خوش نصیب جوان دیکھے ہیں۔ کلوبی اور بطنی۔

قروسس۔ تم نے کس بنا پر یہ رائے قائم کی ہے؟

سولن۔ میں کلوبی اور بطنی کو اس لئے خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ کہ انہوں نے اپنی ماں کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ اُن کی ماں ایک بیل گاڑی میں جا رہی تھی۔ دشمن تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن بیل تھک کر رہ گئے، فرض شناس بیٹوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ اُن کی ماں پیادہ چلے۔ اس لئے وہ خود گاڑی میں جُت گئے۔ اور اُسے منزل پر پہنچا آئے۔ منزل پر پہنچ کر دونوں نے دم توڑ دیا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے سرخرو ہو گئے۔

قروسس۔ اگر تم مُردوں ہی کو خوش قسمت سمجھتے ہو۔ تو زندوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہ ہوا۔ یہ تو سوچو کہ زندگی بھی آخر ایک نعمت ہے۔ زندوں میں بھی تو کوئی خوش قسمت ہوگا۔ مجھے ہی دیکھو، مجھے کون خوش قسمت نہ کہے گا۔

سولن۔ جہاں پناہ! اس مسئلہ میں عقل بیکار ہے۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں یہ کسی سے وفا نہیں کرتی۔ دنیا نہ کسی کی ہو کر رہی ہے۔ نہ رہے گی۔ دولت ڈھلتی چھاؤں ہے۔ صبح یہاں ہے شام وہاں۔ قسمت کا بھی یہی حال ہے۔ آج کسی کو تخت پر بٹھاتی ہے۔ تو کل اُس کو تختۂ دار پر چڑھاتی ہے۔ جب تک کوئی شخص زندہ ہے۔ ہم اُسے خوش قسمت نہیں کہہ سکتے۔ اس کا فیصلہ موت ہی کرتی ہے۔ کہ اس کی زندگی کامیاب تھی یا ناکام۔ میں اُس کو خوش قسمت سمجھتا ہوں جس کا انجام اچھا ہو۔ انجام سے پہلے کوئی خوش قسمت نہیں۔

قروسس۔ ہمیں تم ایسے عالم سے یہ امید نہ تھی ؎

ہم کو یہ راگ سناؤ گے یہ معلوم نہ تھا
شہد میں زہر ملاؤ گے یہ معلوم نہ تھا
خوب موقع تھا دوں کو یہ دکھانے کے لئے
تم یہاں آئے تھے کیا وعظ سنانے کے لئے

سولن۔ میں نے صرف آپ کے سوالوں کا جواب دیا ہے۔ اور آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

الیسپ۔ سولن، یاد رکھو، بادشاہوں سے تمہاری گفتگو یا تو مختصر ہونی چاہئے یا پُر لطف۔

سولن۔ پُر لطف! الیسپ، تمہاری منطق کدھر گئی، فلسفی ہو کر لفظوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے؟ پُر لطف! فلسفی بھی کیا کوئی بھانڈ ہو

مسخرا ہے۔ یا نقال ہے۔ جو پُر لطف باتوں سے جی پرچائے۔ یہ کہو گفتگو مختصر ہونی چاہئے یا پُر مغز۔ سمجھے فلسفہ مآب الیسپ صاحب

الیسپ۔ سولن! مصلحت وقت دیکھ کر بات کرو۔

سولن۔ تم وقت کو دیکھو، میں عاقبت پر نظر رکھوں گا۔

قروسس۔ ہم نے اس لفظی جنگ سے بہت حظ اٹھایا ہے۔ اب بہتر ہے کہ اسے ختم کر دیا جائے۔

منظر دوم

قروسس کا دربار

قروسس۔ (شاہ ہمدان کا خط پڑھتا ہے) "ہمیں بہت افسوس ہے۔ کہ حالاتِ مملکت نے ہمیں اتنی مہلت نہ دی کہ ہم شاہ والاتبار قروسس کی تقریب سالگرہ میں شریک ہو کر لطف اندوز ہوتے۔ ہم بعض سرکشوں کی گوشمالی کرنے میں بہت مصروف ہیں۔ ورنہ ہم خود شاہِ عالی قدر قروسس کے جشن میں ہونے کی آرزو پوری کرتے۔ ملکۂ ہمدان کو بھی افسوس ہے کہ وہ اپنے برادرِ ذوالاقتدار کی مسرت میں اضافہ نہیں کر سکیں۔"

آخر یہ "حالاتِ مملکت" ہیں کون سے جنہوں نے ہمدان شاہ کو اپنے ملک میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے؟ سنا ہے کہ ہمدان سے کچھ مسافر آج ہی یہاں وارد ہوئے ہیں۔ سپہ سالار القانہ کو ہمدان کے حالات سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی چاہیئے۔ (سپہ سالار مسافروں سے حالات دریافت کر کے عریضہ پیش کرتا ہے۔)

قروسس۔ القانہ لکھتا ہے "مسافروں کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ ہمدان میں تھے تو خسرو امیر فارس نے جنوبی ایران میں بغاوت کا علم بلند کیا۔ اور پے در پے شاہی فوجوں کو شکستیں دیں۔ شاہِ ہمدان بہ نفسِ نفیس اس کے مقابلے کے لئے صف آرا ہوئے لیکن اس پر غلبہ نہ پا سکے۔ آخر کار جی ہار کر میدان خالی کر گئے۔ جب مسافر ہمدان سے روانہ ہوئے۔ تو شہر کو باغیوں نے گھیرا ہوا تھا۔"

(خسرو شاہِ فارس کا ایلچی داخل ہو کر خسرو کا نامہ پیش کرتا ہے۔)

قروسس۔ (خط پڑھتا ہے) "خسرو شاہِ ایران"۔ شاہِ ایران! حقیقت ہے۔ یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ (آنکھیں مل کر) "خسرو شاہِ ایران بنام قروسس، شاہ لیڈیا ہر گاہ کہ اعلیحضرت کیخسرو شاہِ ایران استیاجو شاہِ معزول کی جگہ تخت نشین ہوتے ہیں۔ آنجناب سے یہ امید ہے کہ دولتِ ایران اور شاہِ لیڈیا میں وہی تعلقات از سرِ نو قائم ہوں گے۔ جو شاہ معزول کے عہد میں تھے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ فارس کا ادنیٰ سردار لیڈیا کے شہنشاہ سے یہ کہتا ہے۔ کہ مجھے اپنے برابر سمجھو اور مجھ سے برابری کا سلوک کرو۔ کہتے ہیں مینڈکی کو زکام ہونا۔ باغی خسرو سے کہ دو کہ جب تک سورج مغرب سے نہ چڑھے۔ اور سمندر خشک نہ ہو جائیں۔ شاہِ لیڈیا تجھ جیسے ہیچ، کمینے اور محسن کش سے خطاب کرنا بھی خلافِ شان سمجھتا ہے۔ خسرو اچھی طرح جان لے۔ کہ گیدڑ کی موت آتی ہے۔ تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ اور فارس کے رذیل رجواڑے کی شامت آتی ہے۔ تو وہ شاہ لیڈیا کے مُنہ آتا ہے۔

منظر سوم

قروسس۔ تم شہزادے کی فوج کے ہمراہ تھے، کیا خوشخبری لائے ہو۔

القانہ۔ حضور . . . . .

قروسس۔ القانہ۔ کیا خیر تو ہے۔ تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں نظر آتا ہے۔

القانہ۔ حضور کیا عرض کروں . . .

قروسس۔ کیا ہمارے شہسواروں نے ابھی ایران کے سرحدی قلعوں کو فتح نہیں کیا؟

القانہ (سر ہلاتا ہے۔)

قروسس۔ کیا وہ ابھی بدبخت خسرو کے حملے کا انتظار کر رہے ہیں۔

القانہ۔ حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

قروسس۔ جو بات ہے۔ بے خوف ہو کر کہو، لیکن ہمیں اور بیتاب نہ کرو، بتاؤ، جلد بتاؤ۔ شہزادے کو شکست تو نہیں ہوئی۔

القانہ۔ عالم پناہ۔ ایسا ہی ہوا ہے۔

قروسس۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ کہ ایک بے سر و سامان لٹیرے نے ہماری مسلح فوجوں کو زک دی ہو۔

القانہ۔ جہاں پناہ! ایسا ہی ہوا ہے۔ خسرو ہمارے شہسواروں کے سامنے ٹھیر نہ سکتا تھا۔ لیکن اس نے ان کے مقابلے کے لئے شتربان آگے کر دیئے، ہمارے گھوڑے اونٹوں کو دیکھ کر سہم گئے۔ اور پیچھے کو بھاگنے لگے۔ شہسواروں نے ہزار کوشش کی کہ میدان میں جمے

رہیں۔ لیکن گھوڑے بے قابو ہوگئے، دشمن نے اس پریشانی سے فائدہ اٹھا کر ہمارے خیموں کو لوٹ لیا۔ اور ہمارے اکے دُکے نوجوانوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ اگر گھوڑے نہ بھاگتے۔ تو ضرور ہماری فتح ہوتی۔

قروسس۔ شہزادہ کہاں ہے؟

القمانہ۔ جہاں آپ اُسے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ کاش آپ یہ سوال مجھ سے نہ پوچھتے!

قروسس۔ غضب ہوگیا! میری تمام عمر کی دولت لٹ گئی میرا اکلوتا بیٹا یوں ہاتھ سے چلا گیا۔ آہ! بیٹا! تم بوڑھے باپ کو اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ مرنا مجھے تھا۔ تم نے کیوں پہل کی۔ ہائے میرے لئے موت کیوں نہیں آتی؟

القمانہ۔ خدا شہنشاہِ عالم پناہ کو سلامت رکھے! جہاں پناہ! ضبط سے کام لیجئے، اور شہزادہ عالی تبار کا انتقام لینے کی کوئی تدبیر کیجئے۔ جان نثار اس وقت تک دم نہ لیں گے۔ جب تک خسرو کا سر حضور کے قدموں پر نہ ڈال دیں گے۔ لیکن اب تو ضبط کیجئے۔

قروسس۔ ضبط! ایسا صدمہ اور ضبط!! ....
اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ آ کر مجھے رلاتی ہے۔ آہ! جوانِ مرگ! دو دن شباب کی بہاریں تو دیکھنے۔

القمانہ۔ جہاں پناہ! خسرو کی روک تھام کی کوئی تدبیر کیجئے۔ قلعہ کی دیواریں شکستہ حالت میں ہیں۔ ان کی مرمت کا حکم دیجئے۔
تمام ملک میں بھرتی کا اعلان فرما دیجئے تاکہ حملہ آوروں کی مدافعت ہو سکے۔

قروسس۔ قلعہ کی مرمت دیکھی جائے گی۔ فوج بھی اپنے وقت پر فراہم کر لی جائے گی۔ اب سردی کا موسم آگیا ہے۔ عنقریب برف باری بھی شروع ہو جائے گی۔ طارس کا پہاڑ میرا قلعہ ہے۔ اور برف و باراں میری فوج۔ خسرو اس قلعے کو کیسے سر کرے گا۔ اس فوج کو کیسے شکست دے گا؟ سردی گزرنے تک یونان سے کمک آ جائے گی۔ اور ہم خود فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیں گے؟

القمانہ۔ لیکن جاں نثار اتنی دیر تک کیونکر صبر کریں گے۔ وہ شہزادے کے انتقام کے لئے مضطرب ہیں۔ اس حادثہ سے سلطنت کو جو صدمہ ہوا ہے۔ اس کی تلافی کیسے ہوگی؟

قروسس۔ اس کا بار بار ذکر کر کے مجھے نہ رلاؤ۔ میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔ آہ! میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ میں نے تمام عمر شراب نہیں پی لیکن اب اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ ایک دو گھونٹ شراب!

(شراب لائی جاتی ہے۔)

القمانہ۔ عالم پناہ! دشمن نے کوہ طارس کو عبور کر لیا ہے۔ نواح کی رعایا بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہوئی ہے۔ فرمائیے اب ان کے انتظام کی کیا صورت ہوگی۔ دشمن کا مقابلہ کیونکر ہوگا؟

قروسس۔ (شراب پیتا ہے۔)

القمانہ۔ فوج آس پاس کے شہروں میں بکھری پڑی ہے۔ یا تو اسے یہاں جمع ہونے کے احکام جاری فرمائیے۔ یا شہر کو خالی کرنے کی اجازت دیجئے۔

قروسس۔ (شراب پیتا ہے۔)

القمانہ۔ اگر تمام رسد اسی ہفتے کے اندر اندر قلعے میں جمع کر دی جائے۔ تو ایک سال تک دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ——

قروسس۔ (شراب پیتا ہے۔ اور گاتا ہے۔)

سلطنت ہاتھوں سے جاتی ہے تو جائے
اب مے و نغمہ سے مجھ کو کام ہے
غم غلط کرنے کا ہے اچھا طریق
ورثۂ جم بادۂ گل فام ہے

منظر چہارم

(خسرو قروسس کے قلعہ میں داخل ہوتا ہے۔)

القمانہ۔ میں اکیلا خسرو سے لڑوں گا۔ یا یہ تلوار خسرو کی گردن اڑا دے گی یا یہ سر مرے آقا پر نثار ہو جائے گا۔

(خسرو قروسس کے محل میں داخل ہو کر اسے گرفتار کر لیتا ہے۔ اور اس کی مشکیں کسوا کر اسے جلائے جانے کا حکم دیتا ہے۔)

قروسس۔ (چتا پر بندھا ہوا) آہ! سولن! سولن! سولن!

خسرو۔ اسے چتا پر سے اتار دو۔ ہم قیدی سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ (قروسس چتا سے اتارا جاتا ہے) کیا سولن تمہارے کسی دیوتا کا نام ہے؟

قروسس۔ ہاں! اب مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ سولن ایک دیوتا تھا جو

انسان کا بھیس بنا کر آیا اور میں نے اس کی قدر نہ کی۔

خسرو۔ وہ کیوں۔

قروسس۔ قروسس ہمیشہ بے یار و مددگار نہ تھا۔ اس کی بھی سلطنت تھی۔ سپاہ تھی۔ جاہ و حشم تھا۔ دولت تھی۔ دنیا اس کی فوج کا شمار نہ کر سکتی تھی۔ اس کی دولت صحرا کے ذروں سے زیادہ اور آسمان کے ستاروں کی طرح بے اندازہ تھی۔ قسمت اس کی ہم رکاب تھی۔ اقبال اس کے قدم چومتا تھا۔ طول و عرض عالم میں اس کی تعریف کے راگ گائے جاتے تھے۔ تمام دنیا اس کی شہرت پر رشک کرتی تھی۔ اُسے "خوش قسمت قروسس" کہا کرتی تھی۔ لیکن ایک شخص تھا جسے اس کی دولت مرعوب نہ کر سکی۔ جس کی آنکھیں اس کی دولت سے خیرہ نہ ہوئیں۔ اور وہ شخص تھا سولن! وہی تھا جس نے مجھے خوش قسمت نہ کہا۔ اور اس بات پر مُصر رہا کہ قسمت کا فیصلہ موت کے ہاتھ میں ہے۔ آج اس کی بات حرف بحرف سچ ثابت ہوئی ہے۔

خسرو۔ قروسس۔ مجھے تجھ سے جو حکمت کا درس ملا ہے۔ میں اس کے صلہ میں تیری جان بخشی کا حکم دیتا ہوں۔ اب تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ اور میں تیرے مشوروں پر عمل کرتا رہوں گا۔

اتفاقاً۔ زندہ باد سولن! جس نے ایک بادشاہ کی جان بچائی۔ اور دوسرے کو ہدایت دی +

کلیم

رُباعی

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

امجد

دل

(سانیٹ)

دل بظاہر خون کا اک قطرۂ ناچیز ہے
اس میں ہے لرزاں مگر رنگِ شرابِ زندگی
اس کے آگے جلوۂ لعلِ شفق کیا چیز ہے
منحصر اس کی نمو پر ہے شبابِ زندگی

جس طرح روشن فلک پر آفتابِ زرنگار
اس طرح دل خاکدانِ دہر میں ہے نور پاش
عقل ہو جاتی ہے جب بیگانۂ ہوش و قرار
دل ہی کرتا ہے فریبِ رنگ و بو کے راز فاش

دل، محبت لفظ تو دو ہیں مگر مطلب ہے ایک
منسلک دونوں ازل سے ایک ہی رشتے میں ہیں
جس طرح آغاز و انجام مہ و کوکب ہے ایک
ایک ہی منزل ہے ان کی، ایک ہی رستے میں ہیں
آدمی کو آشنائے غم بنا دیتا ہے دل
عشرتِ جاوید کا محرم بنا دیتا ہے دل

ضیا فتح آبادی

سوزِ تمام

جہاں تجھ کو بٹھا کر پوجتے ہیں پوجنے والے
وہ مندر اور ہوتے ہیں شوالے اور ہوتے ہیں

دہانِ زخم سے کہتے ہیں جن کو مرحبا بسمل
وہ خنجر اور ہوتے ہیں وہ بھالے اور ہوتے ہیں

جنہیں محرومیٔ تاثیر ہی اصلِ تمنّا ہے
وہ آہیں اور ہوتی ہیں وہ نالے اور ہوتے ہیں

جنہیں حاصل ہے تیرا قرب خوش قسمت سہی لیکن
تری حسرت لئے مر جانے والے اور ہوتے ہیں

جو ٹھوکر ہی نہیں کھاتے وہ سب کچھ ہیں مگر واعظ
وہ جن کو دستِ رحمت خود سنبھالے اور ہوتے ہیں

تلاشِ شمع سے پیدا ہے سوزِ ناتمام اختر
خود اپنی آگ میں جل مرنے والے اور ہوتے ہیں

ہری چند اختر

ساس

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افرادِ تمثیل

ڈاکٹر ــــــ لال چند
کام لتا ــــــ ڈاکٹر لال چند کی بیوی
پرمانند ــــــ ان کا بیٹا
سروج ــــــ پرمانند کی بیوی
ایک بھکارن ــــــ

منظر:- ایک مکان کا صحن، صحن کوئی خاص لمبا چوڑا نہیں ادھر اُدھر کچھ گملے پڑے ہیں۔ ایک میز کے گرد چار پانچ کرسیاں دکھائی دیتی ہیں میز پر ایک دو اخباریں اور ایک دو کتابیں پڑی ہیں۔ میز کے قریب ایک معمولی مستطیل چٹائی بچھی ہے صحن کے دائیں بائیں دروازے الف اور ب ہیں۔ الف ایک کمرے میں کھلتا ہے اور ب باہر سڑک کی طرف، الغرض کمرہ نہایت سادہ ہے لیکن صفائی بہت ہے۔ لال چند کرسی پر بیٹھا ہے۔ نہایت سادہ لوح اور پرلے درجے کا شریف انسان واقع ہوا ہے۔ عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہے۔ بیوی ذرا سخت مزاج ملی ہے۔ اُس سے ہمیشہ خائف رہتا ہے۔

ڈاکٹر لال چند۔ (اپنے آپ سے، میز پر پڑی ہوئی کتاب کو اٹھاتے ہوئے) یہ ہے زندگی ڈاکٹر کی۔ آرام سے کھانا نہ وقت پر سونا۔ زخموں کی چیر پھاڑ، مریض کی چیخ پکار۔ کوئی نمونیا کا مریض ہے کوئی ہیضہ میں مبتلا ہے کسی کو نزلہ ہے۔ کوئی دردِ گردہ میں تڑپ رہا ہے۔ اور کہیں بدقسمتی سے مریض چل بسے تو ڈاکٹر پر الزام اگر واقف سے فیس مانگے تو ڈاکٹر پر لعنت۔ نہ مانگے تو پیٹ کا سوال بس یہ ہے زندگی ڈاکٹر کی۔

(کتاب کھولتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے مسکراتا جاتا ہے۔ پھر ایک ساتھ ہنس پڑتا ہے۔ کام لتا دروازہ الف کے اندر کھڑی دیکھ رہی ہے)

لال چند۔ قہ قہ قہ.... مصنف کی جتنی داد دی جائے کم ہے کیا خوب لکھتا ہے" انسان کا سچا رفیق مونس و ہمدرد اس کی بیوی ہوتی ہے۔ دوست آشناؤں، بھائی بہن ماں باپ، رشتہ داروں کو مرتے دیکھا۔ لکھو کھا لڑائیاں دیکھیں ملک تباہ ہوتے دیکھے۔ سلطنتیں برباد ہوتی دیکھیں خاندان غارت ہوتے دیکھے مگر بیوی کی ناراضگی (زور دے کر) سب سے بڑھ کر (جلدی سے) دیکھی"... قہ قہ قہ

(کام لتا سفید دھوتی پہنے داخل ہوتی ہے)

کام لتا۔ یہ کہیں سے آج سو دو سو کا توڑا ملا ہے جو اتنے خوش ہو رہے ہیں۔

لال چند۔ آہا آپ تشریف لے آئیں۔

کام لتا۔ (چٹائی پر بیٹھتی ہوئی) جی ہاں

لال چند۔ اچھا کیا یاد دلایا۔ دو سو کا نام لے دیا مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔

کام لتا۔ اسی لئے تو میں ہزار بار کہہ چکی ہوں۔ کہ آپ کے حافظہ میں کچھ فرق ہے۔ دس چیزیں بتلاتی ہوں۔ جس میں سے آپ دو منگوا کر دیتے ہیں۔ اور جو پوچھتی ہوں کہ دس گز ململ کے لئے

کہا تھا۔ ایک کنگھی چاہئے تھی۔ بہو کے لئے دھوتی کو کہا تھا۔ مشین خراب ہو رہی ہے اس کا تیل منگوانے کو کہا تھا۔ تاگا ختم ہو گیا ہے تو جواب ملتا ہے "بل منگوانے کو کب کہا تھا۔ دھوتی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ کنگھی میری الماری میں پڑی ہے۔ تیل کا خیال ہی نہیں رہا۔ اور ہاں البتہ تاگا منگوانا بھول گیا"!

لال چند (کچھ کھسیانا سا ہو کر) یہ۔ یہ۔۔ سب ——— بالکل جھوٹ

کام لتا۔ جھوٹ! واہ جھوٹ کی بھی ایک ہی کہی۔ دور کیوں جاتے ہیں۔ کل ہی کا ذکر ہے آپ کے دوست بہاری لال آپ ہی سے کتاب مانگ کرلے گئے اور ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا ہو گا کہ لگے مجھ پر برسنے کہ تم نے کہیں کتاب ادھر اُدھر پھینک دی ہے

لال چند۔ ہاں ذرا اپنا بھی تو ذکر کرو۔ کل شام ہی کی تو بات ہے کہ دس دس کے دو نوٹ بکس سے نکال کر اپنی دھوتی میں باندھ لئے اور سارا مکان سر پہ اٹھا لیا تھا۔

کام لتا۔ چلو گذرے ہوئے زمانے کا کیا ذکر۔ اب یہ بتلاؤ کہ دو تین ہزار روپیہ پر جو پانی پھیر دیا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا۔

لال چند۔ کیسا روپیہ۔ کہاں کا ذکر۔ یوں پہیلیاں نہ بجھوایا کرو

کام لتا۔ (حیرانگی سے) خوب! دو ہزار روپیہ ضائع کر دیا اور یہ خبر ہی نہیں کہ کہاں اور کس لئے کیا۔

لال چند۔ ہاں تو ذرا سوچ لینے دو (سوچتا ہے) کوئی سامان تو خریدا نہیں کسی کو دیا نہیں لیا نہیں (پھر سوچتا ہے) ہاں ——— نہیں پرماند نے نہیں مانگا یوں ہی دماغ پریشان کر رہی ہو۔ کسی کو دیا نہیں ضائع نہیں کیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

کام لتا۔ خرچ آپ کریں یاد میں کرایا کروں۔

لال چند (اچانک) ہاں ہاں یاد آگیا۔ ٹھیک کہتی ہو۔ مگر ——— مگر ہاں پچھلے اتوار ایک میز جو نیلام گھر سے لایا تھا۔ اس کی مرمت کروائی بڑھئی کو دس روپیہ دی تھی۔

کام لتا۔ (حیرت سے) خوب۔ میں ہزاروں کا ذکر کرتی ہوں یہ دس روپوں کو لئے بیٹھے ہیں۔ وہ "مے نس پل ٹی" (میونسپلٹی) کی ممبری پر جو روپیہ خرچ ہوا ہے میں اس کا ذکر کر رہی ہوں۔

لال چند (ہنسی کو روکتے ہوئے) مے نس پل ٹی

کام لتا (اونچی آواز سے) جی ہاں

لال چند (ہنستے ہوئے) مے نس پل ٹی

کام لتا۔ اب یاد آیا

لال چند۔ تم دو ہزار کیسے کہہ رہی ہو۔ یہاں پانچ سو سے زیادہ ایک پائی نہیں لگی۔

کام لتا۔ اور وہ پانچ سو کس طرح خرچ ہو گئے

لال چند۔ پارٹی بازی میں ہزار ہا روپے خرچ ہو جاتے ہیں شکر کرو یہاں صرف پانچ سو پر ہی گلو خلاصی ہو گئی۔

کام لتا۔ یعنی پانچ سو خرچ ہو گئے ——— خرچ کیا ضائع ہو گئے۔ خاک میں مل گئے اور آپ کو ذرا رنج نہیں پہنچا۔

لال چند۔ رنج۔ رنج کیسا!

کام لتا۔ لٹا دو سب کچھ۔ ممبری نہ ہوئی جائداد مل گئی۔ یہ آخر مے نس پل ٹی کیا ہے۔ کوئی کمرہ ہے دُکان ہے کوئی پہاڑی مقام ہے۔ یہ کونسی بلا ہے جو آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

لال چند۔ (اٹھتے ہوئے) میں چلتا ہوں تمہاری واہیات باتوں کا کیا جواب دوں۔

کام لتا۔ ذرا بیٹھئے تو سہی مجھے دو ایک باتیں اور کہنا ہیں۔

لال چند۔ (بیٹھتے ہوئے) گویا ابھی کچھ کسر باقی ہے۔

کام لتا۔ (لال چند کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے) آپ کو پرماند نے بتلایا ہے!

لال چند۔ کیا! کچھ بھی نہیں۔ کس چیز کے متعلق!

کام لتا۔ پرمانند اور سروج باتیں کر رہے تھے۔

لال چند (جلدی سے) اور تم سُن رہی تھیں

کام لتا۔ جی ہاں۔ وہ اپنی تبدیلی کرا رہا ہے

لال چند (حیرانگی سے) تبدیلی! کہاں

کام لتا۔ دہلی

لال چند۔ تمہیں کس طرح معلوم ہے۔

کام لتا۔ یہ ہے آپ کا حافظہ

لال چند۔ ہاں۔ ہاں ٹھیک ہے تم چوروں کی طرح سن رہی تھیں (گھڑی دیکھ کر) اوہ بہت وقت ہو گیا ہے میں چلتا ہوں (اٹھتے ہوئے) گھروں میں ایسی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔

(چلا جاتا ہے)

کام لتا دو ہزار ادھر اُڑ گیا ادھر پرمانند جا رہا ہے۔ سروج جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ بیٹا ناراض ہو گیا ہے۔ بیوی کو ساتھ لے گیا ہے۔ ناک کٹ جائے گی۔ انگلیاں اٹھیں گی یہ منتر جادو جو کچھ کیا ہے۔ سروج نے ہی کیا ہے (سوچتی ہوئی بیٹھ جاتی ہے پرمانند دروازہ الف سے داخل ہوتا ہے)

پرمانند بھابی

کام لتا۔ (چونک کر) تم آ گئے بہت دیر لگا دی۔ کہاں تھے۔ سروج کے پاس بیٹھے ہو گے!

پرمانند۔ آپ نے تین سوال ایک ہی وقت پوچھ ڈالے۔ کس کس کا جواب دوں۔

کام لتا۔ تم تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو آؤ بیٹھو۔

(پرمانند بیٹھ جاتا ہے)

کام لتا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے ابھی تمہاری تبدیلی کا ذکر کر رہی تھی

پرمانند (سراسیمگی سے) تبدیلی!

کام لتا (کچھ چونک سی جاتی ہے۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے تبدیلی کا نام لے کر غلطی کی ہے)

ہاں۔ تبدیلی۔ وہ تبدیلی۔ تم کیا ذکر کر رہے تھے۔ میں کچھ بھول سی گئی ہوں۔

پرمانند۔ تبدیلی! آپ کیا چیز بھول گئی ہیں۔

کام لتا۔ (ادھر اُدھر دیکھ کر) وہ تم سروج کو کیا کہہ رہے تھے۔

پرمانند۔ سروج کے ساتھ تبدیلی کا ذکر ـــــ آپ کے سامنے (ایک اخبار اٹھاتا ہے)

(سروج دروازہ الف کے پیچھے کھڑی سب باتیں سن رہی ہے

پرمانند کے چہرے پر حیرانگی کے آثار نمایاں ہیں۔

کام لتا۔ وہ تم سروج سے کہہ رہے تھے کہ ہم دہلی ـــــ ہاں اب مجھے اچھی طرح یاد آ گیا ہے کہ ہم دہلی چلے جائیں گے۔

پرمانند (اخبار میز پر رکھتے ہوئے) ہم دہلی چلے جائیں گے! آپ نے کب سنا!

کام لتا۔ جب تم سنا رہے تھے

پرمانند۔ کس کو

کام لتا۔ جس نے تم کو یہ عقل دی۔ تم کو سکھلایا کہ والدین کو چھوڑ کر تم دہلی

جا بیٹھو

پرمانند۔ تو آپ کا مطلب سروج سے ہے

کام لتا۔ ہاں میرا مطلب اسی بے وقوف سے ہے جس نے تمہاری عقل کو بھی تالا لگا دیا ہے۔

پرمانند۔ بالکل جھوٹ۔ سروج بھولی بھالی لڑکی ہے۔ وہ مجھے کس طرح بہکا سکتی ہے۔

کام لتا۔ آہا یہ سروج بھولی کب سے بنی ہے۔ چالاک! ایسی چالاک کہ جس کی حد نہیں۔ مغرور لڑکی تند مزاج۔ ایسی کڑوی باتیں کرتی ہے کہ دل اُبل اٹھتا ہے

پرمانند (خاموش رہتا ہے)

کام لتا۔ (غصے میں) یہ سب اسی کی پٹی پڑھائی ہوئی ہے۔ ورنہ مجھے بھی خوب یاد ہے کہ تمہیں تو بات بھی نہیں کرنی آتی تھی۔

(سروج غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی مگر یہ بات سن کر مسکراتی ہے۔ اور دیوار کے ایک کونے سے چونے کا پلستر اکھیڑ کر پرمانند کی طرف پھینکتی ہے پرمانند ادھر ادھر دیکھتا ہے مگر اس کو معلوم نہیں ہوتا)

پرمانند۔ (خاموش ہے)

کام لتا۔ کل تماشہ دیکھنے گئے تھے رات کو تین بجے واپس آئے۔ کیا خبر اس نے وہیں یہ کچھ سکھایا ہو۔

پرمانند۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں دہلی جانا چاہتا ہوں۔ یہ روز کی کھٹ پٹ تو بند ہو گی۔

کام لتا (نرمی سے) یہ ہے اولاد کا سکھ۔ لاڈ اور پیار کا نتیجہ۔ ماں باپ بچوں کے لئے کیا کیا نہیں کرتے

پرمانند۔ آپ بھی تو چلیں گی نہ ساتھ۔

کام لتا۔ یہ شرارت سروج کی ہے۔ یہ تم پر جادو ٹونا کرنا اسی کا کام ہے

پرمانند۔ یہ ہے تعلیم نہ دینے کا نقصان۔ اگر آپ کے والدین آپ کو تعلیم دلواتے تو آپ بھی اس سے کچھ فایدہ اٹھاتیں

پرمانند اخبار اٹھاتا ہے۔

کام لتا۔ یہ تو بتلاؤ تعلیم کا کیا فایدہ ہوا۔ اپنی ہی مثال لے لو ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے۔

پرمانند۔ (کچھ شرمندہ ہو کر) تو آپ کیا چاہتی ہیں۔

کام لتا۔ بس میں یہی چاہتی ہوں کہ تم میری بات مان لو یعنی تبدیلی کا خیال چھوڑ دو۔

پرمانند۔ بہت اچھا میں یہیں رہوں گا۔

(سروج پرمانند کی بات سن کر کانپ اٹھتی ہے۔ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ کام لتا اٹھتی ہے اور رسوئی کے دروازہ الف سے جانے لگتی ہے۔ سروج باہر نکل آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ سروج منہ پھلائے رونی صورت بنائے ایک کرسی پر آ بیٹھتی ہے۔ میز سے ایک اخبار اٹھا کر کھولتی ہے)

پرمانند۔ میں تم کو بلانے ہی جا رہا تھا

سروج (خاموشی سے اخبار پڑھتی رہتی ہے)

پرمانند۔ سروج تم نے سنا؟

سروج (خاموش)

پرمانند۔ سروج

سروج (خاموش)

پرمانند (اٹھ کر سروج کے پاس آتا ہے) یہ کیا قسم کھالی ہے کہ بولنا ہی نہیں

سروج۔ (خاموش)

(سروج کے شانے ہلاتا ہے۔ اخبار چھین کر پھینک دیتا ہے)

پرمانند۔ سروج (توقف) کیا سندر چہرہ ہے

سروج (ذرا نزاکت سے) ہوگا۔

پرمانند۔ آخر خفگی کا باعث۔ ناراضگی کا سبب۔ توبہ ایسی روٹھی ہے کہ منانے سے بھی نہیں مانتی۔

سروج (منہ بنا کر) ہماری بلا مانتی ہے۔ اس سے غرض واسطہ

پرمانند (میز کے اوپر سامنے بیٹھتے ہوئے) تو کیا ہم جائیں۔

سروج۔ شوق سے بھابی سے باتیں کیجئے۔ اپنی نوکری کا ذکر کیجئے۔ تبدیلی کا تذکرہ چھیڑئیے ہم کو گالیاں دلوائیے۔ ہم نے تو آپ پر جادو ٹونا کر دیا ہے اب آپ کا کیا بنے گا۔

پرمانند۔ (حیرانگی سے) تمہاری کیا شکایت ہے کس سے گلہ ہے۔ جادو ٹونا ـــــ گالیاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

سروج۔ سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(توقف)

آپ تو بیٹھے سارا دن دفتر میں حکومت کریں اور ہم گھر میں ہزاروں جھڑکیاں سنیں اور گالیاں کھائیں۔ انسان کی زبان ہوتی ہے مجھے تو کہہ دیا کہ اگلے مہینے الگ ہو جائیں گے۔ ادھر بھابی سے وعدہ کیا کہ آپ ہی کے پاس رہیں گے۔ میں اتنی بے سمجھ تو نہیں کہ سمجھتی ہی نہیں۔ اب میرے پاس آئے سبز باغ دکھلانے۔

پرمانند (ہنستے ہوئے) سنو آج چھبیس تاریخ ہے یعنی اگلے مہینے کی پہلی کو پانچ دن باقی ہیں۔ اگر ابھی گھر والوں کو ناراض کر لیں تو یہ پانچ دن روٹی کون دے گا۔ تبدیلی کا حکم غالباً اگلے مہینے آئے گا۔ اگر کوئی اور خطا ہو گئی تو میں ......

سروج (ٹھنک کر) ہوں

پرمانند۔ اب سمجھی

(باہر سے ایک بھکارن کے گانے کی آواز آتی ہے آواز سریلی اور موثر ہے)

پرمانند۔ آہا کتنی دلکش آواز ہے کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی کہاں سے بڑھ چڑھ کر ہے بلاؤ سروج اس کو گانا ہی سنیں۔

سروج بڑے گانے کے شوقین ہیں

پرمانند۔ دیکھو وہ چلی جائے گی

سروج اونہہ۔ ہم تو نہیں اٹھتے۔

پرمانند (اٹھتے ہوئے) تم تم

(سروج اٹھ کر دروازہ ب کھولتی ہے۔ اور پکارتی ہے۔ ایک لمبے قد کی حسین عورت پھٹے پرانے کپڑوں سے داخل ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں سارنگی ہے۔ پرمانند سروج کو اشارہ کرتا ہے۔

پرمانند (آہستہ سے) سروج دیکھا

سروج۔ کیا

پرمانند۔ دیکھا تم نے بلا کی حسین ہے

(بھکارن گانا شروع کرتی ہے۔ سروج اس کی طرف پیٹھ کر لیتی ہے

پرمانند کیوں سروج تمہارا کیا خیال ہے۔

سروج کیا خیال۔

پرمانند۔ اگر اسے بھی دہلی لے چلیں۔

(سروج اٹھتی ہے ابھی گانا ختم نہیں ہوتا مگر اسے پیسے دے کر واپس لوٹا دیتی ہے)

پرمانند (ہنستے ہوئے) واہ یہ کیا کیا۔ کتنا اچھا گا رہی تھی۔

سروج گویا گانے کے ماسٹر تو آپ ہی ہیں، کہیں سے ایک دو گانے کی پھٹی پرانی کتابیں اٹھا لائے ہیں جو شروع سے آخر تک غلط واہیات۔

(مسکراتی ہوئی) یہ آپ تان سین کب سے بنے ہیں راگ ودیا کو کھیل سمجھا ہوگا۔ کل غسل خانے میں کیا گا رہے تھے!

پرمانند میں کب گا رہا تھا تو۔ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے

سروج یہ کھیل جورات کو دیکھا تھا کیا عمدہ تھا۔

پرمانند۔ ایک سین تو لاجواب تھا۔ ساس بہو کا جھگڑا توبہ توبہ

سروج مجھے تو جب وہ سین یاد آتا ہے۔ دل کانپ اٹھتا ہے آنکھوں میں اب بھی نیند ہے۔ سونے کو دل چاہتا ہے

پرمانند۔ میں بھی داڑھی مونڈ لوں تم یہیں بیٹھو۔

(پرمانند اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ سروج اخبار پڑھتی پڑھتی اونگھنا شروع کرتی ہے۔ وہ چونک کر اٹھتی ہے اخبار دیکھتی ہے اور پھر اونگھتی ہے اور جلدی ہی نیند میں مدہوش ہو جاتی ہے پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے اور پھر اٹھتا ہے)

* * * * * * *

کاملتا (ہاتھ میں ایک کھلی چٹھی لئے داخل ہوتی ہے) اس سنسار میں دکھ ہی دکھ ہے۔ جب اپنے بیٹے سے سکھ اور آرام نہ ملا تو غیر سے سکھ کی توقع رکھنا ہی غلطی ہے۔

(سروج کے قریب آکر)

بے شرم تجھے اگر موت نہیں آتی تو زہر کیوں نہیں کھا لیتی۔

سروج (خوف زدہ ہوکر) بھابی بھابی۔ یہ

کاملتا۔ خاموش جھوٹی مکار لڑکی۔ اگر مجھے تونے پھر بھابی کہا تو یاد رکھ تیری زبان ہی کاٹ لوں گی۔

سروج (خوف زدہ ہوکر) میرا ——— قصور

کاملتا ابھی قصور پوچھ رہی ہے یہ ہے تیرا کرتوت تجھے گھر میں رکھا جو چیز تونے مانگی وہ منگوا کر دی۔ اور تونے اس کے عوض یہ صلہ دیا کہ گھر خط لکھ مارا کہ میری کوئی سنتا نہیں مجھے مارتے ہیں یہ کرتے ہیں وہ کرتے ہیں

سروج۔ خط۔ بھابی کیا کہہ رہی ہو

کاملتا۔ تجھے معلوم ہو جائے گا۔ ذرا پرمانند کو تو آنے دے۔

سروج۔ اس خفگی کا باعث۔

کاملتا۔ خفگی، ابھی خفگی کا باعث پوچھتی ہے۔ تو نے ہماری بدنامی کی اپنی کی اور سب سے زیادہ اس کی بدنامی کی جس کی زندگی تیرے ساتھ وابستہ ہے جو تیرا سرتاج ہے۔

سروج۔ بس خاموش میں اور کچھ نہیں سن سکتی۔

کاملتا۔ اور میں بھی تجھے چوبیس گھنٹے کا نوٹس دیتی ہوں کہ کل اپنا اسباب وغیرہ اٹھا اور جہاں سینگ سمائیں وہاں چلی جا! لڑکے کی اگر زندگی رہی تو ہزاروں اور شادیاں ہو جائیں گی۔

سروج۔ اب خود ہی بتلایئے آپ نے کتنی باتیں کی ہیں گالیاں دیں میں نے کونسا برا کیا جو گھر لکھ دیا۔

کاملتا۔ تھو ہے تجھ پر اور لعنت ہے تیرے خاندان پر جنہوں نے بغیر سوچے سمجھے تیری ہر بات کو مان لیا۔ تونے ہمارے ہمسایوں سے لڑائی کرانے کی کوشش کی اور نہ معلوم تونے کیا کیا نہیں کیا۔

سروج۔ چلو یہی سہی میں نے سب کچھ کیا۔ کیا آپ کا سلوک مجھ سے اچھا رہا ہے؟

کاملتا۔ نہیں تو بچہ تھی! جو تجھ کو مارا کرتی تھی!

سروج۔ آپ کا سلوک۔ آپ کا سلوک جو بچوں سے ہوا کرتا ہے۔ اس سے بھی بدتر تھا اور اب بھی ہے

کاملتا ہوگا۔

سروج (اخبار ایک طرف پھینکتے ہوئے) یہ ہے زندگی ہندوستانی لڑکیوں کی ہم گوبر اٹھانے اور جھاڑو دینے کے لئے پیدا نہیں ہوئے گالیاں دینا کوئی کمال نہیں، باقی رہا سوال نکلنے اور سینگ سمانے کا تو وہ بھی دیکھ لیا جائے گا

کاملتا۔ تجھے غرور ہوگا اپنے والدین کا، اپنے حسن کا۔

سروج ہاں ہے۔ آپ کو اس سے غرض واسطہ

کاملتا۔ غرض میری بلا کو ہوگی۔ تو جادوگرنی ہے جادوگرنی۔ شکر ہے کہ مجھے پہلے معلوم ہو گیا۔ تونے پرمانند پر جادو کر دیا ہے۔ معلوم نہیں دہلی سے جا کر اسے کیا کرتی۔ ہم سے الگ ہونے کا مقصد یہی تھا۔ تو ناگن نکلی ناگن سانپ سے کھیلنا اپنی جان سے کھیلنا ہے۔

سروج۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہ خاموش ہو جائیے۔
کام لتا۔ پہلے تجھے خاموش کر لوں تو پھر اپنے خاموش ہونے کی بھی فکر کروں گی
کمبخت ہمارے گھر کیا آئی دنیا کی جتنی مصیبتیں ہیں اپنے ساتھ لائی تیرا
ہمارے ہاں اب کوئی کام نہیں چل میری آنکھوں سے دور ہو جا
(سروج دھوتی سے منہ چھپا لیتی ہے اور سسکیاں بھرتی ہے)
سروج یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ اس میں کسی کا کیا قصور ہے!
کام لتا۔ قصور! سراسر تیرا قصور۔ اول تو خط کا لکھنا ہی بیہودہ پن تھا اور اگر
لکھ بھی دیا۔ تو اپنے قصور کو۔ مانا اس سے بڑھکر غلطی ہے اگر
تجھے یہاں سکھ نہیں ملا تو کل سے اپنے گھر سکھ لے لینا۔ شادیانے
بجانا، ناچنا گانا غرضیکہ جو دل میں آئے کرنا ہم بھی دیکھیں گے کہ تجھے گھر
میں پھولوں کی سیج پر کون سلاتا ہے تیرے لئے وہاں مخملی فرش بچھا
ہے باندیاں لونڈیاں رکھی گئی ہیں۔ جو تیرے آگے پیچھے پھرا کریں گی۔
راجہ اندر کی پریاں پہنچی ہیں۔ کھانے کا انتظام ہو رہا ہے ناچ گانا
یعنی یہ کہ جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ تجھے معلوم ہے کس لئے؟ تیری شادی
کا انتظام ہے اب کی دفعہ تیری شادی بڑے امیروں راجاؤں کے
گھر ہوگی۔ جہاں تجھے بہت سکھ ملے گا۔
(سروج غصے میں کرسیاں ادھر ادھر پھینکتی ہے۔ میز پر پڑی ہوئی
ایک دو کتابوں کو پھینک دیتی ہے)
سروج۔ اگر یہی بات ہے تو میں عدالت تک چلنے کے لئے تیار ہوں۔
کام لتا۔ عدالت کیا کہتی ہو عدالت ــــ عدالت پرمانند کو بلاتی ہوں تمہاری عدالت"...
فقرہ کہے بغیر باہر چلی جاتی ہے

(پردہ)

(پردہ اٹھتا ہے کرسیاں پہلے کی طرح رکھی ہوئی ہیں کتابیں میز پر پڑی
ہیں۔ سروج نیند میں مدہوش ہے گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ ادھر ادھر
دیکھتی ہے حیران ہو رہی ہے کہ کیا معاملہ ہے دائیں بائیں چاروں
طرف غور سے دیکھتی ہے۔ نہایت پریشان اور پشیمان ہو رہی ہے)
سروج۔ آئیں کیا میں الگ ہو گئی ہوں۔ کیا یہ سچ ہے (دل کو ہاتھوں سے
تھام کر) کیا میں نے خط لکھا۔
(پھر ادھر ادھر دیکھتی ہے) یہ کس طرح ہو سکتا ہے ــــ کیا وہ
رات کے کھیل کا سین تھا۔ آخر کیا تھا۔
(بار بار مڑ کر دیکھتی ہے۔ آنکھیں ملتی ہے۔ حیرت اور سراسیمگی کے آثار
نمایاں ہیں۔ پرمانند شیونگ برش ہاتھ میں لئے اور گلے اور رخساروں پر
صابن ملے داخل ہوتا ہے۔ سروج پرمانند کو دیکھ کر عجیب سی شکل بنا لیتی ہے)
پرمانند۔ سروج تو تیار ہو جاؤ۔
سروج۔ آپ کہاں تھے (پرمانند کی طرف غور سے دیکھتی ہے)
پرمانند۔ آہا کہاں تھے! کیا بھول گئی ہو۔
سروج۔ نہیں، ہاں وہ آپ کیا کہہ رہے تھے۔
پرمانند۔ تم شاید سو کر اٹھی ہو۔ جو بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔
سروج (پھر چاروں طرف دیکھتی ہوئی) ہاں، شاید آنکھ لگ گئی تھی مگر
آپ نے وہ خط نہیں پڑھا
پرمانند۔ (حیرانگی سے) خط کیسا خط۔ کیا کہہ رہی ہو۔
سروج۔ اوہ مجھے کچھ اور خیال تھا۔ وہ بھابی کچھ ذکر کر رہی تھیں
پرمانند۔ کس کے متعلق!
سروج۔ (پھر آنکھیں ملتی ہے) وہ کیا کہہ رہی تھیں (خاموش ہو جاتی ہے)
پرمانند۔ (ہنستے ہوئے) سروج پاگل ہو گئی ہے۔ ہاں وہ میں کہنے آیا تھا
کہ آج بھی وہی کھیل ہوگا۔ جو کل ہوا تھا۔
سروج۔ میں نہیں دیکھنے جاؤں گی۔
پرمانند۔ تم تو اس کی تعریف کر رہی تھیں۔
سروج۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) بھابی کدھر ہیں
پرمانند۔ اندر کہیں ہوں گی۔ کیوں! کیا کچھ کام ہے۔
سروج۔ نہیں نہیں (پھر چاروں طرف دیکھتی ہے) میں ایسے ہی پوچھ رہی تھی
پرمانند (سروج کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے) تم کچھ خوفزدہ معلوم ہو رہی ہو۔
سروج (کچھ عجیب طرح ہنستے ہوئے) نہیں تو! آپ دہلی کب جائیں گے
پرمانند (ہنس کر) ابھی دہلی کے خواب آ رہے ہیں آئندہ ماہ میں جائیں گے۔
(پرمانند اس شیونگ برش سے سروج کے منہ پر تھوڑا سا صابن لگا دیتا ہے)
سروج (کچھ خوش ہو کر مگر ادھر ادھر دیکھتی رہتی ہے) میرا خیال ہے۔
پرمانند۔ ہاں
سروج ہم نہیں رہیں گے۔ تبدیلی کرنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا (چاروں
طرف دیکھ کر) بھابی کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔
پرمانند۔ خوب تو مجھ پر الزام مت لگانا۔
سروج۔ نہیں ہرگز نہیں
پرمانند تو آؤ جلدی چلو بھابی کو کہدیں کہ ہم دہلی نہیں جائینگے آپکے پاس رہینگے
(سروج اٹھتی ہے جاتے ہوئے بھی ادھر ادھر دیکھتی جاتی ہے)

(پردہ)

اندرلال داس قمر



صحت انسان کی بقا اور کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کمزور اور بیمار آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ ترقی کے تمام راستے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی دولت بغیر تندرستی کے بیکار ہے۔ ہر مرد اور عورت کو خواہ وہ غریب ہو یا امیر اپنی بہبودی اور راحت کے لئے صحت اور تندرستی کا خیال سب سے مقدم رکھنا چاہئے اور بقائے زندگی کے لئے ہر ممکن طریقہ پر کوشش کرنی چاہئے۔

طاقت وہ قدرتی قوت ہے جو انسان کو ہر کام انجام دینے کے قابل بناتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ انسان تندرست ہو مگر یہ لازمی نہیں کہ وہ قوی اور طاقتور بھی ہو۔ کمزوری اور کمی قوت جسم کی اندرونی چند خرابیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے عمر کے ساتھ یہ خرابیاں اور اس کے ساتھ کمزوری بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ انسان زندگی کا پورا لطف اور اس کے تمام کام انجام نہیں دے سکتا۔ تمام قوتیں یعنی قوت دل و دماغ۔ قوت جسم۔ قوت باہ مرد اور عورت کے لیے ضروری ہیں تاکہ زندگی خوش آرام اور پرلطف گزر سکے۔ ان قوتوں کو قائم رکھنا ایسا ہی ہے جیسا زندگی کو برقرار رکھنا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کا پورا پورا لطف اٹھائیں تو کمزوری۔ لاغری اور قوت مردانہ کی کمی کو نہ صرف دور کیجئے بلکہ اپنی طاقت اور قوت کو بڑھانے اور برقرار رکھنے کی کوشش کیجئے

جوانی مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں ضروری ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جوانی کے کیا معنی ہیں اور اس کے کیا فائدے ہیں۔ جوانی عمر کا وہ حصہ ہے جبکہ زندگی کا جوش زندگی کی حرارت اور تمام قوتیں پورے طور پر جسم میں موجود ہوں تاکہ انسان اپنی زندگی سے وہ لطف اور فوائد حاصل کر سکے جو ہر مرد اور عورت کا حق ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ جوانی کا شباب۔ تازگی۔ اور جوانی کی قوت کو برقرار رکھے۔ بڑھاپا اور کمزوری اور اس سے متعلق تمام شکایتیں دور رہیں۔ گرم ممالک میں یہ شکایتیں اور بھی جلد یعنی بہت قبل از وقت نمایاں شروع ہو جاتی ہیں۔ سائنس کے تجربوں سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جوانی کس طرح قائم رہ سکتی ہے اور انسان اپنی مردانہ طاقت اور جسمانی قوت کو کس طرح آخر وقت تک محفوظ رکھ سکتا ہے

قوت اور جوانی کا دارومدار کس چیز پر ہے؟

فطرت نے ہر انسان کو دماغی اور جسمانی قوت کی ایک خاص مقدار عطا کی ہے۔ جو عمر کی طوالت کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے بلکہ بسا اوقات گرم آب و ہوا سخت زیادہ محنت۔ ناکافی غذا اور کثرت جماع سے بہت جلد کم ہونے لگتی ہے اوکاسا اس روز بروز گھٹنے والی قوت کو برقرار رکھنے کا سب سے زیادہ حکمی طریقہ ہے۔ جس میں وہ تمام اجزا ہارمون شامل ہیں جو زندگی۔ قوت اور جسمانی طاقت کو قائم رکھتے ہیں۔ اوکاسا تمام دنیا میں مشہور ہو چکی ہے اور دنیا بھر میں ہر شخص اس کے بے نظیر فوائد کا قائل ہو چکا ہے۔ اوکاسا آپ کی کمزوری کو دور کرتی ہے اور آپ کو آخر زندگی تک ہر ممکن طور پر جوان اور طاقتور رکھتی ہے۔

آج ہی سے اوکاسا کا استعمال شروع کیجئے

آپ اس کے ذریعے بے نظیر صحت پوری طاقت اور جوانی کا لطف حاصل کریں گے فوری اور یقینی فوائد کے لئے سرخ لیبل والی اوکاسا استعمال کیجئے۔

تمام مشہور دوا فروشوں کے ہاں مل سکتی ہے

تازہ اوکاسا پورے لٹریچر بین الاقوامی اسناد کی کاپیوں اور ہندوستان و یورپ کے مصدقہ تعریفی خطوں کے لئے مندرجہ ذیل پتے پر لکھئے:۔

اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹڈ

۱۲ رامپرٹ رو۔ فورٹ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲ بمبئی

لاہور میں سے کا پتہ: جگت سنگھ اینڈ سنز دی مال لاہور اور میسرز بیلی رام برادرس انارکلی۔ لاہور

جاپان میں اُردُو

جاپان اور ہندوستان کے مابین روحانی تعلقات بہت پرانے ہیں ۵۵۲ء میں بودھ مذہب جاپان میں آیا تھا۔ اس کے بعد جاپانیوں میں بودھ مذہب کا رواج ہوتا چلا گیا ایک شہزادہ نے جو ہمارے شاہی خاندان میں سے تھے اور جنہوں نے بودھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ہندوستان جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۸۶۱ء میں وہ جاپان سے سفر ہندوستان پر روانہ ہوئے۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریباً اسی برس کی تھی۔ پانچ برس تک وہ چین میں رہے بالآخر ۸۶۶ء میں انہوں نے چین سے چل کر ہندوستان پہنچنے کا قصد فرمایا کہ راستہ میں ملایا پہنچکر اُن کا انتقال ہو گیا۔

بودھ مذہب جاپان میں رفتہ رفتہ زور پکڑتا رہا۔ یہاں تک کہ سب جاپانی اسی مذہب کے پیرو ہو گئے۔ مذہبی مسئلوں میں بڑے تعجب کی بات معلوم ہوتی ہے کہ مذہب اسلام نے جس کے آثار مغرب کی طرف ہسپانیہ سے لے کر مشرق کی طرف ملک چین اور سینجوریا تک پائے جاتے ہیں جاپان میں کیوں قدم نہ جمایا۔

بہر حال ایسی حالت میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ جاپان کی تہذیب و معاشرت پر جو آثار تہذیب ہند کے پائے جاتے ہیں وہ اسی بودھ مذہب کے ذریعے پڑے تھے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۵۴۲ء میں پہلی دفعہ پرتگیزوں کا جہاز جاپان پہنچا اور ۱۵۸۴ء میں اہل ہسپانیہ وارد جاپان ہوئے۔ جو اہل یورپ اسی زمانے میں جاپان آئے وہ زیادہ تر پادری لوگ تھے۔ اگرچہ انھوں نے عیسائی مذہب کے پھیلانے کی بڑی کوشش کی لیکن اس مذہب نے زیادہ رواج نہ پایا

۱۵۹۱ء میں پرتگیزوں کے وائسرائے ہند نے جو گوا میں تھے۔ ایک خط پادری کے ہاتھ تویوتومی ہیدے یوشی کو جو اسی زمانہ کا سب سے طاقتور سردار تھا، بھیجا۔ اس کے جواب میں ہیدے یوشی نے بھی ایک خط وائسرائے کے نام روانہ کیا تھا۔

ہیدے یوشی کی وفات کے بعد جاپان کے تعلقات یورپ کی قوموں کے ساتھ اور بڑھ گئے۔ پرتگیزوں اور اہل ہسپانیہ کے وارد ہونے کے بعد ڈچ، انگریز، فرانسیسی، روسی اور اہل امریکہ کی قوموں کی آمد ہونے لگی۔

اس زمانے میں اہل یورپ کی آمد نے جاپانی تہذیب قدیم کے جمود میں انقلاب کی تحریک پیدا کرنے کا کام کیا۔ اور جب کہ ہم حالت خواب میں تھے ہمارے آرام میں خلل ڈال دیا۔ دنیا کو سمجھنے اور علوم و فنون یورپ و امریکہ کے حاصل کرنے کی خواہش ہم میں پیدا ہو چلی تھی۔ ایسے موقع پر کیا تعجب ہے کہ غیر ملکی زبانوں کی اہمیت اور ان کی سخت ضرورت محسوس ہو گئی۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں ٹوکیو سکول آف فارن لینگویجز (مدرسہ السنہ غیر ٹوکیو) قایم کیا گیا۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ۱۸۸۴ء میں یہ مدرسہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۴ء کی جنگ چین کے بعد غیر ملکی زبانوں کی تحصیل کے لئے بڑی زوردار تحریک ملک بھر میں پیدا ہو گئی۔ پس ۱۸۹۶ء میں ٹوکیو سکول آف فارن لینگویجز نے دوبارہ جنم لیا۔ اپنی گذشتہ چہل سالہ زندگی میں یہ مدرسہ کامیابی کے ساتھ قومی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ اور ہندوستانی صیغہ جس میں ہندوستانی یعنی اردو زبان پڑھائی جاتی ہے اسی مدرسہ کا ایک جزو ہے

اب میں نفس مضمون کے متعلق معزز ناظرین کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس مضمون پر کچھ لکھنا مدرسہ السنہ غیر ٹوکیو جاپان کے صیغہ ہندوستانی کی تاریخ کا قلم بند کرنا ہے۔ اس مدرسہ پر ہمارے معزز دوست شیخ بدر الاسلام صاحب فضلی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ہمارے مدرسہ کے سابق زبان اردو کے پروفیسر نے رسالہ ہمایوں کی جلد بیس نمبر ۲ میں مختصر حال بیان فرمایا تھا۔

جنگ چین اور جنگ روس کی فتوحات کے بعد جاپان کی حالت مستحکم ہو گئی اور ممالک دنیا کے ساتھ دوستانہ تعلقات ترقی کرتے رہے۔ اس زمانے میں جاپان اور اس کے مشرقی ہمسایہ ہندوستان کے درمیان آمد و رفت اور تجارتی تعلقات عجیب طور پر بڑھنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زبان

کی سخت ضرورت محسوس ہونے لگی لیکن جاپان میں اردو یا ہندوستانی زبان کی تحقیقات بہ نسبت السنۂ یورپ کے بہت دیر میں شروع ہوئی۔

جاپان میں زبان اردو کی تعلیم پہلی دفعہ اپریل ۱۹۰۸ء میں مدرسہ السنۂ غیر ٹوکیو میں شروع ہوئی۔ اس وقت اردو زبان کے پڑھانے کے لئے بائیس گھنٹے ہفتہ وار مقرر تھے اور مدتِ نصاب ایک سال کی تھی۔ اور سبق اکثر شام کے وقت پڑھایا جاتا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۰۹ء میں بارہ، دوسری مرتبہ ۱۹۱۰ء میں دو پھر ۱۹۱۱ء میں پانچ طلبا اس جماعت سے کامیاب ہو کر نکلے

اس وقت اردو زبان کے ساتھ تامل زبان بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اردو زبان کے پڑھانے کے لئے جو ہندوستانی پروفیسر بلائے گئے تھے اُن میں اول ۱۹۰۸ء سے ۱۹۰۹ء تک دت صاحب مقرر ہوئے تھے ۱۹۰۹ء میں اُن کی جگہ مولوی محمد برکت اللہ صاحب مرحوم پروفیسر مقرر ہوئے۔ مولوی برکت اللہ صاحب مرحوم ۱۹۱۴ء تک ہمارے مدرسہ میں پروفیسر رہے۔ اسی زمانہ میں ایک جاپانی لیکچرار کے۔ فوجیتا نامی ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔

مارچ ۱۹۱۱ء میں اردو اور تامل دونوں جماعتیں بند کر دی گئیں اور اپریل ۱۹۱۱ء میں ہندوستانی صیغہ قائم کیا گیا۔ اب بجائے شام کے دن کو تعلیم ہونے لگی اور وہ تامل جماعت ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی۔ مولوی محمد برکت اللہ صاحب اس صیغہ کے طلبا کو برابر اردو زبان پڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں اُن کے مدرسہ چھوڑنے کے بعد ایک سال تک دیواری لال سنگھ صاحب ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک، اُن کے چلے جانے پر ۱۹۱۶ء میں پنڈت ہری ہرناتھ تھرل ٹل صاحب مرحوم اُن کی جگہ اردو پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ خوش مزاج، نیک دل، صاحب کمال، عالم و فاضل اور بڑے محنت کرنے والے تھے۔ وہ ۱۹۲۰ء تک طلبا کی تعلیم میں سخت تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ یہ خاکسار بھی جس کو ۱۹۱۹ء میں ہندوستانی صیغہ میں داخلہ کی عزت نصیب ہوئی تھی ان کے شاگردوں میں تھا لیکن صد ہزار افسوس کہ ۱۰ جون ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ٹوکیو میں ہو گیا۔ اس ہر دل عزیز پروفیسر کی یاد اکثر ان کے شاگردوں کو زار پاتی اور خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ اُن کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک کوئی ہندوستانی پروفیسر نہ رہے۔ اسی سال ہمارے صیغہ کے ایک فارغ التحصیل طالب علم مسمی اینوئی صاحب نائب پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ ۱۹۲۲ء تک مدرسہ میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں ہنری ڈرامنڈ صاحب ہندوستانی پروفیسر مقرر ہوئے وہ نہایت مہربان پروفیسر تھے۔ میں جو اُن کے شاگردوں میں تھا اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ بڑی عنایت سے پیش آتے تھے۔ وہ تقریباً دو سال تک مدرسہ میں کام کرتے رہے۔ ان کی جگہ ۱۹۲۴ء میں شمبھر دت صاحب پروفیسر مقرر ہوئے اور کوئی ایک سال تک پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۶ء میں لالہ عطرسین صاحب جین پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ تین سال تک پروفیسری کا کام کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں نومبر ۱۹۲۵ء میں یہ خاکسار اسی مدرسہ میں ہندوستانی لیکچرار مقرر ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں لالہ عطرسین صاحب جین کے مدرسہ چھوڑنے کے بعد ایک سال تک کیشورام صابر وال صاحب ہندوستانی لیکچرار مقرر ہوئے۔ اور دسمبر ۱۹۳۰ء میں شیخ محمد بدر الاسلام صاحب فضلی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ہندوستان سے تشریف لائے۔ وہ نہایت نیک دل، صاحب کمال تھے اور اردو و فارسی ادب میں گہری علمی لیاقت اور ذوق رکھتے تھے۔ وہ مارچ ۱۹۳۲ء تک اردو زبان اور کچھ فارسی بھی پڑھاتے رہے۔ شاید جاپان کی آب و ہوا نے ان کی صحت پر کچھ برا اثر ڈالا۔ وہ کبھی کبھی بیماریوں میں مبتلا رہے۔ اور انہوں نے سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ افسوس ہے کہ سوا سال کے بعد علالت طبع کے باعث وطن تشریف لے گئے لیکن خوشی کی بات ہے کہ اپنے وطن واپس تشریف لے جانے کے بعد اُن کی صحت بحال ہو گئی۔ وہ اب پانی پت میں حالی مسلم ہائی سکول کے عہدۂ ہیڈ ماسٹری پر فائز ہیں۔ اگرچہ جاپان میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بیماریوں کے علاج میں گزرا تاہم وہ اکثر جاپانی مسئلوں پر مضمون قلم بند کر کے رسالہ "ادبی دنیا" یا "ہمایوں" کو بھیجا کرتے تھے۔ "ادبی دنیا" کی جلد ۵ نمبر ۱ میں "جاپانی زبان کی دلچسپ خصوصیات" اور ہمایوں کی جلد ۲۰ نمبر ۱ میں ٹوکیو سکول آف فارن لینگوئجز وغیرہ مضامین ان کے قلم بند کئے ہوئے شائع ہوئے۔

شیخ فضلی صاحب کی جگہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ان کے معزز دوست مرزا محمد نور الحسن برلاس صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی علیگ ہندوستانی پروفیسر مقرر ہوئے وہ نہایت خوش مزاج، نیک دل، صاحب کمال اردو فارسی ادب اور مذہب اسلام پر گہری علمی لیاقت رکھتے ہیں اور بڑے محنت کرنے والے ہیں ان کی زوجہ محترمہ اشرف جہاں بیگم صاحبہ بھی ان خوبیوں سے متصف ہیں۔ جاپان تشریف لانے کے بعد برلاس صاحب اور ان کی زوجہ محترمہ یہاں کے تہذیبی اور معاشرتی مسئلوں پر جو ان کی نظر میں دلچسپ ہوں۔ اکثر رائے قائم کر کے رسالہ "ساقی" "عصمت" "تہذیب نسواں" وغیرہ میں مضامین شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان دونوں صاحبان کی مہربانی اور محنت و مشقت سے جاپان کی بہت کچھ خوبیاں ہندوستانی ناظرین کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں۔

ان کی تحریریں اکثر ہری تحقیقات سے قلم بند کی جاتی ہیں۔ اور وہ جاپانیوں کی تہذیب و معاشرت کی جیتی جاگتی تصاویر ہوتی ہیں۔ ان کے مضامین میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) جاپان اور منچوریا از برلاس صاحب مطبوعہ رسالہ "ساقی" دہلی فروری و مارچ ۱۹۳۴ء

(۲) جاپان میں ہندوستانی ڈرامہ از بیگم برلاس صاحبہ مطبوعہ رسالہ "ساقی" دہلی جون ۱۹۳۴ء

(۳) ٹوکیو میں مسلمان از برلاس صاحب مطبوعہ رسالہ "شاہجہاں" دہلی اگست ۱۹۳۴ء

(۴) جاپان میں حکمرانی از برلاس صاحب مطبوعہ رسالہ "ساقی" دہلی ستمبر ۱۹۳۴ء

علاوہ ان کے دس مضامین ہندوستان کے مشہور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور باقی دس گیارہ مضامین اب شائع ہونے والے ہیں۔

ہمارے ہندوستانی صیغہ کے اب تک کئی جاپانی لیکچرار مقرر ہو چکے ہیں لیکن وہ اکثر صرف چند ہفتے رہے۔ وہ لیکچرار سب ہمارے صیغہ کے فارغ التحصیل تھے۔ ایوئی صاحب پہلے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ بالآخر یہ تھا کہ ۱۹۲۵ء میں لیکچرار اور ۱۹۲۶ء میں اسسٹنٹ پروفیسر اور ۱۹۳۴ء میں پروفیسر مقرر ہوا۔

جاپان میں اردو مدرسہ بالا ہندوستانی اور جاپانی پروفیسروں اور لیکچراروں کی بے انتہا کوشش اور بے حد محنت و کاوش سے جاپانی طلبا کو پڑھائی جا رہی ہے۔ اس وقت ہمارے صیغہ کی تیسری جماعت میں دس اور پہلی جماعت میں پندرہ طالب علم اردو زبان پڑھ رہے ہیں۔ صیغہ کے فارغ التحصیل طلبا کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔ ان میں سے بعض ہندوستان یا دیگر غیر ملکوں میں جا چکے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر تجارت کے کام میں حصہ لیا ہے لیکن ان میں سے دو محکمہ خارجہ میں کام کر رہے ہیں بعض مڈل سکول میں انگریزی زبان کی تعلیم دیتے ہیں بعضوں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی ہے بعض جنوبی منچوریا ریلوے کمپنی کی خدمت کر رہے ہیں مختصر یہ کہ یہ لوگ مختلف پیشوں میں کسب معاش کر رہے ہیں۔

۱۹۲۶ء سے پہلے مدرسہ کی مدت نصاب تین سال تھی، لیکن اب ۱۹۲۶ء سے چار برس کی ہو گئی ہے جو گھنٹے ہندوستانی زبان کی تعلیم کے لئے مقرر ہیں وہ پہلی جماعت کے لئے بارہ گھنٹے ہفتہ وار، دوسری جماعت کے لئے نو گھنٹے، تیسری کے لئے سات اور چوتھی کے لئے چھ گھنٹے ہیں۔ مدرسہ میں جو اردو کتابیں استعمال کی جاتی ہیں وہ زیادہ تر یو پی یا پنجاب کی درسی کتابیں ہوتی ہیں۔ پرائمری کورس کی کتابیں ختم کرنے کے بعد جغرافیہ، تاریخ، مذاہب ہند وغیرہ کا مختصر حال پڑھایا جاتا ہے پھر مشہور افسانہ نگاروں کے افسانے، اردو اخبارات اور رسالوں کے مضامین، بڑے بڑے اہل قلم کے تحریر کردہ مضامین کے انتخابات، کچھ نظم، جاپانی زبان سے اردو میں ترجمہ، املا، خطوط نویسی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ہمارے صیغہ کے طلبا کے لئے علاوہ اردو زبان کے انگریزی زبان، مادری زبان، اقتصادیات، علم تجارت، مشق انشائے تجارت، ضابطۂ حکومت، قانون سول، قانون تجارت، قانون بین الاقوامی، اصول تعلیم اور جمناسٹک وغیرہ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنا لازمی ہے

ہمارے مدرسہ میں مارچ کے مہینے میں جلسہ دستار بندی کے موقع پر یہ قاعدہ ہے کہ گیارہ صیغوں میں سے دو کے طلبا اپنی اپنی حاصل کی ہوئی غیر ملکی زبان میں رئیس المدرسہ اور پروفیسروں کا شکریہ ادا کر کے الوداعی تقریر کرتے ہیں۔ اس سال ہمارے ہندوستانی صیغہ کی باری تھی تو ہمارے ایک طالب علم نے یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ اس تقریب کی بابت بیگم برلاس صاحبہ ایک مضمون بعنوان "یونیورسٹی کی الوداع" رسالہ "جبیات" ناگپور جولائی ۱۹۳۴ء کے پرچہ میں شائع کرا چکی ہیں۔ اس جلسہ کے علاوہ مدرسہ میں ہر سال نومبر کے مہینے میں دس غیر ملکی زبانوں میں ڈرامے کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی طلبا بھی ان میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ ڈرامہ اکثر سب سے اونچی جماعت کے طلبا کرتے ہیں گویا یہ چوتھی جماعت کے طلبا کا کام ہوتا ہے۔ اور ہمارے ہندوستانی صیغہ کی صرف دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ یعنی اگر اس سال پہلی اور تیسری جماعتیں ہیں تو اگلے سال دوسری اور چوتھی جماعتیں ہوں گی پھر پہلی تیسری، پھر دوسری چوتھی۔ اس لئے جب چوتھی جماعت ہوتی ہے اُس وقت اردو ڈرامہ کیا جاتا ہے۔ الغرض اردو ڈرامہ ایک سال بیچ کیا جاتا ہے۔ پچھلے سال اردو ڈرامہ "پرتگیا" کیا گیا تھا۔ جس کو جناب سدرشن صاحب نے چند سال ہوئے رسالہ "زمانہ" کانپور میں چھپوایا تھا۔ اس ڈرامہ پر ایک مضمون بیگم برلاس صاحبہ نے گذشتہ جون کے رسالہ "ساقی" دہلی میں "جاپان میں ہندوستانی ڈرامہ" کے عنوان سے شائع کرایا تھا۔

مدرسہ کے کتب خانہ میں ہندوستانی صیغہ کے لئے اردو، ہندی فارسی، عربی، انگریزی، جاپانی وغیرہ زبانوں کی کتابیں علم ادب، تاریخ، سوانح عمری، مذہب، افسانہ، قصہ، جغرافیہ، رسم و رواج، زبان، علم اللسان، تعلیم، صرف و نحو وغیرہ موجود ہیں۔ ان کتابوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار پانسو ہے۔ اگرچہ یہ تعداد ہرگز زیادہ نہیں کہی جا سکتی لیکن جاپان میں کسی اور کتبخانہ میں اتنی زیادہ اردو، فارسی، عربی وغیرہ کی کتابیں نہیں مل سکتیں۔ اردو کتابوں میں بڑے بڑے اہل قلم کی تصانیف اور اردو ادب کے نمونے بہت کچھ موجود ہیں۔ رسالے جو ہندوستان سے منگائے جاتے ہیں وہ رسالہ "اردو" (اورنگ آباد) "اسلامک کلچر" (حیدرآباد دکن) "ریاست" (دہلی) ہیں۔ خود مجھ کو ایڈیٹر صاحب "ادبی دنیا" بڑی مہربانی سے اپنا رسالہ باقاعدہ مرحمت فرما رہے ہیں اور رسالہ "ہندوستانی" (الہ آباد) بھی ایڈیٹر صاحب ہندوستانی کی بے حد عنایت سے میرے پاس پہنچتا رہتا ہے۔ رسالہ "ہمایوں" "نیرنگ خیال" اور ہندی رسالہ "سرسوتی" بھی تھوڑے عرصے تک میں پڑھتا رہا۔

"مدرسہ السنہ غیر" میں ہندوستانی صیغہ کے طالب علموں کی ایک مجلس ہے جس کا مقصد زبان، ادب، تاریخ، سوانح عمری، رسم و رواج، مذہب وغیرہ کی تحقیقات کرنا ہے اب اس مجلس کا سرمایہ اتنا کم ہے کہ ہم زیادہ کام نہیں کر سکتے لیکن سال میں ایک مرتبہ موسم گرما کی تعطیلات کے بعد چھوٹا سا رسالہ نکالا کرتا ہے۔ اس رسالہ میں کبھی کسی اردو مضمون کا ترجمہ شائع ہوتا ہے اور پروفیسر صاحبان اردو یا انگریزی میں مختلف مضامین پیش کرتے ہیں۔

ہمارے لئے یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جاپان میں اردو زبان کی یا اس کے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔ آر۔ ہیروسے صاحب نے ایک چھوٹی سی کتاب اردو گفتگو کی لکھی ہے۔ میرے ایک دوست دی۔ تاکاوکی صاحب نے جو چار سال تک ہندوستان میں رہے تھے "ملک ہند کی حقیقی حالت" کے عنوان سے ایک کتاب جاپانی زبان میں تصنیف کی ہے اور انہوں نے اپنی کتاب کے آخری حصہ میں ضمیمہ کے طور پر چند صفحات میں اردو زبان کی گفتگو چھپوائی ہے۔ حال میں ایس۔ نوموراؔ صاحب نے ایک کتاب بعنوان "اردو زبان کا خود آموز" شائع کرائی ہے۔ ان سب کتابوں میں اردو عبارت رومن حروف میں ہے اور ان میں اکثر غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام کتابیں شاید کچھ زیادہ کار آمد نہیں ہو سکتیں۔ علاوہ ان کے ایک ہندوستانی صرف و نحو ہے جس کو اس خاکسار نے تصنیف کیا ہے۔ یہ مدرسہ میں اردو زبان کی صرف و نحو کی تعلیم میں استعمال کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ عوام الناس کے استعمال کے لئے تو شاید موزوں نہیں۔ اس میں جو اردو عبارتیں موجود ہیں وہ سب اردو حروف میں ہیں۔

اردو زبان کے افسانوں یا ناولوں کا ترجمہ جاپانی زبان میں زیادہ نہیں ہوا ہے۔ ایک ہندوستانی کیشورام صابروال صاحب نے جو مدت سے ٹوکیو میں قیام پذیر ہیں اور جاپانی زبان میں مکمل مہارت حاصل کر چکے ہیں رسالہ "کائیزو" میں جو جاپان کے سب سے بڑے اور مشہور رسالوں میں سے ایک ہے منشی پریم چند صاحب کی کہانیوں کے جاپانی ترجمے چھپوائے تھے۔ ان میں سے ایک منتر کا ترجمہ تھا۔ منشی پریم چند صاحب کے متعلق چند سال ہوئے میں نے اخبار "توکیو نچی نچی" میں مختصر سوانح عمری اور ان کی افسانوں پر اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

موجودہ زمانہ کے جاپان میں چھپائی کا ہنر بڑی ترقی کر چکا ہے۔ اخباروں کی تعداد ملک بھر میں تقریباً آٹھ ہزار ہے اور ان میں سے روزانہ اخباروں کی تعداد ایک ہزار ایک سو سے زیادہ ہے۔ بڑے اخباروں میں سے "اوساکا مائی نچی" روزانہ پندرہ لاکھ سے زائد "توکیو نچی نچی" دس لاکھ سے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اور اخبار "توکیو اساہی" اور "اوساکا اساہی" کی اشاعت کی تعداد بھی تقریباً "اوساکا مائی نچی" اور "توکیو نچی نچی" کی اشاعت کی تعداد کے برابر ہوتی ہے۔ اور مشرقی زبانوں میں سے چینی زبان اور یورپ کی اکثر زبانوں میں کتابیں شائع ہو سکتی ہیں۔ سنسکرت زبان کے لئے بھی ناگری ٹائپ موجود ہے لیکن عربی، فارسی، اردو، اور زبان ملایا کے لئے ٹائپ کا ملنا بہت مشکل ہے۔ اگر مل جائے تو بھی اس کے استعمال میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ چونکہ اب تک جاپانیوں میں ان زبانوں کے سیکھنے کا شوق زیادہ پیدا نہیں ہوا لازمی طور سے ان زبانوں کی کتابیں شائع نہیں ہوئیں۔ اس لئے بڑے بڑے مشہور مطبعوں کے تجربہ کار مزدوروں کو بھی عربی، فارسی اردو حروف کے استعمال کا تجربہ نہیں۔ لیکن اب میرا تصنیف کردہ چھوٹا سا رسالہ صرف و نحو فارسی سفارت خانہ ایران کے سکرٹری مرزا احمد خاں اردشیر صاحب کی مہربانی سے شائع ہونے والا ہے۔ اس میں جو عبارت یا الفاظ فارسی زبان کے ہیں ان سب کو کسی طرح فارسی ٹائپ میں چھپوانے کا ارادہ ہے۔

اب میں مدرسہ السنہ غیر اوساکا کے متعلق معزز ناظرین کی خدمت میں کچھ عرض کرتا ہوں۔ یہ مدرسہ سنہ ۱۹۲۲ء میں اوساکا میں جو جاپان کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسہ میں بھی اردو زبان پڑھائی

جاتی ہے۔ وہاں اے۔ ساوا صاحب پروفیسر زبانِ ہندوستانی مقرر ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے ہندوستانی صیغہ کے ایک پرانے فارغ التعلیم ہیں انہوں نے ۱۹۲۰ء میں ہمارا مدرسہ چھوڑا تھا۔ علاوہ ان کے وہاں کے یاما موتو نامی صاحب ایک اسسٹنٹ پروفیسر ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں اس مدرسہ کی مدتِ نصاب تین سال کی ہے۔ چونکہ یہ مدرسہ بالکل نیا ہے اس لئے کتبخانہ میں بھی زیادہ کتابیں موجود نہیں۔ گذشتہ مارچ کو پروفیسر لالہ عطر سین جین صاحب کے مدرسہ چھوڑنے کے بعد جناب مدن لال صاحب لاہوری ہندوستانی پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ جو گذشتہ مئی میں جاپان تشریف لائے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ وہ نہایت نیک دل صاحب کمال اردو اور فارسی ادب میں گہری علمی لیاقت اور ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا اوساکا تشریف لانا مدرسہ معروف کی بڑی خوش نصیبی ہے اس مدرسہ میں بھی ہندوستانی صیغہ کی دو جماعتیں ہوتی ہیں اور طلبا کی تعداد عام طور پر تیس، اسی صیغہ کے گریجویٹوں کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔ اسی صیغہ کے طالب علموں کی مجلس سال میں ایک دفعہ رسالہ "اندو یو" (بحرِ ہند) شائع کرتی ہے جس میں ہندوستان، افغانستان، ایران وغیرہ ممالک کے متعلق مختلف اقسام کے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان میں تعلیم زبان اردو کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی اور کن کن اشخاص کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جاپان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے درمیان جوں جوں آمد و رفت بڑھتی جائے گی اور تجارتی تعلقات ترقی کرتے جائیں گے جاپانیوں میں ملک ہند کی تہذیبی اور معاشرتی حالت کے متعلق تحقیقات کی اور تاریخی و مذہبی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی جائے گی۔ اور ہندوستان کی مروجہ زبانوں میں سے اردو ہندی دونوں زبانوں کی تحقیقات کی اہمیت عوام الناس کے ذہن نشین ہو جائے گی۔

آر۔ گامو

۳۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء

(از ٹوکیو۔ جاپان)

بہرۂ عام

منظرِ صبحِ ازل پھر یاد مجھ کو آ گیا　　آج پھر اس کا تصور دل میں تڑپا گیا

حصۂ ہر انسان کا جب مجھ کو دکھلایا گیا

خود میں حیراں ہوں کہ مجھ سے کس طرح دیکھا گیا

سامنے محمود کے وہ لعل و گوہر کی نمود　　وہ سکندر اور وہ فوجِ سکندر کی نمود

وہ فریدوں کی نمایش اور وہ اکبر کی نمود

تختِ پراں کو سجا کر تاج پہنایا گیا

ذوق بخشِ کائناتِ زندگی تھا مزا　　حُسنِ شیریں کا وہ جلوہ وہ فسوں پرور مزا

کیا کوئی ہے درد کی لذت سے بھی بڑھ کر مزا

مفت میں کیا کوہکن کے دل کو تڑپایا گیا

کیا کہوں اس کا ہے میرے دل پہ کیسی دلربا اثر　　یادِ تقسیمِ ازل ہے کارفرما ذہن پر

بعض لوگ افسردہ خاطر بھی نظر آئے مگر

میں نے بھی کچھ کر لیا جو کچھ مرے پاس آ گیا

جب ہو کارآمد ابد تک بہرۂ عامِ ازل　　راز حسرت کیوں ہو انعام و اکرامِ ازل

کر سکے کوئی بیاں کیا شانِ اقسامِ ازل

بہرہ دستِ غیب سے کس کو نہ پہنچایا گیا

علی منظور حیدرآبادی۔